اپریل 2020

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

اهنامه

نگران اعلیٰ
عراج رسول

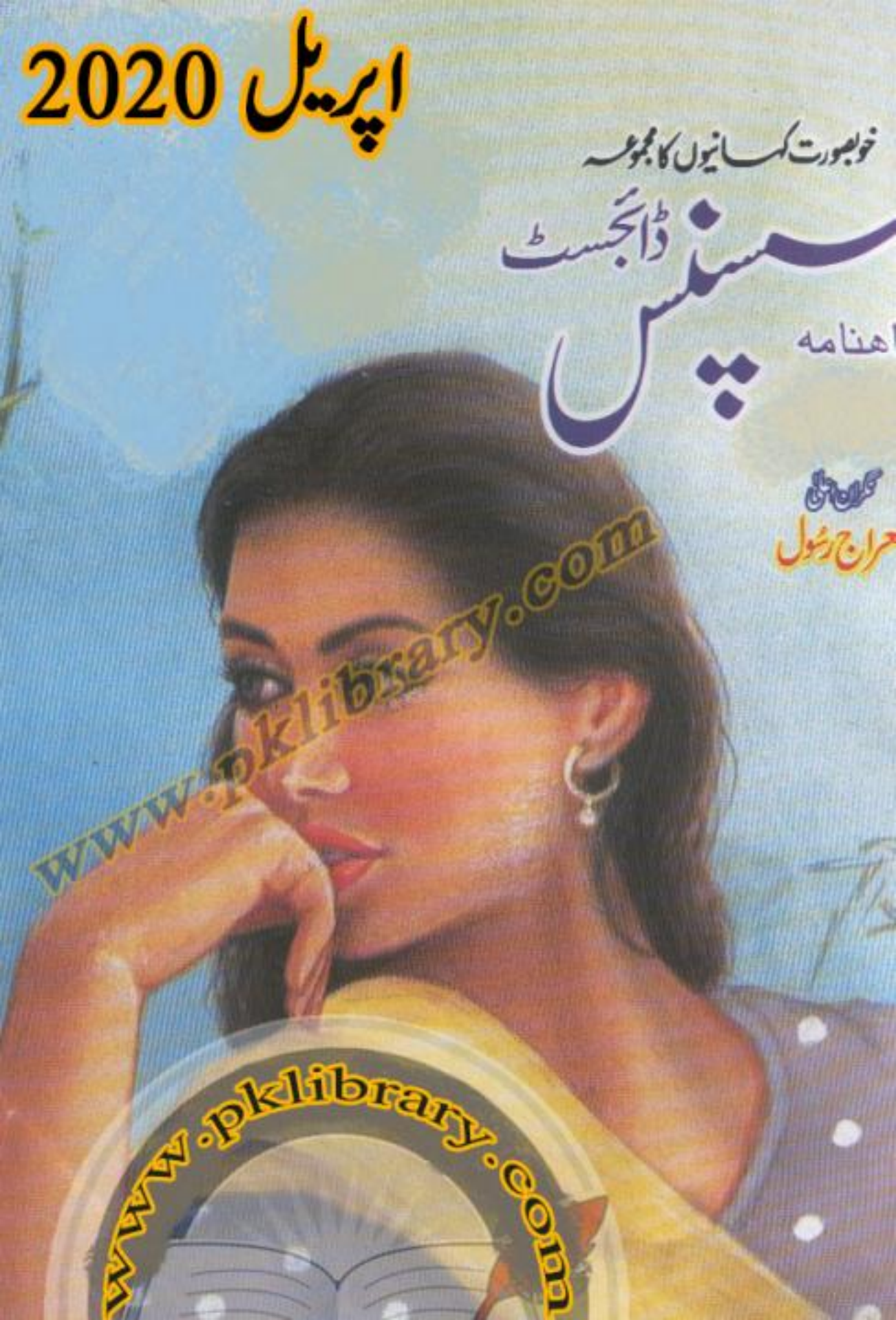

www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

اپریل 2020

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

اهنامه

نگران اعلیٰ
عراج رسول

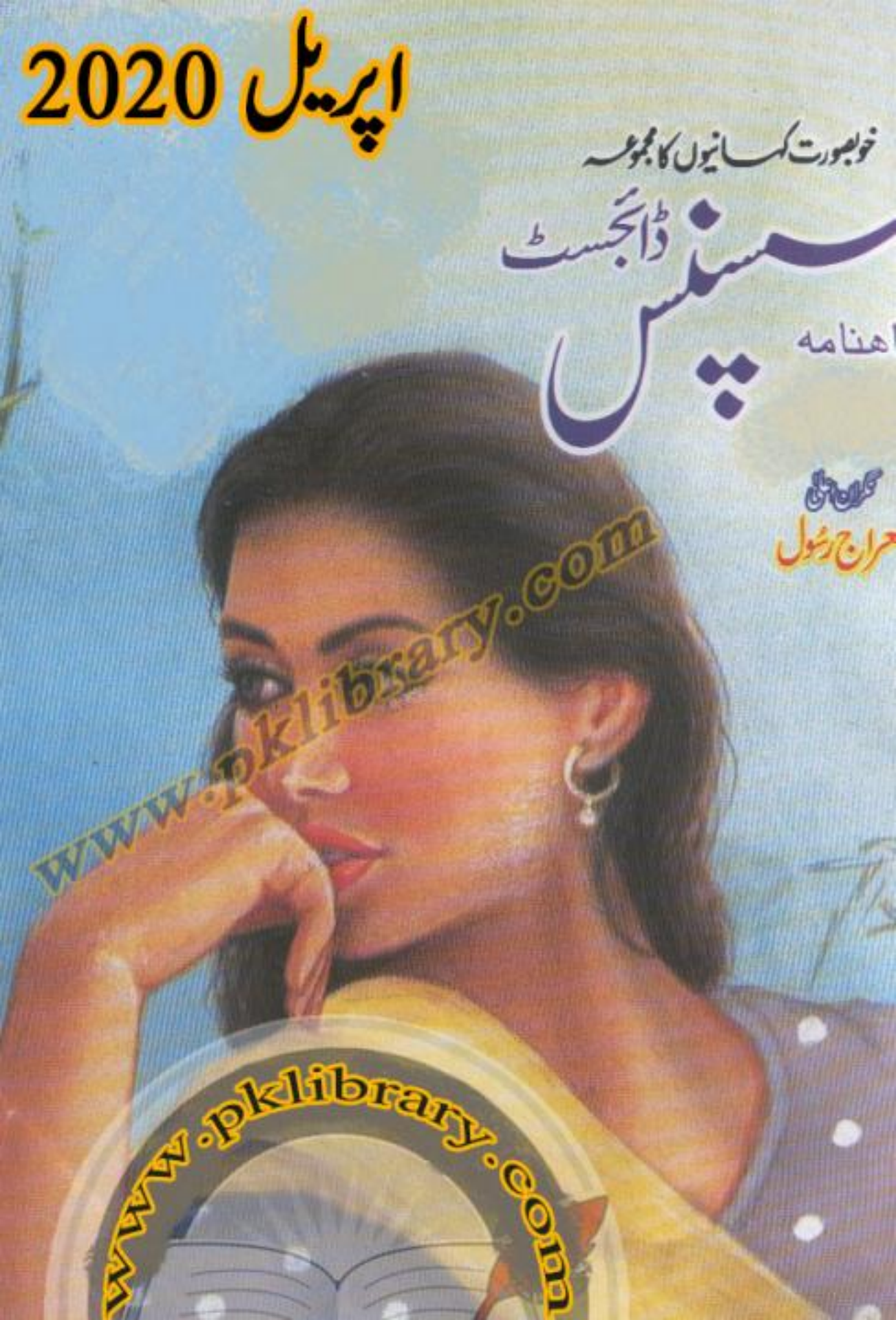

www.pklibrary.com
www.pklibrary.com

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE MEMBER APNS

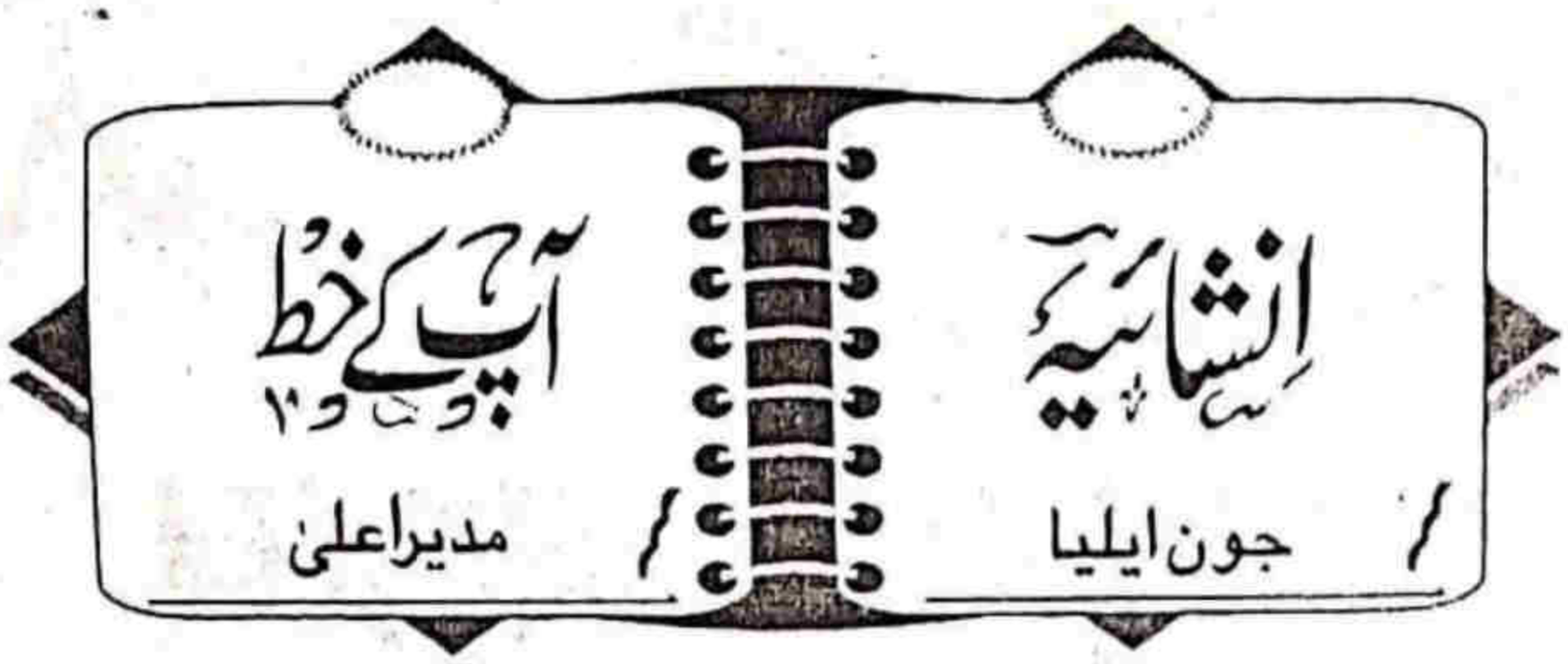

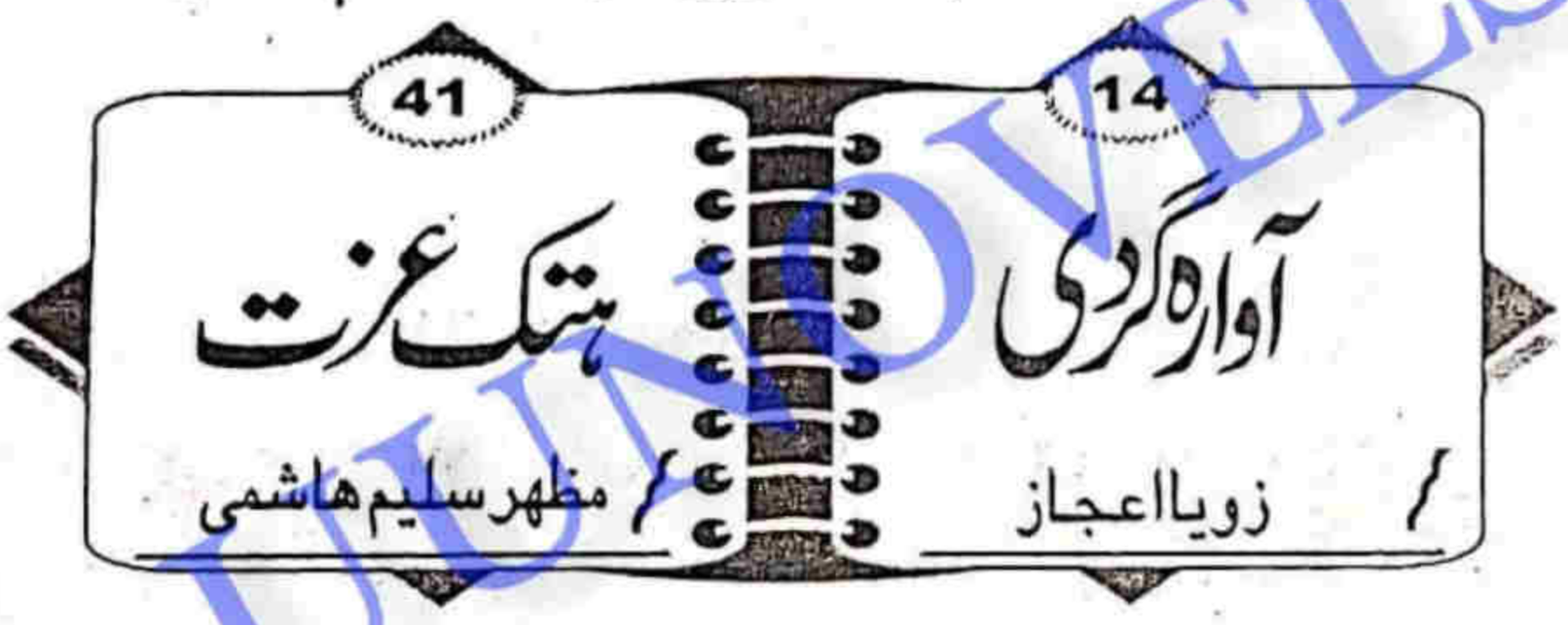

انشائیہ — جون ایلیا
آج کے انسانوں کو لاحق بڑے خطرے کی نشاندہی، بے ضمیروں اور غداروں کا قصہ

آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

14 — آوارہ گردی — زویا اعجاز
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

41 — ہتک عزت — مظہر سلیم ہاشمی
دوستوں کے درمیان ہرجانے اور جرمانے کی عجیب روداد

51 — طویل مسافت — غلام قادر
خاموش محبت کے رستے میں ٹھوکر کھانے والے ایک عاشق بامراد کا قصہ

70 — شہہ زور — اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

99 — اپنا پن — منظر امام
خون کے رشتوں میں محبت کا رنگ تلاش

105 — پنکی دی گریٹ — احمد جعفری
غنڈا گردی کرنے والے

113 — برقی تعلق — طاہر جاوید مغل
رستے ہوئے زخموں کا درد کم کرنے

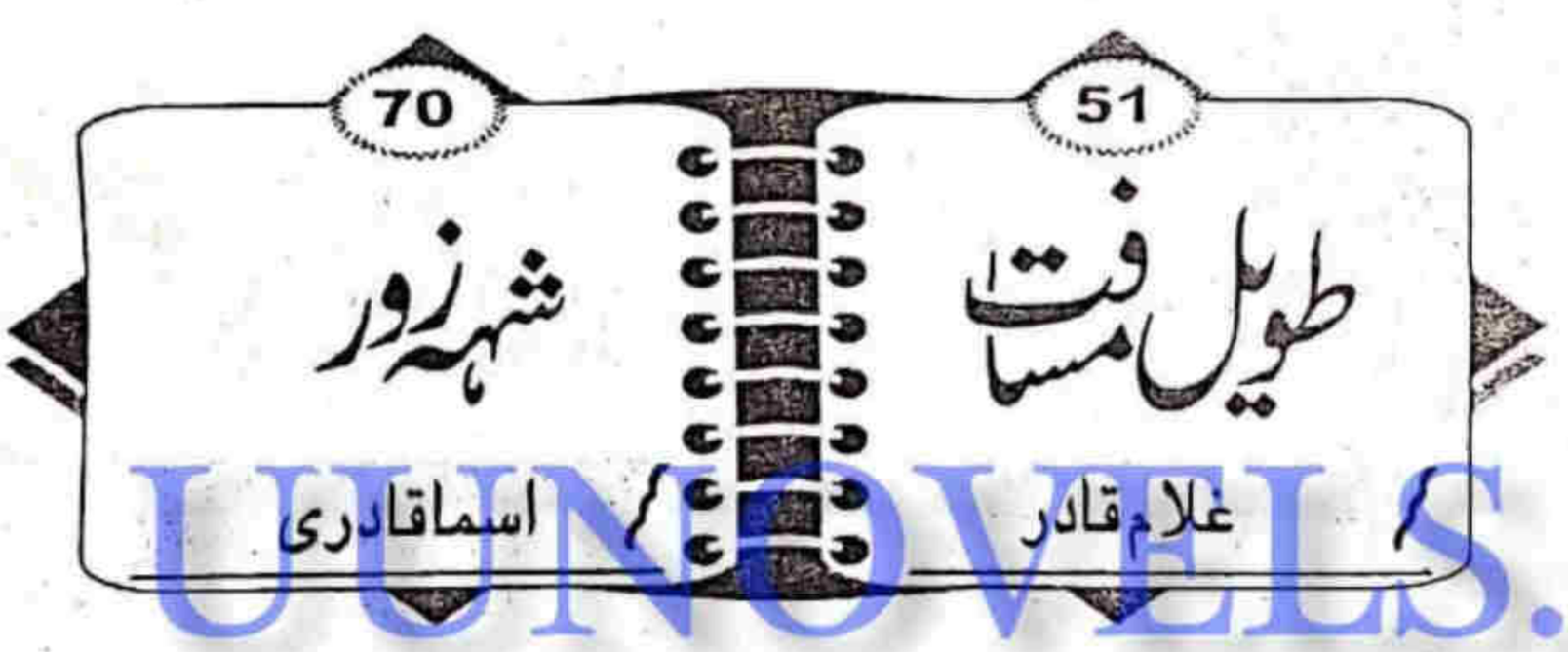

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ — یمنیٰ احمد
نائب مدیر — اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

UUNOVELS.COM

120 — حکمت عملی — ملک صفدر حیات
153 — پرستار — ایم الیاس
163 — دوسرا قیدی — عبدالرب بھٹی

سچائی کی تلاش میں حیران کی بازی لگانے والے فرض شناس پولیس آفیسر کا جذبہ

لمبی چھلانگ لگانے کے فن میں ماہر حسینہ کے محض دو قدم کا احوال

جاں نثار کرنے والے ایک قاتل عاشق کی انتہا پسندی

169 — پناہ کی تلاش — تنویر ریاض
178 — محفلِ شعر و سخن — قارئین
181 — زود پشیماں — ایم اے راحت

موت کے گھر میں زندگی تلاش کرنے والے کی بے وقوفیاں

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے والے ایک پتھر دل انسان کی پشیمانی

200 — ساشا — عمر عبداللہ
227 — تنہائی کا عذاب — شاہ زین رضوان
237 — حضرت حسین بن منصور حلاجؒ — رضوانہ ساجد

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

فلاحی اداروں میں تنہائی کو آباد کرنے والے ٹوٹے ہوئے لوگوں کی کہانی

اللہ کے ایک نیک فطرت اور برگزیدہ بندے کا مقام

247 — پراسرار — رانا زاہد حسین
255 — مظلوم — کبیر عباسی
262 — چاہِ تمنا — نہاہید سلطانہ اختر

شریک سفر کو دھوکا دے کر ٹھوکر کھانے والے شوہر کا انجام

ہواؤں میں اڑنے والی ایک بے وزن حسینہ کا عبرت اثر قصہ

محبت کی مسحور کن دھن پر لہرانے والی ایک [illegible]

UUNOVELS.COM

انشائیہ

جون ایلیا

نیکی

بستیاں سوالوں کے انبوہ میں گھری ہوئی ہیں، ساتھ ہی وہ مسئلے ہیں جن سے ساری دنیا دوچار ہے۔ ہر مسئلہ اپنے سے بڑے مسئلے کا حل چاہتا ہے اور یہ دائرہ پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اگر ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے، زبان گل نہیں گئی ہے اور عقل کو جنون نہیں ہو گیا ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی ان تیز و تند حقیقتوں سے بھاگ کر اپنے اندر پناہ لینا چاہیں، مسئلوں کے اس ہجوم میں انسانیت کے کھوے چھل گئے ہیں۔ تم ذرا دیکھو تو انسانیت کی جواں ہمتی پر کس قدر بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ پر انسانیت کا یہ قافلہ افتاں و خیزاں برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ جاننے، نہ جاننے اور سب کچھ جان کر انجان بننے کے درمیان ایک جنگ ہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ آج بھی سچائی کو جھٹلایا جاتا ہے پر ایسا ہے کہ لہجے کی کھوٹ اور کپٹ اب نہیں چھپتی۔ انسان کی تمام بدبختیوں نے نادانی اور ناحق کوشی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، جھگڑا بس یہ ہے کہ بعض مسخرے اس کرۂ ارض پر سر کے بل چلنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں ٹوکا اور برابر ٹوکتے رہیں گے، یہ ملکوں اور قوموں کا جھگڑا نہیں ہے، قدروں کا جھگڑا ہے۔

انسانیت ایک خاندان ہے نہ اس میں کوئی امتیاز ہے اور نہ تفریق، جو تفریق پیدا کرتے ہیں وہ اس مقدس خاندان میں شامل نہیں۔ لکھنے والوں اور بولنے والوں کا جتنا بھی مقدور ہو اس کے مطابق عالمگیر سماج کے قیام کی کوشش کرنا ان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ یہ وہ مقصد ہے جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ جب ہم امریکا یا انگلستان کو برا کہتے ہیں تو وہاں کے شریف عوام اور دانشور مراد نہیں ہوتے، وہ تو ہمارے خاندان کے محترم رکن ہیں۔ انسانیت دشمن چاہے پاکستان کے رہنے والے ہوں یا امریکا اور انگلستان کے، وہ ہماری نفرت کے یکساں طور پر مستحق ہیں۔ دنیا میں صرف دو عقیدے پائے جاتے ہیں۔ انسانیت اور انسانیت دشمنی اور صرف دو قومیں رہتی ہیں انسان اور انسان دشمن۔ یہ دنیا کے ہر حصے میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ یہ شاید ایک اتفاق ہے کہ ہمیں ایک ایسے دور میں اپنے انسانی فرض کی بجا آوری کا موقع ملا ہے جب انسانیت کے دشمنوں نے مغرب کو اپنا مرکز قرار دیا ہے۔ اگر یہ مرکزیت مشرق کو حاصل ہو جائے تو پھر ہماری تمام سخت کلامیوں کا ہدف مشرق قرار پائے گا۔

پیشہ ور مجرموں کے اس عالمی جتھے سے خبردار رہو جو نہ مغرب کا دوست ہے اور نہ مشرق کا۔ تمہاری تمام مصیبتوں اور محرومیوں کے ذمے دار یہی لوگ ہیں۔ یہ اور ان کے ہوا خواہ انسانوں کو بہلانے اور بہکانے کے ہنر میں طاق ہیں۔ دیکھو، صرف اچھی باتوں ہی کو اپنا مداوا نہ سمجھو، صرف باتوں سے بدن پر گوشت نہیں چڑھتا۔ ان جھوٹے اور باتونی چارہ گروں کی باتوں میں نہ آنا، یہ تمہیں محض خوش آئند لفظوں پر قانع رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر زندہ رہنا ہے تو ایسی قناعت سے پناہ مانگو۔ اور ہاں، عالمی اخوت کے جعلی نعروں کا فریب کبھی نہ کھانا۔ کچھ لوگ ہیں جو اس باب میں بہت عجیب باتیں کرتے ہیں، یہ اپنے سرپرستوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔

لو انہیں پہچانو! یہ گروہ اپنے ذاتی عقیدے کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ انہیں اس کی کوئی فکر نہیں کہ ایک شخص فاقے کی آگ میں جل رہا ہے، انہیں تو صرف اس بات سے سروکار ہے کہ وہ ان کا عقیدہ تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ یہ حضرات زمین اور اس کے معاملوں سے بہت بلند ہیں۔ انہوں نے تو آسمانوں کو گویا پہن لیا ہے۔ ان کے مقدس عقیدے کا نہ کوئی وطن ہے اور نہ کوئی زبان۔ یہ بستیوں کی امنگوں کو بجھا دینا چاہتے ہیں۔ عالمی سماج کا نظریہ تمہیں وطن دشمنی اور اپنی تہذیب سے غداری کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ مگر جس عالمی اخوت کا نعرہ یہ لوگ بلند کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ تم اپنی آزادی، استحکام، حب وطن سماجی سالمیت اور اپنی تخلیقی انا سے یکسر دست بردار ہو جاؤ، اچھا فرض کرو کہ ان کا مطلب یہ نہیں ہے اور ہم بہتان تراشی سے کام لے رہے ہیں، پر یہ سوچو کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور تم اپنی زبان، تہذیب اور اپنے وطن کی محبت سے یکسر بیگانہ ہو جاؤ تو اس کا فائدہ کون اٹھائے گا، تم یا تمہارے دشمن؟ یقین کر لو اس کا فائدہ تمہارے دشمن اٹھائیں گے جو خود ان حضرات کے بھی دوست نہیں ہیں۔

کچھ لوگ ہیں جو اس ملک کو بُرا کہہ کر ہی سکون پاتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف یہیں پائے جاتے ہیں، دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جو ایسے لوگوں کو اپنے درمیان پائے اور انہیں برداشت کرتی رہے۔ جنہیں اس قوم پر غصہ آتا ہے ان کا احترام کرو، ان کے سامنے محبت اور عقیدت سے گردنیں جھکاؤ مگر جو صرف بُرائی کرنا اور پاکستان کی تحریک کو طعنے دینا جانتے ہیں، انہیں نمک حرام اور غدار جانو کہ بُروں کو بُرا کہنا اور سمجھنا بھی بڑی نیکی ہے۔

☆...☆...☆....

دوسرا حصہ

آوارہ گردی

زویا اعجاز

دنیا مختلف تواریخ کا دلچسپ مجموعہ ہے... اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر دور کے تمام پہلوئوں پر دنیا کی نظر بھی پڑ جائے... بہت کچھ جان لینے کے باوجود بہت کچھ نظروں سے اوجھل بھی رہ جاتا ہے... کچھ ایسا ہی حال اس عہد کا بھی رہا جس نے اپنے وقت پر دھوم بھی مچائی اور تباہی بھی... جہاں مختلف عقائد کا ٹکرائو اور نتیجے میں جنگ و جدل نے بڑی خونیں تاریخ رقم کی... انتہائی گنجلک کرداروں اور غیر یقینی حادثات و واقعات سے گندھے انتہائی پُرسرار ماضی کا عکس در عکس۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت آثر واقعات

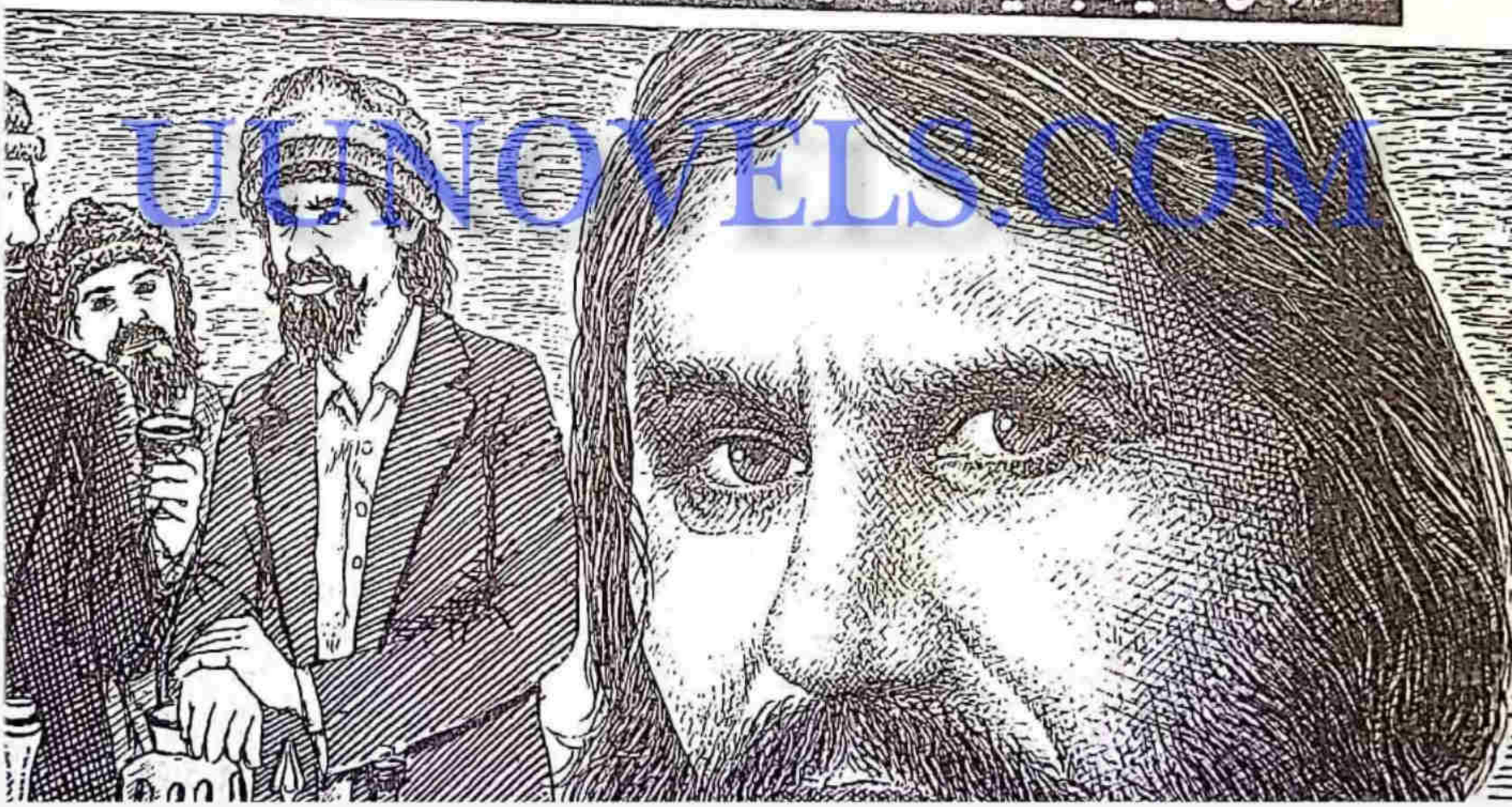

UUNOVELS.COM

اس کشمکش سے الجھتے زار خاندان ریلوے کی ہڑتال کے باعث دارالحکومت سے دور رہنے پر مجبور تھا۔ان کا قیام ''پیٹرہوف'' میں تھا اور دربار میں افواہوں کا یہ عالم تھا کہ زارشاہی کے بحری جہاز پر انگلینڈ فرار کی باتیں زبان زدِ عام تھیں۔حالات میں بہتری کی کہیں سے کوئی امید بر نہیں آرہی تھی۔ زارینہ بھی اپنا شاہی وقار اور کروفر بھول کر میلیتسا کے درپے ہو چکی تھی۔اسے کسی بھی قیمت پر مافوق الفطرت قوتوں کا مالک روسی نژاد شخص درکار تھا۔میلیتسا نے اس کی ملاقات فیوفان سے کروادی جس کے مزاج میں سادگی کا عنصر زیادہ تھا۔اسے ملکہ کی بیماری اور مسائل پر گفتگو سے زیادہ چرچ کے امور پر بات چیت میں دلچسپی تھی۔وہ فلپ کی چرب زبانی اور تیزی طراری میں اپنا کوئی خاص مقام نہ بنا سکا۔اس کے بعد میلیتسا کرونسٹیڈ کیتھڈرل کے بڑے پادری ''لوآن'' کو اپنے محل میں مدعو کرنے لگی۔ فادر لوآن روس بھر میں شہرت کا حامل تھا۔محل میں اس کے احترام کا یہ عالم تھا کہ نکولس کے والد کی وفات کے وقت لوآن ہی اس کے سرہانے موجود تھا۔اسے بیماروں کو شفا بخشنے کی خصوصی عیسائی قوت حاصل تھی۔المیہ یہ تھا کہ فادر لوآن کے مزاج میں بھی سازشوں اور دوجمع دوبائیس بنانے کا کوئی مادہ نہ تھا۔یہی وہ وقت تھا جب میلیتسا فادر گریگوری راسپوٹین کو محل میں متعارف کروانے کا سوچنے لگی تھی۔فادر گریگوری کے بارے میں لوآن اور فیوفان کی رائے بہت اچھی تھی۔ میلیتسا کو یقین تھا کہ وہ ''دہقان'' زارینہ کے تمام دکھ دور کردے گا۔اسی ضمن میں گریگوری کو طلب کر کے فیوفان اور میلیتسا نے اعتماد میں لیا تھا جس کے بعد اس کے ذہن میں شطرنج کی ایک بساط بچھ گئی تھی۔اس شطرنج کے ہر ایک مہرے کا کردار بالکل واضح تھا۔ وہ مخمور انداز میں لیٹا خلا میں گھورتا رہا۔

''زارشاہی تک رسائی اس قدر آسان ثابت ہوگی یہ تو میں نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔وہاں قدم رکھتے ہی کیا کیا کچھ میسر نہ ہوگا۔احترام' دولت' اختیار.....سب کچھ میری مٹھی میں ہوگا.....گریگوری راسپوٹین کی مٹھی میں۔''اس نے خود کلامی کرتے ہوئے اپنا غلیظ ہاتھ چوم لیا۔اس کے ذہن میں ایک بار پھر میلیتسا کا خیال اجاگر ہو گیا جس نے اس سے باقاعدہ حلف لیا تھا کہ وہ زار اور زارینہ سے ملاقات کے لیے کبھی کوئی

جلد بازی یا پہل نہیں کرے گا۔ درباری حالات' اہل خانہ کا فلپ اور سیرافیم کے متعلق غیظ و غضب کسی بھی نئے شخص کو محل میں قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ گریگوری نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ وعدہ کرلیا۔ اکتوبر 1905ء کے وسط میں زارنکولس نے روس کے پہلے آئین پر دستخط کردینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ فیصلہ بلاشبہ بہت مشکل تھا۔ اعصابی تناؤ اور اپنے آباؤ اجداد کی تین سو سالہ شہنشاہت کے خاتمے کے احساس نے اس کے دل و دماغ کو بوجھل اور خیالات میں الجھاؤ پیدا کررکھا تھا۔ انہی دنوں میلیتسا نے گریگوری کو شاہی محل میں جانے کے لیے ذہنی تیاری کا عندیہ دے دیا۔ اس نے گریگوری کی باطنیت' روحانیت اور کمالات کا ذکر کرکے زارینہ کی آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا۔ زارینہ کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اپنے وعدے کے مطابق فلپ دوسرا جنم لے کر ان کی مدد کے لیے چلا آیا ہے۔

اس نازک وقت میں ہر قریبی شخص انہیں جان بچا کر بحری جہاز کے ذریعے انگلستان فرار ہونے کا مشورہ دے رہا تھا لیکن زارشاہی اپنا اقتدار چھوڑ کر جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ گریگوری نے اس ساری صورتِ حال میں اپنا کردار نبھانے کے لیے مکمل ذہن سازی کرلی۔ ماہ اکتوبر اپنی تمام تر ہولناکی کے ساتھ اختتام پذیر ہوچکا تھا۔ نومبر کا آغاز ہوتے ہی زارشاہی میں صوبہ توبول کے اس دہقان کی آمد ہوئی جس نے ان کی زندگی کی طنابیں اپنے ہاتھ میں لے کر مستقبل قریب میں ایک دردناک انجام سے دوچار کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ یکم نومبر کی ایک سہانی سہ پہر تھی۔ نکولس اور الیکسس چار بجے کے قریب سرگیوگا پہنچ گئے۔ میلیتسا اور اسٹینا نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ چائے کا دور چلنے کے بعد ان کی ملاقات فادر گریگوری سے کروائی گئی۔ زارینہ اس ''خدا کے بندے'' سے ملنے کے لیے بہت مشتاق تھی۔ اسے فلپ کا نیا روپ دیکھنا تھا۔

''زارینہ! ان سے ملیے۔ یہ سرزمین روس کے ایک نیک اور بہت باکرامت ولی فادر گریگوری ہیں۔ خداوند نے انہیں بہت سی قوتیں عطا کررکھی ہیں۔'' میلیتسا نے تعارف کی رسم نبھائی۔

''میری خوش نصیبی ہے کہ آج مجھے پاپا (زار روس) اور ماما (زارینہ) سے روبرو اور ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔'' اس کی پُرشوق نظریں زارینہ کے شباب بدن پر مرکوز تھیں۔ عمر رفتہ کی گرد اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ پانچ بچوں کی پیدائش کے بعد بھی اس کی دلکشی اور خوبصورتی میں رتی بھر فرق نہ پڑا تھا۔ اس کے چہرے' انداز اور آنکھوں میں اداسی' اضطراب اور خوف نقش ہوچکے تھے۔ انسانی چہروں کو کسی کھلی کتاب کی طرح پڑھنے والے گریگوری راسپوٹین نے ایک ہی لمحے میں اس کے تمام مسائل اور الجھنیں بھانپ لیں

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی فادر گریگوری!'' الیکسس کے نزاکت و وقار نے اس کی دھڑکنیں مزید تیز کردیں۔

''ہر ہائی نس! میرے نزدیک آپ کا مقام بہت مقدس ہے۔ اسے جھوٹ بول کر یوں خراب تو نہ کیجیے۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے آپ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی؟'' وہ حیران ہوئی۔

''اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایمانداری سے بتایئے۔ آپ اس وقت خوش نہیں بلکہ کسی شدید پریشانی میں مبتلا ہیں۔'' گریگوری نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''زندگی میں پریشانیوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے فادر؟ یہ دکھ اور پریشانیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔'' اس نے بالواسطہ تصدیق کی۔ گریگوری نے گہری نظروں سے نکولس کی جانب دیکھا جو ان باتوں سے لاتعلق اپنی ہی سوچوں میں مگن تھا۔ اس کی پیشانی پر بل اور جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

''لیکن آپ کی زندگی میں یہ پریشانیاں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دکھ اور مصائب آپ کی زندگی میں کسی موسم کی طرح ٹھہر ہی گئے ہیں۔ ہے نا؟'' اس کی اپنایت پر زارینہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''جی ہاں! ایسا ہی ہے۔'' وہ سسکی لے کر بولی۔

''خدا اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ آپ کی یہ آزمائشیں بھی یقیناً بہت بلند درجات اور آسائشیں لے کر آئیں گی۔'' گریگوری کے الفاظ اور انداز ٹھنڈی پھوار کی طرح اس کی انگاروں پر لوٹتی روح کو سکون دینے لگے۔

''مجھے تو اب یاد بھی نہیں کہ آخری بار میں کب دلی طور پر خوش ہوئی تھی۔'' وہ افسردہ ہوئی۔

''مجھے تو علم ہے..... ولی عہد کا یوم ولادت آپ کے لیے بے پناہ خوشیاں لایا تھا۔'' اس کے کامل انداز نے الیکسس کی آنکھیں ایک بار پھر نم کردیں۔

''پریشانی اور آنسو عقل و شعور نگل جاتے ہیں..... ہر ہائی نس! روسی سرزمین کو آپ لوگوں کی بہت ضرورت ہے۔ اپنی

قدرو قیمت پہچانیے۔اپنی ذات کو یوں اذیت میں مبتلا نہ کریں۔'' گریگوری نے اس کے احساس تفاخر میں ہوا بھری۔ زارینہ کو اس کا انداز گفتگو بے حد بھایا۔وہ اس سے بات چیت میں شوہر کی موجودگی سے بھی غافل سی ہوگئی تھی۔ نکولس سوچوں کے جنگل میں بھٹک کر کہیں دور گم تھا۔

''آپ دعا کیجیے نا فادر! دعا کیجیے کہ خداوند ہماری زندگیاں ہموار بنادے۔'' زارینہ نے دلار سے کہا۔

''میں ضرور دعا کروں گا لیکن دوا تو آپ ہی کو کرنی ہو گی۔آپ کو بھی اپنے ان مسائل کے حل کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے ہوں گے۔''

''مجھے بتایئے فادر! آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔نہیں! میں غلط کہہ گئی۔آپ جو کہیں گے ہم وہی کریں گے۔'' زارینہ نے شوہر کی طرف دیکھا۔

''سب سے پہلے تو اپنے اندر سے خوف کا خاتمہ کیجیے۔ اسی خوف نے آپ کی شخصیت اور وقار کو گہنا رکھا ہے۔'' راسپوٹین نے اسے سمجھایا۔

''انقلابیوں کی دہشت گردی نے اس کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔سمجھ ہی نہیں آتا کہ اس صورتِ حال سے زار شاہی کو کیسے محفوظ رکھا جائے۔نکی بے خوابی کے مریض بننے لگے ہیں۔ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں گم رہتے ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں کے زیر اثر بلا ارادہ ہی جذبات کو گویائی دینے لگی تھی۔

''اس صورتِ حال سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ خوف سے نجات پاؤ اور حکمرانی کرو۔'' گریگوری نے قدرے جارحانہ انداز اختیار کیا۔''انقلاب پسند طبقہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔شہنشاہیت کی تو گرد بھی نہیں چھو سکے گا۔انہیں کوئی سیندھ لگانے کا موقع فراہم نہ کیجیے۔میری دعائیں کسی حصار کی طرح آپ کی حفاظت کریں گی۔''

گریگوری کی بھرپور تسلی نے زارینہ کو مطمئن کر دیا۔ وہ اس کی ذات میں فلپ کا عکس محسوس کر کے پُرسکون ہونے لگی تھی۔

''ولی عہد کیسے ہیں؟'' گریگوری کے اس سوال پر وہ چونک گئی۔

''الیکسی بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

''اس کی علالت بس کچھ ہی عرصے کی بات ہے۔اگر معاملات میرے ہاتھ میں رہے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ صرف یہی نہیں! دہقان طبقہ آپ دونوں کا بے دام غلام بن جائے گا۔'' اس کی اپنایت پر زارینہ کا دل گداز ہو گیا۔وہ اپنے وجود میں تشنگی کا احساس لیے نکولس کے ساتھ لوٹ گئی۔ فیوفان بھی ضروری کام سے کہیں روانہ ہو گیا۔اب گریگوری کے ساتھ صرف میلیتسا تھی۔

''کیسی رہی ملاقات؟'' گریگوری نے معنی خیزی سے پوچھا۔

''آپ نے میری توقعات سے بڑھ کر اسے متاثر کیا ہے فادر! آپ نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔'' میلیتسا نے جوش سے جواب دیا۔

بات تو سچ ہے

☆ اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تو آپ کو پہلے اپنا آئینہ توڑنا چاہیے۔

☆ تجربہ بہترین استاد ہے لیکن اس مدرسے کی فیس اپنا قیمتی وقت ہے جو بہت زیادہ ہے۔

☆ مہمان چلے جانے کے بعد اکثر بہت اچھے لگتے ہیں۔

☆ اپنے متعلق آپ خود کچھ نہ کہیں، یہ کام آپ کے جانے کے بعد ہو جائے گا۔

☆ خوش امیدی ایک ماسٹر کی ہے جس سے ہر بند دروازہ کھولا جا سکتا ہے۔

☆ ہجوم میں کئی سر ہوتے ہیں لیکن دماغ نہیں ہوتے۔

لڑائی

پاکستان میں پہلے آدھی لڑائی اس بات پر ہوتی ہے..... تو ہاتھ تو لگا اور پھر آدھی لڑائی اس بات پر ہوتی ہے..... تُو نے ہاتھ کیسے لگایا۔

☆☆☆

حدود

جو چیز آپ کو نہیں ملنی وہ کسی کے پاس بھی چلی جائے گی مگر آپ کے پاس نہیں آئے گی اور جو آپ کی قسمت میں ہے وہ آپ کے لاکھ نہ چاہنے کے باوجود آپ کو ہی ملے گی۔ اللہ کو آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ بشر ہیں مخلوق ہیں۔ آپ کو اپنی حدود میں ہی رہنا چاہیے۔

مرسلہ۔وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

UUNOVELS.COM

''ایسی کئی حیرتیں ابھی مزید تمہاری منتظر ہیں۔''

''آپ باکمال ہیں فادر!'' وہ نثار ہوجانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ گریگوری نے اس کے عزائم بھانپ لیے اور ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

''میں آپ سے ناراض بھی ہوں فادر۔'' میلیتسا کا شاہی انداز یکسر تبدیل ہوگیا۔

''کیوں ناراض ہو؟'' گریگوری نے اس کی زلفیں سنواریں۔

''آپ اس الیکسس کی تعریف کررہے تھے تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں؟'' اس نے دلار سے کہا۔

''سرزمین روس کی حفاظت کے لیے وہ سب کرنا ضروری تھا۔'' گریگوری نے اسے سمجھایا۔

''فادر! آپ کی ذات میں ایک عجیب جادو ہے۔ یہ جادو مجھے ہوش وحواس سے بے گانہ کردیتا ہے۔ ابھی میں آپ کو یہ کہنا چاہتی تھی کہ زارینہ سے کبھی براہِ راست ملاقات نہ کیجیے گا ورنہ زار کی والدہ اور دیگر اہلِ خانہ آپ کے خلاف بھی نئی سازشوں میں مصروف ہوجائیں گے۔ دربار میں بہت حاسدین ہیں۔ آپ جیسا مذہبی انسان وہاں سخت روحانی اذیت محسوس کرے گا لیکن یہ سب کہنے کے بجائے میں آپ کے پاس یوں کھنچی چلی آئی ہوں۔''

''اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے میلیتسا۔ میرے ساتھ تمہارا ہر عمل مقدس ہے۔ میں عام انسان نہیں ہوں۔ مجھ سے تعلقات قائم کرنا خداوند کی خوشنودی کا ذریعہ ہوگا۔'' وہ اپنے مخصوص شیطانی منتر پھونکنے لگا جن کا میلیتسا پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ اس نام نہاد شخص کی باطنی شیطنت محسوس کرنے سے قاصر تھی۔ گریگوری اسے عملی طور پر محبت اور اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے بتانے لگا کہ وہ فیوفان کی رہائش گاہ میں بالکل آرام دہ نہیں ہے اور وہ بہت جلد میلیتسا کو مزید برکات و کرامات عطا کرنے کے لیے اس کے محل منتقل ہوجائے گا۔ میلیتسا اس کی آنکھوں کے تنویم میں بری طرح گرفتار تھی۔ وہ بلا مزاحمت اس کے ساتھ اخلاقی حدود پامال کرتی چلی گئی۔

☆☆☆

نکولس اور الیکسس سے پہلی ملاقات کے بعد گریگوری نہایت صبر وسکون سے اگلی طلبی کا انتظار کررہا تھا۔ اسے علم تھا کہ وہ بہت جلد محل میں قدم رکھ دے گا۔ اس کی راہیں خود بخود آسان ہورہی تھیں۔ پیٹرزبرگ کی اشرافیہ بھی اس کی جانب متوجہ ہوچکی تھی۔ دو روز بعد ہی گریگوری کے پاس فادر میڈویڈ

''فادر گریگوری! میں آپ کو ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''لگتا ہے کسی حاجت مند کو میری ضرورت پیش آگئی ہے۔'' وہ اترایا۔

''جی ہاں! ہمیں حکومتی ملازم ولادی میر لوختن کے گھر جانا ہوگا۔''

''کون ولادی میر؟ کہیں یہ انجینئر اور ریاستی کونسلر تو نہیں؟'' گریگوری چونک گیا۔ اس وقت یہ غیر فوجی عہدہ فوجی جرنیل کے برابر ہی سمجھا جاتا تھا۔

''جی ہاں! وہی ہے۔ ولادی میر کی بیوی ''اولگا لوختینا'' بہت بیمار ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ کسی روحانی تبدیلی کا شکار ہوکر سماجی زندگی سے بیزار ہورہی ہے۔ اس کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ بیماری نے بستر سے ہی لگا دیا ہے۔ سہارا لیے بغیر چل ہی نہیں پاتی۔''

''میں اس کی ہر بیماری کا علاج کردوں گا۔ وہ بالکل ٹھیک ہوکر بھرپور سماجی زندگی بھی گزارنے لگے گی۔'' راسپوٹین نے اعتماد سے کہا اور میڈویڈ کے ساتھ جنرل کے گھر چلا گیا۔

لوختینا کی عمر لگ بھگ بیالیس سال تھی تاہم وہ اپنی عمر سے چھوٹی ہی دکھائی دیتی تھی۔ بیماری نے اس کی دلکشی میں اضافہ ہی کر رکھا تھا۔ گریگوری کے ہاتھوں کے جادوئی لمس اور آنکھوں کی قوت نے لوختینا پر ایسا اثر کیا کہ وہ فوری طور پر خود کو تروتازہ اور پُرسکون محسوس کرنے لگی۔

''شکریہ فادر! آپ واقعی عظیم ہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ گریگوری کو دیکھ کر سحرزدہ ہورہی تھی۔ اس کے غلیظ کپڑوں، بدبودار جسم، میلے ناخنوں والے ہاتھوں اور میل سے چکٹے بالوں کے باوجود ایک بے نام کشش اسے اس کی جانب کھینچ رہی تھی۔ راسپوٹین اس کی کیفیت سے محظوظ ہونے لگا۔

''اب تمہیں کبھی کچھ نہیں ہوگا۔ تم ہمیشہ صحت مند اور چاق وچوبند رہا کروگی۔'' وہ اس کی آنکھوں کو اپنے سحر میں لیتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اب زندگی بھر کبھی کوئی بیماری مجھے نہیں چھوئے گی۔ میں سچ کہتی ہوں فادر! آپ سے عظیم مسیحا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟ مجھے اپنی خدمت اور خاطر کا کوئی تو موقع دیجیے۔'' لوختینا اس کے

''دوں گا۔ تمہیں بھی اپنی خدمت کا موقع ضرور دوں گا۔'' راسپوٹین نے ایک بھرپور نظر اس کے سراپا پر ڈالی اور پھر گھر بار کا جائزہ لینے لگا۔ اسے میلیتسا کے محل کی نسبت یہ اپارٹمنٹ زیادہ پسند آیا تھا۔ وہ یہاں اپنی تمام سرگرمیاں بھرپور طریقے سے جاری رکھ سکتا تھا۔

''میں منتظر رہوں گی فادر! اس خوش نصیبی کے لیے میں دل و جان سے منتظر رہوں گی۔'' لوختینا نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ گریگوری اپنی قوتِ تسخیر پر مسکراتے ہوئے اس کے بالوں اور چہرے سے اٹکھیلیاں کرنے لگا۔

''میری ایک بات یاد رکھنا اولگا لوختینا! میں خداوند کا خصوصی نمائندہ ہوں۔ مجھے براہِ راست بہت سی برکات حاصل ہیں۔ میرے ساتھ تعلقات استوار کرنا ایک مقدس عمل ہے اور مجھے دھوکا دینے والے کے لیے پاتال میں بھی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔'' راسپوٹین نے اپنے لہجے کے زیر و بم سے اسے مزید مسحور کیا۔ لوختینا کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ حواس پر کوئی نشہ غالب آ رہا تھا۔

''آپ خداوند کے خصوصی نمائندے ہیں فادر! آپ کو براہِ راست برکات حاصل ہیں۔ آپ کے ساتھ تعلقات استوار کرنا ایک مقدس عمل ہے۔ آپ کو دھوکا دینے والے کے لیے پاتال میں بھی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ میں اس مقدس عمل کے لیے اپنے شوہر کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ میں آپ سے ہمیشہ وفادار رہوں گی۔'' وہ میکانکی انداز میں بولنے لگی۔

''تم اسے کسی بھی طرح راضی کرو گی کہ مجھے اس گھر میں رہائش دی جائے۔ تم اپنے شوہر کو بھی اس مقدس رشتے کے متعلق علم نہیں ہونے دو گی۔'' اس نے نئی ہدایات دیں۔ لوختینا نے تمام احکامات من و عن دہرا دیے۔

''میں جب بھی چاہوں تم اپنی بیٹی کو بخوشی میرے حوالے کر دو گی اور اس بارے میں کبھی کوئی اعتراض نہیں کرو گی۔'' راسپوٹین کی نظریں کمرے کے باہر لوختینا کی کمسن بیٹی پر تھیں۔

''میں آپ کی یہ طلبی اپنی بیٹی کے لیے خوش قسمتی تصور کروں گی فادر!'' وہ خمار کے رتھ پر سوار تھی۔

''تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے لوختینا؟ زارنکولس سے اس کے کیسے مراسم ہیں؟'' راسپوٹین نے کمرے کا دروازہ بند کر کے کھڑکیوں کے پردے بھی برابر کر دیے۔

''لوختن زار کو سیلو میں پختہ سڑکوں کا انچارج ہے۔ زار سے اس کے اچھے تعلقات ہیں۔ ہمارے کئی احباب شاہی دربار میں ہوتے ہیں۔ دربار میں جاری افواہوں سے آگاہی بھی ہو جاتی ہے۔'' وہ مخصوص ذہنی رو میں بتاتی چلی گئی۔ راسپوٹین کو اپنا فیصلہ بالکل درست محسوس ہونے لگا۔ ولی عہد اور زارینہ کے متعلق مزید معلومات کے لیے یہ گھرانا بہترین ثابت ہوتا۔

راسپوٹین کی توقعات کے عین مطابق اس نے نہ صرف اسے اپنی رہائش گاہ میں قیام کی اجازت دے دی بلکہ اس بات کے لیے بھی بخوشی راضی ہو گئی کہ اولگا اپنے علاج کے لیے کسی بھی وقت اس کے ساتھ جا سکتی ہے۔ لوختن کو یقین تھا کہ فادر گریگوری شفا بخشنے والا ایک حیرت انگیز انسان ہے جس کی صحبت میں انسان بیماری سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں نومبر کے وسط میں راسپوٹین نے اپنے گھر پوکرووسکوئی جانے کا ارادہ کیا تو لوختینا بھی کسی معمول کی طرح اس کے ہمراہ ہو گئی۔ اس نے اپنے شوہر اور کم سن بیٹی کا بھی کوئی خیال نہ کیا تھا۔ راسپوٹین نے پورے سفر میں اسے اپنی سیلانی زندگی کے بہت سے واقعات سنائے۔ لوختینا اس کے دلچسپ انداز میں ڈوب کر ابھر ہی نہ سکی۔ اس کے لیے یہ زندگی کا خوشگوار ترین سفر تھا۔ وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ فادر گریگوری کی مزید اسیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی باتیں روح تک کو سرشار کر دیا کرتیں۔

''اگر میں تم سے کہوں کہ آج ریلوے میں ہڑتال ہو جائے گی تو تم کیا کہو گی؟'' راسپوٹین نے دورانِ سفر اس سے کہا۔ ان دنوں روس میں ملک گیر ہڑتالیں جاری تھیں۔ راسپوٹین کی ایسی کوئی بھی پیشگوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن لوختینا کی ذہنی کیفیت نہایت غلامانہ ہو چکی تھی۔

''آپ ایسا کہہ رہے ہیں تو میں آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لوں گی۔'' اس نے جذب کے عالم میں جواب دیا۔

وہ فادر گریگوری کے آبائی گھر پوکرووسکوئی تک پہنچنے کے اس سفر میں ہر بات کو کسی معجزے سے ہی منسوب کر رہی تھی۔

''آج تم دیکھو گی کہ ہمارے گھر پہنچنے تک خداوند کے چند خصوصی نمائندے حالات کو اپنے قابو میں رکھیں گے۔ اس کے بعد صورتِ حال خراب ہو جائے گی۔ پیٹرزبرگ میں تو بہت سی آفات آنے کا اندیشہ ہے کیونکہ میں جو وہاں سے چلا آیا ہوں۔'' اس نے تکبر سے کہا۔

''آپ عظیم ہیں فادر گریگوری! میں بہت خوش نصیب ہوں کہ آپ کی ذات کے سائے میں چلی آئی ہوں۔'' وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ پوکرووسکوئی پہنچنے کے بعد اہلِ خانہ کا ردِ عمل لوختینا کو گنگ کر گیا۔

Jasoosi Digest March 2020

قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔

"اب آ گیا ہوں نا کچھ دن یہیں رہوں گا۔"

راسپوٹین نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا۔

پریسکو ویا کی حالت بہت عجیب تھی لیکن زندگی نے اب تک اس کا تعارف عجائبات سے ہی تو کروایا تھا۔ وہ اپنے گھر میں والدین اور بن بھائیوں کے ساتھ بہت پُرسکون رہتی تھی۔ گریشا آندھی کی طرح آیا اور لوفان کی طرح چھا گیا۔ اسے شریک حیات بنا کر اپنے گھر لایا تو اس کی ذات تنکے کی طرح ہلکی ہو کر رہ گئی۔ وہ اس کے عجیب و غریب معمولات پر قطع تعلق کر لینا چاہتی تھی لیکن گریشا کے سامنے آتے ہی سب کچھ بھول کر اس کے قدموں کی دھول بن جاتی۔ اس وقت اسے شوہر کے دوسری عورتوں سے تعلقات بُرے لگتے' نہ ہی پراسرار حرکات کے بارے میں کوئی تجسس ہوتا۔ اس کے لیے گریشا کی کسی بھی بات سے انکار ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر نئی مہمان اور گریشا کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گئی۔ اولاد بھی اس کا مکمل ساتھ دے رہی تھی۔ لوخینا جیسی جدید روس کی پروردہ خاتون کے لیے اہلیہ کی یہ عاجزی بہت حیران کن تھی لیکن وہ کسی بھی قسم کی رائے دینے کی اہل نہ تھی۔ وہ ایک غلام تھی۔ اس کی سماعت' بصارت اور دیگر حواس وہی کچھ دیکھ' سن اور محسوس کر رہے تھے جو فادر گریگوری ہدایات دے رہا تھا۔ گریگوری چاہے جس کمرے میں شب بسری کرتا' لوخینا اور اہلیہ کے ساتھ تعلقات استوار کرتا' انہیں مختلف عبادات اور خدا کی قربت و خوشنودی حاصل کرنے کے طریقے بتاتا۔ ان عبادات پر عمل کر کے لوخینا کو اپنی ذات زمین سے بلند محسوس ہونے لگتی۔ گریگوری کی تابع قوتوں نے ان کے دل و دماغ پر ایسی دھند طاری کر رکھی تھی کہ وہ سب اس کی کسی بھی بات یا حکم سے انکار کر ہی نہ پاتے۔ اس کے دیے گئے بظاہر غیر معمولی احکام بھی کسی منفی سوچ کے بغیر بجا لاتے۔ ایسی ہی ایک ہدایت کے مطابق راسپوٹین' پریسکو ویا' لوخینا اور دو بیٹیوں نے حمام میں ایک ساتھ غسل کیا۔ ان کے چہرے سپاٹ اور حواس سلب تھے۔ کوئی بھی غیر اخلاقی فعل محسوس ہو کے ہی نہ دیتا۔ پوکرووسکوئی میں کچھ عرصہ ایسی ہی حرکات و معمولات میں گزارنے کے بعد وہ لوخینا کے ساتھ پیٹرزبرگ چلا آیا جہاں زار اور زارینہ سے ملاقات بہت ضروری ہو چکی تھی۔

سازشوں' نفرت اور حسد کی زہریلی فضا میں ولی عہد کی پیدائش خوشگواریت کا پہلا جھونکا بن کر آئی تھی لیکن خرابی قسمت کی انتہا تو یہ تھی کہ یہ خوشی بھی ادھوری تھی۔ شہزادہ الیکسی آئے دن بیماری کی وجہ سے بستر پر ہی پڑا رہتا۔ ان دنوں بھی وہ بخار کے باعث صاحب فراش تھا۔ شاہی ڈاکٹرز کا کوئی بھی علاج مؤثر ثابت ہی نہیں ہو رہا تھا۔ فیوفان نے فادر گریگوری کو بلوانے کی درخواست کر کے الیکسس کے مُردہ تن میں ایک نئی روح پھونک دی۔

گریگوری کو فیوفان کے خصوصی عقیدت مند کی حیثیت سے طلب کیا گیا۔ وہ اپنی میلی' حریص نظروں سے محل کی شان و شوکت دیکھنے لگا۔ وسیع و عریض عمارت' سنہرے نقش و نگار' خوبصورتی' زیبائش' شاہانہ وقار اس کا دل گدگدانے لگے۔

"ولی عہد اب کیسا ہے؟" اس نے الیکسس کے آتے ہی پوچھا۔

"وہ ٹھیک نہیں ہے فادر! وہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔" الیکسس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "پتا نہیں کس کی نظر کھا گئی ہے میرے بچے کو؟"

"وہ بیمار نہیں ہے۔ وہ آپ کے خون کی بیماری بھگت رہا ہے۔" راسپوٹین کے معنی خیز انداز پر زارینہ اس کی روحانیت پر مزید فدا ہو گئی۔ ہیموفیلیا انہی کا موروثی مرض تھا۔

"کچھ کیجیے فادر! میرے ولی عہد کو بچا لیجیے۔" وہ گڑگڑائی۔ راسپوٹین بے نیازی سے الیکسی کے کمرے میں داخل ہوا جہاں لیمپ کی مدھم روشنیوں میں ولی عہد بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے اردگرد طبی عملے کے افراد تھے۔ گرم ترین لحاف اوڑھے ہونے کے باوجود وہ سردی اور بخار سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ راسپوٹین آگے بڑھا اور اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ طبی عملہ اس کے غلیظ حلیے سے کراہیت محسوس کرنے لگا لیکن اسے کسی بھی بات کی پروا ہی نہ تھی۔ اس نے جھک کر الیکسی کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے راسپوٹین نے بچے کے جسم پر پھونک ماردی۔ ہاتھوں اور پیشانی پر اپنی انگلیاں اچھی طرح پھیر دینے کے بعد وہ ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ مضطرب' نقاہت زدہ اور کپکپاہٹ کا شکار الیکسی پل بھر میں پُرسکون ہو کر سو چکا تھا۔

''یہ کل صبح تک یونہی سوتا رہے گا۔اس سے قبل اسے کوئی نہ اٹھائے۔''اس نے زارینہ سے کہا۔

''اوراس کا بخار؟اسے دوائی بھی تو دینی ہوگی۔''وہ بوکھلائی۔

''بخار اتر چکا ہے۔''راسپوٹین نے بے نیازی سے جواب دیا۔نکولس نے فوراً آگے بڑھ کر بیٹے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جس کی حدت اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ملازمین اور طبی عملے کی موجودگی کے باعث وہ بہ مشکل خود کو فادر گریگوری کی قدم بوسی سے روک پایا۔

اس کے بعد گریگوری کی محل میں آمد ایک معمول بن گئی۔اس نے الیکسی کو اپنے خصوصی حصار میں لے رکھا تھا۔اسے کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا تو زارینہ فیوفان کے ''بھائی اور پیروکار'' کو فوری محل میں طلب کر لیتی۔راسپوٹین بہت حکمتِ عملی سے اپنے منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔اس نے محل میں اپنی آمدورفت میلیتسا سے بھی پوشیدہ رکھی ہوئی تھی۔وہ اب بھی اسی گمان میں تھی کہ زارروس' زارینہ اور گریگوری کی ملاقات اسی کی رہائش گاہ پر ہوتی ہے۔یہ بات زیادہ دیر تک چھپ نہ سکی۔میلیتسا پر یہ انکشاف بجلی بن کر گرا۔وہ تن فن کرتی ''دغاباز'' گریگوری کے پاس گئی۔اس کے ذہن میں آتش فشاں دہک رہا تھا لیکن راسپوٹین کے سامنے آتے ہی اس کے تمام جذبات سرد پڑ گئے۔اس کی آنکھوں کی تنویمی قوت کی تاب لانا ممکن ہی نہ تھا۔

الیکسی کے صحت یاب ہوتے ہی راسپوٹین پر زار اور زارینہ کا اعتماد کئی گنا بڑھ گیا۔وہ اسے مقدس حیثیت عطا کر چکے تھے۔اس عزت واحترام کے باوجود وہ اس کے ''نام'' سے جز بز رہتے۔راسپوٹین کو اس نام کے لغوی معنی بتا کر تبدیلی کی درخواست بھی کی گئی۔انہی کے اصرار پر رائل چانسری کے سربراہ ''بینکنڈورف'' نے وزارتِ داخلہ میں یہ درخواست بھجوا دی۔ان دنوں محل میں راسپوٹین کی آمد پر ولی عہد اپنے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجا کر ''نیا آدمی'' پکارنے لگتا۔زار نکولس نے اسی مناسبت سے اسے ''گریگوری راسپوٹینووی'' کا نام دے دیا۔اس کی مقدس شبیہہ کو مدنظر رکھتے ہوئے محل میں بھی راسپوٹین کے بجائے ''نووی'' (نیا) کہا جانے لگا لیکن یہ صورت حال بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔راسپوٹین کی بدطینتی اور حرکات اسے تاریخ میں اسم بامسمّٰی ہی امر کرنے والی تھیں۔

☆☆☆

شاہی محل میں فادر گریگوری کی خصوصی اہمیت اور آمد اگلے سال تک پوشیدہ رہی۔زار نکولس کے اہلِ خانہ اسے فیوفان کا کوئی معمولی عقیدت مند ہی سمجھتے رہے تھے۔یہ راز پہلی بار 1907ء کی خزاں میں فاش ہوا۔ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اسے فاش کرنے والا بھی خود نکولس اور الیکسس ہی تھے۔وہ گریگوری کی خفیہ آمد سے بیزار ہو چکے تھے۔انہیں کسی بھی طرح اس کی اصل حیثیت بحال کرتی تھی۔نکی نے اپنی بہن ''اولگا'' کو حقیقی روسی دہقان دکھانے کی ترغیب دی۔

''ہمارے محل میں بھلا کسی دہقان کا کیا کام؟'' اولگا حیران ہوئی۔''کیا اسے کسی اور سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے؟''

''نہیں!ہم اسے کیا گرفتار کریں گے؟اس نے تو ہمیں ہی اسیر کر رکھا ہے۔''نکولس نے عقیدت سے کہا اور اسے لیے ولی عہد کے کمرے میں پہنچ گیا۔کمرے کا اندرونی ماحول کسی چرچ کا تاثر دے رہا تھا۔اس کمرے میں بجلی نہیں تھی۔شبیہوں کے سامنے لیمپ جل رہے تھے۔

''الیکسی کہاں ہے؟اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

اولگا اپنے بھتیجے کو غیر موجود پا کر فطری تڑپ میں مبتلا ہوئی۔زارینہ نے اس کی جانب دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔نکولس نے آنکھوں کی جنبش سے اولگا کو ایک جانب متوجہ کیا جہاں الیکسی سر جھکائے فادر گریگوری کے دیو قامت سائے کے پیچھے کھڑا اسی کے انداز میں عبادت کر رہا تھا۔

''یہ.....یہ تو فادر فیوفان کا کوئی بھائی ہے نا؟''

اولگا نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں!یہی تو اس شخص کا کمال ہے کہ اسے ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھ یا سمجھ نہیں سکتا۔یہ فادر فیوفان کا عقیدت مند نہیں بلکہ فیوفان تو خود اس کے متاثرین میں سے ایک ہے۔''زارینہ نے فخر سے بتایا۔

''فادر فیوفان اس جیسے شخص سے کیسے متاثر ہو سکتا ہے بھلا؟'' اولگا نے اس کے بے نیاز اور قدرے غلیظ حلیے کو دیکھ کر ناگواری سے کہا۔

''یہ صرف باطنی آنکھ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔'' نکولس نے جواب دیا۔''فادر نے وعدہ کیا ہے کہ الیکسی بہت جلد مکمل صحت یاب ہو جائے گا۔پھر اس کے بعد انقلابیوں کا تیا پانچا بھی بہت جلد ہو جائے گا۔''

''آپ بہت بڑے بڑے خواب دیکھ رہے ہیں بھائی!'' اولگا نے اسے نرمی سے ٹوکا لیکن نکولس کو راسپوٹین کے علاوہ کوئی نظر آتا ہی کہاں تھا۔وہ فادر گریگوری کی کہی ہوئی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتے تھے۔ولی

عہد کی صحت میں بہتری آنے لگی تو ہولناک انقلاب میں واضح تبدیلی محسوس ہونے لگی ورنہ اس سے قبل انقلابیوں کا یہ حال تھا کہ زارنکولس کو مجبوراً اپنی والدہ کو خط لکھ کر حالِ دل سنانا پڑا۔

''آپ میرے محسوسات سمجھ سکتی ہوں گی۔ مجھے پھاٹک سے باہر جانے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ میں یہ بات سوچ کر بھی شرم سے پانی پانی ہوجاتا ہوں کہ یہ میرا اپنا گھر ہے جس میں قید ہوکر رہ گیا ہوں۔ کوئی بے بسی سی بے بسی ہے۔''

لیکن بہرحال یہ باتیں اب ماضی کا حصہ بن چکی تھیں۔ روس کے طول وعرض میں پھیلا انتشار راسپوٹین کی پیشگوئی کے عین مطابق اپنے منطقی انجام تک پہنچ گیا تھا۔

''فلپ اور سیرافیم کی کارستانیاں آپ بھول گئے ہیں کیا؟ محل میں ایک اور ڈھونگی لے آئے ہیں۔'' اولگا نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''نہیں! تم باطنی آنکھ سے نہیں دیکھ رہی ہو۔ فادر گریگوری ایک ''نیا شخص'' اور ''ہمارا دوست'' ہے۔ اسے خداوند نے ہمیں ایک نئی زندگی فراہم کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ پریشانیوں' مصائب' فسادات سے پاک' صحت مند اولاد اور خوشیوں سے بھری ایک بھرپور زندگی۔'' نکولس کا اعتماد اولگا کو تاسف میں مبتلا کر گیا۔ وہ راسپوٹین کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی الیکسی کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ولی عہد کا ''روحانی علاج'' کرتے ہوئے راسپوٹین میلیتسا سے بھی بھرپور ملاقاتیں کرتا رہا۔ میلیتسا کو فادر گریگوری کی موقع پرستی اور دھوکا دہی پر بہت غصہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہر بار اس کی طلبی پر خود سپردگی کے جذبات میں بہہ کر سب کچھ فراموش کر دیتی تھی۔ فادر گریگوری سے اس کے تعلقات کی تمام تلخیاں دور ہوگئیں۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اعتماد شکنی کے سبھی گناہ گاروں کو معاف کر دیا ہے۔ اسے اب راسپوٹین کی محل میں خفیہ آمدورفت پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ حسب سابق اسے فخریہ طور پر اپنی سہیلیوں سے ملوانے لگی۔ میلیتسا کو یہ حقیقت بھی سمجھ آگئی تھی کہ فادر گریگوری کی شان میں اضافہ زارینہ کی خوشی واعتماد میں اضافہ کرے گا۔

معاملات بہت ہموار انداز میں رواں تھے کہ زارینہ کی نظرِکرم نئی اعزازی خادمہ ''اینیا تانیوا'' پر پڑ گئی۔ ان کے تعلقات میں اس قدر عجلت اور بے احتیاطی سامنے آئی کہ مختصر عرصے میں ہی دربار میں افواہوں کا بازار گرم ہوگیا۔

میلیتسا کا رویہ اس معاملے میں بھی حیران کن رہا۔ اس نے اپنی جگہ لینے والی اینیا کو کوئی بھی منفی ردعمل دینے کے بجائے اسے اپنے محل میں مدعو کرنا شروع کر دیا۔

''میں نے سنا ہے کہ فادر گریگوری کی تمہارے محل میں کافی آمدورفت ہے۔'' اینیا نے اس سے دریافت کیا۔

''ہاں! وہ خصوصی طور پر یہاں آیا کرتے ہیں۔'' میلیتسا نے بے نیازی سے بتایا۔

''میں بھی ان سے ملاقات کرنا چاہوں گی۔'' اینیا... پُرجوش ہونے لگی۔

''کیوں؟ ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''میں اپنے منگیتر بحری افسر ''ویروبو'' کے بارے میں کچھ سوال کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے! ملوادوں گی لیکن ان سے ملنے کے بہرحال کچھ آداب ہیں۔ وہ طور طریقے میں دیگر افراد سے مختلف ہیں۔ کوئی کم علم اور بے خبر انسان ان کی شان میں گستاخی بھی کرسکتا ہے۔'' میلیتسا نے بتایا۔

''مجھے بھی ان آداب سے آگاہ کر دو پیاری!'' اینیا نے التجا کی۔

''فادر گریگوری خداوند کے براہِ راست نمائندے ہیں۔ ان کا ہر عمل مقدس ہوتا ہے۔ ملاقات کے آغاز میں اگر وہ تم سے تین بار بوس وکنار کرے تو پریشان نہ ہونا۔'' میلیتسا ٹھہراؤ سے اسے سب بتانے لگی۔

راسپوٹین کے سامنے آتے ہی اینیا حیرت وخوشی سے ساکت رہ گئی۔ اس کی جادوئی آنکھیں اسے اپنی روح میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''تمہارے ذہن میں بہت سے سوال مچل رہے ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کا مرکز ایک ہی نکتہ ہے۔'' اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''فادر! آپ عظیم ہیں۔ آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ میں اپنے منگیتر ویروبو کے متعلق بات چیت کرنا چاہتی ہوں۔'' اینیا نے تعظیم دی۔

''پانی..... مجھے صرف اور صرف پانی نظر آرہا ہے۔'' اس نے ڈرامائی انداز اختیار کیا۔

''جی ہاں! وہ ایک بحری افسر ہے۔ ہماری شادی بہت جلد متوقع ہے۔ میں اس کے مزاج کے متعلق جاننا چاہتی ہوں۔'' اینیا حیرت زدہ تھی۔

''پانی کا مزاج بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس کے خواص پر کوئی کیسے اعتبار کرسکتا ہے۔ سرد ہو تو منجمد کرے گا' کھولتا ہوا

UUNOVELS.COM

ہوتو سوختہ کرے گا۔اس میں تلاطم آئے تو تباہی کی نئی داستانیں رقم کرے گا۔'' وہ معنی خیزی سے بولا۔اینیا اس کا اشارہ سمجھ کر پریشان ہوگئی۔

''تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ ویرو بو بھی؟''

''تم اس سے شادی کے بعد کبھی خوش نہیں رہ سکو گی۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے مقدس حصار میں لے سکتا ہوں۔'' وہ اس کے شباب کو حریص نظروں سے دیکھنے لگا۔

''آپ کا حصار میرے لیے خوش قسمتی کی انتہا ہوگی فادر! میں اپنا تن من آپ پر نچھاور کردینے کے لیے تیار ہوں۔'' اینیا کے جذبات یکدم ہی بے قابو ہوگئے تھے۔

گریگوری نے کچھ عرصہ اس کے ساتھ بھرپور وقت گزارا۔ اس دورانیے میں وہ میلیتسا کو بالکل نظرانداز کر چکا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میلیتسا سے اس کا دل ہی بھر گیا تھا۔وہ کسی بھی عورت کو زیادہ دیر تک اپنے حواس پر سوار رکھنے کا عادی ہی نہیں تھا۔دوسری جانب میلیتسا کے ذریعے محل میں رسائی کے بعد وہ سودمند بھی نہیں رہی تھی۔راسپوٹین نے محل آنا جانا چھوڑ دیا۔اس کے بعد زارینہ نے بھی میلیتسا سے ملاقاتیں بہت حد تک کم کردیں۔میلیتسا حسد و نفرت کی آگ میں جل کر انگارہ ہوگئی۔وہ کسی بھی طرح الیکسس اور راسپوٹین سے انتقام لینا چاہتی تھی۔اس کے زرخیز دماغ میں منصوبہ پہلے سے تیار تھا۔اب صرف مناسب وقت کا انتظار تھا اور یہ موقع خود راسپوٹین نے ہی اسے فراہم کردیا۔

☆☆☆

وہ...موسم خزاں تھا۔راسپوٹین کے دل میں اچانک گھر واپسی کا سودا سما گیا۔واپسی کے سفر میں وہ اس بار بھی تنہا نہیں تھا۔اس کے ساتھ اولگا لوختینا کے علاوہ تین مزید نوجوان عقیدت مند عورتیں بھی تھیں۔ ''اکیلینا لیپٹسکایا'' غیر شادی شدہ نرس تھی۔''خیونیا بلاڈسکایا'' انجینئر کی بیوہ تھی جبکہ ''زنیا ڈامینشڈٹ'' کالجیٹ سیکریٹری کی اہلیہ تھی۔

دہقان گریشا کے مالی حالات اب کافی بدل چکے تھے۔اس نے پوکرووسکوئی میں وسیع گھر خرید لیا تھا۔گھر پہنچتے ہی اس کا باطن ظاہر پر غالب آگیا۔فادر گریگوری کے لبادے میں پوشیدہ گریشا مکمل جوبن پر تھا۔مخصوص اندازِ گفتگو تبدیل ہوتے ہی وہ بھرپور دہقانی بات چیت کرنے لگا۔ اس نے فوری طور پر بستی والوں کو اکٹھا کیا اور ''پیٹرزبرگ'' کی حسیناؤں سے انہیں متعارف کروانے لگا۔اس کے وجود میں برسوں سے پیوست خار کی چبھن زائل کرنے کا وقت

خوف

خوف کا مطلب تو کوئی اس شخص سے پوچھے جو اپنا موبائل لاک کیے بغیر گھر بھول آیا ہو۔

عشق

مجھے بہت جستجو تھی کہ میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی میں فرق معلوم کرسکوں۔ پھر ایک دن ابا جی نے بتایا کہ اشفاق، اپنی انا کو کسی ایک شخص کے سامنے ختم کرنے کا نام عشقِ مجازی ہے اور اپنی انا کو سب کے سامنے ختم کردینے کا نام عشقِ حقیقی ہے۔

(اشفاق احمد)

لیکن

آپ ایک اچھے انسان ضرور بنو لیکن کسی دوسرے کو اس کا یقین دلانے کی کوشش نہ کرو۔ (شیکسپیئر)

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔حیدرآباد

آگیا تھا۔گریشا نے بستی کے پادریوں اور معززین کو اپنے گھر میں اکٹھا کرلیا۔

''اکیلینا! تم میرے لیے کیا کرسکتی ہو؟'' اس نے سب کے سامنے نرس کو مخاطب کیا۔

''آپ کے اشارے پر اپنی جان بھی قربان کرسکتی ہوں فادر!'' اکیلینا کا والہانہ انداز اور فریفتگی حاضرین کو دم بخود کرگئی۔

''اگر میں کہوں کہ تمہارے لیے شادی ممکن نہیں تو تم کیا کروگی؟''

''میں عمر بھر کنواری رہ کر آپ کی خدمت کرتی رہوں گی۔ کسی بھی مرد کا چہرہ نہیں دیکھوں گی۔'' گریشا نے مسکراتے ہوئے اپنے دیرینہ ساتھیوں کو دیکھا اور فرش پر ایک جانب تھوکتے ہوئے کہا۔

''خیونیا! اسے صاف کرو۔'' اس کے کہنے کی دیر تھی کہ خیونیا کسی چوپائے کی طرح آگے بڑھی اور فرش پر پڑے اس سیال کو اپنی زبان سے صاف کردیا۔اہلِ علاقہ کے دل کراہت، حیرت اور بے یقینی کے جذبات سے لبریز ہونے لگے۔

''بس کرو گریشا! یہ سب کچھ ہمیں دکھا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' ایک پادری چلّایا۔گریشا کی آنکھوں میں

UUNOVELS.COM
Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

تیز چمک لہرائی لیکن وہ پادری کی بات نظرانداز کر کے لوختینا کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''زار روس اور زارینہ اپنی نجی وشاہی زندگی میں کوئی بھی قدم اٹھانے کے لیے کس کے محتاج رہتے ہیں؟''

''ان کی زندگی کا ہر ایک فیصلہ آپ کا مرہونِ منت ہے فادر! وہ آپ کی نافرمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ روسی زارشاہی کے اصل مالک تو آپ ہیں۔ آپ ہم سبھی کے اُن داتا ہیں۔'' لوختینا کے جواب پر حاضرین کو سانپ سونگھ گیا۔

اہل علاقہ اور پادری اس طلبی اور ملاقات کا اصل مقصد سمجھ گئے تھے۔ گریشا انہیں یہ جتانا چاہتا تھا کہ جس شخص کو وہ ماضیِ قریب میں مار پیٹ کرنے کے بعد تضحیک کا نشانہ بنایا کرتے تھے آج روس اسی کے مشوروں کا محتاج ہے۔ پوکرووسکوئی کا یہ سفر نہایت کامیاب رہا۔ سرشار گریگوری واپسی کے لیے پرتول ہی رہا تھا کہ ایک حیرت وتذلیل اس کے در پر آن کھڑی ہوئی۔ اس کی رہائش گاہ پر ''تو بولسک تھیولوجیکل کن سسٹری'' کا ایک انسپکٹر چلا آیا تھا۔ اس کے پاس راسپوٹین کے گھر اور وہاں موجود رہنے والی خواتین کی تلاشی وتفتیش کا اجازت نامہ تھا۔

''یہ تلاشی کس مقصد کے لیے ہے آفیسر؟'' لوختینا نے کڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ایک خلست تنظیم کا پیروکار ہونے کی پاداش میں۔'' انسپکٹر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''فادر گریگوری ایک مقدس انسان ہیں۔ ان کا کسی متنازعہ تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وہ وقار سے بولی۔

''تعلق تو میں کسی نہ کسی طرح تلاش کر ہی لوں گا اور ایک بات کان کھول کر سن لو! میں اسے مقدس تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ایک متنازعہ اور خلستی نظریات کا پیروکار شخص ہے جس نے تم جیسے احمقوں کے ساتھ ایک تنظیم بنا کر خود کو مضبوط کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں صوبے کے بشپ کی جانب سے یہ اطلاع ملی ہے کہ گریگوری راسپوٹین کسی بھی صورت میں چرچ کے معاملات سے وابستہ رہنے کا اہل نہیں۔ وہ ایک آوارہ گرد ہے۔''

''میں ان الزامات کی تردید کرتا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ تم ایک بھی ثبوت حاصل نہیں کر سکو گے۔'' راسپوٹین نے اعتماد سے کہا۔ لوختینا کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس کا ذہن مسلسل کسی نکتے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ دارالحکومت سے کسی بارسوخ شخص کے احکامات کے بغیر اعلیٰ پیمانے پر تفتیش ہونا ممکن ہی نہیں۔ اس کی چھٹی حس مسلسل ایک ہی شخص کی طرف اشارہ کر رہی تھی..... میلیتسا..... وہ یقیناً تاحال اپنی تذلیل فراموش نہیں کر سکی تھی۔

لوختینا فوری طور پر پیٹرزبرگ پہنچی اور زارینہ کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ اس نے اپنی آستین میں ایک سانپ پال رکھا ہے جو ''خدا کے بندے'' کو ان سے دور کرنا چاہتا ہے۔ زارینہ غصے سے بھسم ہو کر رہ گئی۔ اس نے میلیتسا کو اپنی ''قربت'' سے محروم کر دیا۔ اس کی مذموم کوشش کے بعد دربار کی طرح محل میں بھی اسے ''سیاہ عورت'' کہا جانے لگا۔ میلیتسا نے زارینہ کا غصہ سرد کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس کا گناہ کسی بھی صورت معاف نہیں کر سکتی تھی۔

حقیقت تو یہ بھی تھی کہ اسے اب میلیتسا کی زیادہ ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اسے ویرو بووا کے روپ میں ایک اور مخلص ہمدم میسر آ گئی تھی۔ ان دونوں کی اس دوستی کے حوالے سے دربار میں افواہوں کا ایک نیا سلسلہ پھیلنے کا آغاز ہوگیا۔ درباریوں کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ اس دوستی میں غیر اخلاقی تعلقات کا عمل دخل بھی ہے۔ خود ویرو بووا کی مکاری کا یہ عالم تھا کہ اس نے زارینہ کے علاوہ زار سے بھی خفیہ مراسم استوار کر رکھے تھے۔ الیکسس کی دور اندیشی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے حواس پر فادر گریگوری نامی آسیب سوار تھا۔ وہ اسی کی بصارت سے دیکھتی، اسی کی زبان بولتی، اس کی بات کے علاوہ اپنی سماعت میں کچھ اور داخل ہی نہ ہونے دیتی۔ رفتہ رفتہ وہ شاہی کنبے کے ہر ایک فرد کو اس سے متعارف کروانے لگی۔ ویرو بووا نے بھی فادر گریگوری کی اہمیت مکمل طور پر بھانپ لی تھی۔ اسے علم ہوگیا تھا کہ زارینہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کے لیے راسپوٹین کی عقیدت ووفاداری کا دم بھرتے رہنا ہوگا۔ اسی مقصد کے لیے ویرو بووا اس کی وفادار ترین عقیدت مند بن گئی۔

☆☆☆

سرزمین روس میں 1908ء کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

زارینہ اب بھی یہی چاہتی تھی کہ ولی عہد کی بیماری کا راز کسی پر بھی نہ کھلے۔ اسے شاہی وقار اور اپنی نازک حیثیت نے بہت سے تحفظات میں مبتلا کر رکھا تھا۔ راسپوٹین یوں تو بے خوف وخطر محل میں چلا آیا کرتا تھا لیکن ولی عہد یا کسی اور کی بیماری کے علاج کے لیے اسے رات کی تاریکی میں خفیہ طور پر طلب کیا جاتا۔ وسط سال تک نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ فادر گریگوری قانون وضوابط کے برعکس کسی بھی اجازت کے بغیر زار سے ملنے چلا آیا کرتا۔ نکولس کی

قوتِ فیصلہ پر راسپوٹین ہی قابض تھا۔ وہ نازک ترین قومی معاملات بھی اس جاہل دہقان کے مشورے سے حل کیا کرتا۔

اسی سال اکتوبر میں ٹیلی گرام کے ذریعے ایک اطلاع موصول ہوئی کہ آسٹریا اور ہنگری نے خاموشی سے بوسنیا اور ہرزیگووینا پر قبضہ کرلیا ہے۔ ان علاقوں میں آرتھوڈوکس سرب کی ایک کثیر تعداد مقیم تھی۔ اس وقت روس خود کو آرتھوڈوکس دنیا کا قائد تصور کیا کرتا تھا۔ لہٰذا یہ اطلاع ملتے ہی ملک کے طول وعرض میں ہلچل برپا ہوجانا فطری امر تھا۔ اخبارات میں ایک الگ محاذ گرم ہوگیا کہ روس اعلانِ جنگ کردے۔ ڈوما کے اراکین بھی روس کی تاریخی ذمے داریوں کا حوالہ دیتے ہوئے جنگ برپا کردینے کا دباؤ ڈالنے لگے۔ ملک بھر میں فضا بہت گرم جوش ہوچکی تھی لیکن زار نکولس کے سرد اور ٹھس ردِعمل نے سبھی کو غم وغصے میں مبتلا کردیا۔ درِپردہ راسپوٹین نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ جنگ کی صورت میں شکست اور انقلاب کا خطرہ ہے۔ یہ خبر زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ سیاستدان، جرنیل اور اخبارات حقائق سے آگاہ بھی ہوچکے تھے کہ زار کا یہ فیصلہ درحقیقت راسپوٹین کا ہی مشورہ تھا۔ ایک جاہل دہقان کے اس اثر رسوخ اور زار کی عاقبت نااندیشی نے وزیراعظم ''اسٹولپین'' کو سیخ پا کردیا۔ اس نے فوری طور پر راسپوٹین سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔

''کیا تم واقعی عیسایت ہی سے تعلق رکھتے ہو گریگوری؟''

''ہاں! میں دل وجان سے یسوع مسیح کی تعلیمات کا پیروکار ہوں۔'' اس نے استہزائیہ نظروں سے وزیراعظم کو دیکھا۔

''تو پھر تمہیں اپنے مسیحی بھائیوں کے دکھ درد کا احساس کیوں نہیں ہے؟ بوسنیا اور ہرزیگووینا کو ہماری ضرورت ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''ضرورت تو اپنے ملک کو مضبوط کرنے کی بھی ہے۔ جاپان کے انقلاب کی تباہیاں ابھی مندمل نہیں ہوئیں اور تم لوگ ایک اور مصیبت اپنے سر مول لینا چاہتے ہو۔ پہلے اپنے گھر کی آگ بجھالو پھر دوسروں کے گھروں میں تاکا جھانکی کرنا۔''

''راسپوٹین! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرسکتا ہوں۔'' اسٹولپین بھڑکا۔

''مجھے پرواہی نہیں ہے۔ میں ایسی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والوں میں سے نہیں۔ ہاں البتہ تم اپنے انجام کے متعلق ضرور سوچنا۔''

''تم ایک نہایت گھٹیا شخص ہو راسپوٹین! میں تمہیں خلست اور تفرقہ پرور قرار دلوادوں گا۔'' اسٹولپین نے چلا کر کہا۔

''یہ کوشش بھی کرکے دیکھ لو! تم سے پہلے ایک دیوانی نے بھی ایسی ہی حرکت کی تھی۔ کیا ملا اسے؟'' راسپوٹین نے استہزائیہ مسکراہٹ اچھالی۔

''اس کی اور میری حیثیت میں بہت فرق ہے۔ میں اس ملک کا وزیراعظم ہوں..... سمجھے وزیراعظم؟''

''اور میں فادر گریگوری راسپوٹین ہوں۔ میرا قہر تمہیں وزیراعظم سے فقیر بنادے گا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''دیکھ لوں گا میں تمہیں۔ تمہاری اوقات نہ یاد دلوائی تو کہنا۔''

''اچھی طرح دیکھ لینا اسٹولپین! مجھے خوب اچھی طرح دیکھ لینا کیونکہ اس کے بعد تمہاری بصارت کچھ اور دیکھنے کے قابل نہیں رہے گی۔ موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے۔'' راسپوٹین کے گمبھیر انداز نے اسٹولپین کو چونکایا لیکن اس نے نظرانداز کردیا۔ وہ اس کی باتوں اور ہر عمل کو محض شعبدہ بازی سمجھتا تھا۔

اس کے بعد محل میں راسپوٹین کا اثر رسوخ مزید بڑھ گیا۔ اگلے دو سال میں نوبت یہاں تک آپہنچی کہ زار شاہی میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ زار کی والدہ اور بہن اپنا شاہی وقار بھول کر ناخواندہ عورتوں کی طرح دل کی بھڑاس نکالا کرتیں۔

''کتنے افسوس کی بات ہے۔ نکولس کو جانے کیا ہوتا جا رہا ہے؟'' اولگا نے جل بھن کر کہا۔

''ہوتا جا نہیں رہا میری بچی! یہ کہو کہ ہو چکا ہے۔'' والدہ نے تصحیح کی۔

''جی ہاں! اس کی آنکھوں پر کوئی پٹی بندھ چکی ہے۔ وہ اور زارینہ اس جاہل دہقان کے ساتھ بیٹھے جانے کیا باتیں کرتے رہتے ہیں؟''

''اور میں تو حیران ہوں کہ اہلِ خانہ کے لیے کنجوس نکولس اور الیکسس اس راسپوٹین کے لیے اتنے کشادہ دل کیسے ہیں؟'' والدہ نے زہر اگلا۔

''کچھ دن پہلے میری بھی سالگرہ گزری لیکن ان میں سے کسی نے تحفہ نہیں دیا۔ اس دہقان کو ریشمی لبادے، سونے کی صلیبیں، بڑی بڑی رقمیں دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ دہقان اب سگی بہن سے زیادہ اہم ہوگیا ہے؟'' اولگا کا دکھ بہت بڑا تھا۔

''مجھے تو یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ جب یہ آوارہ

گرد پوکرودسکوئی گیا تھا تو اس نے زارینہ کی دی ہوئی ریشمی قمیص' چمڑے کے بوٹ اور قیمتی کمر بند دکھائے۔اس نے ساٹن کی قمیص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان دہقانوں کو بتایا کہ اسے خود ملکہ نے سیا ہے اور اس کے پاس ملکہ ہی کی کڑھائی شدہ اور بھی کئی قمیصیں موجود ہیں۔''

''آہ! زارشاہی پر یہ وقت بھی آنا تھا۔ہماری تین سو سالہ خاندانی تاریخ.... کو یوں چوپالوں میں زیر بحث لایا جانا تھا۔کیا عزت رہ گئی ہوگی ہماری؟'' اولگا تڑپ اٹھی۔

''اسے تو یہ بھی یقین ہے کہ 1905ء کا انقلاب سرد پڑنے میں بھی اسی راسپوٹین کا ہاتھ ہے۔اسی کی دعاؤں نے امن بحال کیا ہے۔'' والدہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

''زارشاہی ایک دہقان کے مشوروں کی محتاج بن کر رہ گئی ہے۔مجھے تو یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ زار اور زارینہ اپنے ذہنی تناؤ اور پریشانی کے خاتمے کا خصوصی علاج بھی اسی سے کرواتے ہیں۔'' اولگا نے بھی ایک راز فاش کیا۔

''اور میں آج تک یہی نہیں سمجھ سکی کہ یہ راسپوٹین آخر کیا آسیب ہے؟ یہ شخص مجھے دنیا کی ہر چیز سے غلیظ لگتا ہے لیکن پھر بھی سامنے آتا ہے تو میں سن سی ہو جاتی ہوں۔یہ خلست ہے یا مقدس روس کی آخری نشانیوں میں سے کوئی ولی؟ شفا بخش صلاحیتوں اور پیش بینی کا مالک ہے یا آوارہ گرد؟ یہ کسی بددعا کی طرح ہمارے خاندان کو کیوں چمٹ کر رہ گیا ہے؟'' زار کی والدہ اپنے بال نوچنے کے قریب تھیں۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ زارینہ اسے اپنا آپ سونپ چکی ہے۔اس کے سامنے کوئی انسان مزاحمت بھی تو نہیں کر سکتا۔'' اولگا نے سرگوشی کی۔''مجھے تو یہ علم بھی ہوا ہے کہ زارینہ اسے اکثر خطوط بھی لکھتی ہے۔استاد کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔والہانہ انداز میں بتاتی ہے کہ راسپوٹین کی قربت' اس کے ہاتھوں کو بوسے دینے یا کندھے پر سر رکھنے سے اسے روحانی سرشاری محسوس ہونے لگتی ہے۔''

''وہ ایسا کرنے پر ہمیشہ مجبور رہے گی کیونکہ اس مقدس احمق گریشا نے یہ دعویٰ بھی کر رکھا ہے کہ زارشاہی شہنشاہی صرف اسی کے طفیل قائم ہے۔اگر وہ چلا گیا تو دربار بھی نہیں رہے گا۔اس کی موت ہماری موت ہوگی۔'' والدہ کی اس بات پر اولگا خوف سے زرد پڑ گئی۔

''خداوند یسوع مسیح ہمارے روس کی حفاظت کرے۔ ہمارا اقتدار اور شان وشوکت سدا یونہی برقرار رہے۔'' وہ جھرجھرا کر بولی۔

اس وقت روس کسی بھی دعا اور نیک خواہشات کی برکت سے مبرا ہو چکا تھا۔قومی زندگی کے مسائل بے حد بڑھ گئے تھے۔شراب نوشی روسی زندگی کا سب سے بڑا روگ تھی۔شہری اور مختلف عہدیدار خمار کی حالت میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتے اور سبکی کے احساس سے سخت قانون سازی عمل میں لانی پڑی۔پیٹرزبرگ میں شراب نوشی کے خلاف پہلی ''آل رشیا کانگریس'' منعقد کی گئی۔ زارشاہی کی ان خواتین کے تحفظات بھی وقت گزرنے پر مزید ہولناک ہوتے گئے۔ان کا قریبی خاندان زارینہ کے توسط سے راسپوٹین سے ملا اور ایک ہی ملاقات میں اس کے گن گانے لگا۔راسپوٹین کی نظریں ماریا گولووینا پر ٹھہر گئیں۔وہ کافی عرصے سے علیل تھی۔نفسیاتی الجھنوں اور تناؤ نے اسے بہت سے مسائل میں مبتلا کر رکھا تھا۔کسی بھی علاج سے اسے کوئی بہتری محسوس ہی نہ ہوتی۔زارینہ کی زبانی راسپوٹین کی تعریفیں سن کر اسے اپنے درد کا درماں نظر آنے لگا۔اس نے اپنے متوقع منگیتر ''فیلیکس'' کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ مکمل تندرست ہو کر تمہاری زندگی میں ہمیشہ کے لیے چلی آؤں۔کیا تمہارے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں پنپتی؟''

''یہ تو تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ماریا! میں بھی تو اپنی ادھوری زندگی کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں۔مجھے صرف تمہارے اقرار کا انتظار ہے۔'' فیلیکس نے بے تابی سے کہا۔

''میں اپنی علالت اور ذہنی الجھنوں کے ساتھ زندگی کا نیا سفر کیسے شروع کر دوں؟ اس طرح تو میں تم پر بوجھ بن کر رہ جاؤں گی۔'' ماریا افسردہ ہوئی۔

''محبت میں کوئی کسی پر بوجھ نہیں ہوتا۔تم جیسی بھی ہو مجھے قبول ہو۔آئندہ ایسی کوئی بات نہ کرنا۔'' فیلیکس ناراض ہوا۔

''تمہاری یہی اپنایت تو مجھے معتبر کر دیتی ہے۔بس مجھے تھوڑا وقت اور درکار ہوگا۔زارینہ نے بتایا ہے کہ فادر گریگوری کے ہاتھوں میں جادو ہے۔وہ ہر ایک مسئلہ چٹکی بجاتے حل کر سکتے ہیں۔'' ماریا کی التجا پر فیلیکس ہنکارا لے کر خاموش ہو گیا۔اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ اپنی زندگی کے مسائل اور ذہنی الجھنوں کے لیے بھی راسپوٹین سے ہی شفایابی حاصل کر لی جائے۔

فیلیکس کی زندگی مسائل کا انبار رہی تھی۔وہ لڑکپن میں ہی برائیوں کی دلدل میں دھنس گیا تھا۔کھیلنے کودنے اور بے فکری کی عمر میں اسے ایک نوجوان جوڑے نے شہوانی

UUNOVELS.COM

کھیل میں شریک کر کے اس کا لڑکپن، بچپن، خواب، تمنائیں، اعتماد اور شخصی وقار سب کچھ نگل لیا۔ آزمائشیں یہیں ختم نہ ہوئی تھیں۔ اس جوڑے سے خلاصی ملی تو وہ پیٹرزبرگ کے ہی ایک عیاش طبع شخص نکولائی کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ اسے زنانہ لباس پہنا کر شہر کی شبینہ سرگرمیوں میں شرکت کے لیے لے جاتا۔ فیلیکس اس لباس میں ایک بھرپور اور گداز حسینہ دکھائی دیا کرتا۔ محفلوں میں شریک مرد اس 'حسینہ' کو شہوت بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ فیلیکس کی شخصیت تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی ذات میں ان مٹ خلا پیدا ہونے لگے۔ ایک محفل میں انگریز بادشاہ ''ایڈورڈ ہفتم'' کی جانب سے بھی ایسے ہی ردعمل کا سامنا کرنا پڑا تو ہر خاص و عام سے اعتبار ہی ختم ہو گیا۔ اس کٹھن وقت کے بعد زندگی میں امید کی واحد کرن ماریا گولووینا تھی۔ فیلیکس پہلی ہی ملاقات میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ فادر گریگوری سے متوقع ملاقات اور دستِ مسیحائی نے اسے قدرے حوصلہ فراہم کیا لیکن جلد ہی یہ امید ناامیدی اور مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔

فادر گریگوری ماریا ہی کے گھر مدعو تھا۔ فیلیکس اس سے کافی پہلے وہاں پہنچ گیا۔ راسپوٹین کا شخصی تاثر اچھا ثابت نہ ہوا۔ وہ درمیانے قد اور دبلی پتلی جسامت کا حامل تھا۔ اس کے غیر متناسب حد تک لمبے بازو بھی عجیب ہی تاثر دیتے تھے۔ اس نے فیلیکس سے بغلگیر ہونے کی کوشش کی لیکن وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے دل و دماغ میں ناگواری کی شدید لہر اٹھی تھی۔ راسپوٹین کوئی شرمند کی یا تذلیل محسوس کیے بغیر ماریا اور اس کی والدہ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ماں بیٹی سے بغلگیر ہوتے ہوئے انہیں زور سے بھینچ لیا۔ دونوں خواتین اس کے سامنے بچھی جا رہی تھیں۔

''بدمعاش انسان... جہنمی! لعنتی کہیں کا!'' فیلیکس نے زیرلب دھواں دھار گالیوں سے نوازا۔ اسے پہلی ہی نظر میں راسپوٹین سے نفرت ہو گئی تھی اور دو عدد خواتین کے جسمانی پیچ و خم کو نظروں میں تولتے راسپوٹین کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ قسمت نے اس کے سامنے مبینہ موت کا ہرکارہ لا بٹھایا ہے۔ فیلیکس کی یہ نفرت مستقبل قریب میں اس قدر بڑھ جانی تھی کہ اس نے فادر گریگوری راسپوٹین کو موت کے گھاٹ اتار دینا تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے منازل طے کرتا رہا۔ راسپوٹین کے معمولات میں رتی بھر بھی فرق نہ پڑا تھا۔ ان دنوں پیٹرزبرگ کے حماموں میں نام نہاد ''فیملی رومز'' کا بہت چرچا تھا جہاں غیر شادی شدہ جوڑے غسل کے نام پر غیر اخلاقی حرکات کا بازار گرم رکھتے۔ راسپوٹین بھی مختلف خواتین کے ساتھ ان حماموں میں جایا کرتا۔ عوامی حلقوں میں اس نے احتیاطی تدابیر کے طور پر اپنا مثبت تاثر ہی برقرار رکھا ہوا تھا۔ اس کے عقیدت مندوں کا ماننا تھا کہ اس عمل سے وہ سابقہ پرہیزگاروں کی طرح اپنے ضبطِ نفس کا امتحان لیتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر کوئی جنسی جذبہ نہیں ہوتا۔

وقت کے اس سفر میں تبدیلی صرف اتنی ہی آئی تھی کہ راسپوٹین کے دیرینہ رفیق ان متنازعہ حرکات پر اس سے متنفر ہوتے جا رہے تھے۔ ان افراد میں اس کا مربی اور خیر خواہ ''فیوفان'' بھی شامل تھا۔ وہ اس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے خار کھانے لگا۔ راسپوٹین کی زندگی بگولے کی زد میں آ چکی تھی۔ شاہی محل میں اس کے مخالفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد افواہیں پھیلنے لگیں کہ فادر گریگوری نے ولی عہد کی دایہ ''وشنیا کووا'' کی عصمت ریزی کی ہے۔ زارینہ کے علم میں یہ بات آئی تو وہ حسبِ سابق غصے کا اظہار کرنے لگی۔ اسے ''اپنے دوست'' کی کردار کشی پر بالکل یقین نہ تھا۔ الیکسس نے وشنیا کووا کو دو ماہ کی رخصت پر روانہ کر دیا۔

یہ معاملہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہو پایا تھا کہ محل کی نرسری کی منتظمہ اعلیٰ ''سوفیا ٹیوٹچیوا'' بھی راسپوٹین کے خلاف ہو گئی۔ زار شاہی کے لیے یہ صورت حال ناقابلِ یقین تھی کیونکہ ٹیوٹچیوا ماضی قریب میں ہر موقع پر راسپوٹین کی ہمدرد ثابت ہوتی رہی تھی۔ ٹیوٹچیوا کا الزام تھا کہ اس نے فادر گریگوری کو رات بھر شہزادیوں کے کمرے میں بسر کرتے پایا ہے۔ یہ دعویٰ ہرگز غیر معمولی نہیں تھا۔ شاہی محل میں اضطراب اور غصے کی فضا بن گئی۔ کچھ روز بعد زارنکولس نے ایک ہرکارے کے توسط سے ٹیوٹچیوا کو اپنی مطالعہ گاہ میں طلب کر لیا۔

''تمہیں یقینی طور پر اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟''

''جی ہاں! کچھ حد تک۔'' وہ اس کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر سنبھلتے ہوئے بولی۔

''نرسری میں کیا چل رہا ہے؟ مجھے تفصیل اور سچ جاننا ہے۔'' زار مزید سنجیدہ ہوا۔

''میری پیشہ ورانہ اخلاقیات بھی یہی کہتی ہے کہ آپ کو سچائی سے آگاہ کروں۔ فادر گریگوری شاہی ضوابط کے خلاف محل میں آ کر شہزادیوں کی عصمت ریزی کرتے ہیں۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

UUNOVELS.COM

''تم یقیناً اس وقت نیند کی حالت میں ہوگی۔ خواب دیکھا ہوگا تم نے کوئی۔'' زار نے بے نیازی سے کہا۔

''ہرگز نہیں! ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا ہے۔ میں نے ان گناہ گار کانوں سے.....'' وہ بات مکمل ہی نہ کر سکی۔

''یعنی تم بھی ہمارے دوست کے تقدس کو مشکوک کر رہی ہو۔ ان کی کردار کشی پر تلی ہو؟'' زار ادھورے جملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔

''جی ہاں! اور میں اسے مقدس تسلیم ہی نہیں کرتی۔ وہ ایک شعبدہ باز اور اخلاق باختہ شخص ہے۔ محل کی کوئی بھی عورت اس کی دسترس سے محفوظ نہیں ہے۔ وہ لاتعداد کی عصمت داغدار کر چکا ہے اور ان گنت اب بھی اس کے نشانے پر ہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

''وہ ہمارا دوست ہے۔ اس سے تعلقات ہماری نجی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔'' زار غصے میں آ گیا۔

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں یور میجسٹی! لیکن خداوند یسوع مسیح کی قسم! میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''میں ان قصوں کو کبھی سچ نہیں مانوں گا۔ اچھے اور نیک لوگ یونہی تہمتوں کی زد میں آیا کرتے ہیں۔ ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا ہے۔'' وہ بھڑک اٹھا۔

''یعنی کوئی اور بھی باقاعدہ طور پر یہ شکایات کر چکا ہے۔'' ٹیوٹچیوا نے فوری نکتہ اٹھایا۔

''ہاں! فیوفان بھی تمہاری طرح حاسدانہ جذبات میں مبتلا ہو گیا ہے۔ خطوط لکھ کر فضول گوئی کرتا ہے کہ شہزادیوں کی عصمت خطرے میں ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے اپنی آستین میں سانپ پال رکھا ہے۔ یہ کیسی بات ہے بھلا؟ میں اپنی اولاد کا دشمن کیسے ہو سکتا ہوں؟''

''فادر فیوفان ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ راسپوٹین آپ کی عزت داغدار کر چکا ہے۔'' ٹیوٹچیوا نے نرمی سے کہا۔

''بس! خاموش ہو جاؤ۔ بالکل خاموش ہو جاؤ۔ میں اس بارے میں ایک بھی لفظ برداشت نہیں کروں گا۔ فادر گریگوری ہمارا دوست ہے اور دوستوں کی عزتیں سانجھی ہوتی ہیں۔ وہ کبھی اسے میلی نظر سے نہیں دیکھا کرتے۔'' زار نکولس کی دہاڑ پر ٹیوٹچیوا نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ زار کے لیے تاسف اور افسردگی محسوس کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اس قدر صاف گوئی کے بعد اپنی نوکری کی سلامتی کے خدشات بھی لاحق ہو گئے تھے لیکن زار نے کسی انتہائی قدم سے گریز ہی کیا۔ ٹیوٹچیوا اور زار شاہی کے درمیان سرد مہری اور فاصلے تو پیدا ہوئے تاہم وہ اپنے عہدے پر برقرار ہی رہی۔

زار نکولس کے اس اعتماد نے راسپوٹین کی بدفعلیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ زار شاہی کے اندرونی رازوں سے آگاہی کے بعد وہ مزید بے خوف ہو چکا تھا۔ اسے علم تھا کہ زار کی بہن اولگا کا شوہر ہم جنس پرست ہے۔ اس کی بے باکی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اولگا پر بھی دست درازی کی کوشش کر ڈالی۔ اولگا کے سخت ردِعمل اور مزاحمت کے بعد وہ کامیاب تو نہ ہو سکا البتہ اولگا اور اس کے شوہر نے مستقبل میں اس سے مکمل گریز کرنے کا عہد کر لیا۔ راسپوٹین کو ان کے اس فیصلے کی بالکل پروا نہ تھی۔ اسے اپنی بداعمالیوں کے لیے خواتین کی کبھی کوئی کمی نہ رہی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مثال تو لوختینا کی تھی جو اتنے برسوں بعد بھی اسی کے زیر اثر تھی۔ راسپوٹین نے اسے مالی اور اخلاقی طور پر دوالیا کر کے اس سے کنارہ کشی کر لی۔ سوئے اتفاق انہی دنوں لوختینا کے شوہر کی آنکھوں پر بندھی پٹی بھی کھل گئی۔ اس نے بیوی سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''آج کے بعد راسپوٹین اس گھر میں قدم بھی نہیں رکھے گا۔''

''دھمکی دے رہے ہو مجھے؟'' لوختینا بپھری۔

''ہاں! دھمکی ہی سمجھو۔ میں اپنے گھر میں اس کی موجودگی بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔''

''اسے یہاں لائے بھی تم تھے۔ اب یہ معاندانہ جذبات کیوں؟'' وہ سرکشی پر آمادہ تھی۔

''وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ حماقت تھی وہ میری۔ مجھے کیا علم تھا کہ وہ معاشرے میں اس قدر متنازعہ حیثیت اختیار کر لے گا۔ احباب مجھ پر تھوتھو کرتے ہیں کہ میں نے کس شیطان صفت شخص کو اپنے گھر میں جگہ دے رکھی ہے۔''

''خاموش ہو جاؤ! تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ خداوند سے معافی مانگ لو۔ تم نے ایک مقدس شخص کے متعلق توہین آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔ خدا کی رحمت کو اپنے گھر سے نکالنا چاہتے ہو؟ خداوند سے معافی مانگ لو اس سے قبل کہ ہم لوگوں پر کوئی عذاب نازل ہو جائے۔'' لوختینا ہیجان زدہ ہو گئی۔

''کس بات کی معافی مانگوں؟ میں اس شخص کی حقیقت سمجھ گیا ہوں۔ وہ ایک ملعون ہے اور اگر تم نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں تمہیں خرچ دینا بند کر دوں گا۔'' اس

UUNOVELS.COM

نے آخری حربہ آزمایا۔

''شوق سے کرو بھئی! مجھے فادر گریگوری کے معجزات پر مکمل ایمان ہے۔ وہ میرے لیے کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال دیں گے۔'' لوخینا نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ جنرل ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس وقت اس نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی۔ اسے گمان تھا کہ وہ لوخینا کو کسی نہ کسی طرح اپنے نقطۂ نظر پر قائل کر لے گا لیکن جب وہ باز آ کے نہ دی تو جنرل نے اسے بے سروسامانی کی حالت میں گھر سے نکال دیا۔ لوخینا کو اس وقت بھی بالکل ہوش نہ آیا۔ وہ راستے میں مختلف مقامات سے بھیک مانگتی ہوئی ''زارسن'' میں راسپوٹین کے قریبی دوست ''الیاڈور'' کے پاس روانہ ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ فادر گریگوری اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ راسپوٹین تو خود ایک مکڑی کے سے جال میں پھنس چکا تھا۔ اس کی شہرت کا شیش محل بری طرح پتھروں کی زد میں تھا۔ اخبارات میں اس کے خلاف مہم عروج پر تھی۔ وہ اخباری مضامین کا ایک بہت بڑا موضوع بن چکا تھا۔ روس کے کثیر الاشاعت اخبارات اس نیم خواندہ اور مفلس خلست دہقان کی زار شاہی میں مقبولیت پر دھڑا دھڑ مضامین شائع کرنے لگے۔ عوامی طبقات میں سنسنی پھیلانے کے لیے چند ایک ''متاثرہ خواتین'' کا اعتراف بھی ان مضامین کا حصہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ راسپوٹین کا نام روس بھر میں عیاشی' بدکرداری اور بے راہ روی کی ضرب المثل بن کر رہ گیا۔ حالات بدتری کی اس نہج پر پہنچے تو وزیر اعظم اسٹولیپن نے خفیہ پولیس کو راسپوٹین کی بیرونی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے احکامات جاری کر دیے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ راسپوٹین کی تمام تر غیر اخلاقی سرگرمیوں کے حوالے سے خفیہ ایجنٹوں کی رپورٹیں زار کے سامنے پیش کر کے اسے بے نقاب کر دے گا۔

یہ خفیہ نگرانی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی۔ الیکسس نے چند ہی روز بعد اس ''توہین آمیز عمل'' کو بند کر دینے کے لیے زار پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے دوست کے خلاف اس مہم پر سخت تشویش زدہ تھی۔ اس نے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچتے ہوئے بڑھتی ہوئی مخالفت و تنقید کو روکنے کے لیے محل میں فادر گریگوری کی آمد و رفت پر قدغن لگا کر ویرو بووا کے گھر پر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ زارینہ کی عقل و شعور سلب تو تھی ہی۔ اس نے شوہر کی ذہنی صلاحیتیں بھی مفلوج کر رکھی تھیں۔ درباریوں سے یہ حقائق پوشیدہ نہیں تھے لیکن اس وقت ہر ایک کو روس کی سلامتی کے بجائے ذاتی مناصب بچانے سے غرض تھی۔

کچھ عرصہ مزید گزرا تو زارینہ نے راسپوٹین کی نرسری میں آمد و رفت کی پابندی بھی ختم کر دی۔ وہ ولی عہد اور شہزادیوں کے علاج کے سلسلے میں کسی اور پر اعتماد کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس پابندی کے خاتمے نے اسے کسی حد تک مطمئن کر دیا لیکن زار کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ اس کی والدہ نے راسپوٹین کے لیے کبھی بھی مثبت جذبات محسوس نہیں کیے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو اس آسیب سے محفوظ رکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ راسپوٹین بھی ان حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کی چھٹی حس پیٹرزبرگ سے وقتی غیاب کا عندیہ دے رہی تھی۔ زار اور زارینہ اس معاملے میں راسپوٹین کے ہم خیال تھے۔

''میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور پُرسکون تھا۔ تمہارے اہلِ خانہ کی یہ مخالفت اور نادانیاں صرف تم دونوں کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتی ہیں۔'' اس نے دانستہ تیور دکھائے۔

''اس مہربانی اور ذرہ نوازی کے لیے ہم آپ کے سدا ممنون رہیں گے فادر!'' زارینہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

''غلطیوں کا تاوان بھی ادا کرنا پڑتا ہے زارینہ!'' راسپوٹین نے بے رخی جتائی۔

''فادر! میرا خیال ہے کہ آپ کو روس بھر کے عیسائیوں کی جانب سے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے جانا چاہیے۔ خداوند کے حضور صرف آپ ہی ہمیں گناہوں' غلطیوں اور کوتاہیوں سے معافی دلوا سکتے ہیں۔'' زار نے التجا کی۔

''جی ہاں فادر! اس سفر کا تمام تر خرچ ہمارے ہی ذمے ہوگا۔ آپ کی یہ زیارتیں ہمارے گناہوں اور آپ کو ملنے والی اذیت کا مداوا ہوں گی۔'' زارینہ کی اس تجویز پر راسپوٹین نیم رضامند دکھائی دینے لگا۔ اس نے بے نیازی و احسانات جتاتے ہوئے سفر کی ہامی بھر لی اور چند مزید روسی زائرین کے ساتھ یروشلم روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

راسپوٹین کی واپسی جون 1911ء میں ہوئی۔ یروشلم کا وہ سفر بھی متنازعہ اور جنسی بدکاریوں سے لبریز رہا۔ اس نے اپنے تاثرات و تجربات Thoughts And Reflections نامی کتاب میں درج

کیے۔ پمفلٹ ''فلپوف'' نے شائع کیے۔عوامی طبقات میں یہی تاثر نمایاں تھا کہ اس پمفلٹ کی اصل مصنفہ راسپوٹین کی بے دام کنیز ''زارینہ الیکسس'' ہے۔اس کے غیاب نے بھی عوام وخواص کے رویّے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔اخبارات میں مضامین کا سلسلہ بھی جوں کا توں جاری تھا۔زارنکولس نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسٹولیپن پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ پولیس نگرانی کے بعد اخباری مضامین کا سلسلہ بھی کسی طرح بند کروائے لیکن اسٹولیپن نے اس کی یہ فرمائش نظر انداز کر دی۔وہ تو خود کسی بھی طرح اس عفریت سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔زارینہ کے ذہنی غلام زارنکولس کو علم ہی نہیں تھا کہ اسٹولیپن نے خفیہ طور پر راسپوٹین کی نگرانی اب بھی جاری رکھی ہوئی تھی۔ثبوت وشواہد اکٹھے کرنے کے بعد وہ خود اعتمادی سے زار کے پاس چلا آیا۔

''روسی سرزمین میں یہ سب کیا ہو رہا ہے معزز وزیر اعظم؟ کیا مقدس روس میں کسی معزز شخص کی یہی عزت رہ گئی ہے کہ اخبارات ہر وقت اس کی کردار کشی کرتے رہیں۔'' وہ بیک وقت غصے اور بے بسی کی کیفیات میں مبتلا تھا۔

''مقدس روس میں معزز شخص کی بے شک بہت عزت ہے یور میجسٹی! لیکن کسی ابلیس صفت کی مدح سرائی کیسے کی جا سکتی ہے؟''

''تم فادر گریگوری کی توہین کر رہے ہو اسٹولیپن!''

''نہیں یور میجسٹی! میں اپنے فرائض نہایت دیانت داری سے انجام دے رہا ہوں۔میرے پاس اس بات کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ راسپوٹین عورتوں کے ہمراہ حماموں میں جا کر غیر اخلاقی افعال کرتا ہے۔'' وہ بضد رہا۔

''وہ عام انسان نہیں ہے اسٹولیپن! مجھے علم ہے کہ وہ انہیں تبلیغ اور ضبطِ نفس کی تعلیم دینے وہاں جاتا ہے۔اس کا ارادہ اور مقصد بہر حال نیک ہے۔غیر اخلاقی افعال کے الزامات مخالفین کا پروپیگنڈا ہیں۔'' زار نے وہ رپورٹ تھام کر آتش دان میں پھینک دی۔اس کے چہرے پر سخت تناؤ تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ راسپوٹین کے متعلق کوئی بھی بات کرتے ہوئے وہ خوفزدہ ہو رہا ہے۔

''راسپوٹین اس ملک کے لیے ایک ناسور بن چکا ہے ہز ہائی نس! اس سے نجات حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔مجھے علم ہے کہ ہز ہائی نس بھی مجھ سے بہت ناراض رہتی ہیں۔انہوں نے میرے خلاف بے رحمانہ مہم کا آغاز کر کے مجھے سیاسی موت فراہم کرنے کی بنیاد تو رکھ ہی دی ہے لیکن میں بھی اپنی وفاداری اور حب الوطنی کے ہاتھوں مجبور ہوں۔میں سچائی کی راہ پر ہی چلتا رہوں گا۔'' اسٹولیپن نے متانت سے کہا۔وہ اپنے دل میں ہزار ہا انکشافات چھپائے بیٹھا تھا۔اسے حالیہ طور پر ہی علم ہوا تھا کہ سائبیریا سے ''بیڈ نائیف'' کی پیٹرزبرگ آمد ہوئی ہے۔وہ تبتی جڑی بوٹیوں سے ہر مرض کا علاج کیا کرتا تھا۔عوامی حلقوں میں یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ راسپوٹین اس سے چند خاص جڑی بوٹیاں لے کر زار کو کھلاتا ہے تاکہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت محدود ہوتی رہے۔

اسٹولیپن کے مزید کچھ بھی کہنے سے قبل زار نے اسے رخصت کا اشارہ کر دیا۔اسٹولیپن نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن زندگی نے عمل کی نوبت ہی نہ دی۔ کچھ عرصے بعد یکم ستمبر 1911ء کو کسی نے ''کیف'' میں ریوالور سے فائرنگ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔یہ امر مشتبہ ہی رہا کہ قتل زارنکولس، زارینہ یا راسپوٹین میں سے کس کے ایما پر ہوا تھا۔راسپوٹین کی من مانیوں کا سلسلہ ایک بار پھر مزید جوبن اختیار کر گیا۔اس نے ایلیا ڈوراور... ہرموگن کے اخلاقی اعتراضات اٹھائے جانے کے بعد زارینہ کے دماغ میں یہ بات راسخ کر دی کہ دونوں اسے قتل کروانے کے درپے ہیں۔زارینہ کے لیے ولی عہد کے معالج اور اپنے لیے خدا کی خصوصی رحمت کے فنا ہو جانے کا تصور ہی ہولناک تھا۔ایلیا ڈوراور ہرموگن کی شامتِ اعمال تھی کہ انہوں نے زارینہ اور راسپوٹین کے خلاف خفیہ خطوط روس کے طول وعرض میں پھیلا دیے۔طیش زدہ زارینہ نے ان دونوں کو ملک بدر کروا کر ہی دم لیا۔راسپوٹین کے مخالفین میں خوف کی لہر سرایت کر گئی۔اس کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانا جانی اور عہدیداری نقصانات سے کم نہ رہا تھا۔

☆☆☆

1912ء کا آغاز ہو چکا تھا۔

گریگوری راسپوٹین کا اثر رسوخ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔وزیر داخلہ ''میکاروف'' ملکی صورتِ حال پر سخت تشویش زدہ تھا۔اس نے زارنکولس سے خصوصی ملاقات کی اور اسے قائل کر کے ہی دم لیا کہ فادر گریگوری کو مستقبل میں ایلیا ڈوراور ہرموگن جیسے دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی خفیہ نگرانی بہت ضروری ہو چکی ہے۔زار نے میکاروف کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیا اور خفیہ ایجنٹوں

کو اس کے متواتر تعاقب پر مامور کر دیا گیا۔ راسپوٹین کا کوڈ نام ''روسی'' رکھنے کے بعد اس کا ہر ایک پل کاغذات میں درج ہونے لگا۔ ایجنٹوں کی فراہم کردہ یہ معلومات میکاروف کو بھی حیرت زدہ کر گئیں۔ راسپوٹین گھر سے نکلتا تو اس کے ساتھ ایک یا ایک سے زائد عقیدت مند خواتین لازمی ہوتی تھیں۔ تنہا نکلنے کی صورت میں اس کا رخ اس بازار کی طرف ہوا کرتا جہاں طوائفیں جسم فروشی کرتی تھیں۔ کسی ایک جسم فروش کو منتخب کر لینے کے بعد وہ طوائف بازی ترک نہیں کر پایا تھا۔ وہ مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے عورتوں پر غلیظ جملے کستا۔ جواباً اسے کبھی دھمکیاں ملتیں، کبھی کوئی راہ گیر عورت نفرت سے اس پر تھوک دیتی تو کبھی اِکا دُکا اس کی جانب مائل بھی ہو جاتیں۔

بعض اوقات وہ ایک دن میں کئی مرتبہ طوائفوں کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کی عادات اور حرکات و سکنات بے حد عجیب و غریب ہو چکی تھیں۔ تنہا جا رہا ہوتا تو خود کلامی کرنے لگتا، اپنے بازو لہراتا اور اپنے آپ کو مارنے لگتا۔ راہ گیر اس کی جانب متوجہ ہو کر عجیب و غریب نظروں سے اسے دیکھا کرتے۔ راسپوٹین ہر خاص و عام کے لیے موضوعِ گفتگو تھا۔ شہر بھر میں برملا کہا جاتا تھا کہ روس پر زار کی نہیں بلکہ بدمعاش، بدخصلت راسپوٹین کی حکومت ہے۔ زارنکولس اور زارینہ فادر گریگوری کی کسی بھی ناراضگی کے خیال سے ہی لرزاں رہتے تھے۔ راسپوٹین انہیں وقتاً فوقتاً احساس دلاتا رہتا کہ پیٹرزبرگ سے اس کا کوچ مشکل کام نہیں ہے تاہم وہ ''اپنے لوگوں'' کے تحفظ کی خاطر ہی وہاں قیام کرنے پر مجبور ہے۔ زارنکولس نے دباؤ کے تحت اخبارات میں راسپوٹین کے خلاف مضامین اور خبروں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی۔ زار کا یہ عمل ''ڈوما'' (روسی مجلس قانون ساز ادارہ) کو سخت ناگوار گزرا۔ ڈوما کے اراکین نے راسپوٹین کے خلاف ایک قرارداد پیش کی جسے بے مثال اکثریتی حمایت ملی۔ قرارداد کی مخالفت میں صرف ایک ہی ووٹ آیا تھا۔ دائیں اور بائیں بازو کے سیاستدان راسپوٹین کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ اس قرارداد میں ایک متاثرہ خاتون برلاڈسکایا کا اعتراف من و عن شامل ہونے پر زار شاہی ''اپنے دوست'' کے خلاف تفتیش کروانے پر مجبور ہو گیا۔ قرارداد منظور ہوتے ہی اخبارات میں مضامین کا سیلاب امڈ آیا۔ سینسر کا محکمہ ایسے اخبارات کو ضبط کرتا تو انتظامیہ ہنسی خوشی جرمانہ ادا کر دیتی۔ ممنوعہ اخبارات کی مانگ میں ہوش ربا اضافہ ہونے لگا۔ انسانی فطرت سے مغلوب عوام انہیں چوری چھپے اور مہنگے داموں خرید لیا کرتے۔

زارنکولس اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ہر محاذ پر فادر گریگوری کے دفاع میں ناکام ہو چکا تھا۔ ایک جانب عوامی سطح پر طوفانِ بدتمیزی برپا تھا تو دوسری جانب اہلِ خانہ بھی متواتر دباؤ ڈال رہے تھے۔ زار کی والدہ آئے روز راسپوٹین کی بداعمالیوں کی شکایات کے بعد ہراساں کیا کرتی کہ راسپوٹین کی یہ حرکات خود زار کو بدنام کر رہی ہیں۔ تیسری سمت میں زارینہ فادر گریگوری کی غیر موجودگی میں برپا ہونے والی تباہی سے آگاہ کرتی تو اس کی قوتِ فیصلہ بالکل ہی مفلوج ہو جاتی۔

ان حالات میں زارنکولس نے وہی راہ اختیار کی جو وہ ماضیِ قریب میں بھی اپناتا آیا تھا۔ اس نے راسپوٹین سے کچھ عرصے کے لیے پوکروسکوئی چلے جانے کی التجا کی۔ اٹھارہ فروری 1912ء کو راسپوٹین مرد و زن کے ایک گروہ کے ہمراہ بذریعہ ریل پیٹرزبرگ روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچنے پر اس کی اہلیہ اور بیٹی پرسکادیِ مرگ کی کیفیات طاری تھیں۔ راسپوٹین نے سرد مہری سے ملاقات کی۔ اس کے دل و دماغ میں اپنی تذلیل اور اس جبری آمد کا طیش سوار تھا۔ اس نے کچھ سوچ بچار کے بعد زار کو خط لکھوایا اور ڈوما کی اس قرارداد کے خلاف خوب زہر افشانی کرتے ہوئے ان کی حدود متعین کرنے پر اکسایا۔ راسپوٹین کا کہنا تھا کہ ڈوما کو زار کی خواہشات کے تابع ہونا چاہیے۔ اپنا غم و غصہ زار تک منتقل کر لینے کے بعد وہ آبائی قصبے میں سکون و اطمینان کے دن بسر کرنے لگا۔ اس کے معمولات میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا۔ اہلِ علاقہ کو اس کی آمد کے بعد ایک نیا موضوعِ گفتگو مل گیا۔ علاقائی روایات کے مطابق مختلف محفلوں میں گریشا کے ہمراہ آنے والی خواتین پر تبصرے جاری ہو جاتے۔ ایسے ہی ایک روز بدحال، میل خوردہ کپڑوں، الجھے بکھرے بالوں اور وحشت زدہ چہرہ لیے کوئی عورت وہاں چلی آئی۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی جلد پھٹ چکی تھی۔

''کیا تم میں سے کسی نے میرے مسیحا کو دیکھا ہے؟'' وہ بے قراری سے پوچھنے لگی۔

''نہیں! کون ہے تمہارا مسیحا؟ کہاں رہتا ہے وہ؟'' ایک مقامی شخص نے میل کی تہوں میں چھپے چہرے کو بغور دیکھا۔ اس کے نقوش بہت جانے پہچانے محسوس ہو رہے تھے۔

''وہ یہیں تو رہتا ہے۔'' عورت نے اپنے میلے

چیکٹ بالوں میں خارش کی۔ ''یہیں کہیں رہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ آئی تھی۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ وہ مجھے بھول ہی گیا ہے۔ میں نے تو کبھی اس کی کوئی بات ٹالی ہی نہیں تھی۔'' اس کی بے ربط باتوں نے ایک اور شخص کو چونکا دیا۔

''میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تم جنرل کی بیوی ہو نا؟ گریشا کے ساتھ پچھلی دفعہ زارروس کے بارے میں باتیں بتائی تھیں۔''

''زارروس..... جنرل..... ہاں! میں وہیں سے آئی ہوں۔ بھیک مانگ کر یہاں آئی ہوں۔ کہاں ہے وہ؟ کتنا عرصہ ہوگیا اسے دیکھے ہوئے۔'' وہ اسی بے ربطی سے کہتی چلی گئی۔ اسے اپنے سامنے کھڑے ان افراد کی آنکھوں سے جھلکتا تاسف اور حیرانی دکھائی ہی نہ دے رہا تھا۔ کسی مقامی نے اسے گریشا کے گھر کا پتا سمجھا دیا۔

لوختینا کے جانے کے بعد وہاں موجود لوگ متضاد باتوں اور کیفیات کا شکار ہوگئے۔ یہ محفل ابھی برخاست نہ ہوئی تھی کہ بستی میں ایک اور تماشا برپا ہوگیا۔ راسپوٹین کی بیوی اس بھکارن نما عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اپنے گھر سے باہر نکلی اور اسے بے دردی سے مارنا پیٹنا شروع کردیا۔

''ماردوں گی..... قتل کردوں گی..... میں ایک ایک کو ماردوں گی..... تم جیسیوں نے مجھ سے میرا شوہر چھین لیا۔ مجھ کم بخت نے آغاز میں ہی ہمت دکھائی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔''

''چھوڑ دو مجھے! میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟'' لوختینا اس کی وحشت کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

''تم لوگوں نے ہی تو بگاڑا ہے۔ آج اسے یہاں آئے اتنے دن ہوگئے ہیں۔ اس نے ایک بار بھی میری طرف محبت بھری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تمہارے شہر نے اسے صرف ایک درندہ بنا دیا ہے..... بھوکا درندہ..... اسے صرف بھوک مٹانے سے غرض رہ گئی ہے۔ وہ محبت بھول گیا ہے..... مجھے بھول گیا ہے۔ کس طرح لڑ جھگڑ کر اپنے گھر لایا تھا۔'' پریسکو ویا کا بین اہلِ علاقہ کے دل دہلا رہا تھا۔

لوختینا خالی نظروں سے اسے دیکھتی اپنا زخمی جسم گھسیٹ کر اہلِ علاقہ سے بھیک مانگنے لگی۔ راسپوٹین لوختینا کی حالت سے بے نیاز تھا۔ وہ اس کے لیے اپنی اہمیت کھو چکی تھی۔ اس نے بھرپور اطمینان سے وہاں ایک ماہ گزارا اور ویروبووا کا ٹیلی گرام موصول ہونے پر واپس پیٹرزبرگ لوٹ گیا۔

☆☆☆

موسم گرما کی جولانیاں عروج پر تھیں۔

راسپوٹین چند خواتین کے ساتھ وقت گزاری کے بعد شاہی محل میں چلا آیا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ کچھ روز پہلے اس کی ملاقات فلپوف سے ہوئی تھی اور حیران کن بات یہ تھی کہ راسپوٹین اس بات سے آگاہ ہی نہیں تھا کہ ماضی قریب میں فلپوف نے اس کے حق میں کئی مضامین لکھ کر شائع کروائے ہیں۔ حالیہ ملاقات میں بھی فلپوف اس سے کافی متاثر ہوا تھا اور راسپوٹین کو یقین تھا کہ مخالفت کی تند ہوا میں فلپوف اس کی حمایت کا چراغ کبھی بجھنے نہیں دے گا۔

محل میں آتے ہی وہ زارینہ کی حالت دیکھ کر چونک گیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال اور ہر ایک انداز سے پریشانی واضح تھی۔ راسپوٹین گہری نظروں سے اس کے حسین خدوخال اور ملیح چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

''کم بخت آج بھی بلا کی حسین ہے۔ عمر کی گرد تو اسے کبھی چھو کر گزرتی ہی نہیں۔'' اس کے ذہن میں ایک کمینی سوچ ابھری۔

''فادر! میں آپ ہی کی منتظر تھی۔ بہت پریشان ہوں میں۔'' وہ اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کے پاس چلی آئی۔

''میرے ہوتے ہوئے پریشانی کیسی؟ مجھے خداوند نے تمہاری ہر پریشانی کے حل کے لیے ہی تو یہاں بھیج رکھا ہے۔'' اس نے زارینہ کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔

''نکی نے ہماری بیٹی اولگا کی منگنی دیمیتری پاؤلووچ سے طے کردی ہے۔''

''دیمیتری..... مجھے تو وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا۔'' اس کے جواب پر زارینہ کھل اٹھی۔

''مجھے بھی وہ بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کے لیے کسی بہترین شخص کا انتخاب کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی ایسا شخص جو دل وجان سے آپ کا بھی عقیدت مند ہو۔'' زارینہ کو اپنے مبینہ داماد کی راسپوٹین کے متعلق نفرت و ناگواری یاد آئی۔

''ایسا ہی ہوگا۔ دیمیتری بہت جلد زار کے ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں شمار ہونے لگے گا۔ میری آنکھیں اسے بہت سے مسائل میں گرفتار دیکھ رہی ہیں۔'' زارینہ اس پیش گوئی پر ریشہ خطمی ہونے لگی۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ راسپوٹین ہمیشہ دانستہ طور پر ایسی بات کی پیشگوئی کرتا ہے جو وہ سننے کی خواہشمند ہے۔ ان حقائق سے بے خبر وہ اپنے دوست کی ''خدمت گزاری'' کرتی اسے ''تاوان'' ادا کرنے لگی۔ شاہی محل سے رخصتی کے بعد راسپوٹین کے

ذہن میں دیمیتری کے شب وروز اور احباب کے ساتھ مصروفیات پر نظر رکھنے کا خیال رواں تھا۔ ذرا سی محنت سے ہی اسے اپنی کوششوں کا پھل مل گیا۔ قدرت کی جانب سے بھی ایسا ہوا کہ دیمیتری ''فیلیکس یوسوپوف'' کا گہرا دوست بن گیا۔ وہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ شمار ہونے لگے۔ ان کی ہر رات شیشہ قہوہ خانوں اور ریستورانوں اور جپسیوں کے درمیان بسر ہوا کرتی۔ فیلیکس کی نفسیاتی کجیوں کی بدولت اس کے نجی عشرت کدوں میں خاتون بیلے ڈانسروں کے بجائے مرد بیلے ڈانسر مدعو کیے جاتے تھے۔ ان لاابالی معمولات میں دیمیتری کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ عوام وخواص کی طرح زارنکولس بھی ان کی دوستی سے تحفظات میں مبتلا ہونے لگا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب شاہی قانون کے تحت ''ہم جنس پرستی'' ایک جرم تھی۔ اس نے دیمیتری پر پابندی عائد کر دی کہ وہ فیلیکس سے ملاقات نہیں کرے گا لیکن دیمیتری کسی کی بھی بات سننے پر تیار ہی نہیں تھا، اپنے متعلق ''ذوجنسی'' کا لقب بھی اس کا فیصلہ تبدیل نہیں کر پایا تھا۔ اس نے شاہی محل چھوڑ کر ایک الگ مکان حاصل کر لیا جس کے فرنیچر' آرائش اور قیمتی تصاویر کی خریداری میں فیلیکس نے ہی اس کی مدد کی۔ راسپوٹین کے لیے یہ تمام صورت حال بہت تسلی بخش تھی۔ اس نے نہایت اہتمام سے پیش گوئی کی کہ دیمیتری اپنی اس غیر فطری روش کے باعث عنقریب سنگین جلدی مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ زارینہ نے اس کی شہ پر شوہر سے لڑ جھگڑ کر بیٹی کی منگنی توڑ دی۔

اپنی مراد بر آنے پر زارینہ بے حد خوش تھی۔ اس نے راسپوٹین پر عنایات کا سلسلہ مزید بڑھا دیا۔ دیمیتری اور فیلیکس راسپوٹین کے اس کردار پر بہت مشتعل تھے۔ فیلیکس کے جذبات سابقہ ناگواری کی بدولت مزید بھڑک اٹھے۔ وہ کسی بھی طرح اس شعبدہ باز کو سبق سکھانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے زیادہ محنت نہ کرنی پڑی۔ اسے علم تھا کہ ان دنوں راسپوٹین ''3 انگلش ایونیو'' میں رہتا ہے۔ فیلیکس نے کسی طرح اس کا ٹیلی فون نمبر حاصل کیا اور مخصوص زنانہ بہروپ اختیار کر کے اسے فون کر دیا۔ راسپوٹین کا وہ فون ہمیشہ مصروف ہی رہتا تھا تاہم اس روز پہلی ہی کوشش میں رابطہ ہو گیا۔

''ہیلو! کون بات کر رہی ہے؟'' رابطہ ہوتے ہی ایک کرخت گمبھیر آواز فیلیکس کی سماعت میں پڑی۔

''ہیلو! کیا یہ 64646 ہے؟'' وہ حتی الامکان لوچ دار آواز میں بولا۔

''ہاں! کون ہو تم؟ میں سن رہا ہوں۔''

''فادر گریگوری! میں ایک نوجوان لڑکی بول رہی ہوں۔ نوجوان اور بے حد خوبصورت۔ میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ یہاں کی رہنے والی بھی نہیں ہوں۔ واپسی سے قبل آپ کی زیارت کرنا چاہتی ہوں۔''

''خوب! میرے گھر اور دل کے دروازے ہر خوبصورت عورت کے لیے کھلے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد چلی آؤ۔ میں سب ملاقاتیوں سے فارغ ہو کر فرصت واطمینان میں تم سے ملاقات کروں گا۔'' راسپوٹین کا لب ولہجہ مخمور تھا۔ فیلیکس نے بھرپور زنانہ انداز میں الوداعی کلمات ادا کیے اور اپنے بہروپ کو مزید دو آتشہ بنانے لگا۔

اگلے ایک گھنٹے میں وہ ایک بہت بڑی خاکستری عمارت کے مرکزی دروازے تک پہنچ گیا۔ لابی میں ایک بھس بھرا بھیڑیا اور ریچھ نصب تھے۔ ان کے پیچھے والی دیوار میں قدرے قدیم طرز کی کھڑکی تھی جہاں موجود پھول دار پودا مرجھانے کے قریب تھا۔ لفٹ آخری منزل پر رک گئی۔ گھنٹی بجانے پر ایک پستہ قد موٹی سی عورت نے دروازہ کھولا۔ اس نے سر پر ایک سفید رومال باندھا ہوا تھا۔ فیلیکس کو علم تھا کہ وہ ''اکیلینا'' یا ''لیپٹنکایا'' میں سے ہی کوئی ایک تھی۔ اس کی بڑی بڑی خاکستری آنکھوں میں خیر مقدمی تاثرات اور چمک تھی۔

''تم پہلے تو کبھی یہاں نظر نہیں آئیں... کیا ملاقات کا وقت لے کر آئی ہو؟'' اس نے فیلیکس کو بغور دیکھا۔ اس کا کوئی بھی تجزیہ یا تجسس فیلیکس کا اعتماد نہیں گڑبڑا سکتا تھا۔ اسے اپنے بہروپ' انداز اور نشست وبرخاست پر مکمل بھروسا تھا۔

''ہاں! فادر نے سب سے آخر میں مجھ سے ملاقات کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے! اندر آ جاؤ۔'' اس نے رستہ دیا۔ فلیلیکس دلکش چال چلتا ہوا اندر چلا آیا۔

اسی وقت برآمدے کے دوسری جانب والا دروازہ کھلا اور راسپوٹین تیزی سے جھومتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ ٹھوس بدن' غیر معمولی چوڑے شانے' ریشمی قمیص' کمر بند' انگریزی ٹراؤزر اور ہائی ٹاپ بوٹ دیکھ کر فیلیکس کے جبڑے بھنچ گئے۔ راسپوٹین کے لمبے بالوں میں درمیانی مانگ نکالی گئی تھی۔ سرخی مائل بھوری ڈاڑھی دیکھ کر اسے غصہ آنے لگا۔ چوڑی ناک' چمکدار نظریں' دائیں آنکھ میں گیدا اس کی طبیعت مکدر کر رہی تھیں۔ اسے

UUNOVELS.COM

اپنے آس پاس بیٹھی خواتین پر بھی طیش آنے لگا جو اس غلیظ شخص پر ریشہ خطمی نظر آرہی تھیں وہاں موجود خواتین نہایت معزز خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اس کے لیے ڈھیروں نذرانے لائی تھیں۔ ان میں بے مثال حسن و جمال اور سیاہ آنکھوں والی شہزادی شیخو وسکایا بھی تھی۔ اس نے راسپوٹین کا پیروکار بننے کے لیے چار سال قبل اپنے شوہر اور بچوں کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ روس کی اولین ہواباز خاتون کو وہاں دیکھ کر فیلیکس ان کی عقل پر ماتم کر کے رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ تنہا رہ گیا تو اسے تنگ کر کے میں بھیج دیا گیا۔ راسپوٹین نے ایک کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم میرے اندازوں سے کہیں زیادہ حسین ہو۔'' وہ حریص گدھ دکھائی دینے لگا۔

''میری خوش قسمتی ہے فادر کہ میں آپ کے سامنے یوں بیٹھی ہوں۔'' فیلیکس نے نزاکت سے کہا۔

''کیا تم پادریوں پر اعتقاد نہیں رکھتی ہو؟''

''نہیں فادر! مجھے کوئی سچا مسیحا نہیں ملا۔'' وہ افسردہ ہوا۔

''وہ واقعی احمق ہیں۔ انہیں کسی بھی اسرار و سچائی کا علم ہی نہیں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ گناہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہمیں ندامت محسوس ہو سکے۔ ندامت روح کی مسرت ہے۔ گناہ سے نفرت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے سمجھنا چاہیے۔ جس قدر گناہ کرو گی تمہاری روح مسرت و سرشاری سے نہال ہو کر مضبوط ہوتی جائے گی۔ آج میں تمہارا روحانی علاج بھی کروں گا۔'' اس کی بات سن کر فیلیکس کے لیے اپنا قہقہہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ راسپوٹین نے معمول کے انداز میں اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ فیلیکس ناگواری سے اس کا لمس اور حرکات برداشت کرتا رہا۔ جب پیمانہ لبریز ہوا تو اس کے چہرے پر تھوکتے ہوئے اپنی اصل آواز میں بولا۔

''منحوس گدھ! میں تمہیں زندگی بھر سکون سے نہیں رہنے دوں گا۔ تم نے دیمیتری کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کا بھرپور تاوان ادا کرو گے۔'' ایک بھرپور مردانہ آواز نے راسپوٹین کا نشہ ہرن کر دیا۔ اپنے ساتھ ہونے والے اس دھوکے نے اسے سخت سیخ پا کر دیا۔ وہ بھرپور وحشت سے فیلیکس کو زدوکوب کرنے لگا جو قہقہے لگاتا اس پر طنزیہ فقرے کس رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے ہانپتا چھوڑ کر اپنی رہائشگاہ پر لوٹ آیا۔

☆☆☆

1912ء کے موسم خزاں کا آغاز زار شاہی پر ایک قہر بن کر نازل ہوا۔

ان دنوں زار نکولس شکار کے سلسلے میں ''بیلووژ جنگل'' میں موجود تھا۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ بھرپور تفریحی وقت بسر کر رہا تھا کہ اچانک ولی عہد الیکسی کی طبیعت میں تنزلی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اسے کھیلتے ہوئے چوٹ لگی تھی۔ ایک سال قبل گردوں میں ہیمرج ہونے سے بھی حالت بہت تشویش ناک ہو گئی تھی۔ اس بار بھی خون زہریلا ہو کر بدن متورم کرنے لگا۔ زارینہ کی جان پر بن آئی تھی۔ زار کی آنکھوں تلے بھی اس وقت اندھیرا چھا گیا جب ڈاکٹرز نے الیکسی کی زندگی کے متعلق مکمل مایوسی اور ناامیدی ظاہر کر دی۔ اس کی بقا شدید ترین خطرے میں تھی۔ وہ درد سے چیختا تو ان دونوں کی آنکھوں میں بھی بے بسی کے آنسو چھلک اٹھتے۔

''فادر گریگوری! کہاں ہیں آپ؟ میرے بیٹے کو زندگی عطا کر دیجیے۔ یہ ڈاکٹرز ہمیں خوفزدہ کر رہے ہیں کہ ولی عہد کو.....'' زارینہ فرط غم سے چلانے لگتی۔ اس غم و دکھ کی حالت میں اس نے راسپوٹین کو ٹیلی گرام روانہ کر دیا تا کہ وہ ولی عہد کو اپنے حصار میں لے کر نئی زندگی عطا کر دے۔

اب قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ ٹیلی گرام بھیجتے ہی الیکسی کی حالت میں کرشماتی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اس کی نازک شریانیں روبہ صحت تھیں۔ زارینہ کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس نے کوئی ''انجیلی معجزہ'' دیکھا ہے۔ زار نکولس بھی دل ہی دل میں اپنے وزراء کی بدگمانیوں پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ فادر گریگوری ان کے لیے زندگی اور خوشیوں کا ذریعہ تھا۔ اس کی ناراضگی یا دوری کا تو اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس بحران سے نکلتے ہی ایک اور آزمائش زار شاہی کا حوصلہ آزمانے کے لیے تیار تھی۔ بحی زندگی کے بعد قومی صورت حال بھی تلاطم خیز تھی۔ سربیا، مونٹی نیگرو، یونان اور بلغاریہ کی آرتھوڈوکس ریاستوں نے ترکی کے خلاف خفیہ اور بھرپور اتحاد قائم کر لیا۔ چھبیس ستمبر 1912ء کو البانیہ میں سکوتری میں ترک قلعے پر مونٹی نیگرو کی فوج قابض ہو گئی۔ پورا خطہ جنگ کے بادلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ روس پر بھی آرتھوڈوکس ریاستوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ الحاق کر لے۔ روسی عوام اور سیاستدان جنگ کے بھرپور حامی تھے۔ بالقان ایک مرتبہ پھر عالمی جنگ کی بھٹی بنتا نظر آنے لگا۔ اس خطرناک موڑ پر زار نکولس نے وزیر خارجہ کو حکم صادر کیا کہ وہ مونٹی نیگرو کے بادشاہ کو ہر قیمت پر پسپائی

کے لیے آمادہ کرے۔ ایک سخت کشمکش کے بعد روی وزیر خارجہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا اور ہولناک متوقع جنگ کے وہ بادل کسی بھی تباہی کے بغیر چھٹ گئے۔

پیٹرزبرگ کے مجموعی ماحول میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ ہر کس و ناکس کے ذہن میں یہ بات راسخ تھی کہ جرمنی بہت مضبوط ملک ہے۔ جاپان سے شکست کے بعد عسکری کمزوری کے باعث روس کو جرمنی سے ٹکر نہیں لینی چاہیے جبکہ حقیقت تو یہی تھی کہ راسپوٹین کو علم تھا کہ جرمن نژاد زارینہ جنگ کے تصور سے بھی خوفزدہ ہے۔ وہ اپنی پیشگوئیوں سے اس کے دل و دماغ کو پرسکون کرنے کا ہنر آشنا تھا۔ شاہی محل میں اس کی مرکزی حیثیت اور روس بھر پر اس کے مطلق اثر کی اصل ضامن بھی زارینہ ہی تھی لہٰذا اس نے زار کو جنگ نہ کرنے پر مجبور کر کے درحقیقت اپنا ہی فائدہ کیا تھا۔ تاہم معاشرہ یہی سمجھے بیٹھا تھا کہ ایک عیاش و بدکردار دہقان نے منصفانہ جنگ میں روس کی شمولیت رکوا کر ان کے قومی وقار کو سخت دھچکا پہنچایا ہے۔ یورپ بھر میں قتل کے حامیوں کو یقین ہو چلا تھا کہ راسپوٹین کی محل میں موجودگی تک جنگ ممکن ہی نہ تھی۔ اس سے بھی زیادہ پُریقین صورتِ حال یہ تھی کہ وہ اتنی آسانی سے زار شاہی کو اپنے وجود سے آزاد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس آسیب سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ صرف اور صرف اس کی موت تھا۔ اب یہ موت طبعی ہوتی یا حادثاتی۔ اس کا فیصلہ تو قسمت نے ہی کرنا تھا۔

اس کشمکش اور عناد میں اضافہ رومانوف خاندان کی ''تین سو سالہ'' شہنشایت کی تکمیل پر ہوا۔ روس کے تمام بڑے شہروں میں عظیم الشان تقریبات منعقد ہوئیں۔ ان شہروں کے مرکزی گرجا گھروں میں منعقد ہونے والی عبادتی تقاریب میں زار کو مدعو کیا گیا اور راسپوٹین ہر موقع پر شاہی خاندان کے قریب نظر آیا۔ اس کی آمد نے بعض مذہبی پیشواؤں کو بھی چیں بہ جبیں کیا لیکن اس اعتراض کے باوجود راسپوٹین کی حیثیت مسلمہ ہی رہی۔ ہر مقام پر ان کے ساتھ اس کی موجودگی شہریوں کو بھی مشتعل کرنے لگی۔

''یالٹا'' میں قیام کے دوران نفرت کی یہ چنگاریاں مزید سلگ اٹھی تھیں۔ زار اور زارینہ اسے اکثر و بیشتر محل طلب کر لیا کرتے۔ شہر کے میئر ''جنرل ڈمباڈزے'' نے ذمے دار عہدیدار کی حیثیت سے زار نکولس سے براہِ راست بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''یور میجسٹی! عوام آپ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔'' اس نے سلیقے سے تمہید باندھی۔

''انہیں کرنی بھی چاہیے۔ ہمارے تین سو سالہ اقتدار میں عوام کو بے حد سہولیات اور آسائشات ملی ہیں۔'' وہ رعونت سے بولا۔

''میں جانتا ہوں یور میجسٹی! عوام کو خوش رکھنا آپ کا شاہی منشور ہے اور آپ نے اسے کامیابی سے مکمل بھی کیا ہے لیکن شہری فادر گریگوری کی شاہی محل میں آمد و رفت ناپسند کرتے ہیں۔''

''تو کرتے رہیں۔ یہ ان کی بدبختی ہے کہ وہ خداوند کے خصوصی نمائندے کی حیثیت پہچان ہی نہیں پا رہے۔ فادر گریگوری ہمارا دوست ہے۔ ہم اپنی زندگی اپنی خواہش کے مطابق گزارنے کے لیے کسی کی پسند یا ناپسند کے محتاج نہیں۔ عوام سے محبت اپنی جگہ لیکن میں انہیں ہمارے ملاقاتیوں پر اعتراض کرنے کا حق کبھی نہیں دوں گا۔ ہم کسی کو بھی اپنے خاندانی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتے۔'' زار کے اس دوٹوک جواب پر بحث یا مزید دلائل کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ڈمباڈزے نے اس وقت سخت ذاتی توہین محسوس کی۔ اس نے شاہی خاندان کی عزت بچانے کے لیے پیٹرزبرگ کے محکمۂ پولیس کے ڈائریکٹر ''اسٹیپن بیلیسٹکی'' کو ٹیلی گرام بھیج کر پیش کش کی کہ راسپوٹین کو یالٹا سفر کے دوران کشتی میں قتل کروا دیا جائے۔ یہ ٹیلی گرام ایک معما بن کر رہ گیا۔ راسپوٹین کے کسی ''خیر خواہ وزیر'' نے اسے بیلیسٹکی تک پہنچنے سے ہی نابود کر دیا۔ نتیجتاً وہ بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

راسپوٹین اپنے کمرے میں کسی زخمی درندے کی طرح ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت اور نفرت کے تاثرات تھے۔ آنکھوں میں ثبت سرد مہری دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کسی مبینہ دشمن کے متعلق سوچ رہا ہے۔

''کچھ کرنا ہوگا۔ مجھے ابھی ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میری توہین کرنے والے کو میں پاتال کی تہ میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے غصے سے کف اڑایا۔

راسپوٹین کا معتوب فادر فیوفان تھا۔ ایک دور میں اس کا مربی اور محسن سمجھا جانے والا فیوفان اس کی شیطانی حرکات کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آیا تھا۔ اس نے زار اور زارینہ کو واضح لفظوں میں یہ پیغام بھجوایا تھا کہ راسپوٹین کے جسم میں کوئی شیطانی روح حلول کر چکی ہے۔ اس کا زار شاہی میں عمل دخل انہیں بھی تباہی کے کسی اتھاہ گڑھے میں پھینک دے گا۔ نکولس اور الیکسس نے اس کی

کسی بھی بات کو سنجیدہ لینا گوارا نہ کیا اور اسے دی گئی علاج ومعالجے کے علاوہ دیگر مراعات بھی چھین لینے کے درپے ہو گئے۔ ان دنوں وہ کرائیمیا میں رہائش پذیر تھے۔ ان کی وہاں موجودگی کے باعث فیوفان کو استراخان منتقل کر دیا گیا جہاں اس کی صحت تباہ ہو کر رہ گئی۔

کچھ عرصے بعد اطلاع ملی کہ فیوفان کو استراخان میں پھیپھڑوں کا ایک مرض لاحق ہو گیا ہے۔ وہ اپنے علاج کے لیے کرائیمیا جانے کا بھی مجاز نہیں تھا۔ اس موقع پر ایلا اپنی بہن سے الجھنے لگی کہ فیوفان پر ایسی پابندیاں عائد کرنا سراسر غیر انسانی فعل ہے۔ راسپوٹین بھی دل میں سخت بغض دبائے بیٹھا تھا۔ وہ فیوفان کو اس کی ''راست گوئی'' کا مزہ چکھانا چاہتا تھا۔ اسی لمحے اس کے شیطانی دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

''وہ مارا! یہی بہتر رہے گا۔ فیوفان کی اب خیر نہیں۔ وہ بہت جلد اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔'' وہ جوش سے اچھل پڑا۔

کچھ روز بعد وہ یالٹا میں مقامی پادری کی بیوہ ''اولگا ایالونو وناپوپووا'' سے ملنے پہنچ گیا۔ اولگا کئی برس سے مفلوج تھی۔ فیوفان انسانی ہمدردی کے تحت سال میں ایک یا دو مرتبہ اس کی عیادت کے لیے آیا کرتا تھا۔ تیرہ اکتوبر کے اس روز اولگا راسپوٹین کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''میرا نام فادر گریگوری راسپوٹین ہے۔ جانتی ہی ہو گی تم مجھے؟'' وہ رعونت سے بولا۔

''میں بیوہ اور معذور اپنی چار دیواری سے باہر کی دنیا سے واقف نہیں۔''

''فیوفان باقاعدگی سے تمہارے گھر آیا کرتا ہے۔ میری شان میں قصیدے تو بہت پڑھے ہوں گے اس نے؟''

''نہیں! وہ صرف میری تیمارداری کے لیے آتے ہیں۔ انہوں نے آپ کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔'' وہ ناگواری سے کہنے لگی۔

''تمہارے شوہر کی بے وقت موت اور پھر اس بیماری کا سن کر مجھے دلی افسوس ہوا۔'' راسپوٹین نے پینترا بدلا۔

''خداوند یسوع مسیح کی رضا کے سامنے ہم سبھی بے بس ہیں۔'' اولگا محض اتنا ہی کہہ سکی۔

''تمہاری بیماری بھی تو معمولی نہیں ہے نا...! ایسی محتاجی میں تو انسان مُردوں سے بھی بدتر ہو جایا کرتا ہے۔'' اس نے ہمدردی جتائی۔

''نصیب میں لکھے حادثات اور بیماریاں تو بھگتنی ہی پڑتی ہیں۔'' وہ اس کی موجودگی سے بہت بے سکونی محسوس کر رہی تھی۔

''مالی مشکلات بھی درپیش ہوں گی پھر تو؟''

''خداوند کا کرم ہے۔ گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔''

''اگر تم چاہو تو میں تمہیں ایک ہزار روبل دے کر مشکلات کا خاتمہ کر سکتا ہوں۔'' راسپوٹین نے داؤ کھیلا۔

''تمہیں صرف زارینہ کو اتنا بتانا ہوگا کہ فیوفان میرے اور اس کے تعلقات کی باتیں کیا کرتا ہے۔'' اس کے فحش الفاظ و انداز دیکھ کر اولگا دنگ تھی۔

''میں اس بھلے آدمی پر کوئی الزام نہیں لگاؤں گی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''مجھے انکار کرنے والے کا انجام بہت برا ہوا کرتا ہے۔ تم اور تمہارے بچے خوار ہو جائیں گے۔'' اس نے دھمکایا۔

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔'' اولگا ہانپتے ہوئے بولی۔

''میں نصف شب کے قریب زارینہ کو تمہارے پاس لاؤں گا۔ اگر تم نے میرا کام کر دیا تو رقم کے ساتھ بیٹے کا محفوظ مستقبل بھی حاصل ہوگا۔ اچھی طرح سوچ لینا۔'' راسپوٹین کی باتیں اس کی قوتِ ارادی کو بھی مفلوج کرنے لگیں۔ اولگا کے چہرے پر نیم رضامندی پا کر راسپوٹین مطمئن ہو گیا۔

اس رات بارہ بجے کے قریب اولگا کے اپارٹمنٹ کے باہر ایک کار آ کر رکی۔ اس کے بیٹے نے دروازہ کھولا اور راسپوٹین کے ہمراہ کسی عورت کو بھی اندر لے آیا۔ وہ طویل قامت، سیاہ لباس اور سیاہ جالی دار نقاب میں ملبوس تھی۔ اس نے اولگا کی عیادت کی اور ملائمت سے مسلسل لیٹے رہنے کے باعث کمر میں ہو جانے والے زخم سہلانے لگی۔

''اولگا! ہم یہاں سچائی جاننے آئے ہیں۔ زارینہ کو بتاؤ کہ فیوفان کس طرح زہر افشانی کیا کرتا ہے۔'' راسپوٹین نے اسے مخاطب کیا۔

''کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا؟'' زارینہ نے نرمی سے پوچھا۔

''نہیں! یہ سب جھوٹ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس شخص نے مجھے ہزار روبل دینے کے عوض غلط بیانی کی ترغیب دی تھی۔'' وہ دل کڑا کر کے بولی۔

''یہ ڈر گئی ہے..... جھوٹ بول رہی ہے..... یہ ضرور کسی کے دباؤ میں ہے۔'' راسپوٹین چلایا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' اولگا نے نقاہت سے آنکھیں موند لیں۔ راسپوٹین

نے اسے دھمکانے کی کوشش کی لیکن اس بار ناکامی اس کا مقدر تھی۔ وہ پاؤں پٹختا اولگا کو حقارت وطیش بھری نظروں سے دیکھتا ہوا زارینہ کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔ اس نے زارینہ کو مطمئن اور فیوفان کے خلاف بھڑکانے کے لیے ایک نئی حکمتِ عملی سوچنی شروع کردی۔

☆☆☆

1913ء کا موسم سرما اپنے عروج پر تھا۔ روس ٹھٹھرا ہوا تھا۔ موسموں کا تغیر راسپوٹین کے مزاج میں کوئی بھی تبدیلی پیدا کرنے سے قاصر رہتا۔ اس کے وجود پر سدا بہار ایک ہی موسم طاری رہتا۔ وحشت' درندگی اور نفس کی پیروی۔

اس برس راسپوٹین نے پہلی بار پیٹرز برگ میں ذاتی اپارٹمنٹ حاصل کرلیا۔ لوخینا' سازونوف اور پھر خستہ حال کرائے کے کمرے میں رہنے والا وہ آوارہ گرد دارالحکومت میں ذاتی جاگیر کا مالک بنا تو جبلی طور پر ہی اہلِ خانہ کی کشش تڑپانے لگی۔ اس نے بیٹیوں کو پوکرووسکوئی سے پیٹرز برگ بلوا لیا۔ اسے بے گھری' حماموں میں وقت گزاری اور طوائف بازی سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس نے دونوں بیٹیوں کو ایک نجی تعلیمی ادارے میں داخل کروادیا۔ اہلِ خانہ کی موجودگی کے باوجود عقیدت مندوں کی آمدورفت ..... میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ان ہموار معمولات میں دو قسم کے حالات تلاطم پیدا کردیتے۔ سازشی عناصر اسے راہ سے ہٹانے کے درپے رہتے تھے۔ وزراء میں اکثر اس پر قاتلانہ حملوں کی منصوبہ بندی تشکیل پاتی لیکن یہ روس کی بدقسمتی اور راسپوٹین کی خوش قسمتی ہی تھی کہ کوئی نہ کوئی مخالف وحاسد وزیر اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لیے راسپوٹین کو بروقت مطلع کردیتا۔

دوسری جانب اخباری مضامین ناہمواری اور بے سکونی پیدا کیے رکھتے۔ اخبارات میں اس کے ایسے انٹرویوز شائع ہوتے جو اس نے کبھی دیے ہی نہ تھے۔ ذلت' کردار کشی اور متواتر ہرزہ سرائی اسے ایسے ذہنی مقام پر لے آئی تھی کہ اعصاب پر سے قابو ہی ختم ہوکر رہ گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت کے پیش نظر زارینہ اور ویروبووا صحافیوں سے دور رہنے کا صائب مشورہ تو دیتیں لیکن صحافیوں کے ٹیلی فون کی گھنٹیاں کھڑکاتے رہنے سے کس طرح روک سکتی تھیں۔ راسپوٹین زچ ہوکر ریسیور میں چیخنے لگتا۔

''تم لوگ مجھ سے چاہتے کیا ہو آخر؟ تم سمجھتا کیوں نہیں چاہتے کہ میں ایک چھوٹی سی مکھی ہوں جسے کسی سے بھی کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس میرے علاوہ اور کوئی لکھائی کا موضوع نہیں ہے کیا؟ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ پہنچا بھی کیسے سکتا ہوں بھلا؟ میرے پاس کوئی منفی قوت نہیں ہے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو..... زندہ رہنے دو..... خود بھی جیو اور مجھے بھی جینے دو..... تمہارے لیے دنیا میں صرف ایک ہی شخص رہ گیا ہے..... راسپوٹین..... راسپوٹین..... خاموش ہوجاؤ..... اتنی تحریریں! تمہیں خدا کو بھی جواب دینا ہوگا..... وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے..... وہی سب جانتا اور فیصلہ کرتا ہے..... پھر بھی اگر تم لوگ ان تماشوں سے باز نہ آئے تو جہنم میں جلو گے۔ میری بددعائیں تمہیں کبھی خوش نہیں رہنے دیں گی۔ گڈ بائے!'' وہ غصے سے ریسیور پٹخ دیتا اور پھر اس کی یہ جھنجلاہٹ اگلے روز کے اخبارات کی نمایاں سرخیوں میں شامل ہوجاتی۔

صحافیوں کی اس معاندانہ مہم کے باوجود زار شاہی میں اس کا اثر رسوخ ختم نہیں ہو پایا تھا۔ وزیراعظم اور وزیر مالیات اس کی رضامندی سے منتخب ہوئے۔ مذہبی معاملات کے بعد سیاست میں بھی اسی کا سکہ چلنے لگا۔

☆☆☆

1914ء کے آغاز میں راسپوٹین شدید روحانی اور جسمانی بحران کا شکار ہوگیا۔ اس زمانے میں اسے اپنی قوتِ تسخیر سے محرومی کا خوف ستانے لگا۔ اب وہ بیمار بچوں کی شفایابی کے لیے طلب کیا جاتا تو وہ اکثر انکار کردیتا۔ اس کے دل ودماغ میں بہت سے خدشات پنپتے رہتے کہ اس کے دائمی کوچ کا وقت آگیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ خدا اب اسے اپنے پاس بلالے گا تاکہ وہ مستقبل میں گناہوں سے محفوظ رہ سکے۔

سوچ کی اس تبدیلی نے ضروریات بھی بدل دیں۔ دہشت کا احساس کسی دھند کی طرح ظاہر وباطن کو اپنی لپیٹ میں رکھتا۔ کسی نادیدہ شے کی آمد ہمہ وقت چوکنا رکھتی۔ وہ اس احساس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں ہلکان ہو کر یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتا کہ یہ نادیدگی محض واہمہ نہیں بلکہ ناگزیر اور اٹل ہے۔ کبھی ایسا بھی لگتا کہ کسی چیز کا سفر شروع ہوچکا ہے۔ وہ راستے میں ہی ہے۔ اس سفر کے اختتام کا تصور ہی اسے جھرجھری کر رکھ دیتا۔ کچھ عرصے بعد وہ شراب میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ روسی دہقان کی زندگی میں اس تلاطم کے ساتھ قومی زندگی بھی ایک بھونچال کی زد میں تھی۔ لوگ پیشگوئی کرنے لگے تھے کہ جنگ کسی بھی وقت چھڑ سکتی ہے۔ یورپ بھر پر ایک جنون طاری تھا۔ عوام نے ایک طویل عرصے سے کسی خونی جنگ کی

ہولناکی کا مظاہرہ نہیں دیکھا تھا۔ پورے براعظم کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھنے والی نپولین کی جنگیں بھی ایک صدی قدیم ہو چکی تھیں۔ اس دوران کچھ جنگیں ہوئی تو تھیں لیکن ان کی حیثیت علاقائی سطح سے زیادہ نہ تھی۔ بنی نوع انسان کو خون اور ہزاروں سوختہ لاشوں کی بدبو کی طلب بے چین کرنے لگی تھی۔ زارنکولس بھی کچھ عرصہ قبل ہی جرمنی سے لوٹا تھا۔ اسے واضح طور پر یہ محسوس ہوا تھا کہ جرمنی کا عسکریت پسند بادشاہ ''انکل ولی'' جنگ میں کود پڑنے سے گریز نہیں کرے گا۔ دوسری طرف فرانس کے لیے بھی ایک سنہری موقع تھا۔ اسے پروشیا کے ساتھ ہونے والے تنازعے میں اپنی شکست فاش کی ذلت نہیں بھولی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انتقام کی خواہش بھی پوری ہو جاتی۔

تیسری جانب بذات خود زارنکولس کے دل میں بھی قدیم بازنطینی دارالحکومت قسطنطنیہ کو ترکوں سے واپس لے کر وہاں آرتھوڈوکس صلیب نصب کروانے کی دیرینہ حسرت مچلنے لگی۔ بحیرۂ اسود پر قابض ہونے کی تمنا بھی شدید ہوتی جا رہی تھی۔ بادشاہت کی چوتھی صدی میں قدم رکھنے والے رومانوف خاندان کے لیے یہ فتح لازوال تحفہ ثابت ہوتی جس سے زارنکولس کا نام بھی امر ہو جاتا۔ وہ ایک ایسا روس تشکیل دینا چاہتا تھا جو کہ شکست خوردہ عثمانی سلطنت کے کھنڈرات پر آرتھوڈوکس دنیا کو متحد کر کے کسی غیر متزلزل مینار کی طرح بلند کر دیتا۔

نوجوان روسی بورژوازی اور پرانی اشرافیہ بھی پہلی مرتبہ ایک ہی نقطۂ نظر سے سوچتے ہوئے جنگ کے خواہشمند تھے۔ ان پُرسکون اور ہموار معاملات میں واحد غیر ہمواری الیکسس تھی۔ نکولس جانتا تھا کہ وہ جنگ سے اذیت ناک حد تک خوفزدہ رہتی ہے۔ اسے روس میں امن، سکون اور چین درکار تھا۔ جرمن نژاد ہونے کے باعث وہ چاہتے ہوئے بھی جرمنوں کے خلاف جنگ لڑنے کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ زار شاہی خاندان اور عوام اسے پل بھر میں محل بدر ہونے پر مجبور کر دیتے۔ ان حالات میں صرف فادر گریگوری ہی امید کی واحد کرن تھی۔ اس نے ماضیِ قریب میں روس کو ایک یقینی جنگ میں کودنے سے بچایا تھا۔ زارینہ شب و روز اس کی واپسی کے لیے دعائیں کرنے لگی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اسے نکولس نے ہی کچھ عرصہ قبل نقصِ امن کے خدشے اور عوامی طیش و غضب سے بچاؤ کے لیے ماسکو روانہ کیا تھا۔ اس زمانے میں زار کے مسائل جزوی طور پر حل ہونے لگے تھے۔ ملکی صورتِ حال کافی حوصلہ افزا تھی۔ عظیم الشان تین سو سالہ تقریبات نے نہ صرف خاندان کے شاہی وقار میں اضافہ کیا تھا بلکہ معیشت کو نیا عروج دینے کے بعد بادشاہت کو ایک نیا استحکام بھی دیا تھا۔ انقلابی صفحۂ ہستی سے نابود کر دیے گئے تھے۔ باقی ماندہ دوسرے ممالک میں قابل رحم زندگیاں بسر کر رہے تھے۔ متوقع جنگ میں فتح اور نئی تجارتی منڈیاں حاصل کرنے کی توقع میں بورژوازی نے بادشاہت کی حمایت پر کمر کس لی۔ انہیں صرف راسپوٹین سے خدشات لاحق تھے۔ اسے مستقبل کی اس فاتحانہ جنگ کے آغاز میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جا رہا تھا۔ گرینڈ ڈیوک نکولائی نکولائیوچ اسی خدشے کے تحت راسپوٹین کے خلاف نکولس کی ذہن سازی کرتا رہا۔

اس ساری صورتِ حال میں زارینہ کی ذہنی اذیت اور کشمکش کا کسی کو بھی مکمل اندازہ ہی نہ تھا۔ وہ زار کو کسی بھی طرح اس ماحول سے دور لے جا کر اس کی ذہنی طنابیں اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی تھی۔ اس کے لیے شوہر کو ''لیوڈیا'' لے جانا نہایت ضروری ہو چکا تھا۔ زار نے اس کی روانگی کو مؤخر کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن زارینہ کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ راسپوٹین اس وقت تک پیٹرزبرگ میں ہی موجود تھا۔ پے در پے قاتلانہ حملوں کی خبروں اور کوششوں نے اس کی توانائی میں تشویشناک حد تک کمی کر رکھی تھی۔ زندگی اور اردگرد کے مناظر سے اجنبیت کا احساس بھی گھیرے رکھتا۔ تنگ آ کر وہ پوکروسکوئی روانہ ہو گیا۔

آبائی قصبے میں قیام کے دوران بھی وہ اپنے خدشات سے ہی الجھا رہتا تھا۔ عقیدت مندوں سے ملاقات کے بعد چرچ آمد و رفت کے علاوہ معمولات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ کچھ روز بعد وہ چرچ سے گھر واپس آیا تو دروازے کے قریب ایک عورت نظر آئی۔ کسی عورت کی موجودگی اس کے لیے انوکھی ہرگز نہیں تھی۔ وہ عقیدت مندوں کے ہجوم کا عادی ہو چکا تھا۔ یہ بھی غالباً انہی میں سے ایک تھی۔ اس نے ایک مختصر بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ راسپوٹین کے دل میں اسے اندر لے جانے کی بھرپور خواہش پیدا ہوئی لیکن ذرا قریب آنے پر اس کی گلی سڑی ناک دیکھی تو طبیعت مکدر سی ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خاتون کو آتشک کی بیماری ہے۔

''خداوند کے نام پر مجھے کوئی خیرات دے دو۔'' اس نے فدویانہ انداز میں کہا۔ راسپوٹین بے خیالی میں اپنے لبادے سے پیسے نکالنے لگا۔ عورت کے جسم میں تناؤ پیدا ہو

گیا۔ اس نے سرعت سے بلاؤز کے ایک شگاف سے نیام میں موجود خنجر نکالا اور بھرپور وحشت سے راسپوٹین کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ حیرت وخوفزدہ راسپوٹین نے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور ایک جانب دوڑ لگادی۔

''کہاں بھاگ رہا ہے مردود؟ رک جا! ہمت ہے تو رک جا! آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ چلاتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔ اس بھاگ دوڑ نے راہ گیروں کو بھی اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ اس اثناء میں راسپوٹین کی نظر زمین پر گرے ایک ڈنڈے پر پڑی۔ اس نے جھک کر ڈنڈا اٹھایا اور نشانہ باندھ کر عورت کے سر پر دے مارا۔ وہ زمین پر جا گری۔

''مارو اس گستاخ کو! اس نے فادر گریگوری پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جان لے لو اس کی!'' مشتعل ہجوم سے ابھرتی آوازوں نے اسے خوفزدہ کردیا۔

''مجھے قتل مت کرو۔ میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے دفاعی انداز میں کہا۔ لوگوں نے اس کے ہاتھ باندھے اور ٹھوکریں مارتے ہوئے ریجنل آفس لے گئے۔

تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ اس عورت کا نام ''خیونیا گیوسیوا'' تھا۔ وہ زارتسین کی رہائشی اور پیشے کے اعتبار سے ٹوپیاں بناتی تھی۔ وہ راسپوٹین کو جھوٹا اور اینٹی کرائسٹ ہونے کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارنے آئی تھی۔ زارتسین سے تعلق پر راسپوٹین کے دل میں سب سے پہلے ایلیاڈور کا خیال آیا لیکن خیونیا تفتیش کے دوران بار بار کسی بھی ایلیاڈور سے لاتعلقی اور اپنے مقصد میں ناکامی پر ندامت کا اظہار کرتی رہی۔ اخبارات میں قیاس آرائیوں کا بازار گرم رہا۔ کچھ نے اسے ذاتی انتقام کا شاخسانہ قرار دیا' کچھ کسی دیرینہ سہیلی پر راسپوٹین کی دست درازی کا بدلہ قرار دیتے۔ راسپوٹین پر یہ حملہ شاہی خاندان اور عقیدت مندوں کے لیے بھی ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ اسے ٹیلی گرام بھیج کر احوال دریافت کرتے رہے۔ ان سب میں خستہ ترین حالت لوخینا کی تھی۔ جس وقت یہ خبر اس تک پہنچی وہ ایلیاڈور سے ملنے اس کے فارم میں موجود تھی۔ خبر ملتے ہی وہ مزید دیوانگی میں مبتلا ہوگئی اور چلاتی ہوئی گھر سے باہر نکل آئی۔

''قیامت برپا ہوچکی ہے۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے معافی مانگ لو..... معافی مانگ لو.....''

ایلیاڈور کے عقیدت مند اسے کسی طرح سمجھا بجھا کر واپس لے گئے۔ لوخینا کی زبان فراٹے بھرتی ہوئی خیونیا کو بد دعائیں دے رہی تھی۔ اس معاملے کو مزید خرابی سے بچانے کے لیے خیونیا کو ''تومسک اسپتال برائے ذہنی معذور'' منتقل کردیا گیا۔ راسپوٹین کے خلاف نفرت کی کسی بھی نئی لہر اٹھنے اور رسوا کن مقدمے سے گریز کا اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ خیونیا چلا چلا کر کہتی رہی۔

''مجھے پاگل کیوں قرار دیا جارہا ہے؟ میرا دماغ بالکل درست ہے۔ میری یادداشت میں بھی کوئی خلل نہیں۔ میں نے اپنے مکمل ہوش وحواس میں خنجر گھونپا تھا۔ میں اسے قتل کرنا چاہتی تھی۔ دوبارہ موقع ملا تو یہی عمل دہراؤں گی۔ اس ملعون کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

مزید تفتیش پر سامنے آنے والے انکشافات ہوش ربا تھے۔ ایلیاڈور نے راسپوٹین کی غلطیوں کو معاف نہیں کیا تھا۔ اس نے ''نوویلی'' میں اپنے چار سو عقیدت مندوں کو دریا کے کنارے اکٹھا کرکے تین انتہائی حسین وجمیل دوشیزائیں منتخب کرکے راسپوٹین کے پاس بھیجنے اور اسے کیفر کردار تک پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ اسی موقع پر وہاں موجود خیونیا نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کردیں۔ اس کا مؤقف تھا کہ ان نوجوان لڑکیوں کے سامنے بھرپور اور مکمل زندگی موجود ہے۔ اس کے برعکس خیونیا جیسی اجڑی ہوئی بدصورت عورت کے پاس کوئی مقصدِ حیات ہی نہیں۔ اس لیے راسپوٹین کے قتل کا ذمہ تن تنہا لے لیا۔

راسپوٹین کے کرم فرما یہ تمام خبریں اسے پہنچاتے رہے۔ مزید خواتین کے اقدام قتل میں ملوث ہونے کا خیال ہی لرزہ خیز تھا۔ راسپوٹین کسی ہولناک دلدل میں پھنس چکا تھا جس سے باہر نکلنے کی کوشش اسے مزید الجھا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر خود کو شراب نوشی میں غرق کرلیا۔ اسے شراب کے لیے کثیر رقم کی ضرورت پیش آنے لگی تو مجبوراً اس نے سیکریٹری لیپٹسکایا کو عقیدت مندوں سے رقوم اینٹھنے کی اجازت دے دی۔ اس معاشی تنگی اور ذہنی کشمکش میں اسے زارینہ کے التجائیہ ٹیلی گرام کوفت اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیتے۔ فادر گریگوری راسپوٹین کے اعصاب ایک ایسے وقت میں انتشار کا شکار ہونے لگے تھے جب زار شاہی کو ان کے ''دوست'' کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

(جاری ہے)

ماخذات:

راسپوٹین.....از ایڈورڈز نسکی

راسپوٹین..از شاہد مختار

UUNOVELS.COM

''یہ قصہ میں نے تو اس طرح سے نہیں سنا۔'' فلپ کی آواز عام بول چال کے مقابلے میں کافی بلند تھی۔
بار کے اسٹول پر بیٹھے ایک کلب ممبر نے گردن اچکا کر اس اونچی آواز کے ماخذ کو دیکھا۔ دو دوستوں کی کوئی بحث تھی اس لیے اس نے کوئی خاص توجہ دینا ضروری نہ سمجھا اور مسکرا کر اپنے ساتھ آئے کھلاڑی کے ساتھ بات چیت میں مگن ہوگیا۔
حسبِ معمول..... ہیسل میئر گالف کلب میں ہفتے کی صبح

ہتک عزت

مظہر سلیم ہاشمی

اصول اور وصول پر مضبوطی سے عمل پیرا مثالی ممالک بھی جب بے اصولی اور وصولی کے گرداب میں پھنس جائیں تو دیگر ترقی پذیر ممالک کا حال کس قدر بدحال ہوگا اس کا اندازہ سطر سطر تحریر پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں انکم ٹیکس بچانے کا کتنا بے داغ منصوبہ بنایا جارہا تھا مگر... اچانک کسی کی گہری نظروں نے جانے کتنے داغ تلاش کرلیے۔

دوستوں کے درمیان ہرجانے اور جرمانے کی عجیب روداد

UUNOVELS.COM

معمول سے زیادہ رش تھا۔ کھلاڑیوں اور کلب ممبرز کی آمد سے ایسا لگتا تھا کہ ظہرانے سے قبل ہی اس کے وسیع و عریض ہال میں بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ بھی باقی نہیں رہے گی۔

کلب کے دو رکن کافی دیر سے ڈائننگ ہال میں تھے اور ان کا مشروبات کا دوسرا دور چل رہا تھا۔ وہ شیشے کی دیوار کے سامنے بیٹھے تھے جہاں سے باہر کا میدان بخوبی دیکھا جا سکتا تھا..... وہاں اب بھی گالف کھیلا جا رہا تھا۔ فلپ ماسٹرز اور مائیکل گلمور نے اپنا ہفتے کی صبح کھیلے جانے والا گالف کا سیشن معمول سے کہیں جلد مکمل کر لیا تھا اور اب بیٹھ کر گفت و شنید میں مصروف تھے۔

''پھر تم نے کیا سنا ہے؟'' مائیکل گلمور نے قدرے آہستہ آواز میں پوچھا لیکن وہ اتنی نیچی نہیں تھی کہ اردگرد والوں کے کانوں تک نہ پہنچ پاتی۔

''میں نے سنا ہے کہ تمہیں اس معاملے میں مکمل طور پر بے قصور قرار نہیں دیا گیا تھا۔''

''میرا کوئی لینا دینا نہیں تھا.....'' مائیکل نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔'' فلپ نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ بات مت بھولو کہ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں نے بھی خود تمہیں اپنے ہاں کام پر رکھا تھا..... اور میں یہ بات تب ہی اچھی طرح جان گیا تھا کہ جو تم منہ پر کہہ دیتے ہو ضروری نہیں اس پر عمل بھی کرو۔''

''میں کسی کو بے وقوف نہیں بنا رہا تھا.....'' مائیکل پٹاخ سے بولا۔ ''یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے کہ میری جاب ختم ہو گئی ہے..... میں نے کبھی اس بات سے انکار بھی نہیں کیا۔''

''بالکل صحیح کہہ رہے ہو..... ساری دنیا جانتی ہے کہ تمہاری نوکری ختم ہو گئی ہے..... لیکن کیا سب یہ بھی جانتے ہیں کہ 'کیسے' ختم ہوئی؟'' فلپ نے لفظ کیسے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی تو بتاؤ کہ تمہیں اس کے بعد اب کوئی نئی نوکری کیوں نہیں مل پا رہی؟''

''یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔'' مائیکل نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''نوکریاں کوئی درختوں پر تو نہیں لگتیں کہ مجھے ایک کے بعد دوسری فوراً مل جائے۔ ویسے بھی اس میں میری تو کوئی غلطی نہیں کہ تم ترقی کرتے ہوئے کروڑ پتی بن گئے ہو۔''

''اور تمہارے پاس اگر پھوٹی کوڑی نہیں بچتی تو میرا بھی قصور نہیں ہے۔ تم ہمیشہ ہی بے روزگار پھرتے ہو..... ویسے یہ بات بھی سچ ہے کہ پچھلے مالکان اگر اچھا حوالہ دیں تو بندے کو بہ آسانی اگلی نوکری مل جاتی ہے۔'' فلپ نے کہا۔

''اب اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' مائیکل نے ماتھے پر تیوری چڑھاتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا۔

کلب کے بیشتر ممبران اپنی بات چیت بھول کر ان دونوں کی بحث کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تمہیں کام کے حصول کا حوالہ کوئی اس لیے بھی نہیں دیتا کیونکہ وہ تمہاری عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف ہیں..... اور یہ بات سبھی لوگ جانتے ہیں کہ تم کام کے دوران کیسی حرکتیں کرتے ہو۔'' فلپ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

یہ بات سب لوگ نہیں جانتے تھے اس لیے ہال میں بیٹھے بیشتر لوگ کان لگا کر ان کی باتیں سننے میں مشغول ہو چکے تھے۔

''وہاں میرے کرنے کا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا اس لیے مالکان نے مجھے الوداع کہہ دیا۔'' مائیکل نے اصرار کیا۔

''تمہارے معاملے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'الوداع' کا مطلب 'نکالا جانا' تھا..... اس وقت تو کسی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا کہ تمہیں نکالا نہیں جا رہا بلکہ الوداع کیا جا رہا ہے۔'' فلپ طنزیہ انداز میں بولا۔

''کمپنی کو وہ مناسب منافع حاصل نہیں ہوا تھا جس کی وہ توقع کر رہے تھے..... چنانچہ کچھ لوگوں کو انہوں نے الوداع کہنا ہی مناسب سمجھا۔'' مائیکل نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''مناسب منافع؟'' فلپ کے حلق سے ایک استہزائیہ قہقہہ نکلا۔ ''ان کو منافع کے بجائے نقصان ہوا تھا۔''

''صرف اس وجہ سے کیونکہ ہم اپنے کچھ اہم اکاؤنٹ ہم عصر کمپنیوں سے مقابلے میں کھو بیٹھے تھے۔'' مائیکل نے وجہ بیان کی۔

''وہ ہم عصر کمپنیاں جنہوں نے تمہاری کمپنی میں ہی کسی کو تھوڑا سا مال لگا کر اندر کی خبریں ہتھیالی تھیں؟'' فلپ نے کہا۔

صورتِ حال کچھ یہ ہو چکی تھی کہ کلب ہال میں بیٹھے بیشتر لوگ اب ان دونوں کی گفتگو ہی سن رہے تھے۔ کئی تو اپنی نشستوں پر ٹیڑھے میڑھے ہو کر بھی ان کی بات چیت کا ایک ایک لفظ سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھے۔ سب کی توجہ کا مرکز اب شیشے والی بڑی کھڑکی کے سامنے بیٹھے دو دوستوں کی گفت و شنید تھی۔

UUNOVELS.COM

''اکاؤنٹ چھن جانے کی تمام وجوہات تمام اسٹاک ہولڈرز کو سالانہ میٹنگ کے دوران وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی تھیں۔'' مائیکل تیزی سے بولا۔

''لیکن کیا ان اسٹاک ہولڈرز کو کسی نے یہ بھی وضاحت دی کہ ایک تازہ تازہ نوکری سے فارغ کیے گئے شخص نے کس طرح نوکری سے نکلنے کے بعد چند دنوں میں ہی ایک نئی کار خرید لی؟'' فلپ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر یوں گویا ہوا۔'' اور یہ دوسری کار تھی..... ایک پہلے سے موجود تھی۔''

مائیکل اس بات پر چند لمحے کے لیے بالکل ہی خاموش ہو کر رہ گیا۔ فلپ اس دوران سیب کے جوس کو گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔

''وہ کوئی نئی کار نہیں تھی۔'' مائیکل کا انداز مدافعانہ تھا۔'' سیکنڈ ہینڈ چھوٹی سی گاڑی تھی..... میں نے کمپنی کی گاڑی واپس کرنے پر حاصل ہونے والے سیکیورٹی فنڈ سے خریدی تھی۔ اور یہ بات تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کیرول بے چاری بھی بینک میں جاب کر رہی ہے..... اسے اپنی گاڑی درکار تھی۔''

''میں تو ویسے واقعی 'بیچاری کیرول' کے بارے میں پریشان ہوتا ہوں..... پتا نہیں تم جیسے شخص کے ساتھ اس نے کس طرح اتنا عرصہ گزار لیا۔'' فلپ نے ناگواری سے کہا۔

''میرے جیسا شخص..... گزارہ؟ آخر ان سب باتوں کی وجہ کیا ہے؟'' مائیکل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''وجہ تو کوئی بھی نہیں.....'' فلپ نے جواب دیا۔

''میں تو بس یہی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک شعلہ جوالا حسینہ..... جس کا میں نام نہیں لوں گا.....'' کان لگا کر سننے والوں کو فلپ کی اس بات پر بڑی مایوسی ہوئی۔

''..... کو دھتکارا گیا تھا کیونکہ وہ ماں بننے والی تھی۔''

بارٹینڈر کوئی سات منٹ سے فارغ تھا کیونکہ کوئی بھی اس سے مزید مشروب کا طالب نہ تھا۔ گالف کلب کے کچھ ارکان جو ابھی تک ان دونوں کی گفتگو سے خود کو لاتعلق ظاہر کر رہے تھے، وہ بھی اب ان کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ کچھ تو سننے کے بجائے آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے بے اعتباری سے انہیں دیکھے چلے جا رہے تھے۔

''لیکن میں تو اس عورت کو صحیح سے جانتا تک نہیں.....'' مائیکل نے احتجاج کیا۔

''جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے..... میں نے یہ قصہ اس طرح سے بالکل بھی نہیں سنا جیسے تم بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' فلپ نے رسان سے کہا۔'' میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ بچے کی شکل.....''

''تم حد سے گزر رہے ہو.....'' مائیکل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یعنی کہ تم کچھ بھی نہیں چھپا رہے؟'' فلپ نے پوچھا۔

''میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں جو میں چھپاؤں.....''

''وہ سنہرے بال بھی نہیں جو کیرول کو تمہاری گاڑی کی عقبی نشست سے ملے تھے؟ سنا ہے وہ سنہرے بالوں والی لڑکی تمہارے آفس کی ہی ساتھی رہی تھی؟'' فلپ نے سخت سوال داغ دیے۔

''ہاں..... لیکن وہ بال تو ایک گولڈن ریٹریور نسل کے کتے کے تھے۔'' مائیکل نے کہا۔

''تمہارے پاس تو ایسا کوئی کتا نہیں ہے۔'' فلپ بولا۔

''ہاں، میرے پاس نہیں ہے لیکن وہ کتا گاڑی کے سابقہ مالک کا تھا۔'' مائیکل بولا۔

''وہ کوئی کتا نہیں تھا بلکہ گھر برباد کرنے والی کتیا تھی.....'' فلپ نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔'' میں تو کیرول پر حیران ہوں جو کہ ایسے صدیوں پرانے بہانے کو سچ مان بیٹھی۔''

''اس نے میری بات پر یقین اس لیے کیا کیونکہ یہی حقیقت تھی۔'' مائیکل نے کہا۔

''حقیقت..... ایسے الفاظ سے تو تمہارا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' فلپ یکلخت ہی پھٹ پڑا۔'' تمہیں کام سے اس لیے نکالا گیا تھا کیونکہ تم اتنے زیادہ ٹھرکی ہو کہ تیس سے کم عمر ہر عورت پر لائن مارنا اپنا فرض عین سمجھتے ہو۔ وہاں پر تم اپنی حرکات سے باز نہیں آئے تھے۔ میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کیونکہ تمہیں اپنی کمپنی سے میں نے بھی انہی وجوہات کی بنا پر نکالا تھا۔''

مائیکل کی برداشت جواب دے گئی اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بند مٹھی کا گھونسا بنا کر فلپ کے منہ پر مارنے کا پورا ارادہ کر ہی لیا تھا کہ کلب کے صدر، ریٹائرڈ کرنل مارتھر اس کے پاس پہنچ گئے۔

''صبح بخیر جناب.....'' فلپ نے نرمی سے کہا اور تعظیماً کھڑا ہو گیا۔

''صبح بخیر مسٹر فلپ۔'' کرنل غصے سے غرایا۔'' کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کی چھوٹی سی غلط فہمی حد سے تجاوز کر گئی ہے؟''

''چھوٹی سی غلط فہمی؟'' مائیکل چلایا۔'' آپ نے سنا

نہیں کہ یہ میرے بارے میں کیا بکواس کر رہا تھا؟''

''بدقسمتی سے ایک ایک لفظ سنا ہے..... باقی کلب ممبرز کی طرح۔'' کرنل نے کہا اور پھر فلپ سے مخاطب ہوا۔ ''میرے خیال سے آپ دونوں کو ان باتوں کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے کو معاف کر دینا چاہیے اور ہاتھ ملا کر اس واقعے پر مٹی ڈال کر گھر چلے جانا چاہیے۔''

''اس دوغلے شخص کے ساتھ ہاتھ ملاؤں جو ہر ایک کو دھوکا دیتا ہے؟'' فلپ نے اکڑ کر کہا۔ ''میں آپ کو بتا رہا ہوں کرنل، یہ شخص اس طرح شریفوں کے گالف کلب میں رہنے کا اہل ہی نہیں ہے..... اس کی ممبر شپ منسوخ کر کے اسے باہر کا رستہ دکھائیں کیونکہ آپ نے اس کے اصل کرتوت تو ابھی سنے ہی نہیں ہیں۔''

اس سے قبل کہ کرنل ان دونوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مزید کوئی بات کرتا، مائیکل اچھل کر فلپ پر پل پڑا۔ تین جوان مرد بھرپور کوشش کے بعد انہیں علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو پائے۔ کرنل نے فوراً ہی دونوں کو کلب کی حدود سے نکل جانے کا فرمان جاری کر دیا۔ ساتھ میں یہ وارننگ بھی جاری کر دی کہ ان کے اس بے ہودہ رویے کو ہاؤس کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا..... تب تک دونوں خود کو ممبر شپ سے معطل سمجھیں۔

کلب سیکریٹری، جیری ہاورڈ نے دونوں کو باہر کا راستہ دکھایا۔ اس نے فلپ ماسٹرز کو اپنی رولز رائس کار میں روانہ ہوتے دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔ اس کی بڑی گاڑی گیٹ کو پار کر چکی تھی لیکن مائیکل کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیری کو کئی منٹ تک ہال کے دروازے پر انتظار کرنا پڑا تب کہیں جا کر مائیکل اپنی سیکنڈ ہینڈ گاڑی پارکنگ سے نکال کر اس کے سامنے سے گزرا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ڈرائیونگ کے دوران ہی کچھ لکھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ جب وہ کلب کے گیٹ سے باہر نکلا تبھی جیری پلٹا اور واپس کلب کے ڈائننگ ہال کی جانب بڑھ گیا۔ کلب سے باہر نکلنے کے بعد وہ چاہے ایک دوسرے کا سر پھاڑتے یا قتل کرتے..... یہ اس کا دردِ سر نہیں تھا۔

جب جیری واپس کلب ہاؤس کی عمارت میں داخل ہوا تو کوئی بھی آنے والے گالف ٹورنامنٹ کے فاتح یا اسپانسر کے حوالے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ ابھی تک لوگوں کی گفتگو کا رخ تازہ ہونے والے واقعے پر ہی مرکوز تھا۔

''جب میں صبح کھیل کے دوران ان کے پاس سے گزرا تھا تو وہ دونوں ہی بڑے خوشگوار انداز میں خوش گپیوں میں مشغول تھے۔'' کرنل نے پُرتاسف لہجے میں کہا جس میں حیرت کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔

کرنل نے اعتراف کیا کہ وہ ان دونوں کے جھگڑے پر شدید حیرت زدہ ہے۔ وہ ان دونوں کو پچھلے پندرہ برس سے جانتا تھا جب وہ پہلی بار ممبر بنے تھے۔ وہ بدمزاج اور برے لوگ نہیں تھے لیکن نجانے آج انہیں کیا ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی عزت یوں اچھالنے لگے تھے۔ کرنل ان دونوں کو پسند کرتا تھا اس لیے یہ سب حالات اس کے لیے باعثِ تکلیف تھے۔ وہ دونوں ہر ہفتے کی صبح گالف کھیلنے آتے تھے۔ کئی برسوں سے یہ ان کا معمول تھا لیکن آج تک انہیں کسی نے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔

''افسوس.....'' کرنل نے کہا۔ ''میں تو سوچ رہا تھا کہ آج فلپ ماسٹرز سے کہوں گا کہ اس سال کے گالف ٹورنامنٹ کو وہی اسپانسر کرے لیکن اب.....''

''آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کرنل کہ اب یہ آپ کے لیے ممکن ہوگا۔'' جیری نے کہا۔ ''فلپ ماسٹرز پہلے ہی ٹیڑھی کھیر رہا ہے، اس سے پیسے نکلوانا آسان کام نہیں تھا اور اب اس واقعے کے بعد تو وہ مزید خودسر ہو جائے گا۔''

''مجھے تو یہی سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ دونوں ایسی باتیں کرتے ہوئے سوچ کیوں نہیں رہے تھے کہ وہ گھر پر نہیں کلب میں بیٹھے ہیں۔'' کرنل نے کہا۔

''کیا اس کی وجہ یہی نہیں کہ فلپ ایک کامیاب زندگی گزار رہا ہے جبکہ مائیکل اب بھی بُرے حالات کا رونا روتا رہتا ہے اور کوئی بھی جاب زیادہ عرصے تک نہیں سنبھال پاتا؟'' جیری نے سوال کیا۔

''نہیں..... ضرور کوئی اور وجہ رہی ہوگی۔'' کرنل نے جواب دیا۔ ''اتنے عرصے کی دوستی ایسے لمحوں میں نہیں ختم ہو جاتی..... آج صبح یہ جو ڈراما ہوا ہے اس کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہے۔''

کلب میں موجود سبھی ارکان اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ فلپ ماسٹرز نے کین سلز مین کی جاب چھوڑ کر اپنا بزنس شروع کیا تھا اور شدید محنت کے بعد ہی کامیابی نے اس کے قدم چومے تھے۔ ''ریڈی فٹ کچن'' کے نام سے اس نے اپنے کام کا آغاز گھر کے صحن سے کیا تھا اور اب وہ شہر کے دوسری جانب واقع ایک فیکٹری کا مالک تھا جہاں تقریباً تین سو..... لوگوں کو روزگار مہیا ہوتا تھا۔

جب فلپ نے اپنی کمپنی ''ریڈی فٹ کچن'' کو پبلک کیا تھا تو پریس والوں نے اندازہ لگایا تھا کہ اکیلے فلپ کے

UUNOVELS.COM

اس میں شیئرز چار ملین پاؤنڈز سے زیادہ ہوں گے۔ جب پانچ سال بعد جان لوئس جیسی کمپنی کے ساتھ پارٹنر شپ کا معاہدہ ہوا تو یہ بات سب کے علم میں آ گئی کہ پہلے پہل فلپ نے معاہدے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے سترہ ملین پاؤنڈز کے ساتھ ساتھ پانچ سال کا سروس کانٹریکٹ پیش کیا گیا تھا جو کہ کسی پاپ اسٹار کو بھی خوش کرنے کے لیے کافی ہوتا لیکن فلپ نے اسے ٹھوکر ماردی اور اپنی شرائط پر معاہدہ کیا۔

اس نے اپنی اس بے تحاشا آمدنی سے ہیسل میئر میں ساٹھ ایکڑ پر مشتمل ایک شاندار جارجین ہاؤس خریدا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے بیڈروم کی کھڑکی سے گالف کورس کو دیکھ سکتا تھا۔ فلپ کی شادی کو بھی بیس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی سیلی، بچوں کی ایک تنظیم کی مقامی شاخ میں چیئر پرسن تھی۔ ان کا بیٹا حال ہی میں آکسفورڈ میں داخلے کے لیے منتخب ہوا تھا۔ مائیکل اس لڑکے کا 'گاڈ فادر' تھا۔

مائیکل گلمور کی کہانی اس کے مقابلے میں بالکل ہی الٹ تھی۔ اسکول میں فلپ اس کا بہترین دوست تھا..... اسکول چھوڑنے کے بعد مائیکل ایک کے بعد ایک جاب بدلتا رہا تھا، کبھی ادھر اور کبھی ادھر..... اس کے پاؤں ایک جگہ پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ اس نے پہلے ایک فیکٹری میں ٹرینی کی جاب کی لیکن چند ماہ میں ہی اسے چھوڑ کر وہ ایک پبلشنگ کمپنی کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ اس نے بھی فلپ کی طرح اپنی جوانی کی چاہت، کیرول ویسٹ نامی لڑکی سے شادی کی جو کہ ایک ڈاکٹر کی بیٹی تھی۔

جب ان کی اپنی بیٹی پیدا ہوئی تو کیرول نے شکایت کی کہ وہ گھر سے بہت زیادہ وقت باہر گزارتا ہے۔ اس نے پبلشنگ کا کام چھوڑا اور ایک مقامی مشروب کی کمپنی میں ڈسٹری بیوشن منیجر کے طور پر کام سنبھال لیا۔ دو سال بعد جب اس کے ماتحت کی اس کی جگہ ترقی ہوئی تو اس نے غصے میں آ کر نوکری سے استعفا دے دیا۔ کچھ عرصہ بغیر جاب کے گزارنے کے بعد اس نے ایک غلہ پیک کرنے والی کمپنی میں نوکری کر لی..... پر جلد ہی معلوم ہوا کہ اسے مکئی سے الرجی ہے۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ کی مدد سے اس نے جب یہ بات ثابت کر دی تو اسے زندگی میں پہلی بار بے روزگاری الاؤنس بھی ملنے لگا۔ فلپ کی کمپنی ''ریڈی فٹ کچن'' میں اس نے ایک ماہ جاب کر کے اچانک ہی بغیر کوئی وجہ بتائے نوکری چھوڑ دی کیونکہ اس وقت فلپ پارٹنر شپ پر آ گیا تھا۔

کافی عرصہ بے روزگار رہنے کے بعد اس نے ایک اڈون بیچنے والی کمپنی میں سیلز منیجر کی نوکری کر لی۔ ایسا لگتا تھا کہ کمپنی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے خوش ہیں لیکن اچانک ہی کمپنی نے بغیر وارننگ کے اسے نکال دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس سال کمپنی کا منافع آدھا رہ گیا تھا اور انہیں مائیکل کو 'الوداع' کہنے کا بڑا ہی افسوس ہوا تھا..... کم از کم کمپنی کے نیوز لیٹر میں مالکان نے یہ ضرور کہا تھا۔

کیرول اس بار اس کے نوکری سے نکالے جانے پر جھنجلا کر ہی رہ گئی تھی۔ چوتھی بار ایسا ہوا تھا اور وہ اس بار اپنی مایوسی کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکی۔ اب ان کی بیٹی کو ایک اچھے کالج میں داخلہ ملا تھا اور وہ زائد آمدنی سے اس کی فیس وغیرہ بہ آسانی ادا کر سکتے تھے لیکن صورتِ حال اچانک ہی خراب ہو گئی تھی۔

فلپ ان کی لڑکی کا 'گاڈ فادر' تھا۔

☆☆☆

''اب تم اس معاملے کو کیسے حل کرو گے؟'' کیرول نے پریشانی سے پوچھا جب مائیکل نے اسے بتایا کہ کلب میں کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

''اس کو صرف ایک ہی طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنی عزت پر اس طرح حرف اٹھانے والے کو سبق سکھانا ہی ہوگا۔ میں اس ذلیل شخص پر ہتکِ عزت کا دعویٰ کروں گا۔''

''اپنے اتنے پرانے دوست کے بارے میں ایسے تو بات مت کرو..... ویسے بھی ہمارے پاس پیسے ہی کہاں ہیں کہ اس طرح کی مقدمے بازی میں جھونک سکیں۔'' کیرول نے کہا۔ ''وہ کروڑ پتی ہے اور ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

''لیکن یہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔'' مائیکل نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس پر مقدمہ ضرور کروں گا، چاہے مجھے اس کے لیے اپنا سب کچھ ہی کیوں نہ داؤ پر لگانا پڑے۔''

''اور اس دوران مجھے اور ریٹا کو جو بھگتنا پڑے گا..... کیا وہ سب تمہارے لیے قابلِ قبول ہوگا؟'' کیرول نے اپنی بیٹی کا نام لے کر اس سے مقدمہ کرنے کے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم میں سے کسی کو بھی نہیں بھگتنا پڑے گا..... جب وہ کمینہ شخص ہتکِ عزت کے بدلے میں ہرجانہ بھرے گا تو ہمارے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔'' مائیکل نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''لیکن.....'' کیرول کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

UUNOVELS.COM

''لیکن کیا؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''لیکن ہم مقدمہ ہار بھی تو سکتے ہیں۔'' کیرول کے لہجے میں تشویش در آئی تھی۔ ''کچھ ملنے کے بجائے یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم اپنا سب کچھ ہی اس معاملے میں خرچ کر کے لٹا بیٹھیں۔''

''یہ تو ناممکنات میں سے ہے.....'' مائیکل نے تیقن سے کہا۔ ''اس بے وقوف سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے کہ اس نے یہ سب باتیں عینی شاہدین کی موجودگی میں کی ہیں۔ اس وقت کم از کم بھی کلب ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں پچاس سے زائد لوگ موجود تھے۔ کلب کا صدر اور ایک مقامی اخبار کا ایڈیٹر بھی ان لوگوں میں شامل ہیں۔ اب ایسا تو ناممکن ہے کہ کسی نے اس ساری بات چیت کا ایک لفظ بھی نہ سنا ہو۔''

کیرول کے نزدیک اب بھی یہ ساری باتیں غیر اطمینان بخش تھیں۔ وہ مائیکل کی باتوں سے بالکل بھی قائل نہ ہوئی تھی۔ اسے کسی قدر تسلی تب ہوئی جب مائیکل نے اگلے چند روز تک فلپ کا نام بھی لینا گوارا نہ کیا۔ وہ بس دعا کر رہی تھی کہ اس کا شوہر عقل سے کام لے اور اپنے حواسوں میں لوٹ آئے۔ یہ سارا معاملہ بھول جانا ہی بہتری ہوتی۔

پھر ایسا ہوا کہ 'ہیسل میئر کرونیکل' نامی مقامی اخبار نے مائیکل اور فلپ کے اس دن کے جھگڑے کی رپورٹ شائع کر دی۔

''یار بنے آزار: گالف کلب میں ہوئی ہاتھا پائی'' جلی الفاظ میں موجود اس شہ سرخی کے نیچے ہفتے کے دن کلب میں ہونے والی لڑائی کا احوال بیان کیا گیا تھا۔ الفاظ کے چناؤ میں بہت احتیاط برتی گئی تھی۔ 'ہیسل میئر کرونیکل' کا ایڈیٹر بخوبی جانتا تھا کہ وہ ساری بات چیت ناقابل اشاعت کے زمرے میں آتی تھی۔ اگر وہ من و عن شائع کرتا تو خود بھی ہتکِ عزت کے دعوے کا شکار ہو سکتا تھا۔ اس نے نہایت چالاکی سے ساری باتیں بیان بھی کر دیں اور خود کو بھی محفوظ رکھا۔ اب ساری عوام ان باتوں کو پڑھ کر چٹخارے لے سکتی تھی لیکن اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

''بس یہ آخری پتھر تھا جو میں نے اپنے وجود پر برداشت کیا ہے۔'' مائیکل نے تیسری بار خبر پڑھنے کے بعد اخبار کو ایک جانب پٹختے ہوئے کہا۔

کیرول کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ وہ کچھ بھی نہ بولی کیونکہ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اب چاہے وہ کچھ بھی کر لے لیکن اس کا شوہر اپنے ارادے میں ٹس سے مس نہیں ہونے والا۔

اگلے پیر کو مائیکل نے ایک مقامی وکیل ریجنالڈ لومیکس سے رابطہ کیا جو کہ اسکول میں اس کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ ظاہری بات تھی کہ وہ فلپ کا بھی ساتھی رہا تھا۔ مائیکل نے اخبار لومیکس کے سامنے رکھا اور اسے وہ تفصیل بھی بتائی جو اخبار والوں نے شائع نہیں کی تھی۔ وہ کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ سو اس نے لومیکس کو اس دن ہونے والے واقعے کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ایک چار صفحات کا پلندا بھی تھما دیا تاکہ اس کے کیے گئے دعوے کو تقویت مل سکے۔

لومیکس نے احتیاط کے ساتھ وہ سارے صفحات پڑھے۔

''یہ سب تم نے کب لکھا؟'' وہ سب پڑھنے کے بعد سر اٹھاتے ہوئے حیرت سے بولا۔

''اپنی کار میں بیٹھ کر..... جب ہمیں کلب ہاؤس سے نکال دیا گیا تھا، اس کے فوراً بعد۔'' مائیکل نے جواب دیا۔

''یہ تو تمہاری غیر معمولی پیش بندی کہلائی جا سکتی ہے۔'' لومیکس تعریفی انداز میں گویا ہوا۔ ''انتہا درجے کی ذہانت اور پیش بندی.....''

وہ چند لمحے تک مائیکل کو اپنے چشمے کے اوپر سے دیکھتا رہا۔ جب مائیکل نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ خود ہی بول پڑا۔

''دعویٰ کرنے سے قبل تمہیں اس بات کا بھی اندازہ ہو گا کہ اس قسم کے معاملات میں اچھا خاصا پیسا خرچ ہوتا ہے؟'' لومیکس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہتکِ عزت کے بدلے میں جتنی بڑی رقم کا دعویٰ کرو گے خرچہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا..... اور اتنے مضبوط ثبوت فراہم کرنے کے باوجود.....'' اس نے مائیکل کے لکھے صفحات کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم مقدمہ ہار بھی سکتے ہو۔''

''اوہ.....'' مائیکل کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

''ہتکِ عزت کے دعوے میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ عینی شاہدین نے کیا یاد رکھا.....؟ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ عینی شاہدین ایسے موقع پر کیا یاد رکھنے کا اعتراف کرتے ہیں۔'' لومیکس نے تفصیل سے وضاحت کی۔

''مجھے ان سب باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہے.....'' مائیکل بولا۔ ''لیکن میں پھر بھی پکا ارادہ رکھتا ہوں کہ یہ دعویٰ ضرور کروں گا۔ وہاں کلب میں پچاس سے زیادہ لوگ ہماری بات چیت سن رہے تھے..... کوئی تو سچ بولے گا۔''

''تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔'' لومیکس نے کہا۔ ''ایسی صورت میں تمہیں مجھے پانچ ہزار پاؤنڈز دینے ... ہوں

گے تا کہ میں کیس کی پیروی کر سکوں اور ابتدائی عدالتی نوٹس وغیرہ بھیجنے کے اخراجات بھی پورے ہو سکیں۔"

یہ سن کر پہلی بار مائیکل ہچکچاہٹ کا شکار نظر آیا۔

"یہ قابل واپسی ہوں گے..... اگر تم کیس جیت جاتے ہو تو۔" لومیکس نے اسے شش و پنج کی کیفیت میں دیکھا تو تیزی سے بولا..... مبادا وہ اپنا ارادہ بدل ہی نہ دے اور فلپ پر مقدمہ درج نہ کروائے۔

مائیکل نے یہ سن کر اپنی چیک بک نکالی اور رقم بھرنے لگا..... اس چیک کے کیش ہونے کے بعد اس کی سالانہ بچت میں چند پاؤنڈ ہی باقی رہ جاتے۔ وہ ایسے معاملے میں اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی جھونک رہا تھا جہاں کامیابی کے امکانات سو فیصد نہیں تھے۔

لومیکس نے اپنی وکلاء فرم کے تحت اگلے دن ہی فلپ ماسٹرز کے خلاف رٹ دائر کر دی اور عدالت کے ذریعے قانونی نوٹس بھجوا دیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد ہی اس کی بلڈنگ میں موجود ایک دوسری وکلاء فرم نے ان کا نوٹس قبول کر لیا۔ اب جو بھی ہونا تھا قانونی طور پر ہی ہونا تھا۔

☆☆☆

گالف کلب ہاؤس کے بار اور ڈائننگ ہال میں مائیکل بمقابلہ فلپ سب کا ہی پسندیدہ موضوعِ بحث بن چکا تھا۔ کوئی ممبر ایسا نہیں تھا جو وہاں آتا ہو اور اس بارے میں اپنے خیالات پیش نہ کرتا ہو۔

اکثر کلب ممبر تو سرگوشیوں میں یہ بھی طے کرتے پائے گئے تھے کہ اگر انہیں مقدمے میں گواہی کے لیے بلایا گیا تو کیا بیان دیں گے۔ کچھ تو باقاعدہ اپنی گواہی کے ڈائیلاگ کی ریہرسل کرتے بھی نظر آتے تھے۔ ان میں سے کئی لوگوں کو تو لومیکس کی لاء فرم کی جانب سے درخواستیں بھی موصول ہو چکی تھیں کہ وہ آ کر اس دن کے واقعے کا آنکھوں دیکھا احوال قلم بند کروائیں۔

غیر جانبدار رہنے کے چکر میں کچھ لوگوں نے تو یادداشت کھو جانے اور بہرے پن کے احمقانہ بہانے بھی بنائے لیکن چند ایسے بھی تھے جنہوں نے جھگڑے کی من و عن تفصیل بیان کی۔ اپنے حق میں کافی سارے لوگوں کے بیانات سن کر مائیکل مزید حوصلہ مند ہو گیا تھا۔ وہ کیرول کی پُرتشویش تنبیہات کے باوجود فلپ کو عدالت میں گھسیٹنے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا۔

تقریباً ایک ماہ بعد، جب کیرول تیار ہو کر اپنی بینک کی نوکری پر جا چکی تھی تب مائیکل کو ریجنالڈ لومیکس کی جانب سے فون کال موصول ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وکیل صفائی نے فلپ کی جانب سے ایک درخواست بھیجی تھی جس پر "غیر جانبدارانہ غور" کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔

"ہم نے جتنے ثبوت اکٹھے کر لیے تھے اس کے بعد تو یہ سب کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔" مائیکل نے کہا۔

"یہ محض ایک صلاح ہے..... اور میں بھی اس کی تائید کروں گا۔" لومیکس بولا۔

"صلاح ہو یا نہ ہو..... میں دو لاکھ پاؤنڈز سے کم ہرجانہ بالکل بھی قبول نہیں کروں گا۔" مائیکل نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

"اوہ..... میں تو ابھی یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ پیشکش کیا کر....."

"تم نہیں جانتے ..... لیکن میں جانتا ہوں۔" مائیکل نے غصے سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس رذیل شخص کی وجہ سے میں پچھلے گیارہ ہفتے میں کوئی نوکری تو کیا

کانٹے نے پھول سے کہا

تم بہت خوبصورت ہو۔ سب لوگ تم سے محبت کرتے ہیں..... اور مجھ سے دامن بچاتے ہیں یعنی نفرت کرتے ہیں۔

پھول نے نرمی سے جواب دیا۔

دنیا کی نفرت سے کیا ہوتا ہے۔ میں جو تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اپنا دامن نہیں بچاتا بلکہ تیرے ساتھ رہتا ہوں۔ جب تک میری زندگی ہوتی ہے یا کوئی مجھے توڑ نہ لے۔

سقراط

سقراط سے پوچھا گیا۔ موت سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟

سقراط نے جواب دیا۔ "زندگی..... کیونکہ ہر قسم کے رنج و غم زندگی میں ہی برداشت کرنے پڑتے ہیں جبکہ موت ان سے نجات دلاتی ہے۔"

☆☆☆

ایک امیر آدمی جو سقراط کا شاگرد تھا، فخریہ کہتا تھا کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ میری ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ سقراط نے کہا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری کوئی خواہش نہیں.....

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

UUNOVELS.COM

ایک انٹرویو کال تک نہیں وصول کر پایا ہوں۔ میں نے بہت بھگت لیا ہے..... اب اس کی باری ہے۔ دو لاکھ پاؤنڈز سے کم میں کچھ بھی سننا پسند نہیں کروں گا۔''

''میرا ذاتی خیال ہے کہ حالات کے پیش نظر تم کچھ زیادہ ہی پُرامید ہو چکے ہو۔'' لومیکس نے چند لمحوں کے وقفے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''بہرحال میں دیکھتا ہوں کہ دوسری جانب سے ایسی کیا استدعا کی گئی ہے جس پر غور کرنا ہے..... اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔ میں مخالف پارٹی سے ملاقات کے بعد ہی تمہیں اب کال کروں گا۔''

مائیکل نے جب یہ خوشخبری کیرول کو سنائی تو وہ بجھ کر رہ گئی..... اس نے بھی بعد میں لومیکس کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی امیدوں کے دریا کے آگے ذرا بند باندھے۔ فون کی گھنٹی سن کر ہی دونوں کی یہ گفتگو بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہوگئی۔

مائیکل نے کیرول کو اپنے ساتھ بٹھا کر فون کا اسپیکر آن کر دیا تاکہ اسے بھی لومیکس کا پیش کیا گیا سارا احوال سنا سکے۔ فلپ نے پچاس ہزار پاؤنڈز جرمانے کے ساتھ ساتھ دونوں جانب کے وکلاء کی فیس اور کارروائی کے تمام اخراجات اٹھانے کی ہامی بھر لی تھی۔

کیرول یہ سن کر ہی مارے تشکر کے سر ہلانے لگی لیکن مائیکل نے لومیکس کو ایک بار پھر سے واضح کر دیا کہ وہ دو لاکھ پاؤنڈز سے ایک پیسا کم نہیں لے گا۔

''تم دیکھ نہیں رہے کہ فلپ ٹوٹ رہا ہے..... اسے بھی شاید اندازہ ہو گیا ہے کہ کیس ایک بار عدالت میں چلا گیا تو ہرجانے کی رقم تعین کرنے کا حق اس کے ہاتھ سے نکل کر جیوری کے پاس چلا جائے گا۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ میں اب پیچھے ہٹنے والا نہیں۔''

کیرول کے ساتھ ساتھ لومیکس بھی اس کی منطق سے قائل نہیں ہوئے تھے۔

''عدالت میں یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا..... بہت کچھ ثابت کرنا پڑے گا۔'' لومیکس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہائی کورٹ کی جیوری کے سامنے اگر اس نے ثابت کر دیا کہ وہ سب محض مذاق تھا تو تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔''

''مذاق.....؟'' مائیکل بھنا کر رہ گیا۔ ''اور وہ جو ہاتھا پائی ہوئی تھی..... وہ بھی مذاق تھا کیا؟''

''یاد رکھو، وہ تم نے شروع کی تھی.....'' لومیکس نے یاد دہانی کرائی۔ ''میری مانو تو پچاس ہزار پاؤنڈز ان حالات میں ایک بہترین پیشکش ہے۔''

مائیکل نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے چند اور باتیں کیں اور آخر میں یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ دو لاکھ پاؤنڈز سے کم پر ہرگز راضی نامہ نہیں کرے گا۔

ابھی دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ دوسری پارٹی نے عدالت سے باہر ہی معاملہ طے کرنے کے لیے ایک لاکھ پاؤنڈز کی پیشکش کر دی۔ اس بار جب مائیکل نے یہ پیشکش رد کی تو لومیکس کو قطعاً حیرانی نہ ہوئی۔

''عدالت سے باہر کی سیٹل منٹ پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ اگر یہ دو لاکھ سے کم کی بات کرتے ہیں تو میں ایسی کسی آفر کے بارے میں سننا ہی پسند نہیں کروں گا۔'' مائیکل نے سختی سے انکار کر دیا۔

لومیکس جانتا تھا کہ اب مائیکل کو سمجھانا اور بھینس کے آگے بین بجانا برابر تھا۔ اس کی بات کا مائیکل پر وہی اثر ہوتا جو کسی بہرے کو گانا سنانے کا ہو سکتا تھا اور وہ اس کام میں بالکل بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لومیکس نے اپنی تمام تر توجہ مخالف پارٹی سے ملاقاتوں پر مرکوز کر دی تاکہ جلد از جلد من پسند نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

تین ہفتے کا مزید وقت اور کئی فون کالز کے بعد آخر دوسری پارٹی مان گئی کہ وہ مکمل دو لاکھ پاؤنڈز ادا کرنے کو تیار ہیں۔ ریجنالڈ لومیکس نے اسی شام یہ خبر بتانے کے لیے مائیکل کو فون کیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بہت بڑی کامیابی سمیٹ لی ہو۔ اس نے مائیکل کو یقین دلایا کہ تمام کاغذی کارروائی چند دن میں ہی مکمل ہو جائے گی اور تمام معاملات وہ دیکھ لے گا۔

''تمہارے تمام اخراجات بھی اسی میں ادا ہو جائیں گے۔'' اس نے مائیکل کو بتایا۔

''وہ تو ظاہری بات ہے۔'' مائیکل نے ہنکارا بھرا۔

''اب بس تم نے یہ کرنا ہے کہ وہاں سے جو معافی نامہ آئے، اس کی تائید کر دو۔'' لومیکس بولا۔

ایک مختصر معافی نامہ تیار ہوا جس پر دونوں جانب سے تائید ہوئی اور اسے عوام میں مشتہر کرنے کے لیے ''ہیسل میئر کرونیکل'' نامی اخبار کو بھیج دیا گیا۔ یہ چونکہ ایک بڑی خبر تھی اس لیے اخبار والوں نے بھی اسے جمعے کے روز پہلے صفحے پر شائع کیا۔

''کلمور اور ماسٹرز میں ہوئی صلح: معافی تلافی کے بعد دوستی بحال.....''

UUNOVELS.COM

''دونوں جانب سے دوستوں میں صلح ہوگئی ہے لیکن اس سے قبل مسٹر گلمور کو ہرجانے کی مد میں ایک بڑی رقم ادا کی گئی ہے۔ فلپ ماسٹرز نے اپنے کہے پر شرمندگی کا اظہار کیا ہے اور تمام الفاظ واپس لینے کا اعلان کیا ہے اور غیر مشروط معافی طلب کی ہے۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ آئندہ وہ اس قسم کے بیانات والفاظ کا استعمال کبھی نہیں کریں گے۔ مسٹر ماسٹرز نے اس قانونی کارروائی کے تمام اخراجات بھی برداشت کیے ہیں۔''

فلپ نے اسی روز گالف کلب کے صدر کو بھی پیغام بھیجا جس میں اعتراف کیا گیا تھا کہ شاید اس دن وہ زیادہ پی کر بہک گیا تھا۔ اپنے انٹ شنٹ بولنے اور لڑائی جھگڑا کرنے پر وہ شدید معذرت خواہ ہے۔ اگر اس کی ممبر شپ معطلی ختم کر کے بحال کر دی جائے تو وہ کلب کے صدر کو یقین دلاتا ہے کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

صرف کیرول ہی ایسی تھی جو کہ اس ٹسل کے نتیجے پر واضح طور پر ناخوش دکھائی دیتی تھی۔

''کیا بات ہے ڈارلنگ؟'' مائیکل نے پوچھا۔ ''اب تو ہم جیت گئے ہیں اور ہمارے مالی مسائل بھی حل ہو ہی گئے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' کیرول نے کہا۔

''پھر تم اداس کیوں ہو؟'' مائیکل نے سوال کیا۔

''میں بس اس لیے اداس ہوں کہ آخر ہمیں اس جیت کی کیا قیمت ادا کرنا پڑی؟'' وہ بولی۔

''میں نے تو کوئی قیمت ادا نہیں کی۔'' مائیکل نے حیرت سے کہا۔

''تم نے دو لاکھ پاؤنڈز کے بدلے میں اپنا دوست کھو دیا ہے مائیکل اور افسوس تمہیں اس چیز کا ادراک بھی نہیں ہے۔'' کیرول نے زخمی لہجے میں کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے.....'' مائیکل شرمندہ سا ہو کر بولا۔

''ایسا ہی ہے مائیکل.....'' کیرول نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''بس مجھے اتنا بتا دینا کہ کیا یہ دو لاکھ پاؤنڈز واقعی اتنے قیمتی تھے... جس کے لیے تم نے اپنا بچپن کا دوست کھو دیا؟''

مائیکل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا لیکن اپنی بیوی کے تاثرات دیکھ کر خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

کچھ دن بعد جمعے کے روز مائیکل کو اپنی ڈاک میں ایک لفافہ ملا جس پر گالف کلب کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اسے بڑی خوشی ہوئی اور اس نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ درمیان میں صرف ایک ہی ورق تھا جس پر لکھا تھا۔

''ڈیئر مسٹر گلمور۔ کلب کی ماہانہ میٹنگ پچھلے بدھ کو ہوئی جس میں کرنل مارتھر نے آپ کے معطلی کے مسئلے کو بھی بیان کیا۔ 16 اپریل بروز ہفتہ ہونے والی آپ کی ہاتھا پائی بھی زیر بحث آئی۔ اگرچہ اس قسم کا رویہ کلب کے قواعد کی شدید خلاف ورزی ہے لیکن حالات وواقعات کے پیش نظر آپ کو آخری وارننگ دی جا رہی ہے۔ آئندہ ایسے کسی واقعے کے پیش آنے کی صورت میں آپ کی رکنیت معطل کرنے کے بجائے منسوخ کر دی جائے گی۔ آپ پر عائد کی جانے والی معطلی بھی ختم کی جاتی ہے۔ خلوص کیش....

جیری ہاورڈ (سیکریٹری)''

یہ خط پڑھ کر مائیکل خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

''میں نے صبح گھر کی ضروری اشیا کی خریداری کے لیے جانا ہے۔'' رات کو کیرول نے اپنے پیروں پر کریم لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے کیا ارادے ہیں؟''

''میں گالف کھیلنے جاؤں گا..... میری رکنیت بحال ہو گئی ہے۔'' مائیکل نے اسے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

''اچھا خیال ہے۔'' کیرول نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ حیران ہو رہی تھی کہ اس سارے فساد کے بعد اس کے شوہر کے ساتھ کوئی بھی کلب ممبر کھیلنے کو تیار ہوگا بھی یا نہیں؟

☆☆☆

وہ دونوں اتنی صبح کھیلنے کے لیے آن پہنچے تھے کہ کئی کلب ممبرز کو پتا ہی نہ چلا کہ مائیکل اور فلپ اکٹھے ہی کھیل رہے ہیں۔

''شکر ہے کہ ان دونوں نے اپنا جھگڑا حل کر لیا اور اب اکٹھے ہی کھیل رہے ہیں۔ ورنہ اگر ناراضی برقرار رہتی تو خوامخواہ ہی کلب کا ماحول خراب ہو جاتا۔'' جیری نے انہیں دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''مجھے بہرحال یقین نہیں آ رہا۔'' کرنل زیر لب بڑبڑایا۔ ''بھلا کوئی سیب کا جوس بھی پی کر بہک سکتا ہے؟''

''پتا نہیں اتنا عرصہ بول چال بند رہنے کے بعد یہ کس بارے میں بات کر رہے ہوں گے؟'' جیری نے کرنل کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ وہ شیشے کے پار میدان میں دونوں کو گالف کھیلتے دیکھنے میں مگن تھا۔

کرنل نے ایک دوربین منگوائی اور جیری کی بات کا جواب دینے کے بجائے ان دونوں پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں جو بڑے سکون سے گالف کھیلتے ہوئے بات چیت کر رہے تھے۔

UUNOVELS.COM

"بے وقوف..... تم کیسے چار فٹ سے بھی کم فاصلہ ہونے کے باوجود بال سوراخ میں ڈالنے میں ناکام ہو گئے؟" مائیکل نے پوچھا۔ "لگتا ہے تم نے آج پھر صبح صبح پی لی ہے۔"

"تم جانتے تو ہو سب....." فلپ نے تسابلی سے جواب دیا۔ "میں ڈنر سے قبل بالکل بھی نہیں پیتا اور تم جو مجھ پر الزام لگا رہے ہو شراب نوش ہونے کا، اس پر میں تمہارے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ بھی کر سکتا ہوں۔"

"ہاں ہاں..... کر لو..... لیکن پہلے تو بتاؤ کہ تمہارے گواہ کہاں ہیں؟" مائیکل کے لہجے میں شرارت آمیز طنز تھا۔

"اتنی جلدی بھول گئے کہ تمہارے خلاف پچاس کے قریب عینی شاہدین میرے پاس موجود تھے۔"

دونوں اس بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

وہ دونوں بڑی دیر تک گالف کھیلتے رہے اور ان کی گفتگو میں کئی موضوعات زیرِ بحث آئے..... آٹھویں گالف ہول تک ان کے درمیان پھر اس جھگڑے کی بابت کوئی بات نہ ہوئی۔ جب وہ نویں ہول کے پاس پہنچے تو وہ گالف ہاؤس سے سب سے زیادہ فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے تسلی کی کہ کوئی بھی ان کی بات چیت سننے کے لیے آس پاس موجود نہیں ہے تو اطمینان کی سانس لی۔ قریب ترین کھلاڑی بھی قریباً دو سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ مائیکل نے سب سے نظر بچا کر ایک خاکی لفافہ اپنے گالف بیگ سے نکالا اور فلپ کے حوالے کر دیا۔

"شکریہ....." فلپ نے یہ کہہ کر لفافہ اپنے بیگ میں اس کی زپ کھول کر ڈال لیا۔ "بڑے عرصے بعد ایسی دولت ہاتھ آئی ہے جس پر کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑے گا۔" وہ اب گالف بال کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"میرے پاس ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز ہیں..... پچاس تمہیں واپس کر دیے ہیں تاکہ اگر کوئی اخراجات ہوں بھی تو وہ اس میں سے پورے کر لینا۔" مائیکل نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی میرا نہیں خیال کہ تمہیں ہرجانہ ادا کرنے پر کوئی نقصان ہوا ہے۔"

"ظاہری بات ہے کہ میں سب سے زیادہ شرح پر ٹیکس ادا کرتا ہوں..... اس لیے میرا کلیم بھی پوری رقم کا... ہوگا کیونکہ یہ تو بزنس میں نقصان ہوا ہے۔" فلپ نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔ "اور یہ ناممکن ہوتا اگر تم نے کبھی میرے ہاں ملازمت نہ کی ہوتی۔"

"اور چونکہ میں نے ہتکِ عزت کی مد میں بطور ہرجانہ یہ رقم حاصل کی ہے، سو مجھے بھی اس پر کوئی ٹیکس ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" مائیکل بولا۔

"یہ ایسی قانونی موشگافی تھی کہ کسی کی بھی نظر میں نہیں آسکی..... تم نے اپنے گاڈسن کی پڑھائی میں مدد کر دی اور میں نے اپنی گاڈ ڈاٹر کی۔" فلپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارا شکریہ کہ تم نے پچاس واپس کیے، گو کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی لیکن اپنے بیٹے کے لیے میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں..... باقی رہی ریٹا تو وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح ہی عزیز ہے۔"

"اگرچہ کچھ پیسے فیس کی مد میں ہمارے دوست لومیکس کو ہی ملے ہیں لیکن مجھے افسوس ہوا کہ تمہیں وکلاء کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑے۔" مائیکل نے اظہارِ افسوس کیا۔

"ارے فکر کی کوئی بات نہیں..... وہ بھی تو کبھی ہمارا دوست رہا ہے۔" فلپ نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی یہ رقم میرے ٹیکس کی ادائیگی میں قابلِ واپسی شمار ہوتی ہے تو ایک کلیم اس کا بھی ڈال دوں گا۔ بس ایسے سمجھ لو کہ مجھے ایک پینی بھی خرچ نہیں کرنی پڑی اور تمہاری بیٹھے بٹھائے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز کی لاٹری نکل آئی جس پر کوئی ٹیکس بھی نہیں دینا پڑے گا۔"

"اور کسی عقل مند کو پتا بھی نہیں چلا....." مائیکل نے کہا اور وہ دونوں ہی ہنسنے لگے۔

☆☆☆

کئی گز کے فاصلے پر بہت دور موجود کرنل مارتھر نے دوربین اپنی آنکھوں سے ہٹائی اور واپس اس کے باکس میں رکھنے لگا۔

"تو کیا آپ اس سال کے پریزیڈنٹ گالف چیمپئن شپ ٹورنامنٹ کے فاتح کو دیکھ رہے تھے؟" جیری نے کرنل سے سوال کیا۔

"نہیں....." کرنل نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بات مکمل کی۔ "میں اس سال کے ٹورنامنٹ کے اسپانسر کو دیکھ رہا تھا۔"

یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ کرنل مارتھر نے فوج میں بطور جاسوس بھی کام کیا ہوا تھا اور وہ لب پڑھنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ اس نے 'لپ ریڈنگ' کر کے ساری بات جان لی تھی اور اس کے بعد وہ چاہے ذاتی طور پر کوئی رقم نہیں اینٹھ سکتا تھا لیکن فلپ کو بدنامی سے ڈرا کر کم از کم اپنے کلب کے لیے اسپانسر شپ تو حاصل کر ہی سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

خاموش محبت کے رستے میں ٹھوکر کھانے والے ایک عاشق نامراد کا قصہ

کیسی حیرت کی بات ہے کہ بچپن جو ناسمجھی اور بے توجہی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے اس کی یادیں انسان کے ذہن میں کتنی دور تک اپنی جڑیں پھیلا لیتی ہیں کہ ان کے بغیر انسان خود کو ادھورا سمجھتا ہے، وہ بھی ایک طویل مسافت طے کرکے اس بات کو سمجھ پایا تھا کہ ایک عام سے چہرے والی وہ تیز طرار لڑکی اس کے لیے کس قدر اہم تھی۔

طویل مسافت

غلام قادر

میرے موبائل فون پر کال آئی، نمبر دیکھا تو نمبر انجانا تھا یعنی میرے فون کی میموری میں سیو نہیں تھا۔ میں نے ٹالنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر ریسیو کرلیا مگر ہیلو فوراً ہی نہیں کہا۔

''شہزاد بول رہے ہو؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا اور ذہن میں جھماکا سا ہوگیا۔

''آواز تو اسی کی ہے لیکن وہ مجھے کیسے فون کرسکتی ہے؟'' میں نے اپنے خیال کی تردید کی۔

''جی بول رہا ہوں۔'' میں نے نمبر دیکھا۔ نمبر بھی اس کا نہیں تھا۔ وہ ہوتی تو اس کا نام آتا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے خیال کی تردید کی۔

''میں گل بول رہی ہوں..... گل چودھری۔'' اس نے کہا تو میرا ذہن بھک سے اڑ گیا۔

''یہ نمبر تو تمہارا نہیں ہے۔'' میں نے کہا لیکن فوری طور پر اس کا جواب نہیں آیا۔

''یہ میرا نیا نمبر ہے۔ دس مہینے سے میرے پاس ہے۔'' اس نے کہا۔

دس مہینے..... جب وہ اسلام آباد شفٹ ہوئی تھی۔

دس ماہ..... پرانا..... جب اس نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ میرا مذاق اڑایا تھا۔ وہ کچھ کہا تھا جو کسی اور کے کہنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔

''یہ نمبر میں نے تم سے بچنے کے لیے لیا تھا کہ تم مجھے تنگ نہ کرو۔'' اس نے کہا۔

''اور اب خود ہی فون کر رہی ہو۔'' میں نے کہا جس کے جواب میں ایک خاموشی چھا گئی۔

''ہاں! اور اب میں ہی فون کر رہی ہوں اور ایک سوال پوچھنا چاہ رہی ہوں۔'' اس نے رک رک کر کہا۔ اس کا لہجہ ویسا ہی مضبوط تھا جیسے ہمیشہ ہوتا تھا جس لہجے کے اعتماد کی وجہ اس کی ایک وجہ شہرت تھی۔

''وہ کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''سوال یہ ہے مسٹر شہزاد کہ مجھ سے شادی کرو گے؟'' اس نے کہا تو میرے ذہن نے فوراً کہا۔ ''یہ گل نہیں ہو سکتی۔''

کیا تم واقعی گل چودھری ہو؟'' میں پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔

''کم سے کم تمہیں تو یہ سوال نہیں کرنا چاہیے شہزاد ہمایوں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں، مجھے کیوں یہ سوال نہیں کرنا چاہیے؟'' میں نے پلٹ کر سوال کیا۔

''اس لیے نہیں کرنا چاہیے کہ کبھی یہ کہنے والے بھی تم ہی تھے کہ تمہاری آواز لاکھوں میں ایک ہے۔'' اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ ہنس پڑی۔ وہی ہنسی جسے سن کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ فضا میں ہر طرف جلترنگ سے بج اٹھے ہوں۔

''جب میں نے یہ کہا تب میں بہرہ تھا۔'' میں نے کہا اور جلترنگ دوبارہ سے بج اٹھے اور دیر تک بجتے رہے۔

''تم بھی نا شہزاد بالکل نہیں بدلے۔'' اس کی ہنسی رکی تو اس نے کہا۔

''مگر تم بدل گئی ہو..... مکمل بدل گئی ہو۔'' میں نے کہا جس کا جواب اس نے نہیں دیا تھا مگر جب کچھ دیر بعد بولی تو اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''تم نے اب تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' اس نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، میرا جواب کیا ہوگا؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن تمہارے جواب سے میری جیب پر اثر پڑے گا۔'' گل نے کہا تو میں سمجھ نہ سکا۔

''جیب پر کیا اثر پڑے گا؟'' میں نے نہ سمجھ آنے والے انداز میں کہا۔

''اگر تم ہاں کہو گے تو میں ساڑھے چھ کی فلائٹ سے کراچی پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

اور اگر نہ کہوں تو.....'' میں نے کہا تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

''میں ٹکٹ کینسل کروا دوں گی جس کا ایک حصہ کٹ جائے گا اور مجھے کم پیسے ملیں گے۔'' اس نے کہا۔

''چلو پھر ٹکٹ کینسل نہ کراؤ۔'' میں نے کہا تو وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گئی۔

''ائرپورٹ آؤ گے؟'' اس نے سوال کیا۔

''آنا ہی پڑے گا.....'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

''ٹیسٹ کھیلنے سے پہلے فرسٹ کلاس کھیلنا ضروری ہوتا ہے۔ غلامی کی عادت ایک دم تو نہیں پڑتی۔'' میں نے کہا اور جلترنگ ایک بار پھر بج گئے اور بجتے چلے گئے۔

''ابھی تمہاری فلائٹ میں بہت وقت ہے۔'' میں نے مزید کہا۔

''پیکنگ کرنی ہے اور امی کو بھی بتانا ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور رافعہ کو؟'' میں نے اس کی بہن کے بارے میں سوال کیا۔

''وہ یونیورسٹی کے سالانہ ٹور پر گئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں ابھی گھر جا کر سب کو تمہارے آنے کا بتا دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی نہیں شہزاد۔'' اس نے کہا۔

''پھر ارادہ بدلنے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' اس نے ایک لفظ کا جواب دیا۔

''تو پھر منع کیوں کر رہی ہو؟'' میں نے کہا لیکن اس نے اچانک خدا حافظ کہہ دیا۔

''ائرپورٹ پر ملاقات ہو گی۔'' اس نے خدا حافظ کہنے کے ساتھ کہا۔

اس نے فون کیا تو میں نے سوچا کہ یہ نہ اس نے بتایا نہ میں نے پوچھا کہ کس ائرلائن سے آ رہی ہو اور یہ بھی کہ ساڑھے چھ بجے فلائٹ کراچی پہنچے گی یا اسلام آباد سے روانہ ہو گی۔ میں نے اس کے نمبر پر ڈائل کیا تو حسب توقع اس کا فون بند ہو چکا تھا۔

''وہ ایسی ہی ہے۔'' میں بڑبڑایا لیکن ہمیشہ کی طرح میرے بڑبڑانے کا اس پر کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔

دس ماہ پہلے وہ اسلام آباد شفٹ ہو گئی تھی۔ روانگی

JUNOVELS.COM

سے پہلے وہ مجھے مسترد کر چکی تھی۔ اس کے لیے کراچی میں بھی نوکریوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے آئی بی اے میں ٹاپ کیا تھا لیکن اسلام آباد کی نوکری کو ترجیح دی تھی اور اس کی وجہ اس نے یہ بتائی تھی کہ کراچی میں رہوں گی تو تمہارا سامنا ہوتا رہے گا اور تم بھی ایسے نہیں ہو کہ آسانی سے پیچھا چھوڑ دو ..... پھر وہ اسلام آباد چلی گئی تھی۔

میں زندگی کی پہلی بڑی شکست پر دل گرفتہ تھا، اس وقت اپیا نے مجھے سہارا دیا تھا۔

''جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں میرے بھائی۔'' اپیا نے کہا تھا۔ اگر وہ تمہارے نصیب میں ہے تو تمہیں ضرور ملے گی لیکن سنجیدگی سے یہ بھی سوچو کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اس میں غلط کیا ہے۔''

میں نے اپیا کی باتوں پر غور کیا تو گل کا ہر اعتراض صحیح لگا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی میں نے خود کو بدلنا شروع کر دیا۔

''اب شہزاد ہمایوں صبح نو بجے دفتر میں ہوتا تھا اور نو بجے دفتر پہنچنے کے لیے سات بجے اٹھنا ضروری تھا اور سات بجے بیدار ہونے کے لیے گیارہ بجے بستر پر ہونا ضروری تھا۔

بات صرف یہاں تک نہیں تھی۔ شہزاد ہمایوں کی اب کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی۔ نہ وہ لڑکیوں کو ڈنر پر مدعو کرتا تھا، نہ موبائل پر لمبی لمبی باتیں کرتا تھا بلکہ حد تو یہ تھی کہ گھر میں ہونے والی پارٹیوں میں بھی واجبی سی شرکت کرتا تھا۔

میری اس تبدیلی پر اگر کوئی خوش تھا تو وہ پاپا تھے۔ پہلے ان کے لبوں پر ہر وقت گلہ ہوتا تھا کہ میں کاروبار سے لاتعلق رہ کر لاابالی پن میں وقت ضائع کر رہا ہوں لیکن اب ان کا کوئی کام میرے مشورے کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ ماما کی شکایتیں چھوٹی نوعیت کی تھیں لیکن ساتھ ہی وہ اس سے خوش تھیں کہ میں نے گل چودھری کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔

ماما کو گل سے ایک نہیں، ڈھیروں شکایتیں تھیں۔ سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ اس کا تعلق ان کے طبقے سے نہیں تھا اور صرف یہ نہیں تھا بلکہ اس کی ذہنیت بھی مڈل کلاس والوں کی سی تھی۔

ماما اپنی عادت سے مجبور تھیں۔ انہیں جب کسی میں ایک برائی نظر آتی تو پھر وہ برائیاں بھی نظر آنے لگتی تھیں جو اس میں موجود ہی نہیں ہوتی تھیں۔ پہلی بار جب میں نے گل کے لیے بات کی تو وہ بھڑک اٹھی تھیں اور کہا تھا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کیا برائی ہے اس میں؟'' اپیا نے سوال کیا۔ میں ان سے پہلے ہی بات کر چکا تھا اور وہ میرے اس فیصلے سے خوش تھیں۔

''زندگی میں پہلی بار میرے بھائی نے کوئی عقل مندی کی بات کی ہے۔'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔

اپیا نے ہی پاپا سے بات کی تھی اور ان کی رضامندی فوراً ہی مل گئی تھی پھر ان دونوں نے مشترکہ طور پر ماما سے بات کرنی چاہی تھی لیکن ماما کا پارہ پاپا اور اپیا کی ہر دلیل کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔

''میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ تکلو کبھی میرے گھر کی بہو نہیں بنے گی۔'' ماما نے کہا تھا۔

''خدا کے لیے ماما..... وہ کالی کہاں سے ہو گئی؟'' اپیا کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

''تمہیں تو وہی نظر آئے گا جو تمہارا بھائی دکھائے گا۔'' ماما نے کہا مگر اپیا بھی انہی کی بیٹی تھیں۔

''اس کا رنگ مجھ سے تو صاف ہے۔'' اپیا نے کہا۔

''تم تو اپنے باپ پر گئی ہو۔'' ماما نے پاپا کے گہرے سانولے رنگ پر طنز کیا۔

''یہ سوچیں کہ وہ آپ کے بیٹے کی پسند ہے۔'' پاپا نے دخل دینا چاہا۔

''ساری دنیا بھی ایک طرف ہو جائے تو بھی نہیں مانوں گی۔'' ماما اپنی جگہ سے اٹھ گئیں جیسے وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی ہوں۔

ماما کی باتوں سے میں خاصا دل گرفتہ ہوا تھا لیکن اپیا نے مجھے سنبھالا۔ ''تم ماما کی باتوں کو چھوڑو، میں اور پاپا مل کر انہیں سنبھال لیں گے۔'' اپیا نے کہا۔ ''تم اس سے مل کر یہ کنفرم کرو کہ ہمیں کب ان کے گھر جانا ہے۔''

اپیا کی باتوں نے مجھے حوصلہ دیا تو میں نے ان کے سامنے وہ بات کہہ دی جو حقیقت تھی۔ ''ابھی تو میں نے اس سے کوئی بات ہی نہیں کی ہے۔''

میں نے حقیقت بتائی تھی مگر اپیا مجھے یوں دیکھنے لگیں جیسے میں نے کوئی بہت ہی احمقانہ بات کی ہو۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ ابھی تک تم نے اسے پرپوز بھی نہیں کیا ہے۔'' انہوں نے استفہامیہ لہجے میں کہا اور میں فقط گردن ہلا کر رہ گیا۔

''بھائی! ایک بات کہوں، ناراض تو نہیں ہو گے؟'' اپیا نے کہا اور میرا برسوں کا تجربہ بتا رہا تھا کہ کوئی بہت ہی بری بات آنے والی ہے۔

''میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتی تھی جتنا کہ تم ہو۔'' انہوں نے کہا تو میں انہیں گھور کر رہ گیا۔

UUNOVELS.COM

''یار ایپا! وہ اکھڑی اکھڑی رہتی ہے اس لیے ہمت ہی نہیں ہوتی ہے۔'' میں نے جواز دیا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو، دنیا کے دوسرے بڑے فلرٹ۔'' انہوں نے ایک اور وار کیا۔

''اور پہلا کون ہے؟'' میں نے ان کے دوسرا بڑا فلرٹ کہنے پر کہا تھا۔

''اس کی ابھی تلاش جاری ہے۔'' ایپا نے کہا تو میں مسکرا دیا اور ایپا نے مجھے یوں گھورا جیسے میں نے کوئی غلط کام کیا ہو۔

''میں سمجھا آپ سلمان بھائی کا نام لیں گی۔'' میں نے ان کے شوہر کا نام لیا تو ایپا ہنس دیں۔

''جو بندہ امریکا میں چار برس گزارنے کے بعد بھی اس لڑکی سے کچھ نہ کہہ سکا ہو جس سے وہ شادی کرنا چاہتا ہو، وہ کیا فلرٹ کرے گا۔'' ایپا نے اپنے ہی شوہر کا مذاق اڑایا تھا اور ہم دونوں ہی ہنس دیے تھے۔

ہمارے ہنسنے کی وجہ ایپا کی شادی سے پہلے کا وہ واقعہ تھا جب سلمان نے اپنی کزن جو ایپا کی سہیلی تھی، سے یہ کہلوایا تھا کہ وہ ایپا کو پسند کرتے ہیں اور ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور ایپا کا جواب ایسا تھا کہ ان کی سہیلی بھی ہنستی رہی تھی۔ ''اگر وہ مجھے پسند کرتا ہے تو مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا۔ فی سی ایس سے پیغام کیوں بھجوا رہا ہے۔''

''فی سی ایس سے پیغام اس لیے بھجوا رہا ہے کہ تیری شہرت ہتھ چھوٹ کی ہے۔ جب تو کورٹ میں کسی پر ہاتھ اٹھا سکتی ہے تو تجھ سے ہر شریف آدمی ڈرے گا۔'' ان کی سہیلی نے اپنے کزن کا دفاع کیا۔

''ہاتھ تو میں نے اس لیے مارا تھا کہ ایک تو مجھے بیچ بارنے کا غم تھا اوپر سے وہ میرے کان کے پاس آ کر کہنے لگا جتنی خوب صورت آپ ہیں، اتنا اچھا کھیلتیں تو بارلی نہ۔'' ایپا نے کہا تو وہ دونوں ہنس دیں۔

''میں سلمان بھائی سے کہہ دوں گی کہ فی سی ایس کی سروس یہاں فیل ہے اس لیے ڈائریکٹ ڈائجسٹ سے کام لیں۔'' ایپا کی سہیلی نے کہا۔

ایپا اس سہیلی کے یہاں سلمان بھائی سے دو تین بار مل چکی تھیں۔ ایک بار وہ ہمارے گھر اپنی کزن کے ساتھ اس پارٹی میں بھی شرکت کر چکے تھے جو ماما نے ایپا کے بیڈمنٹن چیمپئن شپ جیتنے پر دی تھی۔

ان چند ملاقاتوں میں انہوں نے ایپا پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ ایپا ان کی وجاہت اور قابلیت سے متاثر بھی تھیں کیونکہ سلمان بھائی امریکا سے سرجری کی ڈگری لے کر آئے تھے اور ان کا مستقبل روشن تھا۔

ماما نے اس وقت بھی اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ ''بیٹا پڑھ لکھ کر قابل ہو گیا ہے مگر وہ فیملی تو مجھے پینڈو لگی تھی۔'' ماما کے بہت سے اعتراضات میں سے ایک یہ بھی تھا۔

''زمیندار لوگ ہیں۔ کمالیہ اور جھنگ میں ان کی خاصی زمینیں ہیں۔ زمیندار لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' پاپا نے اعتراضات کے جواب دیے تھے۔

ہم بہن بھائی ماضی کو یاد کر کے کچھ دیر ہنسے تھے مگر پھر سے وہ موضوع تازہ ہو گیا تھا۔

''پہلے لڑکی سے بات کر لے، اسے بتا دے کہ تو کیا چاہتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہمایوں گروپ آف انڈسٹریز کے مالک کے اکلوتے بیٹے کو وہ انکار نہیں کرے گی۔''

ایپا نے مجھے حوصلہ دینے کی کوشش کی تھی اور میں اس پر جز بز ہو رہا تھا کہ ایپا میری بات نہیں سمجھ رہی تھیں۔

''یار ایپا! آپ میری بات نہیں سمجھ رہی ہیں۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تیری بات مان لیتی ہوں لیکن میں جو کہہ رہی ہوں، وہ تو بھی سمجھ۔'' انہوں نے زور دے کر کہا۔

''وہ ہمارے گھر آئی تھی؟'' ایپا نے سوال کیا۔

''پہلی بار وہ تب آئی تھی جب ماما نے نئی فیکٹری کی خوشی میں میوزیکل ایوننگ رکھی تھی جس میں عابدہ پروین آئی تھیں اور عابدہ پروین اس کی بھی فیورٹ سنگر ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے عابدہ پروین کا پروگرام اس لیے رکھا تھا کہ اس میں گل چوتھری کو دعوت دے سکو۔'' ایپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی تار ائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہیں بلکہ ماہر ترین۔'' میں نے کھسیائے ہوئے انداز میں کہا۔

''مائی ڈیئر ٹل رے لی برادر میری دو آنکھیں ہیں جن سے سب کچھ نظر آتا ہے بلکہ وہ بھی نظر آتا ہے جو عام آدمی نہیں دیکھ سکتا۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا مطلب ہے اس کا؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''کہہ تو دیا میرے پیارے بھائی کہ پہلے اس سے بات کرو۔ اس کے بعد کے مسائل ہمارے ہیں۔'' انہوں نے مجھے سمجھایا تھا۔

''اگر اس نے انکار کر دیا تو—؟'' میں نے کہا۔

''تیرا وہ سو سے زیادہ عشق کرنے کا تجربہ کس دن کام

UUNOVELS.COM

آئے گا۔'' اپیا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی تھیں لیکن میں نے نظر انداز کیا۔

''میں پانچ برس اس کے ساتھ پڑھا ہوں۔ ان پانچ برسوں میں دس سے زیادہ ہماری بات نہیں ہوئی اور جب ہوئی تلخی ہی رہی۔'' میں نے کہا۔

''مثلاً کس طرح کی تلخی؟'' اپیا نے کچھ دلچسپی لی۔

''ایک بار میں نے نوٹس مانگے تو اس نے کہا..... کلاس میں تم بھی ہوتے ہو اپنے نوٹس خود کیوں نہیں تیار کرتے؟'' اس نے مغرورانا انداز میں کہا تھا۔

''بات تو اس کی صحیح تھی۔'' اپیا نے کہا تو میں انہیں صرف گھور کر دیکھنے لگا۔

''تو نوٹس نہ دینے پر آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مغرور ہے؟'' اپیا نے کہا۔

''نوٹس اسی نے دیے تھے بلکہ فوٹو اسٹیٹ کروا کے دیے تھے۔'' میں نے کہا تو اپیا نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

''او بھائی! کسی ایک جگہ جم کے کھڑا ہو، کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ.....''

''میں نے ان نوٹس کو سمجھنا چاہا تو پتا ہے اس نے کیا کہا تھا؟'' میں نے کہا تو اپیا دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگیں۔

''عجیب سے لہجے میں اس نے کہا..... شہزاد ہمایوں! لڑکی کو گھیرنے کی یہ تکنیک اب پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے۔ اس لیے پلیز نئی تکنیک سیکھ کر آئیں۔'' میرا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ اپیا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر ہنستی چلی گئیں۔

''آئی لائک اٹ۔'' اپیا نے ہنسی روک کر کہا اور دوبارہ سے ہنسنا شروع کر دیا۔

''میرے پیارے بھائی! ایک بار بات تو کرو، اگر پہلی بار منع کر دے تو دوبارہ کرو۔'' اپیا نے جواب دیا تو میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ وہ اس طرح کی لڑکی ہے کہ ایک بار انکار کر دے گی تو اقرار نہیں کرے گی اور پھر ہوا بھی یہی کہ جب میں نے اس سے بات کی تو اس کا جواب انکار میں تھا۔

''گل! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' میں نے اسے اکیلا دیکھ کر کہا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ کینٹین میں اکیلی تھی ورنہ ہمیشہ اس کے ساتھ تین چار لڑکیاں تو ہوتی ہی تھیں۔ ساتھ میں کبھی نادر اور نجم بھی ہوتے تھے جو ان کے گروپ میں تھے جو پڑھاکو گروپ سمجھا جاتا تھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام گل چودھری ہے اور صرف میرے قریبی دوستوں کو مجھے اس نام سے مخاطب کرنے کی آزادی ہے۔'' اس نے عجیب خرانٹ لہجے میں کہا تھا۔

''اور دوسری بات؟'' میں نے کہا۔ اس کا رویہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔

''دوسری بات یہ کہ مجھے تم سے مخاطب کرنے کی آزادی بھی قریبی دوستوں کو ہے اور آپ میرے دوستوں کی فہرست میں بھی شامل نہیں۔'' اس نے اپنا خرانٹ لہجہ برقرار رکھا تھا۔

''او کے گل چودھری صاحبہ، مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا لیکن اس نے میری بات پر توجہ نہیں دی تھی۔

میں نے پورا واقعہ بالکل اسی طرح جس طرح پیش آیا تھا، اپیا کو بتایا تو خلاف توقع انہوں نے ہنسنے یا مذاق اڑانے کے بجائے سنجیدگی سے سنا۔ ''اس کا موبائل نمبر حاصل کر کسی طرح۔'' اپیا نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔

'اس کا نمبر کس سے لوں؟' میں نے سوچا لیکن بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک راستہ مجھے سمجھ میں آیا۔

آفس کلرک نے پانچ سو روپے لے لیے اور اس کے فارم کو چیک کیا لیکن اس پر موبائل نمبر نہیں بلکہ گھر کا نمبر تھا۔

اس روز جس روز میں نے نمبر حاصل کیا تھا، گل انسٹی ٹیوٹ نہیں آئی تھی۔

مجھے نمبر ملا تو میں یہ سوچ کر چپ رہا کہ گھر پر تو کوئی بھی فون اٹھا سکتا ہے۔ میں حسن اسکوائر پہنچنے والا تھا کہ میرے ذہن میں ترکیب آئی۔ گل کے علاوہ کسی نے فون اٹھایا تو اس سے معلوم کروں گا کہ گل کی طبیعت کیسی ہے۔ آج وہ کیوں نہیں آئی اور پھر اس سے بات ہو جائے گی۔

میں نے فون کیا تو پہلی ہی بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

''کون بول رہا ہے؟'' دوسری جانب نسوانی آواز تھی لیکن یہ گل کی آواز نہیں تھی۔

''آپ ایمبولینس والے ہیں نا؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''ہوں تو نہیں مگر فرمایئے کیا ایمرجنسی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''امی بے ہوش ہو گئی ہیں، آپی نے ایمبولینس کے لیے فون کیا تھا۔''

''ایڈریس بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ میرا سوال احمقانہ تھا لیکن اس نے جواب دیا تو میں اس علاقے کے پاس ہی تھا۔

''آپی گھر کے باہر ہی ہیں، دوسرا مکان ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

UUNOVELS.COM

جب تک اس کی بات ختم ہوئی مجھے گلی نظر آ چکی تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر گاڑی کے بریک لگائے۔

''شہزاد.....تم.....'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔

''کہاں ہیں تمہاری امی؟'' میں نے کہا تو جواب میں وہ ہاتھ کا اشارہ کرنے لگی۔

اس روز میں نے اپنی ڈرائیونگ کے وہ کمال دکھائے کہ میں خود حیران تھا۔ گل کی امی کو وہاں موجود ایک نوجوان کی مدد سے کار میں منتقل کرنے کے بعد میں نے کار اس طرح دوڑائی تھی کہ دو بار گل کی بہن رافعہ کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ تین سگنل اس طرح توڑے کہ مخالف سمت سے آنے والی گاڑیوں کو بریک لگانے پڑے۔ کچھ نے چیخ کر گالیاں بھی دیں لیکن میں نے امراضِ قلب کے اسپتال پہنچ کر بریک لگائے اور کار سے اترتے ہی اندر اسٹریچر کے لیے بھاگا۔

گل کی امی کو ایمرجنسی میں پہنچانے کے فوراً بعد انکل کو فون کیا جو امراض قلب اسپتال کے چیف تھے۔

''نوید انکل! میں آپ کے اسپتال کی ایمرجنسی میں ہوں۔'' میں نے ان کے ''ہاں شہزاد'' کہتے ہی کہا تھا۔

''وہیں رکو میں آتا ہوں۔'' انہوں نے کہا تھا۔

نوید زبیری انکل پاپا کے دوست بھی تھے۔ وہ اور ان کی فیملی ماما کی تقریباً ہر پارٹی میں ہوتے تھے۔

نوید انکل چند منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔

تھوڑی دیر میں گیٹ پر موجود چوکیدار آ گیا۔

''صاحب! گیٹ سے گاڑی ہٹا لیں۔'' اس نے کہا۔

میں اپنی کار کو وہاں سے ہٹا کر پارکنگ میں لگا کر آیا تو اتنی دیر میں نوید انکل بھی باہر آ چکے تھے۔

''اگر مریضہ کو پہنچانے میں پانچ منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ بچ نہیں سکتی تھیں۔'' نوید انکل نے سارجنٹ کو سمجھایا۔

''انکل! کیسی ہیں وہ؟'' میں نے گل کی موجودگی کی پروا نہیں کی تھی۔

''آؤٹ آف ڈینجر تو نہیں لیکن امید ہے کہ صبح تک حالت سنبھل جائے گی۔'' انہوں نے جواب دیا، تبھی میں نے دیکھا کہ گل نے رونا شروع کیا۔ اس کی دیکھا دیکھی رافعہ بھی آنسو بہانے لگی۔

''شکر کرو بچو کہ بالکل صحیح وقت پر تم انہیں لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔'' نوید انکل نے انہیں تسلی دی۔ پھر جاتے جاتے رکے۔ ''بیٹا! آپ اپنے والد، بھائی یا کسی بڑے کو بلائیں۔'' نوید انکل نے کہا لیکن دونوں بہنیں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگیں پھر گل نے ہی بات کی۔

''والد صاحب کا آٹھ برس پہلے انتقال ہو گیا ہے اور بھائی ہمارا کوئی ہے نہیں۔''

میں نے دیکھا کہ نوید انکل کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔

''شہزاد! میرے ساتھ آؤ۔'' نوید انکل ایمرجنسی میں جاتے جاتے رکے اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

''آج کی رات مریض کے لیے بہت کٹھن ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' انہوں کہا تھا۔

''کتنے فیصد چانس ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''مجھے ایک پارٹی میں جانا تھا لیکن ابھی دو گھنٹے میں یہیں ہوں۔'' انہوں نے گل کی والدہ کے بیڈ کے پاس رک کر کہا تھا۔

''میں بھی ابھی یہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم ان دونوں لڑکیوں کو لے کر میرے دفتر میں جاؤ، میں آتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے باہر آ کر ان دونوں کو نوید انکل کا پیغام دیا مگر وہ دونوں وہاں سے ہلنے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ نوید انکل باہر آ گئے۔

''تم لوگ اب تک یہیں ہو؟'' انہوں نے مصنوعی ناراضی کے ساتھ کہا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے رافعہ کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگے۔ مجبوراً گل بھی ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔ اس کے پیچھے میں چل رہا تھا۔

نوید انکل اس وقت تک کچھ نہیں بولے تھے جب تک ہم ان کے کمرے کے صوفے پر نہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے ایک نظر ہم تینوں پر ڈالی۔ ''میں نے انہیں ایک انجکشن دیا ہے، اس کا رزلٹ دو گھنٹے میں آنا شروع ہو گا۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''وہ رزلٹ تو دو گھنٹے بعد آنا شروع ہو گا لیکن پتا نہیں دو گھنٹوں تک میں زندہ رہوں گا یا نہیں۔'' انہوں نے کہا تو ہم انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

''تم جوان لوگ ہو، بھوک برداشت کر لو گے، میں بوڑھا آدمی ہوں میں کتنا برداشت کروں گا جبکہ دوپہر میں بھی کچھ نہ کھایا ہو۔'' انہوں نے کہا تھا۔

دونوں بہنوں کے انکار کے باوجود انہوں نے آرڈر دے دیا۔ پھر اچانک بولے۔ ''بہت اچھا کیا تم نے کہ

ایمبولینس کا انتظار نہیں کیا۔'' ان کا مخاطب میں تھا۔

''شہزاد جب پہنچے ہیں تو میں ایمبولینس کا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' گل نے کہا تھا۔

''یہ پتا نہیں کیسے فرشتہ بن کر آ گئے تھے۔'' رافعہ نے بہن کی بات کو آگے بڑھایا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم وہاں ان کے گھر پر موجود تھے۔'' نوید انکل نے کہا تو ایک ساتھ ہم تینوں کی گردنیں نفی میں ہل گئیں۔

اس کے بعد رافعہ نے پوری تفصیل بتائی کہ کس طرح میرا فون آیا اور کس طرح میں نے بتایا کہ میں ان کے گھر کے قریب ہی ہوں اور اس نے فون پر ایڈریس سمجھایا اور فون میں نے رکھا نہیں تھا کہ یہ وہاں پہنچ گئے۔'' رافعہ نے کہا تو نوید انکل نے خاموشی سے اس کی بات سنی۔

''راستے میں تمہیں پتا چلا کہ وہ دل کی مریضہ ہیں؟'' نوید انکل نے سوال کیا۔

''راستے میں نہیں، کار میں بیٹھتے ہی کہا تھا۔'' اس بار گل نے جواب دیا تھا۔

نوید انکل نے پوری بات سنی، اس دوران ان کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر اچانک انہوں نے کہا۔ ''پہلے مجھے اگر ایک ڈاکٹر ہونے کی بنیاد پر پچاس فیصد یقین تھا تو اب نوّے فیصد یقین ہے کہ اللہ اپنا کرم کرے گا۔'' انہوں نے پوری سنجیدگی سے کہا تھا۔

''اپنی پروفیشنل زندگی میں بہت سے واقعات میں نے دیکھے ہیں کہ قدرت نے کس طرح غیبی امداد کی اور یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔'' نوید انکل خاموش ہوئے تو رافعہ کے آنسو نکل گئے اور گل نے مجھے مخاطب کیا۔

''تھینک یو۔''

''یہ آنسو اور شکریہ اس وقت کے لیے بچا رکھو جب تم اپنی والدہ کو گھر لے جانا۔ فی الحال تو اس کھانے سے انصاف کرو۔'' انہوں نے اسی وقت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شخص کو جس کے ہاتھ میں ٹرے تھی، دیکھ کر کہا تھا۔

دونوں بہنوں نے ابتدا میں کچھ انکار کیا لیکن نوید انکل کے اصرار سے وہ مجبور ہو گئی تھیں۔ نوید انکل نے کھانے کے فوراً بعد ہم تینوں سے کہا کہ تم لوگ یہیں بیٹھو، چائے آ رہی ہے۔ میں ایک راؤنڈ نیچے کا لگا کر آتا ہوں۔ رافعہ نے ساتھ جانے کے لیے کہا لیکن نوید انکل نے اسے وہیں رکنے کے لیے کہا اور خود چلے گئے۔

ہم وہیں بیٹھے تھے کہ چوکیدار نے گل کو مخاطب کیا۔ ''آپ کو کچھ لوگ بلا رہے ہیں۔'' گل کے ساتھ رافعہ بھی باہر آ گیا۔ وہ تین لوگ تھے۔ ان میں وہ نوجوان بھی شامل تھا جس کی مدد سے میں نے گل کی والدہ کو کار میں منتقل کیا تھا۔

''ہمارے کرایہ دار ہیں۔'' رافعہ نے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔

گل ان کے ساتھ مصروف تھی اور رافعہ اپنے کرائے داروں کے بارے میں بتاتی رہی کہ یہ جو صاحب ہیں، یہ بابا کے ساتھ آفس میں تھے۔ اب یہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور کسی پرائیویٹ کالج میں ہیں۔

''آپ کے والد پڑھاتے تھے؟'' میں نے سوال کیا تو رافعہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہ ہو۔

''جب ان کا انتقال ہوا تو وہ کالج کے پرنسپل تھے۔'' رافعہ کا جواب تھا۔

''ان کا انتقال کس طرح ہوا تھا؟'' میں نے ایک اور سوال کیا تو رافعہ نے ایک بار پھر حیرت سے مجھے دیکھا۔

''ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔'' اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

دوبارہ مجھے حیرت سے دیکھنے کے بعد اس نے اچانک سوال کیا۔ ''آپ باجی کے دوست ہیں؟'' اس نے سوال کیا تو میں بوکھلا گیا۔

''میں ان کا دوست نہیں، صرف کلاس فیلو ہوں۔'' میں نے وہی جواب دیا تھا جو حقیقت تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ میرے جواب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔

رافعہ اور میں خاموش کھڑے تھے اور گل آنے والوں کے ساتھ مصروف تھی کہ نوید انکل آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ''آپ لوگ باہر ہیں، اندر چائے آپ کا انتظار کر رہی ہوگی۔'' انہوں نے ہمیں باہر دیکھ کر کہا۔ گل آگے بڑھی تو اس کے ساتھ کھڑے لوگ بھی آگے آ گئے۔

''حالت پہلے سے کچھ بہتر ہے۔'' نوید انکل نے ان کے کوئی سوال کرنے سے پہلے کہا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ جس حالت میں وہ لائی گئی تھیں اس میں بہتری ہے۔'' انہوں نے اپنے فقرے کی وضاحت کی۔

''ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں؟'' رافعہ نے کہا تو ایک لمحے کے لیے انہوں نے کچھ سوچا۔

''میں نے انہیں سی سی یو میں شفٹ کروا دیا ہے جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔'' پھر مزید کہا تھا۔

UUNOVELS.COM

.....''ویسے بھی ان کی بظاہر حالت وہی ہے جو تم نے دیکھی تھی یعنی ابھی وہ ہوش میں نہیں آئیں۔'' ان کا جواب تھا مگر رافعہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

''کب تک آجائیں گی وہ ہوش میں؟'' رافعہ نے دوسرا سوال کیا تو نوید انکل سوچ میں پڑ گئے۔

''ابھی ان کی حالت یوں کہہ لو کہ پانچ فیصد بہتر ہوئی ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ مزید بگڑی نہیں، یعنی دوائیں ان پر اثر کر رہی ہیں۔'' نوید انکل کا جواب تھا لیکن رافعہ کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اور بھی کچھ سننا چاہتی ہے۔

وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چل دیے تھے اور ہم ان کے پیچھے چل دیے۔

''میں نے ہمایوں کو فون کر دیا ہے، وہ کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔'' اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے کہا تھا۔

''انہیں کیوں فون کر دیا؟'' میں نے کہا۔

''اس کا فون آیا تھا تو میں نے بتا دیا کہ تم یہاں ہو، اس پر اس نے کہا کہ وہ بھی آرہا ہے۔'' نوید انکل نے کہا۔

''پاپا نے سوال کیے تو ان کا کیا جواب دوں گا۔'' میرے ذہن میں سوال ابھرا تھا لیکن پھر میں نے ذہن کو جھٹک دیا۔ ''دیکھا جائے گا۔''

چائے اور پاپا آگے پیچھے ہی آئے تھے لیکن پاپا کے ساتھ اپیا کا چہرہ دیکھ کر میری وہ سوچ پھر سے آگئی کہ سوالات کا جواب کیا دوں گا۔

''اپیا جہاں رائی بھی نہ ہو وہاں پہاڑ بنانے کی ایکسپرٹ تھیں اور یہاں تو ان کے لیے کئی سیر رائی موجود تھی۔'' میرے ذہن میں سوال ابھرا تھا۔

پہلے وہ داستان دہرائی گئی کہ کس طرح میں نے ڈرائیونگ کی اور اسپتال پہنچا پھر پاپا نوید انکل سے گل کی امی کا پوچھتے رہے۔ وہ گل کے برابر ہی بیٹھے تھے جبکہ دور رافعہ ایک صوفے پر تھی۔

''آج کا سارا کریڈٹ شہزاد کا ہے۔ اگر پانچ منٹ اور ہو جاتے تو تقریباً ناممکن ہو جاتا۔'' نوید انکل نے کہا تو اپیا کی آنکھوں میں ایک لمحے..... صرف ایک لمحے کے لیے ستائش ابھری تھی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میں ابھی خوش بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اپیا کے ہونٹ ہلے اور میری تمام خوشی خاک میں مل گئی۔

''اللہ نے کوئی بھی مخلوق بے وجہ نہیں بنائی۔'' انہوں نے کہا تو سب ان کی جانب متوجہ ہوئے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔

''میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ اللہ نے اس شخص کو کیوں بنایا ہے جو میرا بھائی ہے کہ قدرت کو اس مخلوق سے یہ کام لینا تھا۔'' انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

پاپا اور نوید انکل ان سے واقف تھے اس لیے ان کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ گل کے ہونٹوں پر بھی تھی لیکن رافعہ کے چہرے پر حیرت تھی۔ اس نے پہلے اپیا اور پھر مجھے دیکھا اور پھر بول پڑی۔ ''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟''

''تم اس شخص سے واقف ہو۔'' اپیا نے یوں کہا تھا جیسے انہیں رافعہ کا یوں حمایت میں بولنا ناگوار گزرا ہو۔ رافعہ کی گردن نفی میں ہلی تو انہوں نے دوسرا سوال کیا۔ ''تمہاری اس شخص سے کتنی ملاقاتیں ہیں؟'' اپیا کے سوال پر رافعہ پہلے صرف انہیں دیکھتی رہی پھر بولی۔

''آج پہلی ملاقات ہے.....'' اس کے الفاظ ابھی پوری طرح نکلے ہی نہیں تھے کہ اپیا نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھا تھا۔

''تبھی تم یہ کہہ رہی ہو۔'' مجھ پر نظر ڈالنے کے بعد انہوں نے رافعہ سے کہا تھا۔

''چھوٹی بہن، یہ وہ شخص ہے جس کا نام میرے والدین نے غلط رکھ دیا ہے۔ اس کا نام ہونا چاہیے تھا بحر الکاہل..... کاہلی کا سمندر ہے یہ شخص۔'' اپیا کا فقرہ مکمل ہوا تو نوید انکل اور پاپا کے قہقہے گونج اٹھے۔

''آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا بھائی ہے۔'' رافعہ نے اس انداز میں کہا تھا کہ اپیا نے فوراً اسے گلے لگا لیا۔ رافعہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''آج سے اس ایک بھائی کو ہم دونوں بہنیں شیئر کریں گے۔'' اپیا نے یہ کہتے ہوئے رافعہ کو سینے سے لگا لیا تھا۔

میرا جی چاہا کہوں کہ ایک بہن مشکل سے برداشت ہوتی ہے اب تو یہ دو ہو گئی ہیں لیکن رافعہ کے آنسو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

اپیا کی گفتگو کا ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ کبیدہ ماحول میں بہت کمی آگئی تھی۔ گل کی آنکھوں میں بھی اب پہلی سی تشویش نظر نہیں آتی تھی۔ پاپا نے جانے کی اجازت لینے سے پہلے گل سے آہستہ آواز میں بات کی۔ آواز ہم میں سے کسی تک نہیں آرہی تھی لیکن گل کی نفی میں ہلتی ہوئی گردن ہم میں سے ہر ایک نے دیکھی تھی۔

UUNOVELS.COM

اپیا نے بھی پاپا کے ساتھ جانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑی تو رافعہ نے کہا۔ ''شکریہ۔'' اور اپیا جاتے جاتے رک گئیں۔

''دو دن بعد جب ہم تمہاری امی کو لے کر گھر جائیں گے تب تک کے لیے اپنا یہ شکریہ سنبھال کر رکھو۔'' اپیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''انشاء اللہ۔'' پاپا اور رافعہ کے ہونٹوں سے ایک ساتھ نکلا۔ پھر اپیا جاتے جاتے ایک بار پھر رکیں۔

''نوید انکل میں ان سے اپنے ساتھ چلنے کو کہوں تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ یہ دونوں اسپتال میں ہی رکنا چاہیں گی اور آپ کے جاتے ہی انہیں یہاں سے بھی بے دخل ہونا پڑے گا۔'' اپیا نے کہا تھا۔

''میں تمہاری بات سمجھ گیا۔'' نوید انکل نے کہا تھا۔ ''میں جاتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں یہیں رہنے دیا جائے لیکن دیکھتا ہوں کہ ان کے لیے کوئی بہتر انتظام ہو جائے۔ ڈاکٹر سرور کو بلاؤ۔'' نوید انکل نے چپڑاسی سے کہا۔

ہم ایک ساتھ ہی کمرے سے نکلے تھے۔ کچھ دیر میں ڈاکٹر سرور آئے تو نوید انکل نے ان سے کہا۔ ''کوئی پرائیویٹ روم خالی ہے؟''

''سر! سیکنڈ فلور پر ایک روم ہے۔'' سرور کا جواب تھا۔

''رات کے لیے وہ روم انہیں دے دینا۔'' انہوں نے ہدایات دیں تو ڈاکٹر سرور نے یوں گردن ہلائی جیسے وہ سمجھ گیا ہو۔

''تم رکو گے؟'' اپیا نے مجھ سے سوال کیا تو میرا جواب اثبات میں پاتے ہی انہوں نے رضامندی دے دی تھی۔

''شہزاد! آپ چلے جائیں۔'' گل نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

''بحرالکاہل کے کچھ کارآمد ہونے کے آثار ملنے لگے ہیں تو کیوں روک رہی ہو۔'' میرے بجائے اپیا نے جواب دیا تھا۔

میں اپیا اور پاپا کو چھوڑنے جانے لگا تو رافعہ بھی ہمارے ساتھ چل دی جبکہ ڈاکٹر سرور نے گل کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

کار کے قریب پہنچنے لگے تو پاپا نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ میری جانب بڑھا دیے۔

''میرا فون کھلا ہوگا۔ رات میں ضرورت پڑے تو فون کر دینا۔''

''میں بھی فون کھلا رکھوں گی۔'' اپیا نے کہا تھا۔

میں رافعہ کے ساتھ دوبارہ اوپر آیا تو گل ہمارے انتظار میں تھی۔ ''بہت دیر کر دی۔'' اس نے کہا تھا۔

''پاپا اور اپیا کو چھوڑنے پارکنگ تک گئے تھے۔'' میں نے کہا تو گل خاموش ہو گئی لیکن مجھے اس کی تشویش کچھ بے معنی سی لگی تھی۔

ہم سی سی یو تک ساتھ گئے۔ اندر ڈیوٹی ڈاکٹر اور نرسیں موجود تھیں۔ ہمیں دروازے پر دیکھ کر ڈاکٹر اٹھ کر آیا۔ گل نے والدہ کے بارے میں سوال کیا۔

''ابھی وہی پوزیشن ہے۔'' ڈاکٹر کا جواب تھا۔

''میں ایک نظر انہیں دیکھ سکتی ہوں؟'' گل نے درخواست کرنے والے انداز میں کہا۔ ڈاکٹر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا... وہاں رکے گا نہیں... تو گل نے ہامی بھر لی۔

میں وہیں کھڑا رہا۔ گل اندر گئی اور اپنی والدہ کے بیڈ کے پاس کچھ دیر رکی لیکن واپس آنے سے پہلے اس نے دوسرے ڈاکٹر سے بات کی اور باہر آ گئی۔

''شہزاد.....'' گل نے وہاں رکتے ہوئے کہا تو میں بھی ڈر گیا۔

''میں کچھ دیر یہاں رکنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا تو میں اسے صرف دیکھتا رہا۔

''کہاں..... یہاں دروازے کے باہر؟'' میں نے کہا۔ اس کی گردن ایک بار اثبات میں ہلی لیکن کچھ ہی دیر میں وہ بولی۔ ''تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' اس نے کہا اور چل دی۔ میں اس کے ساتھ چلتا رہا لیکن ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

ہم دوبارہ کمرے میں پہنچے تو رافعہ بیڈ پر بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ گل سیدھی اس کے پاس گئی اور دونوں بہنیں آہستہ آہستہ بات کرتی رہیں۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا لیکن گل نے دوسرے بیڈ پر جگہ بنا لی تھی۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

رافعہ کچھ دیر تو اسی طرح بیٹھی رہی پھر ٹانگیں لمبی کر کے لیٹ گئی۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کوریڈور میں آ گیا۔ گل نے میرے جانے کو نوٹ کیا لیکن کہا کچھ نہیں۔ کافی دیر گزر گئی میں کوریڈور میں ٹہلتا رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے گل دروازے پر نظر آئی۔

''کمرے میں چلو۔'' اس نے کہا تو میں بغیر کچھ کہے اس کے پیچھے چل دیا تھا۔

ہم ایک بار پھر آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

UUNOVELS.COM

''ایک بات سچ سچ بتاؤ گے؟'' اس نے کچھ دیر بعد کہا تھا۔ جب وہ سامنے آکر بیٹھی تھی تب ہی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

''تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا؟'' اس نے میرے ''پوچھو'' کہنے کے ساتھ ہی سوال کیا۔

''آفس سے..... تمہارے فارم سے۔'' میں نے وہ کہہ دیا جو حقیقت تھی۔

''کیوں.....؟'' اس نے اگلا سوال کیا تھا۔

''کیا یہ مناسب وقت ہے یہ سوال کرنے کا؟'' میں نے جواب میں کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

فون کی گھنٹی بجی تو میں نے چونک کر پہلے فون کو دیکھا کیونکہ میں آپریٹر سے کہہ چکا تھا کہ کتنا بھی ضروری فون ہو، مجھے نہ دینا پر گھڑی کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ میں بہت دیر ماضی کی بھول بھلیوں میں گھومتا رہا تھا۔

''سر! آپ کی والدہ کا فون ہے۔ وہ دو بار پہلے بھی فون کر چکی ہیں۔ اب وہ ناراض ہو رہی ہیں۔'' آپریٹر نے کہا تو میں نے کال ملانے کو کہا۔

''جی ماما؟'' میں نے فون اٹھا کر کہا تھا۔

''میں نے تمہیں یاد دلانے کے لیے فون کیا تھا کہ ہم نے بیگم عشرت کے یہاں آج ڈنر پر جانا ہے۔'' انہوں نے میری آواز سنتے ہی کہا تھا۔

''ماما..... میں مصروف ہوں۔'' میں نے کہا لیکن وہ تقریباً چلاتے ہوئے بول پڑیں۔

''میں نے تمہیں دو روز پہلے بتایا تھا اور آج صبح آفس کے لیے نکلتے ہوئے بھی یاد دلایا تھا۔'' انہوں نے کہا تو مجھے یاد آ گیا کہ بیگم عشرت کون تھیں اور انہوں نے کیوں مدعو کیا تھا۔

''ماما! جاپان سے ایک کلائنٹ آ رہا ہے، اس نے چند گھنٹے رکنا ہے اور پھر دبئی روانہ ہو جانا ہے۔'' اپنی بہانہ فیکٹری سے میں نے تازہ جھوٹ نکالا تھا۔

''صبح تک تو تمہارا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔'' ماما نے میرا جھوٹ پکڑنے کی کوشش کی۔

''دو گھنٹے پہلے اس کا فون آیا تھا اور ہم اس پر کام کر رہے تھے جو اس سے میٹنگ میں بات کرنی ہے۔ اسی وجہ سے میں آپ کا فون نہیں لے سکا تھا۔'' بہانے فیکٹری سے ضمنی جھوٹ تراشا تھا تو ماں کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''پہلے باپ پارٹیز خراب کرتا رہا اب بیٹے نے اس کی جگہ لے لی ہے۔''

''کب تک فارغ ہو جاؤ گے؟'' ماما نے کہا تھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا ماما۔ ہو سکتا ہے ایک دو گھنٹے میں فارغ ہو جاؤں یا پھر دیر لگ جائے۔'' میں نے غائبانہ پاپا کا شکریہ ادا کیا تھا جنہوں نے اس کا عادی بنا دیا تھا۔

''یہ دعوت ایک طرح سے تمہارے اعزاز میں تھی۔'' ماما نے کہا، وہ نہ بھی بتاتیں تب بھی اپیا مجھے بہت کچھ بتا چکی تھیں۔

''میں کوشش کروں گا۔ اگر جلد فارغ ہو گیا تو فون کر کے آ جاؤں گا۔'' میں نے ماما کو تسلی دی۔ وہ ان تسلیوں کی حقیقت جانتی تھیں۔ پاپا برسوں سے اس طرح کی تسلیاں دیتے رہے تھے لیکن انہوں نے کہا کچھ نہیں۔

گھڑی دیکھی تو ابھی گل کی فلائٹ آنے میں دیر تھی اور اگر فلائٹ اسلام آباد سے ساڑھے چھ بجے چلنی تھی تو چار گھنٹے باقی تھے۔

امید تو نہیں تھی کہ وہ فون اٹھا لے گی لیکن میں نے اس نمبر پر ڈائل کر دیا جس سے فون آیا تھا لیکن اس نے ہمیشہ کی طرح میرے اندازے کو غلط ثابت کر دیا۔

''اتنے بے چین نہ ہو، جہاز میں سوار ہو چکی ہوں۔ چند منٹ میں فلائٹ اڑنے والی ہے۔'' گل نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

''بے چین نہیں ہوں، تم نے بتایا نہیں تھا کہ ساڑھے چھ بجے وہاں سے اڑے گی یا ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچے گی۔'' میں نے کہا لیکن اس کا جواب سن کر دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''کامن سینس کی بات ہے۔ اگر تمہیں ساڑھے چھ بجے پہنچنے کے لیے کہہ رہی ہوں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ساڑھے چھ کراچی ائرپورٹ پر ہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''تم نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔'' میں نے اس کی دلیل رد کر دی مگر اس کا جواب پچھلے جواب سے زیادہ سخت تھا۔

''سائنس کی اتنی ترقی کے باوجود کامن سینس بڑھانے کی نہ کوئی دوا ہے نہ انجکشن۔ بہرحال فون بند کر رہی ہوں کیونکہ جہاز اڑنے کا اعلان ہو چکا ہے۔'' اس نے کہا اور میرا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

''دو گھنٹے بعد وہ میرے سامنے ہو گی۔'' میرا ذہن ایک بار پھر گل چودھری کی جانب مڑنے لگا کہ اپیا کا فون آ گیا۔

''تو نے اماں کو بھڑکا دیا ہے۔'' اپیا کے لہجے میں یہ توانائی جبھی آتی تھی، جب وہ خوش ہوتی تھیں۔

''میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ اگر وہ خود بھڑک گئی ہیں تو

UUNOVELS.COM

میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے کہا تو اپیا کے قہقہے نے میرے ذہن کی تصدیق کر دی۔

''تم نے بیگم عشرت کی دودھ سے زیادہ سفید بیٹی ڈاکٹر صبیحہ عشرت کو دیکھنے جانے سے انکار کر دیا ہے نا۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، صرف بیگم عشرت کے ڈنر میں جانے سے معذرت کی ہے کیونکہ جاپان سے مہمان آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ بہانے ماما سے بنانا، ایسا کوئی اہم کلائنٹ نہیں ہوتا جو ایک گھنٹے پہلے اطلاع دے۔'' اپیا نے میرا جھوٹ پکڑ لیا تھا اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شادی سے پہلے وہ پاپا کے ساتھ اسی دفتر میں کام کر چکی تھیں۔

''سچ بتا کس لڑکی کے ساتھ ڈیٹ ہے؟ کوئی نئی ہے یا پرانی کے ساتھ پھر سے.....'' میری خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے بولنا شروع کر دیا اور بولے جا رہی تھیں کہ میں نے ان کا فقرہ کاٹ دیا۔

''آپ جانتی ہیں کہ میں یہ سب چھوڑ چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اللہ بھلا کرے اس گل چودھری کا جو انتقال کرتے ہوئے تجھے سدھار گئی۔'' اپیا نے کہا تو میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

''اللہ نہ کرے۔''

''میرا مطلب تھا کہ کراچی سے اسلام آباد جانے سے پہلے وہ تجھے سیدھے راستے پر لگا گئی۔''

''جس کے انتقال کرنے یا منتقل ہونے کی آپ مجھے اطلاع دے رہی ہیں تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب سے کچھ دیر بعد ساڑھے چھ بجے کراچی ائرپورٹ پر وہ دوسرا جنم لے رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

مجھے یقین تھا کہ اپیا کے سر پر یہ اطلاع بم کی طرح پھٹی ہو گی لیکن وہ اپیا تھیں، میری بڑی بہن۔

''کیا کہہ رہے ہو بھائی؟'' انہوں نے مزاحیہ انداز میں کہا اور قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ بول پڑیں۔ ''تفصیل بتا تفصیل۔''

میں نے وہی کچھ بتا دیا جو گل سے میری بات ہوئی تھی اور انہوں نے یہ سب خاموشی سے سنا۔

''بھائی! میری بات مان، اب تو انکار کر دے۔'' اپیا نے کہا۔

''مجھے کئی بار پہلے بھی شبہ ہوا تھا کہ پچھلے جنم میں تم خودکش بمبار تیار کرتی تھیں لیکن اس فقرے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔'' میں نے کہا تو اپیا نے..... زوردار قہقہہ لگایا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ماما کی دودھ سے زیادہ سفید بہو لانے کی حسرت دل میں ہی رہ جائے گی۔'' اپیا نے کہا تو میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا، وہ مسکرا بھی رہی ہوں گی۔

''مجھے نہ وہ فیملی پسند آئی تھی نہ وہ صبیحہ.....

''ائرپورٹ جا رہے ہو تو ڈرائیور کو نہ لے جانا۔ وہ ماما کا پکا مخبر ہے۔'' اپیا نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے ایک بار پھر گھڑی کی جانب نگاہ ڈالی اور ڈرائیور کو بلوایا۔ چند فائلیں اس کے حوالے کیں اور اس سے کہا کہ دفتر میں رہے، مجھے کسی وقت بھی اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

کار تک میں اپنے ایکسپورٹ منیجر کے ساتھ نکلا تھا۔ ڈرائیور سے چابیاں لیں جو فائلیں پچھلی سیٹ پر رکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ایکسپورٹ منیجر سے آہستہ سے کہا۔ ''آپ گھر جائیں لیکن کوئی پوچھے تو بتائیے گا ہم ائرپورٹ گئے تھے، اپنے جاپانی کلائنٹ کو لینے۔'' میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ مجھ سے پہلے وہ پاپا کے بھروسے کا آدمی رہا تھا۔

کار سڑک پر آئی تو میں نے رفتار دھیمی کر لی تھی۔ ائرپورٹ تک پہنچنے میں ابھی وقت تھا لیکن دھیمی رفتار اور ٹریفک کی زیادتی نے مجھے ماضی میں دھکیل دیا تھا۔

''محترمہ گل چودھری صاحبہ! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' میں نے پہلے روز جب وہ کلاس سے نکل کر لائبریری کی طرف جا رہی تھی، اس سے کہا تھا۔

''کیجیے۔'' اس نے وہیں رک کر کہا۔

''یہاں نہیں۔'' میں نے آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ کسی کو ہم پر توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی لیکن میں نروس تھا۔

''لائبریری چلتے ہیں۔'' اس نے پیشکش کی مگر میں اس پر بھی تیار نہیں ہوا۔

''کیا ہم کہیں اور نہیں مل سکتے؟'' میں نے کہا تھا۔

''مثلاً ان جگہوں میں سے کسی ایک جگہ جہاں آپ مختلف لڑکیوں کے ساتھ ڈیٹ پر جاتے رہے یا پھر.....'' گل نے معنی خیز انداز میں کہا اور فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''گل! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے اصرار کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم کیا بات کرنا چاہ رہے ہو لیکن میں ابھی سے کہہ دیتی ہوں کہ آپ وقت ضائع کر رہے

ہیں۔'' اس کا انداز وہی اکھڑ پن والا تھا۔

''کوئی بات بھی سنے بغیر فیصلہ سنانا انصاف نہیں ہے۔'' میں نے کہا تو وہ مجھے صرف دیکھتی رہی تھی۔

''کوئی بھی لڑکی جب یہاں سے تمہاری گاڑی میں بیٹھ کر جاتی ہے تو لوگ بالکل کنفرم انداز میں اس کے بارے میں بات کرتے ہیں۔'' اس نے کہا پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں نے اس کا فقرہ کاٹ دیا۔

''تم لوگوں کی باتوں سے ڈرتی ہو؟'' میں نے کہا تو اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''تمہاری طرح وہ بھی بڑے گھر میں رہنے والوں کی اولاد ہیں لیکن میرا تعلق مڈل کلاس سے ہے جہاں ان باتوں کی اہمیت ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

''میری درخواست ہے کہ ایک بار.....'' اس بار اس نے میرا فقرہ مکمل ہونے نہیں دیا تھا۔

''کل چھٹی ہے، تم جب والدہ کو دیکھنے کے بہانے آؤ گے تو میں کوشش کروں گی کہ ان سے اجازت لے کر تمہارے ساتھ جاؤں۔'' اس نے کہا تھا۔

''کس وقت آؤں؟'' میں نے سوال کیا۔

''فون پر بتادوں گی۔'' اس کا جواب تھا۔

اس کی والدہ کی بیماری کے دنوں میں ہمارے درمیان موبائل نمبروں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔

وہ پہلی رات جب اس کی والدہ بے ہوش تھیں اور ہم دونوں جاگ رہے تھے، اس نے اچانک کہا تھا۔ ''شہزاد! کہیں سے چائے مل سکتی ہے؟ سر میں شدید درد ہے۔''

اس وقت فجر کی اذانیں ہو چکی تھیں اور اس نے وہیں کمرے میں نماز بھی ادا کر لی تھی۔

میں نے اس کی پہلی فرمائش سنتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کینٹین کی جانب جاتے ہوئے مجھے کچھ خیال آیا اور میں سی سی یو کی جانب مڑ گیا۔ ابھی میں سی سی یو تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ ڈاکٹر نظر آ گیا جس نے گل کو اجازت دی تھی۔

''اچھا ہوا آپ مل گئے۔'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا۔

''آپ کی مریضہ کو ہوش آ گیا ہے اور وہ کسی گل کو پوچھ رہی ہیں۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

میں وہیں سے واپس ہوا۔ گل میری اتنی جلدی واپسی پر حیران ہوئی تھی۔ میں نے اسے کمرے سے باہر بلایا۔

''تمہاری امی کو ہوش آ گیا ہے اور وہ تمہیں پوچھ رہی ہیں۔'' میں نے کہا تو گل کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

وہ سوتی ہوئی رافعہ کی جانب بڑھی ہی تھی کہ میں نے اسے روک دیا تھا۔

''وہ چھوٹی ہے، خود پر قابو نہیں رکھ سکے گی۔ تم بھی خود پر قابو رکھو اور نارمل رہو۔ اس طرح ان کے سامنے آنسو بہاؤ گی تو ان کی طبیعت صحیح نہیں ہو گی۔''

گل نے اس وقت میری بات مانی اور.... جا کر منہ دھویا اور ہم دونوں سی سی یو کی جانب چل دیے۔ سی سی یو میں ماں سے ملنے گل اکیلے ہی گئی تھی لیکن باہر نکلتے ہوئے اس کے چہرے پر جو خوشی تھی، اسے بیان کرنا مشکل تھا۔ ہم خاموشی سے چلتے ہوئے کمرے تک آئے لیکن کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے رک کر کہا تھا۔ ''شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔''

''ابا نے کہا تھا کہ جب ہم تمہاری امی کو لے کر گھر جائیں گے تب تک کے لیے یہ شکریہ بچا کر رکھو۔''

رافعہ اسی طرح سوئی ہوئی تھی جیسے ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ ''میں چائے لے کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور گل کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔

میں چائے لے کر آیا تو گل اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے چائے آگے بڑھائی اور خود اس کے سامنے اپنی چائے لے کر بیٹھ گیا۔ رافعہ نے ایک دو کروٹیں لیں اور پھر سو گئی۔

''یہ گھر پر بھی اسی طرح سوتی ہے؟'' میں نے گل سے سوال کیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''کل یہ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ جاگی ہے ورنہ تو دس بجے سے پہلے ہی سو جاتی ہے لیکن صبح سب سے پہلے جاگتی ہے۔'' گل نے جواب دیا۔ اس کی نظریں بہن پر جمی ہوئی تھیں۔

''اب دیکھتے ہیں کب جاگتی ہے۔'' میں نے کہا تو گل مسکرا دی۔

''اب جاگے گی تو اس بات پر ناراض ہو گی کہ امی کے پاس جاتے ہوئے مجھے کیوں نہیں اٹھایا۔'' گل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

ہم اسی طرح بیٹھے تھے کہ میرے فون کی گھنٹی بجی، دوسری جانب ابا تھیں۔ ''کیا صورتِ حال ہے؟'' انہوں نے میرے ہیلو کہتے ہی سوال کیا تھا۔

''صبح ہوش آ گیا ہے۔ گل ان سے مل بھی لی اور انہوں نے چند باتیں بھی کیں۔'' میں نے انہیں بتایا تھا۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' ابا نے کہا لیکن ساتھ ہی انہوں نے بتایا۔ ''میں نے ناشتا بنوا لیا ہے اور بس نکلنے والی ہوں

UUNOVELS.COM

مگر اب کچھ دیر ہو جائے گی کیونکہ میں نفل پڑھ کر گھر سے نکلوں گی۔" انہوں نے کہا تھا۔

میں نے گل کو بتایا تو اس نے کہا۔ "نفل تو مجھے بھی پڑھنے چاہئیں۔" اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

"تمہاری بہن بہت اچھی ہیں۔" گل کے اس فقرے کے جواب میں میرے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن میں نے کہنے سے احتراز کیا تھا۔

جب ایما آئیں، اس وقت تک رافعہ سو رہی تھی انہوں نے ہی اسے اٹھایا تھا۔ وہ آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھی تو ایما نے ناشتے کے لیے کہا جو ملازم میز پر لگا رہا تھا۔

"باجی..... امی....." اس نے اٹھتے ہی پہلا سوال کیا تھا۔

"انہیں ہوش آ گیا ہے لیکن ابھی وہیں سی سی یو میں ہیں۔" گل نے جواب دیا تھا۔

"میں امی کے پاس جاؤں گی۔" اس نے ضد کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

"منہ دھولو..... ناشتا کرلو..... پھر میں نوید انکل سے بات کر کے اجازت لیتی ہوں۔" ایما نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

رافعہ میرے ساتھ ٹیبل پر آئی تو پہلا فقرہ کہا۔ "اتنا کون کھائے گا؟"

"تم کھاؤ گی، تمہاری بہن اور میرا بھائی کھائے گا اور جو بچ جائے گا وہ میں کھالوں گی۔" ایما نے کہا تھا۔

ناشتا ختم کرنے کے بعد رافعہ نے ایک بار پھر بات کی اور ایما نے نوید انکل کو فون کیا لیکن وہاں سے وہی جواب ملا جو متوقع تھا۔ "ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" انہوں نے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ وہ ڈاکٹروں سے رابطے میں ہیں اور ان کے پاس بہت اچھی خبریں ہیں۔

"نوید انکل آ جائیں تو ان دونوں بہنوں کو گھر لے جانا تاکہ یہ دونوں فریش ہو کر واپس آ جائیں۔" ایما نے حکم دیا تو میں نے باہی بھر لی تھی۔

نوید انکل آئے، ان کے ساتھ ہی رافعہ اور گل اپنی والدہ سے بھی مل لیں۔ واپسی پر دونوں خوش تھیں۔ "ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ حیرت انگیز طور پر امپروو کر رہی ہیں۔" رافعہ نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ ایما نے دونوں کو مبارک باد دی تھی۔

"شام تک شاید انہیں وارڈ میں شفٹ کر دیں۔" گل نے بتایا تھا۔

"پہلے تم دونوں گھر جا کر فریش ہو کر آ جاؤ۔" ایما نے دوبارہ سے وہی بات دہرائی۔

میں ان کے ساتھ جانے کے لیے اٹھا تو ایما میرے پاس آئیں۔ "سکیرال میں رک نہ جانا۔ جلدی آنا۔" انہوں نے بہت آہستگی کے ساتھ کہا تھا اور میں صرف انہیں گھور کر رہ گیا تھا۔

باران کی آوازوں نے مجھے چونکا دیا تھا۔ گسٹن بند ہوا تو میں اس پر رک گیا تھا لیکن سرخ سے سبز ہوا تو میں وہیں ماضی میں سفر کرتا رہا اور میرے پیچھے رکی ہوئی گاڑی والے نے ہارن بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔

جس روز گل سے بات ہوئی تھی اور اس نے اگلے روز میری بات سننے کی بات کی تھی لیکن رات بھر جاگتے رہنے کے باوجود اس کا فون نہیں آیا تھا۔ میں نے کار آگے بڑھائی۔ ائرپورٹ جانے کا وہ آخری موڑ سامنے نظر آ رہا تھا لیکن میں ایک بار پھر ماضی میں اترتا چلا گیا۔

صبح کے قریب آنکھ لگی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری جانب وہی تھی جس کا انتظار تھا۔ "وہ بچ چکے ہیں اور تم اب تک سو رہے ہو۔" اس نے کہا تھا۔

"رات بھر تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا صبح کے

ہمارا قائد

(قائداعظم کا خط بنام موہن داس کرم چند گاندھی 17 اگست 1944ء)

قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی تمام شعبوں کے احکامات موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر جسمانی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فردِ واحد کے حقوق تک۔ اخلاق سے لے کر انسدادِ جرائم تک، دنیاوی سزا و جزا سے لے کر آخرت کی سزا و جزا تک..... غرض کہ ہر قول و فعل پر عمل احکامات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا جب میں کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہیں، تو حیات اور مابعد از حیات کے ہر معیار اور پیمانے کے مطابق کہتا ہوں۔

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ حیدرآباد

UUNOVELS.COM

قریب سویا تھا۔'' میں نے وہی کہا تھا جو حقیقت تھی مگر اس پر اس کا الٹا اثر ہوا تھا۔

''میں سوچتی تھی کہ لڑکیاں اتنی جلدی تمہارے چنگل میں کیسے آجاتی ہوں گی لیکن اس فقرے نے بتا دیا کہ وہ سب کیسے ہوتا ہوگا۔'' گل نے کہا تھا لیکن میں اس کی بات سمجھنے کے باوجود اس کے جواب میں صرف اتنا کہہ سکا۔

''میں سچ بول رہا ہوں۔''

''چار بجے تک آجانا۔ میں تیار رہوں گی۔'' اس نے کہا تھا اور پھر مزید کچھ کہے بغیر اس نے فون رکھ دیا تھا۔

چار بجنے میں ابھی وقت تھا اور میرا بستر چھوڑنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کا فقرہ دس بج رہے ہیں۔ ابھی تک سو رہے ہو' نے مجھے اٹھا دیا تھا۔ پاپا اور اپیا ڈائننگ روم میں ناشتا کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہی جلدی اٹھنے کے عادی تھے جو ماما کے نزدیک مڈل کلاس ذہنیت تھی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟'' اپیا نے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔ ''صبح صبح اٹھ گئے، وہ بھی چھٹی کے دن۔'' اپیا کے لہجے میں پریشانی سے زیادہ طنز تھا۔ پاپا کچھ دیر بعد اٹھ گئے تو میں نے اپیا سے سرگوشی کی تھی۔

''گل نے چار بجے بلایا ہے۔'' میں نے کہا تھا لیکن وہ اس طرح دیکھنے لگی تھیں جیسے کچھ سمجھ نہ سکی ہوں۔ میں نے ایک روز پہلے کی بات چیت بتائی تو وہ اس طرح سوچ میں ڈوب گئیں جیسے میں نے ان سے ایٹم بم بنانے کا جدید ترین طریقہ پوچھ لیا ہو۔

''اس نے بلایا ہے تو ضرور جاؤ مگر بھائی وہ مختلف لڑکی ہے۔ تمہاری دال مشکل سے گلے گی۔'' اپیا نے حوصلہ دینے کے بجائے حوصلہ پست کرنے والی بات کی تھی۔

''صبح صبح کبھی کوئی اچھی بات بھی منہ سے نکال لیا کرو۔'' میں نے جلے بھنے انداز میں کہا تھا۔

''پہلے میں اسے اتنا نہیں جانتی تھی۔ ایک دو مختصر ملاقاتیں تھیں لیکن ان دنوں میری اس سے جتنی بات ہوئی ہے، اسے ایک بالکل مختلف لڑکی پایا ہے۔ اسے نہ ہمارا بڑا گھر متاثر کر سکا ہے نہ قیمتی گاڑیاں اور نہ ہی ہماری فیملی کے اثر رسوخ سے وہ متاثر ہوئی ہے۔'' اپیا نے کہا تھا۔

''پہلے تو آپ کچھ اور کہتی تھیں۔'' میں نے انہیں یاد دلایا کہ وہ کیا کہتی رہی تھیں۔

''پہلے میں اس سے اس طرح ملی نہیں تھی جس طرح اب ملی ہوں۔'' اپیا نے کہا تھا۔ اپیا نے میری مایوسی مزید بڑھا دی تھی۔

''وہ سہاروں کے بغیر آگے بڑھنے والی لڑکی ہے۔ اپنے طور پر کچھ کرنا چاہتی ہے۔'' اپیا نے کہا اور میں انہیں دیکھتا رہا تھا۔

ائرپورٹ کے سامنے کے سگنل پر گاڑی رکی تو میں پھر ماضی سے نکل آیا تھا۔ ساڑھے چھ بجنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ میں نے کار پارکنگ میں لگائی اور سیٹ پیچھے کر کے بیٹھ گیا۔

''میں نے کل بھی تم سے کہا تھا کہ جو تم کہنا چاہتے ہو وہ میں جانتی ہوں لیکن تم نے ضد کی اور پھر تمہارا اہم پر اتنا بڑا احسان ہے اسی کو سوچ کر آگئی ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔

میں اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ہائی ٹی پر لایا تھا اور ہم ایک کونے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے کہ اس نے کہنا شروع کیا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ گفتگو کا آغاز اس نے کیا تھا ورنہ پورے راستے میں یہی سوچتا رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کیسے کروں گا۔

میں اس کے گھر پھلوں کے ٹوکرے کے ساتھ پہنچا تھا تو رافعہ نے مجھے پھلوں کے ٹوکرے کے ساتھ دیکھتے ہی کہا تھا۔ ''شہزاد بھائی! ابھی آپ آئے نہیں تھے کہ میں امی سے کہہ رہی تھی کہ اب ہمیں پھلوں کی دکان کھول لینی چاہیے۔

''باجی کا کہنا ہے کہ ہمیں تین وقت کھانے میں پھل کھانے چاہئیں، اس سے طاقت بھی ملے گی، خرچ بھی بچے گا اور انہیں کھانا بنانے سے فرصت بھی ملے گی۔'' رافعہ نے کہا اور کہتی چلی گئی تھی۔

''آؤ بیٹا بیٹھو۔'' گل کی امی نے کہا تھا۔ ان سے میری پہلی ملاقات تب ہوئی تھی، جب وہ کمرے میں شفٹ ہوئی تھیں۔ میرا غائبانہ تعارف دونوں بہنیں پہلے ہی کرا چکی تھیں۔

''آنٹی! ایک سالگرہ میں جانا ہے اپنی کلاس فیلو کی۔'' میں نے گل کی دی ہوئی ہدایت پر عمل کیا تھا اور ہم ہائی ٹی پر آگئے تھے۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں کیا کہنے والا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''تمہارا اپنے گھر مجھے چار بار مدعو کرنا، اپنے گھر والوں سے مجھے ملوانا، اپنی سالگرہ پر بلانا جہاں صرف تمہارے گھر والے ہوں اور تمہارا ایک دوست ہو۔'' اس نے کہا تھا۔

''گل! میں سنجیدہ ہوں۔'' میں نے کہا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اتنا کہنا کافی نہیں ہوگا۔ ''میں تم سے شادی کرنا

چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جسے میں کوئی نام نہ دے سکا۔

''یہ فقرہ تم اس سے پہلے کتنی بار کہہ چکے ہو؟'' اس نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''پہلی بار کہہ رہا ہوں۔'' میں پہلے ہی نروس تھا، اس کے طنزیہ فقرے نے مزید نروس کر دیا تھا۔

''یہ فقرہ بھی کتنی بار کہہ چکے ہو؟'' اس نے میرا جواب سنتے ہی کہا تھا۔

''کون سا فقرہ.....؟'' میں سمجھ نہیں سکا تو میں نے سوال کر دیا۔

''یہی کہ پہلی بار کہہ رہا ہوں۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''تمہیں یقین کیوں نہیں آتا میری باتوں کا؟'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہوتی چلی گئی۔

''جن لڑکیوں نے یقین کیا، انہیں کیا حاصل ہوا جو مجھے یقین کر کے حاصل ہوگا۔'' اس نے کہا تو میں لاجواب ہو گیا تھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ ان لڑکیوں کی قربت میں نے نہیں چاہی تھی، وہ خود سے میرے قریب آئی تھیں؟'' میں نے کہا۔

''مان لیتی ہوں تمہاری بات کہ وہ شکار کرنے آئی تھیں اور خود شکار ہو گئیں کیونکہ خوابوں میں رہنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ وہ تمہاری قیمتی گاڑی، بڑے سے گھر اور تمہاری مہنگی ڈریسنگ سے متاثر ہوئیں۔ تم نے ان کے خوابوں کو اور ہوا دی اور تم نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو حاصل کرنا چاہتے تھے۔'' اس نے تلخ انداز میں اپنی بات کہی تھی۔

''شاید حقیقت ایسی نہیں ہے۔'' میں نے کہا لیکن اس نے میرے فقرے پر توجہ نہیں دی تھی۔

''جو لڑکی تمہاری بڑی کوٹھی، قیمتی گاڑی اور مردانہ وجاہت سے متاثر نہ ہوئی، اس کے لیے تم نے شادی کا جال بُنا۔'' اس نے کہا، اب کی بار اس کے لہجے کی تلخی پہلے سے زیادہ نمایاں تھی۔

''گل! مجھے بات تو کرنے دو۔'' میں نے کہا تو وہ رک کر مجھے دیکھنے لگی۔

''تم سے پہلے میں نے تمہارے بارے میں گھر پر بات کی تھی۔ اگر میرا ارادہ چیٹ کرنے کا ہوتا تو میں گھر پر بات کیوں کرتا؟'' اپنے طور پر میں نے مضبوط دلیل دی تھی۔

''تمہارے پاپا اور اپیا کے رویوں سے یہیں ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے گھر پر بات کی ہے بلکہ تمہاری ماما کی مجھ سے چڑنے کی وجہ بھی یہی ہے۔'' اس نے کہا تھا۔

''کچھ دنوں کی بات ہے، اس کے بعد وہ نارمل ہو جائیں گی۔'' میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے میری بات اچک لی۔

''وہ تو اتنے برس بعد اب تک تمہارے والد کو مڈل کلاس کا طعنہ دیتی ہیں اور یہ بات اپیا نے بتائی ہے لیکن میرا سوال تو کچھ اور ہے۔'' وہ کہتے کہتے رکی تھی۔

''تم مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے ایسا سوال کیا جس کا جواب میں اپنے آپ کو نہیں دے سکا تھا۔

''نہ میں کوئی جہیز لا سکتی ہوں، نہ میری فرسٹ کلاس فرسٹ کی ڈگری تمہارے کسی کام کی ہے۔ خوب صورت میں ہوں نہیں، یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ ایک خوبی جو مجھے خود میں نظر آتی ہے وہ میرا لانبا قد ہے مگر میرے پانچ فٹ دس انچ قد کو تم نے اونٹ کا ٹائٹل دیا تھا اور جو مجھ پر اس طرح چپک گیا کہ ٹیچرز تک مجھ سے یہ سوال کر چکے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''وہ تو صرف ایک مذاق تھا۔'' میں نے شرمندگی سے کہا تو وہ کاندھے اچکا کر رہ گئی۔

''ہمایوں گروپ آف انڈسٹری کے مالک کے اکلوتے بیٹے شہزاد ہمایوں..... اگر تم میں سے تمہارے باپ کی دولت نکال دی جائے تو تمہارے پاس کیا بچے گا؟'' اس نے سوال کیا اور خود ہی جواب دینے لگی۔

''ایک ایسا شخص جو ہمیشہ کلاس شروع ہونے کے بعد آتا ہے اور کلاس سے نکلنے والا پہلا شخص ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کا وقت اپنی دوست لڑکیوں کے ساتھ گزرتا ہے، رات دیر تک پارٹیوں میں مشغول رہتا ہے، اس کی اپنی پہچان کوئی نہیں۔'' وہ اپنی تلخ گفتگو میں سانس لینے رکی تو میں بول پڑا تھا۔

''ایک امیر گھر میں پیدا ہونا کیا اتنا ہی بڑا گناہ ہے؟ مجھ میں برائیاں دیکھتے ہوئے یہ نہیں دیکھ پا رہیں کہ نہ میں کوئی نشہ کرتا ہوں..... نہ جوا کھیلتا ہوں جبکہ ہماری سوسائٹی میں یہ بیماریاں عام ہیں۔'' میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن گل نے میری بات کاٹ دی۔

''جو خوبیاں تم اپنی بتا رہے ہو، وہ اپیا کی کڑی نظروں کی وجہ سے ہیں اور اس کے لیے تمہیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' اس نے میری یہ دلیل بھی رد کر دی تھی۔

''جانے تم کس آئیڈیل کی تلاش میں ہو؟'' میں نے

UUNOVELS.COM

کہا تو اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

''میں ایک عام سے بندے کی تلاش میں ہوں جو شام میں گھر آئے تو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ وہ میرے پکائے ہوئے کھانے کی تعریف کرے۔ نہ خود پارٹیوں میں جائے اور نہ مجھے مجبور کرے۔'' وہ بولتے بولتے رکی تھی۔

''چھوٹا سا گھر چاہتی ہوں کہ آواز دوں تو ایک کونے سے دوسرے کونے تک آواز پہنچ جائے، نہ کہ ایسا گھر کہ انٹرکام پر تلاش کرتی رہوں۔'' وہ خاموش ہوئی تو میرے ذہن میں ماما کے الفاظ گونجے۔

''ایک چھوٹا سا گھر بنانا چاہتی ہوں جو ہم نے اپنی تنخواہوں سے بچت کر کے بنایا ہو نہ کہ وہ گھر جو والدین کی دین ہو۔'' اس نے کہا تھا۔

میرے نزدیک وہ جو باتیں کر رہی تھی وہ آئیڈیل ازم کا شکار ہو کر کر رہی تھی لیکن میں اس سے یہ کہہ نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ وہ میری بات سن کر بھڑکی نہیں تھی۔

''تمہارے نانا نے اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے تمہارے پاپا کو اس لیے سلیکٹ کیا تھا کہ ان میں انہیں اسپارک نظر آیا تھا۔ وہ اس وقت بھی ذمے دار شخص تھے۔ ان میں وہ لاابالی پن نہیں تھا جو تم میں ہے۔'' اس نے ایپا سے سنی باتیں دہرائی تھیں۔

''وقت آئے گا تو میں بھی ذمے دار ہو جاؤں گا۔'' میں نے اس کی مسکراہٹ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

''وقت آئے گا مطلب، تم اپنے والد کی وفات کا انتظار کر رہے ہو؟'' اس نے میری بات کا الٹا مطلب لیا تھا۔

''کیا ہم اگلے ہفتے آج ہی کے دن مل سکتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''ہم دس بار ملیں لیکن میرا جواب وہی ہوگا۔'' اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

''بہت جلدی آ گئے۔'' میں اسے چھوڑنے گھر گیا تو اس کی والدہ سے ملنے چلا گیا۔

''کیا ایپا اسلام آباد چلی گئیں؟'' میں گھر سے نکل رہا تھا کہ اس نے سوال کیا۔

''ان کے شوہر رات کی فلائٹ سے آ رہے ہیں اور وہ اچھی بیوی بننے کے لیے ان سے پہلے اسلام آباد پہنچ گئی ہیں۔'' میں نے کہا تھا۔ رافعہ مجھے باہر کار تک چھوڑنے آئی تو میرے ذہن میں ترکیب آئی۔ ''رات جلدی نہ سونا، گل سو جائے تو مجھے فون کر لینا۔'' میں نے کہا، وہ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی مگر اس نے وعدہ کر لیا تھا۔

رافعہ کے فون آنے سے پہلے میں نے اس پر سوچنا شروع کیا تھا کہ مجھے اس سے بات کس طرح شروع کرنی ہے۔ ابھی میں اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ خیال آیا کہ ایپا سے مشورہ کر لوں لیکن پھر خیال آیا کہ وہ اپنے شوہر کو ائرپورٹ چھوڑنے جا رہی ہوں گی لیکن پھر میں نے انہیں فون کر ہی دیا۔ انہوں نے دوسری ہی کال پر ریسیو کر لیا۔ میں نے انہیں اپنے پلان کے بارے میں بتایا تو وہ چیخ پڑی تھیں۔

''یہ حماقت نہ کرنا۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''تمہارا خیال ہے کہ ان کی والدہ نادان ہیں، وہ کچھ نہیں سمجھ رہیں۔'' انہوں نے ڈانٹنے نہیں بلکہ پھنکارنے والے انداز میں کہا تھا۔

''ایپا! گل تو کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔'' میں نے کہا تھا۔

''میں نے باتوں باتوں میں ان کی والدہ سے بات کی تھی کہ گل کا کوئی رشتہ وغیرہ ہے تو انہوں نے بتایا تھا کہ رشتے تو ہیں لیکن گل نے منع کر دیا تھا۔'' ایپا نے کہا۔

''تو کیا خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں؟'' میں نے کہا تھا۔

''گل کی والدہ تمہیں پسند کرتی ہیں۔ اس کی بہن بھی بہت زیادہ پسند کرتی ہے لیکن سوال گل کی رضامندی کا ہے۔'' انہوں نے جواب دینا شروع کیا تھا۔

میں کار کی سیٹ سے ٹیک لگائے ماضی میں بھٹک رہا تھا کہ فون کی بیل ہوئی تو میں نے اسکرین پر اس کا نام دیکھتے ہی اٹھا لیا پھر میں ہیلو کے بعد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ''گھر سے تو نکل گئے ہو یا ابھی گھر پر ہی ہو؟'' اس نے کہا تھا۔

''پارکنگ میں ہوں۔'' میں نے کار سے نیچے اترتے ہوئے کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے کار کا دروازہ بند کیا۔

''گڈ.....'' اس نے کہا تھا۔

''کار کا دروازہ اتنی زور سے بند نہ کرتے تب بھی میں یقین کر لیتی۔'' اس نے کہا تھا۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔

''جہاز اتر گیا ہے، باہر آنے میں کچھ وقت لگے گا۔'' اس نے کہا تو میں خاموشی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

''بہت ساری تبدیلیوں کے بارے میں سن رہی تھی لیکن ہمیشہ سے دیر سے آنے والے کو وقت پر آتا دیکھ کر اس تبدیلی پر خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا تھا۔

''تبدیلی تو شاید بہت سی جگہ آئی ہے۔'' میں مزید خاموش نہیں رہ سکا اور وہ ہنس دی تھی۔

اس نے باہر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ باہر آنے والے اولین مسافروں میں وہ تھی، ایک چھوٹا سا اٹیچی

کیس اس کے ساتھ تھا اور بڑا سا بیگ اس نے گلے میں لٹکایا ہوا تھا۔

میں نے اس سے اٹیچی لی اور پارکنگ کی طرف چل پڑا جہاں کار موجود تھی لیکن میرے چلتے ہوئے اس نے اچانک کہا۔

''ریسٹورنٹ میں کچھ دیر نہ بیٹھیں۔'' اس نے کہا۔

''جہاں سے خدا حافظ کہا تھا، وہیں پر خوش آمدید کہنا ضروری ہے۔'' میں نے کہا تو وہ مسکرا دی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں مجھے شرماہٹ بھی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس کے اسلام آباد روانگی کے وقت میں نے یہیں پر اسے خدا حافظ کہا تھا۔

ہم اسی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو اس نے کونے کی میز منتخب کی لیکن یہ وہ میز نہیں تھی۔ وہ دوسرے کونے میں تھی جہاں ایک جوڑا دو بچوں کے ساتھ موجود تھا۔

''شاید آئندہ کبھی ایسا وقت آئے کہ ہم بھی ان کی طرح یہاں موجود ہوں۔'' میں نے اس جوڑے کی جانب اشارہ کیا تو اس نے نظریں جھکالی تھیں' اس کا یہ انداز میرے لیے بالکل اجنبی تھا' اس وقت جب میں اس سے اٹیچی کیس لے رہا تھا، اس وقت بھی اس نے نظریں جھکالی تھیں۔ اس کے چہرے پر لالی آگئی تھی جو اس سے پہلے میں نے کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

''میں منتظر ہوں۔'' میں نے آرڈر دینے کے بعد کہا اور وہ یوں چونکی تھی جیسے میں اس کو خیالوں میں بھٹکتے ہوئے واپس لایا ہوں۔ اس نے کہا کچھ نہیں، صرف بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر جیسے کہہ رہی ہو کہ کس بات کے منتظر ہو۔

''تم نے فون پر مجھ سے کچھ کہا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی اور اس کی نظریں ایک بار پھر جھک گئیں جیسے اسے اپنا وعدہ یاد آ گیا ہو۔

''میری تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ تو آپ خود ہیں۔'' اس نے کچھ دیر بعد بولنا شروع کیا تھا۔ ''لیکن کچھ اور وجوہات بھی ہیں جس نے بتایا کہ میری سوچ کچھ صحیح ہے اور زیادہ غلط ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔

''اسلام آباد میں میرے ساتھ آفس میں ایک شخص کام کرتا تھا علی وارث ..... اس کے خیالات بھی تقریباً وہی تھے جو میرے تھے' وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتا تھا جیسی میں کرتی تھی۔'' گل نے کہنا شروع کیا تھا۔

''میں نے اپیا سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگیں کہ عملی طور پر وہ ثابت کرے تب بات کرنا۔'' گل چودھری کی گفتگو میں وقفہ آیا تو میں بول پڑا تھا۔

''تم اپیا سے رابطے میں تھیں؟'' میں نے سوال کیا تو اس کی گردن ہل گئی تھی۔

''اپیا سے بھی اور ان کے شوہر سے بھی۔'' گل کا جواب تھا اور مجھے اپیا پر غصہ آیا کہ انہوں نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن میں خاموش رہا تھا۔

''وارث نے چار ماہ قبل ایک پرائیویٹ فرم جوائن کر لی تھی۔ تمام لوگوں نے منع کیا کہ بڑی آرگنائزیشن چھوڑ کر چھوٹی اور پرائیویٹ کمپنی میں نہ جاؤ لیکن اس نے کسی کی بات نہ مانی۔ اب دس روز قبل اس کی وجہ بھی سامنے آ گئی۔'' گل نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

''اور وہ وجہ کیا تھی؟'' میں نے اس کی طویل ہوتی خاموشی کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

''اس نے اس کمپنی کے مالک کی طلاق یافتہ بیٹی سے شادی کر لی ہے جو اس سے عمر میں تو بڑی ہو گی ہی لیکن چھوٹے سے قد کی ایک موٹی سی لڑکی ہے۔'' گل یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

''تو اس شادی نے تمہاری سوچ بدل دی؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا جس کا اس نے فوری جواب نہیں دیا۔

''میرے قریبی دوستوں مجم نے بھی یہی کیا۔'' اس نے کہا تھا۔

''اپنی ماموں زاد سے منگنی توڑ کر روبی کی بڑی بہن سے شادی کر لی اور نادر نے ایک گرین کارڈ ہولڈر سے شادی کی اور اگلے چند دنوں میں وہ امریکا چلا جائے گا۔'' گل یہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھی۔

میرا دل چاہا کہ میں کہہ دوں کہ تم نے سوچا کہ جب سب یہ کر رہے ہیں تو میں کیوں پیچھے رہ جاؤں۔ میں نے سوچا لیکن پھر اس لیے خاموش ہو گیا کہ کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ ایک بار پھر سے بھڑک جائے۔

''تم نے اپنے آنے کا اپیا سے ذکر کیا تھا؟'' میں نے سوال کیا تو اس کی گردن نفی میں ہل گئی۔

''اپیا کو میری تبدیلی کا کچھ اندازہ تھا لیکن شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں اتنی بدل جاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہماری اسلام آباد میں جو آخری ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو انہوں نے ہر ملاقات میں اس کا ذکر کیا تھا کہ ماما زور و شور سے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔'' گل اتنا کہہ کر رکی اور پھر

UUNOVELS.COM

دوبارہ سے اپنی بات شروع کی۔

''کل شام جب میری ان سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے لڑکی پسند کر لی ہے اور ان کے گھر ڈنر پر آپ سب لوگ مدعو ہیں۔'' اس نے اپنی بات مکمل کی ہی تھی کہ میرے موبائل پر اپیا کی کال آئی۔

''چیزیں فائنل ہو گئیں یا مجھے مدد کے لیے آنا پڑے گا؟'' اپیا نے سوال کیا تھا۔

''آپ واقعی شیطان ہیں کہ ابھی آپ کا ذکر ہی ہو رہا تھا کہ آپ کا فون آ گیا۔'' میں نے کہا تو اپیا نے میرے موڈ سے بہت کچھ اندازہ لگا لیا تبھی تو ان کا ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا تھا۔

''میں شیطان نہیں، اس کی بڑی بہن ہوں۔'' اپیا نے کہا تو میرے ساتھ گل کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میں نے مائک اسی لیے کھولا تھا کہ گل بھی ان کی بات سن سکے۔

''گھر پر سیدھے ڈنر کے لیے آ رہے ہو؟'' اپیا نے سوال کیا۔

''وہاں ہم آئے تو ماما شاید زندگی بھر مجھ سے بات نہ کریں۔'' میں نے کہا تو اپیا کا زندگی سے بھرپور ایک قہقہہ سنائی دیا۔

ہم نے وہاں سے اٹھنے سے پہلے پروگرام کو حتمی شکل دی تھی۔ مجھے گل کو اس کے گھر ڈراپ کرنا تھا اور وہاں سے مجھے اپنے گھر جانا تھا جہاں ایک طوفان میرا منتظر تھا۔

ہم گل کے گھر پہنچے تو رافعہ نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے اور گل کو ساتھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ گل سے پہلے اس نے مجھے گلے لگایا تھا۔ ''اللہ نے میری دعائیں قبول کر لیں۔'' اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا۔

میں وہاں سے جلد نکلنے کے موڈ میں تھا لیکن رافعہ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

''آج صبح سے میرا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ جب کچھ سمجھ نہیں آیا تو میں نے بریانی بنا ڈالی۔''

''تمہارے ہاتھ کی بریانی کھانے سے بہتر ہے کہ تم میرے لیے بند کباب منگوا لو۔'' گل نے کہا تھا۔

''آپ سے میں کہہ بھی رہی ہوں، آپ تو اتنی بری ہیں کہ مجھے کل شام بات کرتے ہوئے بھی کچھ نہیں بتایا۔'' رافعہ نے شکوہ کیا۔

''میں نے پوچھا بھی رافعہ کو بتانا ہے تو منع کر دیا۔'' میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے کہا تھا لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔

''آپ بھی برے ہیں۔'' اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

''آپ کو معلوم تھا لیکن آپ نے بھی نہیں بتایا۔'' اس نے کہا تو میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

''کیا کروں بہن! اتنی مشکل سے تو کشتی بھنور سے نکلی تھی۔'' میں نے کہا تو قہقہہ لگانے والوں میں گل بھی شامل تھی۔

کھانا کھا کر نکلا تو گھر پہنچنے سے پہلے اپیا کو فون کر دیا کہ گھر پہنچے یا نہیں لیکن انہوں نے ایک اور خبر سنا دی۔

''میں تو ہضم کر چکی تھی لیکن پاپا سے نہ رکا گیا اور انہوں نے اگل دیا اور ماما کا غصے سے برا حال ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''جہاں سب فیس کیا ہے، یہ بھی کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔

میں معاملے کو جتنا آسان سمجھ رہا تھا، وہ ویسا نہیں تھا۔ ماما نے مجھے دیکھتے ہی اپنا غصہ انڈیلنا شروع کر دیا۔

''کیا دیکھا ہے تم نے اس میں، کم از کم ایک بار اسے تو دیکھ لیتے، اس سے بات کرتے پھر کوئی فیصلہ کرتے۔'' ماما نے کہا پھر اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا پاپا میری مدد کو آئے۔

''کیا خرابی ہے اس میں؟'' پاپا نے سوال کیا۔

''رنگ دیکھا ہے اس کا، کیا مقابلہ ہے اس کا.....'' ماما نے پاپا کو جواب دینا شروع کیا تھا۔

''یہ برائی تو اس میں ماں کی طرف سے آئی ہے۔'' پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا تو ہم سب مسکرانے لگے۔

''آپ تو خاموش ہی رہیں۔'' ماما نے پاپا کو مخاطب کیا اور وہ بھی بھرپور غصے سے۔

''کیا دیکھا ہے تم لوگوں نے اس میں، کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں۔ لڑکیاں خود کما کر اپنی فیسیں نکال رہی ہیں۔'' انہوں نے ایک اور اعتراض کیا۔

''ماما دس از ٹو مچ۔'' اپیا کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

''کہا تو سچ ہے۔'' ماما نے اسی انداز میں جواب دیا تھا۔

''سلام ہے ان تمام بچوں پر جو محنت کر کے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور صرف تعلیم حاصل نہیں کرتے بلکہ ٹیوشنز میں وقت لگانے کے بعد بھی فرسٹ کلاس فرسٹ آتے ہیں۔'' اپیا واقعی غصے میں آ گئی تھیں۔

''کیا ہے اس میں جو تو دیوانہ ہو رہا ہے؟'' ماما نے کہا تو میری ہنسی نکل گئی اور میرے ساتھ پاپا اور اپیا بھی مسکرا دی تھیں۔

UUNOVELS.COM

''شیریں نے فرہاد سے پہاڑ کھدوا دیا تھا اور تمہاری ہونے والی بہو کا کمال یہ ہے کہ آنے سے پہلے ہی اس نے تمہارے بیٹے کو اتنا ریگولر آفس بھی کر دیا ہے کہ اتنا تو میں بھی نہیں تھا۔''

''میں نے کہہ دیا ہے کہ میں دوبارہ ذلیل ہونے اس دہلیز پر نہیں جاؤں گی۔'' ماما نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

''میں تو جاؤں گا اور اس لیے جاؤں گا کہ میں نہیں چاہتا کہ یہ بات سننے کو ملے کہ ہمایوں صاحب کے بیٹے نے کورٹ میرج کر لی ہے۔'' پاپا کا انداز بھی فیصلہ کن تھا۔

''اس کی نوبت نہیں آئے گی پاپا..... ماما اپنے اکلوتے بیٹے کی بات مان لیں گی۔'' میں نے ماما کی گردن میں ہاتھ ڈال دیے تھے۔

''تم ایک بار اس سے مل تو لیتے۔'' ماما نے جواب دیا۔

''ایک بار نہیں، دس بار مل لوں گا لیکن میرا فیصلہ وہی ہوگا۔'' یہ میرا جواب تھا۔

ماما اس جواب پر خاموش رہی تھیں اور کچھ دیر بعد بغیر کچھ کہے اٹھ کر چل دی تھیں۔ اپیا نے انہیں روکنا چاہا لیکن پاپا نے اشارے سے منع کیا۔

صبح ناشتے پر بھی ماما کا منہ پھولا ہی رہا۔ ان کے لہجے میں اکھڑ پن تھا۔

دفتر میں پاپا سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا۔

''شکست ماننے کے بعد وہ اس کا اعلان کرنے میں ہچکچا رہی ہیں۔'' مجھے ان کا یہ فقرہ قرین قیاس لگتا تھا لیکن میں ان سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ جب تک وہ ہچکچاتی رہیں گی، میں کیا کروں گا لیکن اس شام اپیا نے ایک نیا بم پھوڑا۔

''سلمان ایک ہفتے کے لیے امریکا کی کانفرنس میں جا رہے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں۔'' اپیا نے ڈنر کے دوران کہا تھا۔

''کتنے دن کے لیے جا رہی ہو؟'' پاپا نے پوچھا۔

''کانفرنس کے بعد ان کا خیال ہے کہ دو ہفتے کے لیے وہاں رک جائیں۔'' اپیا نے جواب دیا۔

''اور یہاں کیا ہوگا؟'' ماما یک دم بول پڑی تھیں۔

''یہاں کیا ہوتا ہے؟'' اپیا نے اس طرح سوال کیا تھا جیسے کچھ نہ جانتی ہوں۔

''یہ جو تم تینوں نے چکر چلایا ہوا ہے۔'' ماما نے باری باری ہم تینوں کی جانب دیکھ کر کہا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ کل جا کر بات کر لیتے ہیں اور منگنی ایک ہفتے میں کر لیں گے اور یہ جب .... واپس آئیں گے تب شادی ہو جائے گی۔'' پاپا نے کہا لیکن ماما نے فوراً ہی انکار کر دیا تھا۔

''جو کچھ ہونا ہے، وہ ایک ساتھ ہوگا۔'' ماما نے کہا تو اپیا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''ایک ہفتے میں تو شادی نہیں ہو سکے گی۔'' پاپا نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

''اسے بھائی کا اتنا ہی خیال ہے تو امریکا نہ جائے۔'' ماما نے فیصلہ سنا دیا۔

''میں سلمان سے بات کرتی ہوں۔'' اپیا نے کہا۔

''جو بات کرنی ہے وہ کر لو لیکن یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' ماما نے کہا تھا۔

اپیا اور پاپا کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ دال میں کچھ نہیں بہت کچھ کالا ہے۔

اگلی صبح سلمان بھائی کراچی پہنچ گئے تھے پھر اسی شام وہ سب گل کے گھر گئے اور شادی کی تاریخ پکی ہو گئی۔ ماما کی خواہش کے مطابق جو کچھ ہونا تھا، وہ ایک ساتھ ہی ہونا تھا۔ سلمان بھائی کو اکیلے امریکا جانا تھا اور دس دن بعد انہیں واپس آنا تھا اور تین ہفتے بعد شادی میں شریک ہونا تھا۔

سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسے طے ہوا تھا۔ گل چودھری اب گل شہزاد ہے۔ پاپا کے مشورے اور میری مخالفت کے باوجود اس نے گارمنٹ کا بزنس شروع کر دیا۔ چار برسوں میں اس کا کاروبار ہم سے زیادہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ وہ اپنا آدھا وقت ہمارے آفس کو دیتی ہے اور آدھا گارمنٹ فیکٹری کو۔ جب تک گھر میں رہتی ہے بچوں اور کچن میں رہتی ہے۔

ماما آدھی سے زیادہ مڈل کلاس ہو چکی ہیں۔ انہیں بہو کے ہاتھ کے کھانے پسند آتے ہیں۔ پارٹیز اب بھی ہمارے یہاں ہوتی ہیں لیکن کراچی میں بارش کی طرح کبھی کبھی ہوتی ہیں۔ بہزاد میرے بڑے بیٹے نے نرسری میں جانا شروع کر دیا ہے۔ اس کے اسکول لانے اور لے جانے کی ذمے داری بھی ماما کی ہے۔ دوسرے بچے کی آمد متوقع ہے جس پر ماما اور گل میں پہلا اختلاف سامنے آ گیا ہے، گل کی خواہش ہے کہ بیٹی ہو اور ماما کہتی ہیں بیٹی ہوئی تو پھوپی پر نہ جائے۔ میں خاموش ہوں لیکن گل کھل کر کہتی ہے کہ اپیا میری آئیڈیل ہیں۔ پاپا کہتے تو کچھ نہیں ہیں لیکن زیر لب مسکراتے ضرور ہیں اور اپیا کا نشانہ کل بھی میں تھا آج بھی میں ہوں اور گل اس میں ان کی مددگار اور ہمنوا ہے۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

شہ زور

اسما قادری

قسط :4

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اس روز صبح سویرے ڈاکٹر کے راؤنڈ سے بھی پہلے عالم شاہ کے والد، صداقت شاہ کی عیادت کے لیے عرفان اللہ کی آمد حیران کن تھی۔ صداقت شاہ صوبائی اسمبلی کے رکن ضرور تھے لیکن ان کا شمار ان افراد میں نہیں ہوتا تھا جن کا چہرہ ٹی وی ویژن کی اسکرین پر تواتر سے نظر آتا رہتا ہے اور عوام کی اکثریت جن سے واقف ہوتی ہے۔ بااثر جاگیردار ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو محدود رکھنا پسند کرتے تھے اور اب بھی خاموشی سے اسپتال میں اپنا علاج کروا رہے تھے۔ ایسے میں عرفان اللہ کا ان کی عیادت کے لیے چلے آنا واقعی ایک حیران کن بات تھی۔ سماجی کارکن کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھنے والے عرفان اللہ بھی اسی پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہے تھے جس پارٹی کے ساتھ صداقت شاہ منسلک تھے۔ بنیادی طور پر بزنس مین عرفان اللہ نے چند سال قبل ہی سماجی خدمت کے میدان میں قدم رکھا تھا لیکن اس سلسلے میں بہت تیزی سے ان کا نام اوپر آ گیا تھا۔ سماجی خدمت سے وہ سیاست کی طرف آئے تو لوگوں کی سمجھ میں آنا شروع ہو گیا کہ ایک بزنس مین کے سماجی خدمت کے شعبے میں آنے کی کیا وجہ تھی۔ بزنس مین کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ عرفان اللہ بھی سیاست کے میدان میں آنے کے لیے اب تک سماجی خدمت کے شعبے میں سرمایہ کاری کرتے تھے۔ بظاہر وہ بالکل اچانک اور ''عوامی اصرار'' پر سیاست میں آئے تھے لیکن سمجھنے والے سب سمجھتے تھے۔ عالم شاہ بہرحال انہیں اسپتال میں دیکھ کر الجھن میں پڑ گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان ہی کی پارٹی کے ایک جانے مانے وزیر صاحب بھی موجود تھے۔

''یہ کیا صداقت شاہ صاحبں! آپ ادھر بیمار ہوا اور ہم کو خبر ہی نہیں ہے۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے صاحبں کہ آپ ہم کو غیر سمجھتے ہو۔'' آتے کے ساتھ ہی وہ وزیر صاحب، صداقت شاہ سے شکوہ کرنے لگے۔

''ایسی بات نہیں چانڈیو صاحب! بس میری عادت نہیں ہے اپنی خاطر کسی کو تکلیف میں ڈالنے کی۔ گھر والوں کو بھی بے خبر ہی رکھا ہوا ہے، بس یہ میرا بیٹا عالم شاہ ہے نا، اسے دن رات اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے اور مزے سے اپنا علاج کروا رہا ہوں بلکہ اب تو ٹھیک ہی ہو گیا ہوں اور آج کل میں واپس گاؤں بھی جانے والا ہوں۔'' صداقت شاہ نے مسکرا کر اپنی صفائی پیش کی۔

''پھر تو ہم نے آپ کو ٹھیک وقت پر ہی پکڑ لیا نا۔ ہمیں خبر ملنے میں مزید دیر ہو جاتی تو آپ نے تو ملے بغیر ہی واپس چلے جانا تھا۔'' چانڈیو کا لہجہ بڑا دوستانہ تھا، اس بار صداقت شاہ نے محض مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ چانڈیو نے بھی شکایت کے سلسلے کو مزید آگے نہیں بڑھایا اور عرفان اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ اپنے عرفان اللہ صاحب سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ بڑے انسان دوست آدمی ہیں۔ پارٹی میں ان کی شمولیت سے پارٹی کو نیک نامی بھی ملی ہے اور مالی فائدہ بھی ہوا ہے۔ ان کی وجہ سے اس بار ہمیں بہت زیادہ فنڈز ملے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ تھوڑے ہی عرصے میں عرفان اللہ صاحب ہماری پارٹی کا اہم ستون بن گئے ہیں۔'' چانڈیو، عرفان اللہ کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور عالم شاہ شدید بوریت محسوس کر رہا تھا۔ ان لوگوں کی آمد کی وجہ سے اسے حنین کو فون کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ رات گئے اسپتال واپس آ کر سویا تھا اس لیے کچھ دیر قبل ہی جاگا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر حنین سے رابطہ کرنے کا موقع ملتا، اس سے پہلے ہی وہ لوگ آ گئے۔ وہ کچھ دیر تو اخلاقاً وہاں رک گیا لیکن سلطان جیسے شخص کے باپ کی مسلسل تعریفیں سننا ممکن نہیں تھا اس لیے باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے پہلے روم سروس کو کمرے میں مہمانوں کی خاطر مدارت کا آرڈر دیا پھر حنین کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا موبائل آف جا رہا تھا۔ اس نے گھر فون کر کے معلوم کیا تو پتا چلا کہ حنین صبح صبح وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ اس نے ٹائم دیکھا تو خیال آیا کہ حنین یونیورسٹی میں کلاس لے رہا ہو گا۔ تازہ صورتِ حال جاننے کے لیے اس نے بشریٰ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کے نمبر پر بیل جا رہی تھی لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ عالم شاہ نے سوچا کہ وہ کہیں مصروف ہو گی اس لیے موبائل بند کر دیا۔ پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد وہ اسے پھر کال کر رہا تھا لیکن وہ اب بھی کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ عالم شاہ کو کچھ عجیب لگا۔ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مزید دو بار اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن اب بھی صورتِ حال وہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر ایک بار پھر حنین کا نمبر ملایا لیکن اس کا نمبر ہنوز بند تھا۔ اس نے سوچا کہ سرمد کو فون کرے اور اس کی ڈیوٹی لگائے کہ وہ معلوم کرے کہ کیا گڑبڑ ہے لیکن اس سے پہلے ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور عرفان اللہ اور چانڈیو باہر نکلے۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسے ان کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وہ دونوں اس کے قریب آ کر رکے۔ عرفان اللہ نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دی اور بولے۔

''تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی بیٹا! جوان اولاد باپ کا

بازو ہوتی ہے۔ تمہارے والد بوڑھے اور کمزور ہو رہے ہیں، اب تم نے ہی ان کی جگہ سنبھالنی ہے۔ بے کار تجربات میں وقت گزارنے کے بجائے ان کے تجربے سے فائدہ اٹھانا سیکھو۔'' اتنی بات کہہ کر وہ دونوں کچھ فاصلے پر کھڑے اپنے باڈی گارڈز کے جلو میں آگے بڑھ گئے اور وہ حیران سا انہیں دیکھتا رہ گیا کہ پہلی ملاقات میں اسے ایسی نصیحت سے نوازنا بے معنی نہیں تھا۔ کم از کم وہ اپنے والد سے یہ... امید نہیں کر سکتا تھا کہ انہوں نے اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہی ہو گی کہ عرفان اللہ نے ان سے ہمدردی میں اسے نصیحت کرنا ضروری سمجھا ہو۔ سرمد کو فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ دوبارہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بستر پر لیٹے صداقت شاہ سوچوں میں گم تھے۔

''خیریت تو ہے بابا سائیں! آپ کچھ فکر مند نظر آ رہے ہیں؟'' اس نے فوراً ہی ان کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا۔

''جب اولاد اتنے پُرخطر کام کرنے لگے کہ اس کی سلامتی مشکوک ہو جائے تو پھر آدمی کے پاس تفکرات کے سوا کچھ نہیں بچتا۔'' انہوں نے نہایت گمبھیر لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔ عالم شاہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا سائیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا ضرور لیکن خود اس کا ذہن بہت سے حساب کتاب لگا رہا تھا۔ رات کی کارروائی کے بعد عرفان اللہ کی صبح صبح آمد اور اس کے بعد بابا کی پریشانی بے معنی نہیں تھی۔

''کل رات جب میں سو رہا تھا تو تم کہاں تھے؟'' صداقت شاہ نے اس سے سوال کیا۔ جواب میں وہ ان سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اس لیے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔ صداقت شاہ نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔

''تم میرے اکلوتے بیٹے ہو عالم شاہ اور میں تمہیں کسی فضول چکر میں گنوانا نہیں چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں روایتی زمیندار نہیں ہوں اور سیاست میں بھی صرف اس لیے آیا ہوں کہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے کچھ کر سکوں۔ میری جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ صرف اپنے مفادات دیکھتا اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا اس لیے خود اس گندگی میں اترنے پر مجبور ہو گیا۔ میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور اپنے مفادات کے لیے کس حد تک جا سکتے ہیں اس لیے میں تمہیں ان لوگوں سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں سے ٹکر لینے سے پہلے تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ میں، تمہاری ماں اور تمہاری بہنیں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے کی صورت میں کس اذیت سے گزر سکتے ہیں۔'' وہ اسے سمجھا رہے تھے اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑتا جا رہا تھا لیکن باپ کے سامنے بولا تو لہجہ دھیما اور نرم ہی تھا۔

''اذیت سے تو میں بھی گزر رہا ہوں بابا سائیں! میرا دوست غائب ہے۔ کیا ایک دوست کا دوست پر اتنا حق نہیں کہ مصیبت کے وقت اس کے کام آئے؟''

''دوست کے حق سے انکار نہیں، پر یہ تو دیکھنا پڑتا ہے کہ کس کا حق زیادہ ہے۔ پال پوس کر امیدوں سے بڑا کرنے والے ماں باپ کا یا چار دن کے دوست کا۔ یہ جو ابھی یہاں سے گئے ہیں نا یہ بڑی گھٹیا نسل کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ایک بار میری خاطر تجھ سے رعایت کر دی ہے، پر اب بتا گئے ہیں کہ یہ آخری بار تھا۔''

''وہ یہاں دھمکیاں دینے آئے تھے اور آپ نے ان کی دھمکیاں سن لیں؟ ہم کیا چوڑیاں پہن کر بیٹھے ہوئے ہیں؟'' عالم شاہ ان کی بات سن کر غصے کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''میں بیکار کی لڑائیاں مول لینے کا قائل نہیں ہوں اور یہ معاملہ ہے بھی میری پارٹی کے لوگوں سے متعلق۔ اصول و قواعد کے مطابق مجھے ان ہی لوگوں کا ساتھ دینا ہے، اس لیے فی الحال تم سب بھول جاؤ۔ الیکشن کے بعد دیکھیں گے کہ تمہارے دوست کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟'' انہوں نے جیسے بات ختم کر دی۔

''لیکن تب تک تو بہت دیر ہو جائے گی بابا سائیں۔ اتنے عرصے میں تو معاذ کا ہر سراغ مٹ جائے گا۔'' اس نے ان کے فیصلے پر احتجاج کیا۔

''سراغ اب بھی کوئی نہیں ہے بیٹا..... تم صرف لکیر پیٹ رہے ہو۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''معاذ کا سراغ نہیں ہے لیکن اس کے مجرموں کا سراغ تو ہے بابا سائیں!''

''کیا بگاڑ لو گے تم ان لوگوں کا؟ اور کیا ثبوت ہے تمہارے پاس ان کے خلاف۔ صرف ایک ویڈیو..... جسے وہ عدالت کے سامنے چیلنج کر دیں گے کہ تم نے زبردستی تشدد کے ذریعے اس لڑکے سلطان سے وہ بیان لیا تھا۔ اتنی معمولی چیزوں سے قابو میں آنے والے لوگ نہیں ہیں یہ۔''

''لیکن بابا سائیں.....'' اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔

''کوئی لیکن ویکن نہیں۔ تم بس آج ہی میرے ساتھ گاؤں چل رہے ہو اور وہاں اس وقت تک رہو گے جب تک میں تمہیں شہر آنے کی اجازت نہیں دے دیتا۔ ڈاکٹروں سے میں خود بات کر لوں گا کہ مجھے آج اور اسی

UUNOVELS.COM

وقت چھٹی چاہیے۔'' انہوں نے حتمی فیصلہ سنا کر عالم شاہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ جب وہ اس لہجے میں بات کرتے تھے تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ بہت لاڈلا ہونے کے باوجود اب عالم شاہ ان سے اپنی بات نہیں منوا سکتا اور اب اسے ہر حال میں ان کی ماننی ہے۔

☆☆☆

بشریٰ کو بہت دیر بعد ہوش آیا تھا اور ہوش میں آتے ہی اس نے اپنے ماں باپ کی لاشیں دیکھی تھیں۔ کرسی پر بندھے بیٹھے گلزار عاصم کا سر ایک طرف ڈھلک چکا تھا اور چہرے پر موت کی اذیت ثبت ہو گئی تھی۔ عائشہ کی لاش اس کے بیڈ پر پڑی تھی اور بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ کسی درندے نے اس نازک سی عورت کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہو۔ چند پل کے لیے وہ ساکت بیٹھی یہ سب دیکھتی رہی۔ غم اس انتہا کا تھا کہ اس کی آنکھیں آنسو بہانے سے بھی قاصر تھیں۔ وہ آنسو جو آنکھوں سے بہنے سے قاصر تھے، انگارے بن کر اس کے دل پر گر رہے تھے۔ ان انگاروں نے اس کے پورے وجود میں ایک ان دیکھی آگ بھڑکا دی تھی۔ اس آگ کی ہر لپٹ بس ایک لفظ کو تخلیق کر رہی تھی۔ انتقام، انتقام اور انتقام۔ اسی ایک لفظ نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو بند نہیں ہونے دیا۔ سانسوں کے سلسلے کو جاری رکھا اور اسے اتنا حوصلہ دیا کہ وہ اپنے بے بس جسم کو گھسیٹتی ہوئی اپنے موبائل تک لے گئی اور مقامی تھانے فون کر کے اپنے گھر واردات کی اطلاع دی۔

پولیس آئی اور معمول کی کارروائیاں کرتی رہی۔ اس سے تابڑ توڑ سوالات کیے گئے۔ مجرموں کے بارے میں پوچھا جاتا رہا لیکن اس کے پاس ان کے ہر سوال کے جواب میں بس یہ مختصر بیان تھا کہ آنے والوں نے خود کو ڈاکو ظاہر کیا تھا لیکن پھر عائشہ کو دیکھ کر ان کی نیت بدل گئی تھی۔

وہ خود چل پھر کر پورے گھر کا جائزہ نہیں لے سکتی تھی۔ پولیس والوں کی زبانی ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ پورا گھر بری طرح تتر بتر تھا۔ کمپیوٹر اور پڑھنے لکھنے کے سامان کو خصوصیت سے نقصان پہنچایا گیا تھا۔ ساری الماریاں اور درازیں کھلی ہوئی تھیں جیسے ان کی تلاشی لی گئی ہو۔ زیور اور نقدی کے غائب ہونے کی اطلاع دی گئی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ رات کے آخری پہر گھر میں گھسنے والوں کا کارنامہ تھا یا وردی والے چوروں نے موقعے کا فائدہ اٹھا کر ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ اس کا اتنا بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان ہو چکا تھا کہ اس معمولی سے مالی نقصان کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے تو پولیس کی آمد کے بعد احوال معلوم کرنے آنے والے پڑوسیوں سے بھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا کہ کیسے دیوار سے دیوار ملی ہونے کے باوجود وہ ان پر بیتنے والی قیامت سے بے خبر رہے تھے۔ وہ گلزار عاصم کی بیٹی تھی اور خود بھی صحافت کی دنیا سے وابستہ تھی اس لیے اسے دنیا کے رنگ ڈھنگ اچھی طرح معلوم تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارے نظام میں اتنی گڑبڑ تھی کہ لوگ اس قسم کے واقعات کی بھنک پڑ جانے پر بھی آنکھیں اور کان بند رکھنا ہی مناسب سمجھتے تھے۔ ان کے بارے میں تو پہلے ہی سب کو پتا تھا کہ وہ بہت طاقتور اور خطرناک لوگوں سے پنجہ لڑائے بیٹھے ہیں، ایسے میں کون خود کو مصیبت میں ڈالتا۔

پولیس کی پوچھ گچھ کے جواب میں بھی ایک پڑوسی نے بس اتنا اعتراف کیا تھا کہ صبح وہ اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہا تھا تو اس نے گھر کے دروازے کے ساتھ ایمبولینس کھڑی دیکھی تھی لیکن توجہ اس لیے نہیں دے سکا تھا کہ ایک تو بچے اسکول سے لیٹ ہو رہے تھے اور دوسرے اس نے فرض کر لیا تھا کہ بشریٰ کو چیک اپ کے لیے اسپتال لے جایا جا رہا ہوگا۔ ایمبولینس میں حنین کو وہاں سے لے جایا گیا تھا۔ پڑوسی کے اس بیان سے پولیس والوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ ڈاکوؤں نے خود کو کور اپ کرنے کے لیے ایمبولینس استعمال کی تھی اور گھر کی قیمتی اشیا اسی ایمبولینس میں رکھ کر فرار ہو گئے تھے۔ اصل میں پولیس والے بھی اتنے بھولے یا انجان نہیں تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ آج کل بشریٰ گلزار کا کن لوگوں سے ٹاکرا چل رہا ہے اور ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے میں ان کا اپنا دم نکلتا ہے اس لیے انہوں نے بشریٰ کی ڈاکوؤں والی کہانی پر یقین کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا تھا۔ بشریٰ کو ان سے کوئی امید ہوتی تو سچ کو کیوں چھپاتی۔ سچ صرف اسے معلوم تھا اور اس سچ کی روشنی میں اسے خود اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

☆☆☆

''اب کیسی حالت ہے تیری پٹ۔ پہلے سے تو چنگا ہے نا؟'' وہ کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا ادھیڑ عمر میزبان اس کے پاس چلا آیا اور اس سے اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔

''ٹھیک ہو رہا ہوں چاچا جی! آپ کی جادو اثر دوائیں مجھے موت کے منہ سے واپس کھینچ لائی ہیں۔ ورنہ جب میں پہاڑ سے نیچے گر کر زخمی ہوا تھا اور پھر مجھے سانپ نے ڈس لیا تھا تو مجھے لگا تھا میرا آخری وقت آ گیا ہے اور اب عالمِ برزخ میں ہی میری آنکھ کھلے گی۔'' مسکرا کر ادھیڑ

عمر شخص کو جواب دیتا یہ لڑکا معاذ تھا۔ وہ بچ گیا تھا۔ وہ سلطان کی سر پر لگائی گئی ضرب کھا کر بچ گیا تھا۔ وہ کیرتھر کی سنگلاخ چٹانوں سے گر کر بچ گیا تھا اور وہ اس خطرناک سانپ کا زہر اپنے جسم میں اترنے کے باوجود بچ گیا تھا جس کی ہلاکت خیزی مشہور تھی۔ اس کا بچ جانا ایک معجزہ تھا اور ایسے معجزے ان کے ساتھ رونما ہوتے ہیں جو کسی دعا کے حصار میں ہوں یا پھر ان کے ساتھ رونما ہوتے ہیں جو بہت سے امتحانات اور آزمائشوں کے حصار میں بھی زندگی کو جینے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں۔ معاذ کا شمار شاید دونوں ہی گروہوں کے افراد میں ہوتا تھا لیکن ابھی اس نے خود کو دریافت نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ اپنی بے چین روح کو پوری طرح پہچان نہیں پایا تھا۔

''تو نے غلط سوچا تھا پٹ! تو ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو ایسے آسانی سے مر جاتے ہیں۔ تو بہت خاص ہے اور اپنے خاص بندوں کی وہ سو ہنڑار ارب خود حفاظت کرتا ہے۔ مجھ جیسے تو بس اس کی مرضی پورا کرنے کا ایک بہانہ بن جاتے ہیں۔'' چہرے پر مسکراہٹ لیے وہ ادھیڑ عمر شخص اسے بہت گہری اور اندر تک اتر جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کا نام فیضو تھا۔ بے ہوشی سے ہوش کے مراحل طے کرتے ہوئے معاذ نے کئی بار اس شخص کو اپنے قریب دیکھا تھا۔ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے پتا نہیں کیا کیا جتن کرتا رہا تھا۔ کبھی اس کے زخموں پر کسی مرہم کا لیپ کرتا تھا تو کبھی زبردستی اس کا منہ کھول کر کڑوی زہر دوائیں حلق سے اتارنے پر مجبور کرتا تھا۔ شروع کے تین چار دن تو فیضو گویا سائے کی طرح نیم بے ہوش معاذ کے ساتھ چمٹا رہا تھا۔ اس کی بیٹی لیلیٰ بھی اس کی مددگار بنی رہتی تھی پھر جیسے جیسے معاذ کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی، فیضو پیچھے ہٹتا گیا اور لیلیٰ کی خدمت گزاری بڑھتی چلی گئی۔ فیضو بظاہر ایک نکما اور بیکار آدمی تھا جو سارا سارا دن جھونپڑی کے باہر پلنگ پر پڑا اپنا حقہ گڑگڑاتا رہتا تھا لیکن جب اس کی نظریں جسم میں اترتی تھیں تو معاذ پورے جسم میں عجیب سی لہریں دوڑتی محسوس کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ فیضو میں کچھ خاص ہے لیکن وہی فیضو اس سے کہتا تھا کہ تجھ میں کچھ خاص بات ہے پٹ! اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ بھلا اس میں کیا خاص بات ہے۔ اب بھی وہ الجھ گیا اور بولا۔

''مجھ میں بھلا کہاں کچھ خاص ہے چاچا جی! کچھ خاص ہوتا تو وہ دو ٹکے کا آدمی سلطان اتنی آسانی سے پیچھے سے آکر میرے اوپر حملہ نہ کر پاتا۔''

''تو خاص نہ ہوتا تو تجھ پر حملہ ہی نہ ہوتا۔ یہ جو لوگ ہوتے ہیں نا، یہ خاص بندوں سے ہی حسد کرتے ہیں اور ان کے دشمن بن جاتے ہیں، پر تجھے اپنے خاص ہونے کا اس لیے پتا نہیں چلتا کہ ابھی تو نے خود کو کھوجا نہیں ہے، پر میری پہچان غلط نہیں ہو سکتی۔ تیری جیسی آنکھیں ہر ایک کی نہیں ہوتیں۔ تو ان آنکھوں کے بل پر حکمرانی کر سکتا ہے۔'' فیضو نے دعویٰ کیا تو وہ ہنس دیا اور اداسی سے بولا۔

''حکمرانی تو دور کی بات ہے، ابھی تو میں اپنے گھر جانے سے بھی قاصر ہوں۔ پتا نہیں میرے گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ میری امی نے تو میری گمشدگی پر رو رو کر اپنا حال برا کر لیا ہوگا۔''

''میں اس بات کو سمجھتا ہوں پٹ لیکن ابھی تیری حالت ایسی نہیں ہے کہ سفر کر سکے۔ میری مجبوری نہ ہوتی تو میں اپنے کسی آدمی کو تیرے گھر والوں کو چٹھی ڈالنے ہی بھیج دیتا۔''

فیضو نے وہی پرانا جواب دیا۔ اس کے مطابق ان پہاڑوں میں بسنے والے ایک ڈکیت گروہ سے ان کی ٹھن گئی تھی۔ وجہ تنازعہ لیلیٰ کی ذات تھی۔ گروہ کے سردار کا لیلیٰ پر دل آ گیا تھا اور وہ اس سے شادی کا خواہشمند تھا لیکن لیلیٰ نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ کسی ڈاکو سے شادی نہیں کرے گی۔ وہ لوگ ان پہاڑیوں میں بہت مشکل اور غربت زدہ زندگی گزارتے تھے لیکن لوٹ مار اور ڈاکا زنی نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ سپیرے تھے، کچھ شکاری اور کچھ دوسرے ہنرمند جو اپنے اپنے ہنر سے تھوڑا رزق کماتے تھے لیکن دوسروں کے نوالے جھپٹنے کا کبھی نہیں سوچتے تھے..... تو لیلیٰ نے سردار کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا اور جواب میں وہ سارے کے سارے عتاب میں آ گئے تھے۔ ان کا ان پہاڑوں میں سفر کرنا دوبھر ہو گیا تھا۔ ان پہاڑوں میں رہ کر وہ نایاب سانپوں کے زہر، کچھ انہونی جڑی بوٹیاں، جانوروں کی کھالیں اور سینگ وغیرہ حاصل کرتے تھے۔ ان کی عورتیں کچھ دستکاری کے نمونے تیار کرتی تھیں اور وہ یہ سب لے جا کر شہروں میں بیچ آتے تھے۔ ان کے پاس کھیت کھلیان نہیں تھے کہ ان سے اپنا رزق حاصل کر لیتے۔ وہ بہت محدود ذرائع آمدنی رکھتے تھے اور دشوار گزار پہاڑی راستوں پر سفر کر کے عام آبادیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ اس سخت زندگی کے عادی، وہ اپنی زندگی سے شکوہ کناں نہیں تھے لیکن جب سے ان پر عام آبادیوں تک جانے کے راستے تنگ ہوئے تھے، وہ بڑی مصیبت میں آ گئے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ اناج کے حصول کا تھا۔ گنے چنے مویشیوں کے

دودھ، مرغیوں کے انڈوں اور شکار کیے گئے جانوروں کے گوشت سے گزارہ ہونا ممکن نہیں تھا اس لیے جان جوکھم میں ڈال کر وہ ان راستوں پر سفر کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ ابتدا میں کوششیں بارآور بھی ہو جاتی تھیں لیکن اب لگتا تھا کہ ڈاکوؤں نے ہر راستے پر گھات لگا لی ہے۔ دو بار شہر جانے والی ٹولیوں سے ان کا سارا مال و اسباب چھین لیا گیا تھا۔ ایک بار مزاحمت پر ایک جوان آدمی قتل ہو گیا تھا اور اس کے بعد سے ہی سفر کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔

''مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے چاچی، آپ تو میرے محسن ہیں۔ میں تو بس یونہی اپنے گھر والوں کی پریشانی کے خیال سے فکرمند ہو رہا تھا۔'' معاذ کو بھی ان کی مجبوری کا احساس تھا اس لیے خود ہی ان کی دلجوئی کرنے لگا۔ اسی وقت لیلیٰ اندر آئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں اور خاکی قمیص بھی پسینے سے بھیگ رہی تھی۔

''تم کہاں مصروف تھیں جو اتنے پسینے میں ہو رہی ہو؟'' معاذ نے اسے دیکھ کر بے تکلفی سے پوچھا۔ لیلیٰ ایسے مزاج کی لڑکی تھی جس پر لڑکی سے زیادہ لڑکے کا گمان ہوتا تھا اس لیے معاذ کو یہاں رہتے ہوئے اس سے بے تکلف ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

''یہ میری دھی رانی بڑے ضدی مزاج کی چھوکری ہے۔ ادھر زمین بہت سخت ہے، کچھ اگانا آسان نہیں ہوتا لیکن یہ کہتی ہے کہ کیرتھر کی زمین بانجھ تو نہیں ہے۔ ہم سے تھوڑی دور اس زمین پر سبزہ اگتا ہے تو ادھر ہمارے علاقے میں بھی اگ سکتا ہے، بس محنت تھوڑی زیادہ کرنی ہو گی۔ دیوانی زرخیز حصوں سے مٹی ڈھو ڈھو کر لائی ہے اور ادھر کیاریاں بنا کر وہ مٹی اس میں ڈالی ہے۔ اس مٹی میں یہ شہر سے منگوائے ہوئے بیج بو کر جانے کیا کیا اگاتی رہتی ہے۔ اس کے جنون کی وجہ سے ہمیں تازہ سبزیاں کھانے کو مل جاتی ہیں۔ اب تو اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی ایسا کرنے لگے ہیں۔ پر میری دھی رانی جتنا محنتی کوئی اور نہیں ہے۔ یہ زمین کو جتنی محنت اور محبت سے سینچتی ہے، زمین بھی اس کو اتنا ہی صلہ دیتی ہے۔'' فیضو نے بیٹی کو محبت سے دیکھتے ہوئے خود معاذ کی بات کا جواب دیا۔

''اوہو..... جب ہی تو مجھے یہاں اتنے مزے کا کھانا ملتا ہے۔ شہروں میں تو تازہ سے تازہ بھی سبزی و ترکاری کم سے کم دو دن پرانی ملتی ہے اور ہم اسے ہی صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔'' معاذ نے سن کر تبصرہ کیا۔

''ہاں، پر تم عام شہری چھوکروں جتنے نازک نہیں ہو۔ تمہارے جسم میں موت سے لڑنے کی اتنی طاقت نہیں ہوتی تو تمہاری جان بچنی بہت مشکل تھی۔ جس بندے کے جسم سے اتنا خون بہا ہو اور اوپر سے اسے سانپ نے بھی ڈس لیا ہو، اس کی جان بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب ہی تو میں کہتا ہوں کہ تجھ میں کچھ خاص ہے۔'' فیضو نے ایک بار پھر اسے اس کا خاص ہونا جتایا۔

''بابا کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں جب مراد کے ساتھ تمہیں اٹھا کر یہاں لائی تھی تو مجھے بھی امید نہیں تھی کہ تمہاری زندگی بچ سکے گی۔'' لیلیٰ نے اس کی اس وقت کی حالت کو یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ اس روز وہ صبح صبح پہاڑی بکرے کا شکار کرنے نکلی تھی۔ راستے میں مراد بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا لیکن بہت دیر تک انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل سکی تھی اور وہ شکار کی تلاش میں اپنے علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے پھر انہوں نے ایک چٹان پر پہاڑی بکرا کھڑا دیکھ لیا۔ جوش اور عجلت میں ان سے تھوڑی بے احتیاطی سرزد ہو گئی اور وہ قلانچیں بھرتا ہوا اپنی جگہ سے بھاگ نکلا۔ وہ اس کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے لیکن اچانک ہی لیلیٰ کی نظر نیچے گرے ہوئے معاذ پر پڑ گئی اور اس نے مراد کو اس طرف متوجہ کیا۔ مراد اپنے بھاری تن و توش کے باوجود بہت پھرتیلا تھا۔ وہ لپک کر نیچے اتر گیا اور بے ہوش پڑے معاذ کو اوپر لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ وہ شکار کے لیے نکلے تھے اس لیے ان کے پاس ضروری سامان موجود تھا۔ مراد کی ہدایت پر لیلیٰ نے موٹی سی رسی کا سرا ایک بڑے اور بھاری پتھر سے باندھ کر نیچے پھینکا اور مراد، معاذ کو نیچے سے اوپر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اوپر موجود لیلیٰ نے بھی اس کی مدد کی۔ معاذ کے ہاتھ پر سانپ کے کاٹنے کا نشان بھی اتفاقاً اس کی نظروں میں آ گیا اور اس نے بازو پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تین مضبوط پٹیاں باندھ کر زہر کو پھیلنے سے روکنے کا انتظام کیا۔ اس کا باپ فیضو ایک سپیرا تھا اس لیے ایسے اس طرح کے معاملات سے نمٹنے کا تجربہ تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کے اور مراد کے گھوڑے اس جگہ سے بہت زیادہ دور نہیں بندھے ہوئے تھے۔ چنانچہ اسے لیلیٰ والے گھوڑے پر لاد کر وہ بہت تیزی سے اپنے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

معاذ اتنا زیادہ زخمی تھا کہ انہیں اس کی جان بچنا مشکل محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کی سانسوں کے جاری سلسلے نے انہیں جدوجہد پر اکسایا تھا۔ ان کی یہ جدوجہد رائگاں نہیں گئی تھی اور فیضو کے تجربے کے ساتھ معاذ کے اندر کی زبردست قوتِ مزاحمت نے مل کر اسے ایک نئی زندگی دے

UUNOVELS.COM

دی تھی لیکن یہ سب یکا یک نہیں ہوا تھا۔ بے ہوشی سے ہوش کی دنیا میں آنے کے لیے اسے کئی دن لگ گئے تھے۔ ایک طرف اس کے سر پر لگائی جانے والی ضرب بے حد مہلک تھی تو دوسری طرف اسے جس سانپ نے کاٹا تھا، اس کا زہر بھی بہت زود اثر تھا۔ فیضو کو اپنے تمام تر تجربے کے باوجود اسے بچانے کی جدوجہد میں دانتوں پسینا آ گیا تھا۔ گرنے کے دوران معاذ کے جسم پر جو ڈھیروں زخم آئے تھے، ان کی تو فیضو گنتی بھی نہیں کر سکا تھا اور اس نے بس اس بات پر اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ لڑکے کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ باپ کے ساتھ لیلیٰ بھی اس کی تیمارداری میں جتی رہی تھی اور تیمارداری کے اس عمل کے دوران ہی اس کے دل میں معاذ کی محبت کی کونپل پھوٹی تھی۔ وہ تھا ہی ایسا کہ صنفِ مخالف کے لیے خود کو اس کی کشش کے حصار میں آنے سے روکنا ممکن نہیں رہتا تھا۔ لیلیٰ نے سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ پرورش پائی تھی اور بظاہر مردانہ صفات کی حامل لڑکی تھی لیکن تھی تو لڑکی ہی جس کے اندر محبت کا چشمہ دھیرے دھیرے بہتا رہتا ہے۔ معاذ نے اس کے دل کو اپنے ساتھ باندھ لیا تھا اور جب وہ حالتِ نیند میں ہوتا تھا تو وہ خاموشی سے اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی لیکن ایسا صرف تنہائی میں ہوتا تھا۔ کسی اور کے سامنے تو وہ معاذ کو نظر بھر کر دیکھتی تک نہیں تھی جیسے اس وقت وہ پل بھر کو بیٹھ کر اپنا پسینا سکھانے کے بعد کونے میں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ٹین کی پیٹیوں میں سے سب سے اوپری پیٹی کا ڈھکن کھولے پتا نہیں کیا تلاش کر رہی تھی۔

"مراد دو تین دن سے ملنے نہیں آیا۔ کہیں مصروف ہے کیا؟" اس کی ابتدائی حالت کا ذکر چھڑا تھا تو مراد کی یاد آنا لازمی تھا۔ وہ بھی تو اس کے محسنوں میں سے ایک تھا۔ احسان کے علاوہ اس کی طبیعت کی سادگی اور خلوص کی وجہ سے بھی معاذ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ معاذ کی تنہائی اور بوریت کا خیال کر کے وہ کافی دیر تک اس کے پاس بیٹھا اس سے ڈھیروں باتیں کرتا رہتا تھا اور جب بھی اسے لگتا تھا کہ معاذ اداس ہے تو پتا نہیں کہاں کہاں سے گھڑ کر اسے لطیفے سناتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ معاذ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی تھی اور چہرے سے اداسی کے بادل چھٹنے لگتے تھے۔

"مصروف کدھر ہو گا وہ موٹو! اس کے کون سے کاروبار چل رہے ہیں جس میں الجھ کر اسے فرصت نہ ملے۔ زیادہ سے زیادہ اس غم میں گھل رہا ہو گا کہ کچھ دن اور اگر علاقے میں اناج نہ آ سکا تو اسے اپنی روٹیوں کی تعداد کم کرنی ہو گی۔" پیٹی میں منہ دیے دیے ہی لیلیٰ نے مذاق اڑانے والے انداز میں مراد پر تبصرہ کیا۔

"بڑی گل ہے وڈی رانی! کسی کو ایسا نہیں بولتے۔ سب اپنے نصیب کا کھاتے ہیں اور مراد تو بڑا سوہنڑا چھوکرا ہے، پر تو اسے دیکھتی ہے، اس کے اجلے من کو نہیں دیکھتی۔" فیضو نے فوراً اسے ٹوکا۔

"تمہاری شہ پر ہی وہ اتنا پھیلتا ہے بابا! اگر تم اس کی طرف داری نہ کرو تو میں دو دن میں اس کا دماغ ٹھیک کر دوں۔" اب وہ سیدھی کھڑی ہو گئی تھی اور اس کے سانولے چہرے پر غصے کی ہلکی سی سرخی نظر آ رہی تھی۔

"لے بھئی معاذ پٹ! سمجھ جا مراد کے نہ آنے کا سبب۔ یہ جو میری وڈی رانی ہے نا، اس نے اس نمانے کو کچھ الٹی سیدھی سنائی ہو گی اور وہ دل تھوڑا کر کے بیٹھ گیا ہو گا، پر فکر کی کوئی گل نہیں ہے۔ دو ایک دن میں سب بھول کر آ جائے گا۔ میں نے بتایا نا کہ چھوکرا دل کا بڑا اجلا ہے۔" لیلیٰ کے انداز سے فیضو نے نتیجہ اخذ کر لیا اور ہنس کر معاذ کو تسلی دی۔ لیلیٰ کے چہرے کے تاثرات چغلی کھا رہے تھے کہ فیضو کا اندازہ ٹھیک ہے۔ معاذ لیلیٰ کی طرف دیکھ کر شریر سے انداز میں ہنس دیا۔ مراد کے دل کی بات اور لیلیٰ کا گریز دونوں اس کے سامنے تھے اس لیے اسے لیلیٰ کو چھیڑنا اچھا لگا تھا۔ اس کے اس طرح ہنسنے پر لیلیٰ نے خفگی سے منہ موڑ لیا تو وہ زیرِ لب مسکرا دیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چٹانوں کی طرح سخت نظر آنے والی لیلیٰ کے دل کی سرزمین سے اس کی محبت کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔

☆☆☆

"تم بڑے کمال کی لڑکی ہو لیلیٰ! میں نے کبھی اپنی زندگی میں اتنی پھرتیلی اور جفاکش لڑکی نہیں دیکھی۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان پہاڑوں میں ایسی ہرفن مولا قسم کی لڑکی سے ملاقات ہو جائے گی۔" وہ لیلیٰ کو گوڈی کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے لگائے ہوئے پودے دیکھنے آیا تھا اور دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس نے اچھا خاصا باغیچہ سا بنایا ہوا ہے۔ کسی کیاری میں ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچیں لگی تھیں تو کسی میں سرخ سرخ ٹماٹروں سے لدے پودے بہار دکھا رہے تھے۔ کریلے کی خوب پھیلی ہوئی بیل پر لدے کھلتے سبز رنگ کے کریلے کچھ ایسی چمک لیے ہوئے تھے کہ دل چاہتا تھا یونہی کچا ہی توڑ کر چبانا شروع کر دو۔ ان کی کڑواہٹ کے ڈر نے معاذ کو ایسی کسی حرکت سے باز رکھا۔ کریلے کے ساتھ ہی توری کی بیل بھی

UUNOVELS.COM

تھی اور اس بیل پر چھوٹی بڑی مختلف سائز کی تو ریاں جھول رہی تھیں۔ ہوا سے لہلہاتی پالک کی تازگی آنکھوں کو تراوٹ بخش رہی تھی اور یہ سب ایک ایسی جگہ موجود تھا جہاں پانی اتنی آسانی سے دستیاب نہیں تھا۔ استعمال کا پانی لانے کے لیے ڈیرے کے باسیوں کو کافی دور چل کر جانا پڑتا تھا، ایسے میں لیلیٰ کا یہاں یہ سب اگا لینا ایک کرشمہ ہی تھا۔ وہ اپنے اور فیفو کے استعمال کے پانی کے علاوہ ان پودوں کے لیے بھی پانی ڈھو کر لاتی تھی اور یہ کسی عام لڑکی کے بس کی بات تو نہیں تھی۔ اسی لیے سدا بہار کے پودے سے ایک پھول توڑتے ہوئے معاذ نے یہ تعریفی کلمات ادا کیے تھے۔ وہاں پھولوں کا صرف یہی ایک پودا تھا جس پر لگے گلابی اور سفید پھول بہت پیارے لگ رہے تھے۔

''سوچتا تو آدمی بہت کچھ ہے پر زندگی پل پل اپنے انوکھے رنگ دکھاتی رہتی ہے۔ میں جب پانچ سال کی چھوٹی سی بچی تھی اور اپنے گاؤں کی گلیوں میں بھاگتی پھرتی تھی تو مجھے بھولے سے بھی کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ میں ان پہاڑوں میں آبسوں گی جہاں میرا بابا سانپوں کی تلاش میں جاتا ہے اور جو مجھے بڑے پراسرار لگتے ہیں۔'' کیاری میں گوڈی کا عمل جاری رکھتے ہوئے لیلیٰ نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا تو معاذ اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

''کیا مطلب؟ تم لوگ شروع سے ہی ان پہاڑوں کے رہنے والے نہیں ہو۔ تمہیں دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ تم یہیں کی پیدائش ہو۔''

''ایسا اس لیے لگتا ہے کہ ہم نے پُور پُور خود کو یہاں کے رنگ میں ڈھالا ہے۔ آدمی کو جہاں رہنا ہو، وہیں کے رنگ میں رنگ جائے تو ہی کامیاب رہتا ہے۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا اور دونوں ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''لیکن تم لوگ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہاں ایسی جگہ کیوں چلے آئے جہاں زندگی اتنی مشکل ہے۔ گاؤں میں تو پھر بھی اتنی سخت زندگی نہیں ہوگی۔'' معاذ نے اس کے سانولے ہاتھوں پر لگی مٹی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ خوب صورت تھے لیکن سخت محنت نے ان ہاتھوں کو بھی ایک طرح کی سختی عطا کر دی تھی۔

''گاؤں میں زندگی یہاں سے بھی زیادہ مشکل تھی بلکہ ہمارے لیے بنا دی گئی تھی۔ جرم صرف اتنا تھا کہ ایک غریب آدمی کی بیوی بہت خوب صورت تھی اور گاؤں کے وڈیرے زمین، فصلوں اور ڈھور ڈنگروں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے لوگوں کو بھی اپنی جاگیر سمجھتے تھے۔ ان سے برداشت نہیں ہوا کہ اتنی خوب صورت عورت ان کے بجائے ایک غریب آدمی کے گھر میں ہو۔ میری ماں کو اس کی خوب صورتی کے جرم میں اٹھا لیا گیا اور پورے تین دن بعد اس کی کٹی پھٹی، نچی ہوئی لاش کھیتوں میں پڑی ہوئی ملی۔ تین دن تک میں ماں کو پکارتی ہوئی گاؤں کی گلیوں میں پھرتی رہی۔ بابا ان دنوں سانپوں کی تلاش میں پہاڑوں پر گیا ہوا تھا اور عین اس دن واپس آیا جس دن میری ماں کی لاش ملی۔ ماں کی لاش دیکھ کر وہ پتھر بن گیا اور بنا ایک آنسو بہائے اسے قبر میں اتار دیا۔ مجھے اور تسلی دلاسے دینے والوں میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس رات میں سو رہی تھی تو وہ چپکے سے اٹھ کر باہر چلا گیا اور صبح سے کچھ دیر پہلے واپس آکر مجھے نیند سے جگایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اتنی اچانک، سورج نکلنے سے بھی پہلے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ بابا کے کندھے پر سوار حیرت سے انجان راستوں کو دیکھتی ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد میں یہاں پہنچ گئی اور تب سے یہیں ہوں۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس رات بابا کہاں گیا تھا۔ اس رات وڈیرے کے دونوں بیٹے اپنے شہری دوستوں کے ساتھ ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے اور رات گئے تک موج مستی کرنے کے بعد شراب کے نشے میں دھت پڑے سو رہے تھے اس لیے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ موت دو چمکتے سانپوں کی صورت نازل ہو چکی ہے۔ وہ جو باپ کی دولت کے بل پر لوگوں کی خوشیوں کو ڈستے پھرتے تھے، سوتے میں سانپ کے ڈسنے سے مارے گئے۔ بابا اپنا انتقام لینے کے بعد مجھے یہاں لے آیا اور پھر میری اس انداز سے پرورش کی کہ میں عام سی کمزور لڑکی نہ رہوں۔ شاید اسی لیے تمہیں مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی ہے۔'' سپاٹ سے انداز میں اپنی ساری کہانی سنا کر اس نے معاذ کی طرف دیکھا۔ پھر وہ چند قدم چل کر اس کے مقابل آکر کھڑی ہوئی اور اس کے ہاتھ میں موجود پھول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''پھولوں کو مت توڑا کرو معاذ سائیں! یہ اپنی شاخوں پر ہی خوش رہتے ہیں اور توڑنے پر بڑی جلدی مرجھا جاتے ہیں۔ مجھے پھول بہت اچھے لگتے ہیں لیکن پانی کی کمی کی وجہ سے میں نے پھولوں کا صرف ایک پودا لگایا ہے اور وہ بھی ایسا جس پر سارا سال پھول آتے رہتے ہیں۔''

''سوری! میں انجانے میں تمہیں تکلیف دے بیٹھا۔'' معاذ نے فوراً اس سے معذرت کی لیکن وہ اس کے معافی مانگنے سے پہلے ہی مڑ کر لوہے کے باریک جال سے بنے اس چھ بائی چھ کے احاطے میں گھس گئی تھی جس کی چھت

بھی اسی جال کی تھی لیکن اوپر ایک پلاسٹک شیٹ ڈال کر دھوپ اور بارش سے بچنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں اس نے ڈھیروں مرغیاں پالی ہوئی تھیں اور اب بڑی جانفشانی سے مرغیوں کی پھیلائی ہوئی گندگی صاف کر رہی تھی۔ معاذ مسکرا دیا۔ وہ لڑکی تضادات کا مجموعہ تھی۔

''کیا حال ہے معاذ سائیں، خیر آ ہے؟'' وہ وہاں سے ہٹنے ہی والا تھا کہ مراد چلا آیا اور ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس سے پوچھنے لگا۔

''اب تو بہت بہتر ہوں مراد، زخم بھر گئے ہیں اور کمزوری بھی اتنی زیادہ نہیں رہی ہے۔ تم سناؤ تم کہاں تھے؟ میں تمہیں یاد ہی کر رہا تھا۔''

''ہاں سائیں، مجھے خبر ہے۔ فیضو چاچا نے پیغام بھیجا تھا اس لیے میں وقت نکال کر آپ سے ملنے آ گیا ہوں۔'' مراد کے ہنستے مسکراتے چہرے پر تھوڑی سی سنجیدگی آ گئی۔

''خیریت، کہاں مصروف تھے؟'' معاذ کو اس کے بارے میں لیلیٰ کا تبصرہ یاد آیا تو ایک نظر مرغیوں والے احاطے کی صفائی کرتی لیلیٰ پر ڈالی اور مراد سے پوچھنے لگا۔

''آپ کے پوچھنے پر میں آپ کو بتا رہا ہوں لیکن آپ کسی سے ذکر نہ کرنا سائیں۔'' مراد نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور آواز نیچی کر کے بولا۔

''کوئی خاص بات ہے کیا؟'' اس کے انداز پر معاذ کا تجسس جاگا۔

''میں اور دو دوسرے بندے آج رات ادھر سے نکل کر جانے والے ہیں۔ ہم اسی کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ میرے پاس ایک دوربین ہے، اس کی مدد سے اور علاقے میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ہم نے دیکھ لیا ہے کہ کس راستے پر پہرا کم ہے۔ ہم ادھر سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ ضرورت پڑی تو مار دھاڑ بھی کر لیں گے۔'' مراد نے اپنے شانے سے لٹکی رائفل کو تھپکی دی۔ وہ پُرامن لوگ تھے لیکن معاذ نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ہتھیار ضرور رکھتے تھے۔ اس جگہ ہتھیاروں کے بغیر رہنا آسان بھی نہیں تھا۔ شکار اور دشمن سے بچاؤ کے لیے ہتھیار لازمی تھے لیکن عورتوں میں اس نے صرف لیلیٰ کو ہی ہر وقت ہتھیار ساتھ لے کر گھومتے دیکھا تھا۔

''یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے مراد! فرض کرو تم لوگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو واپس آنا مشکل ہو جائے گا۔ تمہاری واپسی تک وہ اپنے پہرے کا نظام اور بھی سخت کر دیں گے۔'' معاذ نے تشویش کا اظہار کیا۔

''خطرہ تو مول لینا پڑے گا معاذ سائیں..... ہم نے ہمت نہیں کی تو تھوڑے دنوں میں فاقے کی نوبت آ جائے گی۔'' اس نے مجبوری بیان کی اور مجبوری ایسی تھی کہ معاذ اسے روکنے کے لیے مزید اصرار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''احتیاط کرنا مراد! میں تم لوگوں کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا، جواب میں مراد نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر جیسے یاد آنے پر بولا۔

''آپ کو اپنے گھر والوں کے نام چٹھی بھیجنی تھی نا۔ آپ مجھے دے دو۔ میں ادھر ڈاکخانے سے ٹکٹ لگوا کر آپ کے گھر بھجوا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، تم تھوڑی دیر رکو میں لے کر آتا ہوں۔ لکھ کر تو کئی دن سے رکھا ہوا ہے۔'' معاذ اپنے لیے مخصوص جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔ خط لے کر واپس آیا تو مراد اور لیلیٰ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ مراد کے چہرے پر محظوظ ہونے والے تاثرات تھے جبکہ لیلیٰ برہم سی نظر آ رہی تھی۔ معاذ سمجھ گیا کہ مراد نے لیلیٰ کے ساتھ چھیڑ خانی کی ہے۔ مراد نے اسے دیکھ کر اشارہ کیا کہ وہ لیلیٰ کے سامنے خط نہ دے۔ یقیناً وہ اپنی روانگی کو لیلیٰ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی بات سمجھ کر معاذ نے خط جیب کے اندر رکھ لیا۔ اس کے جسم پر موجود لباس اسے فیضو نے فراہم کیا تھا، خود اس کے اپنے کپڑے تو گرنے کے عمل کے دوران بری طرح پھٹ گئے تھے۔

''دیکھ مراد! میں تجھے آخری بار سمجھا رہی ہوں کہ میرے منہ نہ لگا کر۔ میرا دماغ گھوم گیا تو میں بھول جاؤں گی کہ تو سجاول چاچا کا بیٹا ہے اور سجاول چاچا میرے بابا کے وہ محسن ہیں جنہوں نے مشکل وقت میں ہمیں یہاں پناہ دی تھی۔'' معاذ نے سنا، لال بھبوکا چہرے کے ساتھ لیلیٰ، مراد کو وارننگ دے رہی تھی۔

''تو سب بھول جا مجھے پروا نہیں ہے لیکن بس یہ مت بھولنا کہ مراد تجھ پر مرتا ہے۔'' اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر مراد عاشقانہ لہجے میں بولا تو لیلیٰ کا ضبط جواب دے گیا اور اس نے مکا بنا کر مراد کے جبڑے پر رسید کرنا چاہا۔ مکا مارنے کے اس کے عمل میں جتنی پھرتی تھی، مراد نے بھی اتنی ہی تیزی سے ایک طرف جھکائی دے کر خود کو اس کے وار سے بچایا تھا۔ اتنے بھاری تن و توش کے ساتھ ایسی پھرتی قابلِ تعریف تھی۔ معاذ اسے داد دیتے رہ گیا۔ اسے بروقت احساس ہو گیا تھا کہ اس کی داد لیلیٰ کے غصے کا گراف اور بھی بلند کر دے گی۔ اب بھی وہ خطرناک موڈ

میں نظر آرہی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ ایک کوشش میں ناکام ہونے کے بعد مراد پر دوسرا وار کرنے والی ہے۔

''پلیز سیز فائر۔ آپس میں اس طرح لڑنا گندے بچوں کی نشانی ہے۔'' معاذ نے انہیں ٹوکا۔

''میں بچی نہیں ہوں۔'' اس کے کہنے پر لیلیٰ رک تو گئی لیکن منہ بنا کر بولی۔

''بچی نہ سہی لیکن مجھ سے بہت چھوٹی ہو اس لیے میری بات ماننا تم پر فرض ہے۔'' معاذ نے اس پر رعب ڈالا۔

''آپ کی تو میں ہر بات مان سکتی ہوں معاذ سائیں۔'' وہ اچانک ٹھنڈی پڑ گئی اور عجیب سے لہجے میں کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے اس انداز پر معاذ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مراد کے چہرے پر بھی ایک تاریک سایہ لہرایا ہے۔

''بڑی ٹیڑھی بچی ہے۔ اب بھی وقت ہے، سوچ لو مراد کہ اتنی خونخوار لڑکی کے ساتھ کیسے گزارہ کرو گے۔'' لیلیٰ کے جملے کا تاثر ماند کرنے کے لیے معاذ نے قصداً مراد کو چھیڑا اور لیلیٰ کے لیے خصوصیت سے ''بچی'' کا لفظ استعمال کیا تاکہ مراد سمجھ لے کہ وہ لیلیٰ کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

''میں سنبھال لوں گا معاذ سائیں..... مجھے بچپن سے اسے سہنے کی عادت ہے۔ لائیں، آپ اپنی چٹھی جلدی سے دے دیں۔ مجھے واپس جا کر ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔'' مراد نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب عام سے لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ معاذ نے جیب میں موجود کاغذ نکال کر اسے تھما دیا۔ یہاں اسے کوئی لفافہ میسر نہیں آیا تھا بلکہ وہ تو کاغذ قلم ملنے پر بھی حیران ہی تھا۔ مراد نے البتہ اسے تسلی دے دی تھی کہ ڈاک خانے سے لفافہ لے کر اس کا خط پوسٹ کر دیا جائے گا۔

''اجازت سائیں۔'' مراد نے اس نے لفافہ اور پتے والی چٹ لے کر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھی اور معانقے کے لیے بازو پھیلائے۔ معاذ فوراً اس کے گلے سے لگ گیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ لیلیٰ کے رویے سے جو احساس ہوا ہے، اللہ کرے وہ ایک غلط فہمی ہی ہو اور اس پیارے لڑکے کا دل کبھی دکھی نہ ہو۔

☆☆☆

کیرتھر پر رات اتر آئی تھی۔ کامل رات۔ اس رات سے مختلف جو شہروں پر اترتی ہے۔ شہروں کی رات کو مصنوعی روشنیاں کامل نہیں ہونے دیتیں اس لیے شہر والے رات کے اس حسن کو بھی دیکھنے سے محروم رہتے ہیں جو کیرتھر اور اس جیسے دوسرے ویرانوں میں جگمگاتا ہے۔ ان ویرانوں کی راتیں بظاہر بڑی بھیانک اور پُراسرار محسوس ہوتی ہیں لیکن اسی ہیبت اور اسرار کے پردے میں سے ہی حسن بھی جھانکتا ہے۔ معاذ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے حسن کو دریافت کرنے، اس سے لطف اندوز ہونے اور اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس نے پورے چاند کی رات میں پہاڑوں پر چاندنی کا رقص بھی دیکھا تھا اور اب چاند کی آخری راتوں کا حسن بھی دیکھ رہا تھا۔ چاند پورا ہو تو اس کا حسن نظروں کو باندھ لیتا ہے اور دوسری خوب صورتیوں کو محسوس نہیں کرنے دیتا لیکن اب چاند سے خالی آسمان پر وہ ستاروں کا راج دیکھ رہا تھا۔ سیاہ آسمان پر موجود ستاروں کی ناقابلِ شمار تعداد نے اسے مبہوت کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ستارے بھی اتنے روشن ہوتے ہیں یا پھر کیرتھر کے ماحول کا اثر ہے کہ وہ ستاروں کو اتنا روشن محسوس کر رہا ہے۔ یہ شاید ماحول کا ہی اثر تھا ورنہ قدرت کہاں اپنی تقسیم میں غیر انصافی سے کام لیتی ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو پٹ؟'' وہ جانے کتنی دیر تک ستاروں کی اس انوکھی دنیا میں گم رہتا کہ فیضو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس کے قریب ہی آ بیٹھا تھا اور اپنے حقے کی نے درست کر رہا تھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ یہاں سے آسمان کتنا قریب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں وہ سامنے والے پہاڑ پر چڑھ جاؤں تو ہاتھ بڑھا کر آسمان سے تارے توڑ سکتا ہوں۔'' معاذ نے کافی دور نظر آتے ایک پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سحر زدہ سے لہجے میں جواب دیا تو فیضو ہنسنے لگا۔

''آپ کو میری بات بچکانہ لگ رہی ہے نا چاچا جی؟'' اس کے ہنسنے پر معاذ نے ذرا جھینپ کر دریافت کیا۔

''بچوں کی سی باتیں کرنے میں کیا برائی ہے پٹ! ہم میں سے ہر ایک کے اندر ایک بچہ چھپا ہوتا ہے اور یہ بچہ اتنا شریر ہوتا ہے کہ وقت بے وقت شرارت کرنے پر تل جاتا ہے۔ اس بچے کے ہونے پر شرمندہ ہونے کے بجائے کبھی کبھی اس کے لاڈ اٹھانے میں کچھ نہیں جاتا۔ میں تو اپنے اندر کے بچے کو بڑا خوش رکھتا ہوں اور اکثر اس کی پسند کے کھیل کھیلتا رہتا ہوں۔ تم کھیلو گے میرے ساتھ وہ کھیل.....؟'' بتاتے بتاتے فیضو نے اچانک اس سے پوچھا تو وہ حیران رہ گیا کہ اس وقت اتنے اندھیرے میں فیضو کون سا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ یہاں راتوں کو کسی شغل میلے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہی اپنے کام نمٹا کر سو جاتے تھے اور صبح منہ اندھیرے ہی ان کے دن کا آغاز ہو جاتا تھا۔ ایسے میں فیضو کا پوچھا گیا سوال

اسے حیران نہ کرتا تو کیا کرتا۔ آج کل تو ویسے ہی وہ لوگ رسد کی کمی کی وجہ سے ہر شے بہت سوچ سمجھ کر خرچ کر رہے تھے اور انتہائی ضرورت کے علاوہ کہیں کوئی چراغ روشن نہ کیا جاتا تھا ایسے میں فیضو کوئی کھیل کھیلتا بھی تو کیسے۔

''مجھے اندھیری راتوں میں تاروں سے کھیلنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ تارے میرے سب سے من پسند کھلونے ہیں۔'' اس کی حیرانی سے بے نیاز فیضو اسے بتا رہا تھا۔

''تاروں سے کیسے کھیلتے ہیں چاچا؟'' معاذ نے تجسس سے پوچھا۔

''تجھے بھی سکھا دیتا ہوں یہ کھیل پٹ۔ ادھر آسمان کی طرف دیکھ اور جو تارا تجھے سب سے زیادہ روشن اور سوہنا لگے، اسے اپنے لیے چن لے۔'' فیضو بول رہا تھا اور معاذ کی آسمان پر بھٹکتی نظروں نے خود ہی ایک تارا چن لیا تھا۔

''جو تارا تو چنے گا، وہ تیرا کھلونا ہوگا۔ انوکھا کھلونا جسے تو ہاتھ نہیں لگا سکے گا لیکن نظروں کی ڈور سے باندھ کر اس کی روشنیوں سے کھیل سکے گا۔ تو دیکھے گا کہ روشنیاں تیرے لیے ناچ رہی ہیں، تیرے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں اور تیرے اندر اتر کر تیری روح کو روشن کر رہی ہیں۔'' فیضو بولتا جا رہا تھا لیکن اب اسے فیضو کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے منتخب کردہ ستارے نے اس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مبہوت سا بظاہر ننھے نظر آنے والے اس تارے کی بے پناہ روشنیوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ان روشنیوں کے بے شمار رنگ تھے پر کوئی رنگ نہیں تھا۔ کم از کم وہ ان میں سے کسی رنگ کو دوسرے سے جدا کر کے کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ دیکھتا رہا۔ روشنیاں رقص کرتی رہیں پھر دھیرے دھیرے ان روشنیوں نے نیچے اترنا شروع کر دیا اور نظروں سے اس کے اندر اترنے لگیں۔ اس کا وجود ان روشنیوں سے بھرنے لگا اور پھر وہی ہوا جو بہت زیادہ روشنی میں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں اور اسے نظر آنا بند ہو گیا۔ وہ گھبرا گیا کہ کہیں بھٹک کر راستہ نہ بھول جائے لیکن اسی وقت کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ روشنیوں کی چکاچوند کم ہونے لگی۔ اس کا دل گھبراہٹ سے آزاد ہونے لگا اور پھر جیسے وہ آسمان پر اڑتے اڑتے ہولے سے زمین پر آ اترا۔ وہاں وہی اندھیرا تھا اور فیضو اس کے قریب اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ اندھیرے میں اس کی پراسرار آنکھیں کسی سانپ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اندھیرے کے باوجود معاذ کو ایسا لگا کہ وہ مسکرا رہا ہو۔ پراسراری مسکراہٹ۔

''آج کے لیے اتنا ہی کھیل کافی ہے پٹ! نیا کھلاڑی اتنا بھی کھیل لیا تو سمجھو کمال کر دیا۔'' سرگوشی میں اس سے کہتے ہوئے فیضو نے اس کے شانے پر ایسے تھپکی دی جیسے فٹ بال، ہاکی یا کرکٹ کی ٹیم کا کوچ کسی نئے کھلاڑی کو اس کی بہتر کارکردگی پر تھپکی دیتا ہے۔

''رات بہت ہو گئی ہے۔ جا اب جا کر سو جا۔'' دھیرے سے ایک اور تھپکی دیتے ہوئے اس نے معاذ کو نصیحت کی تو وہ کسی سحر زدہ شخص کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بستر پر لیٹ کر اسے خیال آیا کہ آج مراد اور اس کے دوست کیا کرنے والے ہیں لیکن دماغ پر اچانک ہی ایسی تھکن طاری ہو گئی تھی کہ کچھ سوچنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شدید تھکن کے احساس سے مغلوب وہ جلد ہی نیند کی گہری وادیوں میں اتر گیا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر سویا تھا کہ پے در پے ہونے والے دھماکوں نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ گہری نیند سے جاگنے کے باعث کچھ دیر تو وہ اصل صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکا پھر اسے سمجھ آنے لگی کہ یہ فائرنگ کی آوازیں ہیں۔ رائفل، شاٹ گن اور پسٹلوں ہر طرح کے ہتھیار کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ دو گروہ آپس میں برسرِ پیکار ہوں۔ اسے فوراً مراد اور اس کے ساتھیوں کا خیال آیا۔ آج رات وہ لوگ اپنے ڈیرے سے نکل کر آبادی کی طرف جانے والے تھے۔ اس نے سوچا کہ کہیں ان لوگوں کا ڈاکوؤں سے تصادم تو نہیں ہو گیا ہے لیکن اگلے ہی پل اس نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ اس کی معلومات کے مطابق ڈاکوؤں کا ٹھکانا یہاں سے کافی دور تھا اور نکاسی کے راستوں پر جن مقامات پر انہوں نے پہرا بٹھا رکھا تھا، وہ مقامات بھی کافی آگے تھے جبکہ یہاں جو فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں، وہ اتنی قریب تھیں کہ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ فائرنگ یہیں ڈیرے پر ہی ہو رہی ہے۔ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور صورت حال جاننے کے لیے احتیاط کے ساتھ باہر نکلا۔ باہر اب پہلے جیسا اندھیرا نہیں تھا۔ ایک جھونپڑی میں آگ لگ گئی تھی اور اس جلتی جھونپڑی کی روشنی میں چند متحرک سائے نظر آ رہے تھے۔ غیر معمولی تن و توش کے باعث اس نے مراد کے سائے کو پہچان لیا اور جھکا جھکا اس کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی رائفل سنبھالے ایک بڑے پتھر کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس کے قریب پہنچ کر معاذ نے اس سے سوال کیا۔

''خمیسو ڈاکو کے گروہ نے ڈیرے پر حملہ کر دیا ہے۔'' اس نے بغیر پلٹے جواب دیا اور ایک فائر کیا۔ اسی کی طرح

UUNOVELS.COM

دوسرے لوگ بھی مختلف مقامات پر چھپے فائرنگ کر رہے تھے لیکن معاذ نے یہ بات فوراً محسوس کر لی تھی کہ ڈاکوؤں کی طرف سے تابڑ توڑ فائرنگ کے جواب میں یہاں سے بہت محتاط فائرنگ کی جا رہی تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ ڈاکوؤں کے پاس ایمونیشن کی کوئی کمی نہیں تھی اور ڈیرے والوں کے پاس اسلحے کا محدود ذخیرہ تھا۔

"کیا مجھے کوئی ہتھیار مل سکتا ہے؟" صورت حال کو سمجھ کر معاذ کا خون بھی جوش مارنے لگا۔ اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے باقاعدہ شوٹنگ سیکھی تھی اور کئی طرح کے ہتھیار چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

"یہ دوسری رائفل لے لو معاذ سائیں، پر خیال سے۔" مراد نے پتھر کی جڑ میں پڑی رائفل اس کی طرف کھسکائی اور بولا۔ جواب میں معاذ بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مراد ایک طرف سے مسلسل ہونے والی فائرنگ کی طرف متوجہ ہو گیا اور سمت کا تعین کرتے ہوئے اس طرف فائر مارنے لگا۔ معاذ خاموشی سے پیچھے کھسک گیا اور رینگتا ہوا قوس کی صورت گھوم کر آگے کی طرف جانے لگا۔ اس کی نظروں نے آگے ایک ابھری ہوئی چٹان کو تاڑ لیا تھا اور اسے امید تھی کہ اس چٹان کی آڑ سے حملہ آوروں کو زیادہ بہتر طور پر نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ چٹان کی آڑ سے جھانکنے پر اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا اور ایک لمحے کے جائزے سے ہی اس نے تین ایسے افراد کو تاڑ لیا جن کے ہتھیار مسلسل آگ اگل رہے تھے۔ وہ تینوں مکمل اندھیرے میں تھے لیکن ان کے ہتھیاروں سے نکلنے والے شعلے ان کی نشاندہی کر رہے تھے۔ معاذ نے ایسے ہی ایک شعلے کو اپنا ہدف بنا کر فائر کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہاں سے اگلتے شعلے یکدم ہی رک گئے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں "وہ مارا" کا نعرہ لگایا۔ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا لیکن دوسری طرف سے دیکھ لیا گیا تھا کہ فائر کہاں سے آیا ہے چنانچہ اپنے نقصان کے جواب میں اسے ہدف بنانے کے لیے بے تحاشا فائرنگ کی جانے لگی۔ گولیوں نے چٹان کے سامنے کے رخ کو ادھیڑ کر رکھ دیا لیکن معاذ اس کی آڑ میں محفوظ و مامون رہا۔ چند لمحوں کے اس سلسلے کے بعد دونوں ہتھیار یکے بعد دیگرے خاموش ہو گئے تو معاذ نے ذرا سے توقف سے سر نکال کر آڑ میں سے باہر جھانکا۔ اسے خدشہ تھا کہ ہتھیاروں کا خاموش ہو جانا چال بھی ہو سکتی ہے تاکہ وہ آڑ سے باہر آ جائے لیکن اس کے جھانکنے پر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔

اندھیرے میں اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا اتنا اندیشہ بھی نہیں تھا لیکن یہ خدشہ تو بہرحال تھا کہ ذرا سے توقف کے بعد دوبارہ فائرنگ شروع ہو سکتی ہے۔ آڑ میں سے احتیاط سے جھانکتے ہوئے اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک آڑ میں سے شعلہ کوندا اور آگے ڈاکوؤں کی صفوں میں شعلے اگلتے ایک ہتھیار کو خاموش ہونا پڑا۔ معاذ کو اندازہ ہو گیا کہ ڈیرے والوں میں سے کوئی ہے جو اس سے بھی آگے موجود ہے۔ اس نے آگے موجود شخص کو ایک خیالی تھپکی دی اور خود بھی رینگتا ہوا آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈاکوؤں کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے یہاں والوں کا آگے بڑھ کر انہیں جواب دینا بہت ضروری تھا۔ ویسے یہ بات بھی قابلِ داد تھی کہ بے خبری میں شب خون مارے جانے کے باوجود ڈیرے والوں نے اپنے سے کئی گنا بہتر ہتھیاروں سے لیس ڈاکوؤں کو ابھی تک ڈیرے پر گھسنے سے روکے رکھا تھا۔ اگر ڈاکو یہاں گھسنے میں کامیاب ہو جاتے تو ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ سب سوچتا وہ رینگتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک نسوانی چیخ سنی۔ چیخ درد میں ڈوبی ہوئی تھی پھر بھی وہ اسے شناخت کرنے میں کامیاب رہا۔ بلاشبہ وہ لیلیٰ کی چیخ تھی اور اس آڑ میں سے سنائی دی تھی جہاں سے اس نے ایک شعلہ نکل کر ڈاکوؤں کی صفوں کی طرف جاتا ہوا دیکھا تھا۔ لیلیٰ کے علاوہ پورے ڈیرے پر اتنی نڈر دوسری کوئی عورت ہو بھی کون سکتی تھی جو ڈاکوؤں سے یوں سب سے آگے جا کر مقابلہ کرنے کھڑی ہو جاتی۔

اس کی چیخ سن کر وہ پھرتی سے آگے کی طرف لپکا لیکن پھر اچانک ہی پیچھے سے ایک بگولا سا آیا اور معاذ سے آگے نکل گیا۔ معاذ نے پہچان لیا کہ وہ مراد ہے۔ وہ اس چٹانی آڑ تک پہنچا تو مراد ایک لمبے چوڑے سائے سے لپٹا ہوا تھا وہ یقیناً کوئی ڈاکو ہی تھا جو ہاتھ میں رائفل ہونے کے باوجود مراد کے اس طرح لپٹ جانے کے باعث اپنی رائفل کو استعمال کرنے سے قاصر تھا اور اپنی جسمانی طاقت کی مدد سے ہی جونک کی طرح چمٹے ہوئے مراد سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی اس کا گھوڑا کھڑا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر لیلیٰ لدی ہوئی تھی اور یقینی طور پر بے ہوش تھی۔ معاذ دیکھ رہا تھا کہ مراد طاقتور اور پھرتیلا ہونے کے باوجود اس گرانڈیل شخص پر قابو پانے میں ناکام ہے اور وہ شخص رائفل چھوڑ کر پے در پے مراد کے سر اور گردن پر مکے برسا رہا ہے۔ یہ مکے یقینی طور پر بہت قوت سے مارے جا رہے تھے اور مراد کی قوتِ عمل کو کمزور کر رہے تھے لیکن پھر بھی وہ اپنے مقابل کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مراد

کی مدد کے خیال سے معاذ اپنی جگہ سے حرکت میں آنے ہی لگا تھا کہ اسے وہاں ایک اور شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ پستہ قامت کا ایک سیاہ پوش تھا جس نے اپنی رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور یقیناً اس کا بٹ مراد کے سر پر مارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گولی اس نے اس لیے نہیں چلائی ہو گی کہ وہ مراد کے بجائے اس کے اپنے ساتھی کو بھی لگنے کا احتمال تھا۔ اس کا رائفل والا ہاتھ نیچے آتا، اس سے قبل ہی معاذ حرکت میں آیا اور رائفل کا رخ اس سیاہ پوش سائے کی طرف کرتے ہوئے گولی چلا دی۔ نشانہ بے پناہ سچا تھا۔ پستہ قد سیاہ پوش کی کھوپڑی اڑ گئی۔ اسی وقت مراد کو موقع ملا تو اس نے اپنے مقابل کے منہ پر سر کی ٹکر دے ماری۔ اس کا تربوز جیسا بھاری سر یقیناً اس کے مقابل کے ناک منہ کا کباڑا کر گیا ہو گا جب ہی وہ بری طرح ڈکرایا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر جھکتا چلا گیا۔ اس کے جھکتے ہی ایک گولی آئی اور مراد کے شانے کو ادھیڑتی ہوئی نکل گئی۔ معاذ گولی کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا، ایک لمحے کی بھی تاخیر کے بغیر اس نے جوابی فائر کیا۔ نتیجے میں کسی کی دردناک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ کوئی گر کر نیچے لڑھکتا چلا گیا ہو۔ معاذ ہر خطرے سے بے نیاز لپک کر مراد کے قریب پہنچا لیکن اس کا احوال معلوم کرنے سے پہلے ابھی تک چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپے شخص کے سر پر رائفل کے بٹ سے ایک نپی تلی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دینا مناسب سمجھا۔

''یہ خمیسو خان ہے ڈاکوؤں کا سردار۔'' مراد ایک ہاتھ سے اپنے زخمی بازو کو دبائے خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اذیت کو برداشت کرتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولا تو معاذ چونک گیا اور ایک نظر اب بھی گھوڑے کی پشت پر لدی بے ہوش لیلیٰ پر ڈالی۔ اسے فوراً سمجھ آ گئی کہ کسی طرح خمیسو خان کو لیلیٰ کی یہاں موجودگی کا پتا چل گیا ہو گا اور اس نے اپنے دو حواریوں کے ساتھ اسے گھیر کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی ہو گی لیکن اس کی اور مراد کی بروقت مداخلت نے بازی الٹ دی اور الٹا خمیسو بے ہوشی کی حالت میں ان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ خمیسو کا پگڑ کھول کر اسے مراد کے بازو پر باندھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ایک حصے کی پٹی بنا کر مراد کے گلے میں ڈال دی اور اس پٹی میں اس کا زخمی بازو لٹکا دیا۔ ان تراکیب سے خون کے بہنے کی رفتار کم ہونے میں خاطر خواہ مدد مل سکتی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے لیلیٰ کی طرف توجہ دی۔ وہ بے ہوش تھی لیکن نبض اور سانسوں کی رفتار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے بہت زیادہ شدید چوٹ نہیں آئی ہے۔ اس نے لیلیٰ کو گھوڑے سے اتار کر نیچے ڈالا اور مراد کو اشارہ کیا کہ وہ لیلیٰ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرے۔ مراد پتھریلی زمین پر لیلیٰ کے قریب بیٹھ کر اس کے گال تھپتھپانے کے ساتھ ساتھ اسے آوازیں لگا رہا تھا جبکہ معاذ کی توجہ گھوڑے کی طرف تھی۔ اپنے مالک کے بے ہوش ہو کر گرنے سے وہ خاصا مضطرب نظر آ رہا تھا۔ معاذ دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ اور سر کو سہلا کر اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کئی برس پہلے گھڑ سواری سیکھی تھی اور اسی عرصے میں اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ گھوڑا چاہے کیسا ہی اڑیل ہو اس سے بہت جلد مانوس ہو جاتا تھا۔ اس گھوڑے نے بھی بتدریج پرسکون ہونا شروع کر دیا۔ دوسری طرف مراد بھی لیلیٰ کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اسے سوال و جواب کا موقع دیے بغیر معاذ نے بولنا شروع کر دیا۔

''لیلیٰ! تم خمیسو کو اس کے گھوڑے پر ڈال کر ڈیرے تک لے جاؤ اور کسی طرح یہ بات ڈاکوؤں تک پہنچانے کی کوشش کرو کہ ان کا سردار خمیسو خان ہمارے قبضے میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے سردار کی سلامتی کے لیے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں جاتی ہوں۔'' لیلیٰ فوراً تیار ہو گئی۔ معاذ نے اس کی مدد سے بھاری بھرکم خمیسو خان کو گھوڑے کی پشت پر لادا اور لیلیٰ کو گھوڑے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اچک کر قابلِ تعریف پھرتی سے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئی۔ فائرنگ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا اور اس میں پہلے سے زیادہ تیزی آ گئی تھی۔ یقیناً لیلیٰ اور معاذ کے ہاتھوں شکار ہونے والے اپنے ساتھیوں کی لاشوں نے ڈاکوؤں کو برافروختہ کر دیا تھا اور وہ ڈیرے والوں کو بھون کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ لوگ جس چٹان کی آڑ میں تھے، وہاں تک کسی گولی کی رسائی نہیں تھی لیکن لیلیٰ گھوڑے سمیت ڈیرے کی طرف جاتی تو اس کا نظروں میں آ جانا لازمی تھا۔ اس مسئلے کا حل معاذ نے یوں نکالا کہ دوسرے رخ سے ڈاکوؤں کی طرف فائرنگ شروع کر دی۔ فوراً ہی ڈاکوؤں کے ہتھیاروں کا رخ بھی اسی طرف ہو گیا۔ معاذ، لیلیٰ کو پہلے ہی مختصراً سمجھا چکا تھا اس لیے وہ فوراً ہی حرکت میں آ گئی اور خمیسو خان کے گھوڑے کو ایڑ لگا کر بجلی کی رفتار سے ڈیرے کی طرف لپکی۔ مختصر سے کھلے علاقے کو پار کر کے ڈیرے کی طرف جانے میں اسے زیادہ وقت نہیں

UUNOVELS.COM

لگا۔ معاذ کی فائرنگ کا جواب دیتے ڈاکو اس کی طرف متوجہ ہوتے، اس سے قبل ہی وہ چٹانوں کی آڑ میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے محفوظ ہونے کا اندازہ ہوتے ہی معاذ نے فائرنگ کا سلسلہ ترک کر دیا اور چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھے مراد کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب غیر ضروری فائرنگ کر کے گولیاں ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''تھوڑی دیر میں انشاءاللہ یہ سارا سلسلہ رک جائے گا تو میں تمہیں ڈیرے پر بھجوا دوں گا۔ میں نے لیلیٰ سے کہا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی پہلی فرصت میں گھوڑوں سمیت یہاں آجائے۔'' مراد کو تسلی دیتے ہوئے بھی اس کی نظریں گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کہیں معمولی سی غفلت بنا ہوا کھیل نہ بگاڑ دے۔ احتیاطاً اس نے ڈاکوؤں کی طرف ایک دو فائر بھی کیے کہ انہیں اس کی اسلحے سمیت وہاں موجودگی کا اندازہ رہے اور وہ اس جگہ پر چڑھے نہ چلے آئیں۔ انتظار کا یہ وقفہ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا اور فائرنگ کی آوازوں کے درمیان ایک مختلف آواز سنائی دی۔ معاذ نے اس آواز کو شناخت کر لیا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بھونپو کی آواز تھی جس پر ڈاکوؤں کو مخاطب کر کے انہیں خمیسو خان کے اپنے قبضے میں ہونے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ پہلی بار تو شاید کسی نے توجہ نہیں دی لیکن جب اعلان بار بار دہرایا جانے لگا تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور فائرنگ کا سلسلہ آہستہ آہستہ تھمنے لگا۔ ڈیرے والوں کی طرف سے یہ سلسلہ پہلے ہی رک چکا تھا۔ ان کی طرف سے ایک بار پھر اعلان دہرایا گیا۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ سردار تمہارے قبضے میں ہے۔'' آخرکار ڈاکوؤں کی طرف سے بھی بھونپو کے ذریعے ہی پوچھا گیا۔ معاذ کو بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکو اس طرح کے بھونپو اپنی ہر واردات کے دوران اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ لوگوں کو خبردار کر دیا جائے کہ ان کے سامنے کسی مزاحمت کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

''ثبوت کے لیے تمہارے سردار کا گھوڑا کافی ہے۔'' بھونپو پر جو آواز گونجی، اسے معاذ نے اس بار شناخت کر لیا۔ وہ فیضو کی آواز تھی۔ اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی ڈیرے کی طرف سے خمیسو خان کا گھوڑا برآمد ہوا اور ڈاکوؤں کی جانب دوڑتا چلا گیا۔

''سردار کی آزادی کے بدلے میں کیا چاہتے ہو؟'' پل بھر کے لیے ڈاکوؤں کو سانپ سونگھ گیا تھا لیکن پھر ادھر سے بات آگے بڑھائی گئی۔

''سردار کی آزادی کی قیمت ہم سردار سے ہی طے کریں گے۔ ابھی بس تم واپس لوٹ جاؤ اور اپنے سردار کی واپسی کا انتظار کرو۔ اگر تم میں سے کوئی ڈیرے کے قریب بھی پھٹکا تو ہماری طرف سے سردار کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔'' فیضو نے گونجیلی آواز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تم نے کچھ الٹا سیدھا کیا تو یاد رکھنا کہ جواب میں ڈیرے پر ایک بھی شخص زندہ نہیں بچے گا۔'' وہ ڈاکو تھے اور انہیں لوگوں کو دہشت زدہ کر کے اپنا مطلب نکالنے کی عادت تھی اس لیے اتنی آسانی سے دھمکی میں آنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

''دھمکی مت دو۔ ہماری طرف سے خمیسو خان کی زندگی کی ضمانت ہے لیکن شرط وہی ہے کہ تم لوگ ڈیرے سے دور رہو گے اور کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرو گے۔'' فیضو ان سے بڑے مضبوط لہجے میں بات کر رہا تھا۔ آخر ان کی طرف سے پسپائی اختیار کر لی گئی اور فیضو کی ہدایت کے مطابق وہ لوگ واپس پلٹنے لگے۔ اسی دوران لیلیٰ، مراد کا گھوڑا لے کر آ گئی تھی۔ معاذ نے مراد کو گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی اور وہ دونوں ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ معاذ کے لیے لیلیٰ اپنا گھوڑا چھوڑ گئی تھی۔ معاذ گھوڑے پر سوار ہو کر ڈیرے پر پہنچا تو وہاں اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی۔ جھونپڑی میں لگی آگ بجھا لی گئی تھی لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہاں مشکل سے ہی کچھ بچا ہو گا۔ اچھی بات یہ تھی کہ مکین بچ گئے تھے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ چھوٹے بچے کی کسی ضرورت کے لیے ماں نے ذرا دیر کو لالٹین جلائی تھی۔ ڈاکوؤں کی طرف سے اس روشنی پر فائر کیا گیا اور لالٹین پھٹنے سے آگ بھڑک اٹھی۔ عورت نے شور مچا کر اپنے شوہر کو جگایا اور وہ لوگ بچوں کو لے کر باہر بھاگے لیکن انہیں اتنی مہلت نہیں ملی کہ جلتی ہوئی جھونپڑی میں سے اپنا اسباب نکال سکیں۔ وہ کوئی لاکھوں کا سامان نہیں تھا لیکن جو بھی تھا ان کی زندگی کی لازمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بہت اہم تھا اس لیے وہ اس سے محروم ہونے پر آنسو بہا رہے تھے اور دیگر لوگ ان کو تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

دوسری افسوسناک خبر مراد کے ایک ساتھی کے بارے میں ملی۔ اس لڑکے کی کمر میں بائیں جانب گولی لگی تھی اور اس کی حالت بہت تشویشناک تھی۔ فیضو، مراد کا باپ سجاول اور مزید ایک دو لوگ اس لڑکے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مراد کی بھی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ خون اچھا خاصا بہہ جانے کی وجہ سے مراد کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن

UUNOVELS.COM

اس کی جان کو بہر حال خطرہ نہیں تھا۔ تشویش اس دوسرے لڑکے کی طرف سے ہی تھی۔ گولی اس کے جسم کے اندر ہی تھی اور بہت گہرائی میں چلی گئی تھی۔ فیضو جو کافی حد تک علاج معالجے میں ماہر تھا، اس کے زخم کو ٹٹول کر دیکھ چکا تھا لیکن اسے گولی نہیں ملی تھی۔ فیضو بہر حال سرجن نہیں تھا اس لیے بے بس ہو گیا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ اب اس بات پر تھی کہ لڑکا کم سے کم تکلیف محسوس کرے اور خون کے بہاؤ میں کمی آجائے۔ اسے علاج کے لیے شہر لے جانے پر بھی غور ہو رہا تھا اور اس کے لیے اسٹریچر سا تیار کیا جا رہا تھا لیکن معاذ دیکھ رہا تھا کہ فیضو کے چہرے پر مایوسی کے سائے تھے۔ یقیناً وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ لڑکے کے پاس اتنی مہلت نہیں ہے کہ وہ شہر پہنچ سکے۔ اصل میں تمام تر کوشش کے باوجود زخم سے خون کا بہاؤ نہیں رک رہا تھا اور لمحہ لمحہ وہ زندگی سے دور جاتا جا رہا تھا۔ آخر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا چراغ بجھ گیا اور اس کی ماں کے بین کلیجا پھاڑنے لگے۔ تھکا ہوا نڈھال معاذ ایک طرف خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ مرنے والے کی ماں کے بینوں نے اسے اپنی ماں کی یاد اور بھی شدت سے دلا دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی امی کی زندگی کا محور و مرکز ان کا گھر اور بچے ہیں اور پہلوٹی کی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ اس سے کچھ زیادہ ہی شدید محبت رکھتی ہیں، ایسے میں اس کی گمشدگی پر ان کا کیا حال ہوگا، وہ سمجھ سکتا تھا۔

☆☆☆

بشریٰ نے شہد رنگ آنکھوں اور بالوں والی سونیا خان کو اسپتال کے اپنے اس کمرے میں دیکھا تو حیران رہ گئی۔ سونیا پہلے بھی ایک بار اس کی عیادت کے لیے آئی تھی لیکن اب موجودہ حالات میں جبکہ اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑنے پر تلا ہوا تھا، ایک معمولی شناسا کی آمد حیران کن تھی۔ لوگ تو عائشہ اور گلزار عاصم کی میت پر بھی بس دنیاداری نبھانے آئے تھے اور اسے افسوس کے چند جملے پکڑا کر چلے گئے تھے۔ کسی رشتے دار، پڑوسی، دوست اور آشنا نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ لڑکی جو ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئی ہے اور جس کی اپنی حالت ایسی ہے کہ بستر سے اتر کر اپنی اہم ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتی، ہم اس کڑے وقت میں اس کا ساتھ دیں گے۔ اصل میں سب خوف زدہ تھے۔ واقعے کو ڈکیتی کی واردات قرار دیے جانے کے باوجود ہر ایک کو اندازہ تھا کہ یہ اندوہناک حادثہ بااختیار لوگوں سے ٹکر لینے کا نتیجہ تھا اور کوئی ایسے حالات میں بشریٰ کی مدد کر کے خود عتاب کا شکار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ راحیلہ جو اس کی سب سے قریبی دوست تھی اور اس کے غم پر اس سے زیادہ آنسو بہاتی رہی تھی، وہ بھی چاہتے ہوئے اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھی اور ایک رات کے لیے بھی اس کے پاس اس کے گھر میں نہیں رک سکی تھی۔ اس کے والدین اپنی جوان بیٹی کو پرائی آگ میں جلنے کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے راحیلہ کی التجا پر بس اتنی مہربانی کی تھی کہ بشریٰ کے چند قریبی اعزا سے مشورہ کر کے اسے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا تھا جہاں اس کی دیکھ بھال کے لیے اسپتال کا تربیت یافتہ عملہ موجود تھا۔

راحیلہ یونیورسٹی سے دو تین بار اس سے ملنے کے لیے آئی تھی اور بشریٰ نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے والدین سے کہہ کر اس کا گھر بکوانے کا انتظام کر دے۔ وہ اب اکیلی اس گھر میں نہیں رہ سکتی تھی اور جو کچھ اس کے دماغ میں چل رہا تھا اس کے مطابق تو اسے گھر سے زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔ رہائش کے لیے وہ کسی ویمن ہاسٹل میں بھی کمرا لے سکتی تھی۔ اسے حنین کے بارے میں بھی علم ہو گیا تھا۔ اس کی تشدد زدہ لاش دوسرے دن شہر کے ایک سنسان علاقے میں ملی تھی۔ بشریٰ نے اپنے گھر میں گھسنے والوں کی بربریت دیکھی تھی۔ خصوصاً باذل کا چہرہ اور آنکھیں وہ کسی صورت نہیں بھول سکتی تھی اس لیے اسے اندازہ تھا کہ حنین مرنے سے پہلے کتنے کرب اور اذیت سے گزرا ہوگا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ حنین، معاذ کی خاطر بشریٰ کے ساتھ مل کر کیا کچھ کر رہا ہے اس لیے ان دونوں واقعات کا آپس میں تعلق جوڑنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ عام لوگوں کے علاوہ پولیس نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی اور ایسا یقیناً جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ پولیس کی طرف سے اس معاملے میں مسلسل مجرمانہ غفلت برتی جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں وہ سونیا خان کو اسپتال میں اپنے سامنے دیکھ کر حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

''کیسی ہو تم بہادر لڑکی؟'' سونیا نے اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تیزی سے امپروو کر رہی ہوں اور امید ہے کہ جلد اس بستر سے جان چھوٹ جائے گی۔'' بشریٰ نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ پہلے سے زیادہ رفتار سے صحت مند ہو رہی تھی۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ غم انسان کو ڈھا دیتے ہیں اور وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھتا ہے لیکن بشریٰ کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔

UUNOVELS.COM

وہ دواؤں اور علاج کے دیگر طریقوں سے زیادہ اپنی قوت ارادی کے بل پر ٹھیک ہو رہی تھی اور اب اس نے بستر سے اتر کر خود سے تھوڑا چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔

"دیٹس گڈ! میں یہی سننا چاہتی تھی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بہت افسوسناک ہے لیکن میں یہاں تم سے افسوس کرنے سے زیادہ تمہاری ہمت بڑھانے کے لیے آئی ہوں اور یہی کہنا چاہتی ہوں کہ ہمت سے کام لو کیونکہ اس دنیا میں صرف وہی سر اٹھا کر جی سکتے ہیں جن کے اندر ہمت ہو۔" بشریٰ کی اس سے پہلے جو دو ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان میں اس نے سونیا کا تاثر ایک امیر اور فیشن ایبل عورت سے زیادہ نہیں لیا تھا لیکن آج وہ اسے خاصی مختلف لگی تھی۔

"تھینک یو سو مچ میم! آپ کے الفاظ نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ آپ واحد فرد ہیں جو اس طرح کی بات کہہ رہی ہیں ورنہ میرے جاننے والوں میں سے جو ملتا ہے، وہ مجھے یہی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ کیونکہ میں اپنی جراتوں کا انجام دیکھ چکی ہوں اس لیے مجھے سنبھل جانا چاہیے اور خاموشی سے سر جھکا کر جینے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"وہ لوگ ایسی باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ یا تو وہ ظالموں کے پٹھو ہوتے ہیں اور ان کا نمک حلال کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں یا پھر وہ اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ ان کے اندر کسی ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ میرا تعلق چونکہ ان دونوں قبیل کے لوگوں سے نہیں ہے اس لیے میں تم سے وہی کہہ رہی ہوں جو حق ہے۔" سونیا نے ایک ادا سے شانے جھٹکتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ بلاشبہ وہ بہت حسین عورت تھی اور اس کی ہر ادا دلکش تھی۔

"مجھے آپ کے خیالات جان کر خوشی ہوئی ورنہ ہمارے ہاں کے لوگ خصوصاً خواتین تو بالکل بھی اس انداز میں نہیں سوچتیں۔" بشریٰ نے اس کی تعریف کی۔

"میرے خیال میں سوچتی تو ہیں لیکن اپنی سوچ کے مطابق عمل کرنے کے لیے ان کے پاس وسائل اور مواقع نہیں ہوتے۔ اتفاق سے میرے پاس یہ دونوں چیزیں ہیں اس لیے مجھے اظہار میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ بہرحال اس بحث کو جانے دو۔ فی الحال تو میں تمہارے پاس یہ آفر لے کر آئی ہوں کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اگر تم چاہو تو میرے گھر میں رہ سکتی ہو۔ وہاں تمہیں تحفظ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" اس نے پیشکش کی تو بشریٰ حیران رہ گئی اور حیرت سے بولی۔

"آپ مجھے اپنے گھر میں رہنے کی آفر کر رہی ہیں؟"

"بالکل..... اس سلسلے میں، میری داراب سے بھی بات ہو گئی ہے۔ اسے بھی تم سے ہمدردی ہے اور ہم دونوں ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اتنے بڑے گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو جائے گا تو اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" سونیا نے اسے بتایا۔

"تھینک یو سو مچ میم! میں آپ کی اس آفر پر غور کروں گی۔" بشریٰ اپنے بارے میں بہت سے فیصلے پہلے ہی کر چکی تھی لیکن سونیا کی پُرخلوص پیشکش کے جواب میں فوری انکار مناسب نہیں لگا اور اس نے بات بنا دی۔

"جیسی تمہاری مرضی..... میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے، البتہ یہ ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم میری آفر قبول نہ کرو تب بھی مجھ سے کونٹیکٹ میں رہنا۔ مجھے تم ہمیشہ اپنی مدد کے لیے تیار پاؤ گی اور میرے گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا..... میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ میں ہر طرح کے حالات میں تمہارا ساتھ دوں گی، چاہے بظاہر تم کتنا ہی غلط کام کیوں نہ کر رہی ہو۔" سونیا خان کا لہجہ بہت خاص تھا اور نظریں یوں بشریٰ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ اسے اندر تک پڑھ رہی ہو۔

"کیوں.....؟" بشریٰ کے لبوں سے بے ساختہ ہی سوال پھسل گیا۔

"معاذ کے لیے۔ معاذ جیسے شاندار لڑکے کو ضائع کر دینے والوں کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری جنگ ان ہی لوگوں سے ہے جو معاذ کی گمشدگی کے ذمے دار ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ ان لوگوں کو اپنے کیے کی سزا ضرور ملے۔" سونیا کے اتنے صاف جواب نے ایک بار پھر بشریٰ کو حیران کر دیا۔ یہ بات تو پہلی ملاقات میں محسوس ہو گئی تھی کہ سونیا، معاذ میں دلچسپی لے رہی ہے لیکن یہ دلچسپی اتنی گہری ہو گی، اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ سونیا ایک شادی شدہ عورت تھی اور ہمارے معاشرے میں شادی شدہ خواتین اپنی وفاداریاں اپنے شوہر سے ہی وابستہ رکھتی ہیں۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں داراب کی بیوی ہوں لیکن یہ ایک غیر جذباتی رشتہ ہے۔ کم از کم میری جانب سے ایسا ہی ہے۔ میں نے غربت سے جان چھڑانے کے لیے داراب کا ہاتھ تھاما تھا اور اب تک اس ساتھ کے بدلے

UUNOVELS.COM

اسے وہ سب دیتی رہی ہوں جس کی اس نے مجھ سے خواہش کی۔ میں اس سے بے وفائی کا ارادہ بھی نہیں رکھتی لیکن دل کے معاملات میں انسان بے اختیار ہوتا ہے۔ معاذ کو تم میرے دل کی بے اختیاری سمجھ لو۔'' سونیا جیسے اس کی ہر سوچ پڑھ رہی تھی اور صاف گوئی سے اسے ہر اَن کہے سوال کا جواب دیتی جارہی تھی۔ بشریٰ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ معاذ کے معاملے میں بے اختیار تو اس کا بھی دل تھا لیکن وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ نہیں کرسکی تھی، الٹا اس چکر میں اتنا کچھ گنوا دیا تھا۔

''مجھے معاذ کے دوست حنین کے بارے میں بھی اطلاع ملی تھی کہ جس دن تمہارے پیپرز کی ڈیٹ ہوئی، اس سے اگلے دن اس کی ایک دن پرانی تشدد شدہ لاش کہیں پڑی ملی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ حنین بھی معاذ والے چکر میں اپنی جان سے گیا ہے۔'' سونیا نے یکدم ہی موضوعِ گفتگو بدلا اور حنین کا معاملہ چھیڑ دیا۔ دونوں واقعات کا جو ربط پولیس نے نہیں جوڑا تھا، وہ اس نے آرام سے جوڑ لیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ میں تمہارے لیے ایک آؤٹ سائڈر جیسی حیثیت رکھتی ہوں اور تم اتنی آسانی سے مجھ پر اعتبار نہیں کرسکتیں لیکن میں پھر بھی تم سے یہ کہوں گی کہ مجھ پر اعتبار کر کے تم نقصان میں نہیں رہو گی۔ تم نے اب تک بھی اتنا نقصان اس لیے اٹھایا ہے کہ تمہارے پاس وسائل اور تجربے کی کمی ہے۔ میں اس کمی کو پورا کرسکتی ہوں لیکن بات وہی ہے کہ تم مجھ پر اعتبار کرو۔'' حنین کے معاملے میں اس کے اندازے کی تصدیق کرنے کے سلسلے میں بشریٰ تذبذب کا شکار ہوئی تو اس نے مزید کہا اور اس پل بشریٰ کو عالم شاہ یاد آیا۔ وہ بھی وسائل والا بندہ تھا اور اسی نے انہیں سلطان کو اغوا کر کے اس سے معاذ کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کی تجویز دی تھی لیکن سب الٹا ہو گیا تھا۔ وہ سلطان کا تو کچھ نہیں بگاڑ پائے تھے، الٹا انہیں ہی ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس پر ستم یہ تھا کہ اس دن کے بعد سے عالم شاہ بھی منظر سے غائب تھا۔ حواس بحال ہونے کے بعد اس نے بعد میں اپنا موبائل چیک کیا تھا تو اسے علم ہو گیا تھا کہ اس روز صبح عالم شاہ نے کئی بار اسے کال کی تھی لیکن وہ بے ہوش ہونے کی وجہ سے اس کی کوئی کال ریسیو نہیں کرسکی تھی۔ بعد میں اس نے کئی بار عالم شاہ کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کا موبائل بند ملا۔ کوٹھی کے لینڈ لائن نمبر پر رابطہ کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ گاؤں گیا ہوا ہے۔ گاؤں کا رابطہ نمبر دینے سے ملازم نے یہ کہہ کر معذرت کرلی تھی کہ انہیں ایسے بنا اجازت کسی کو نمبر دینے کی اجازت نہیں ہے۔ بشریٰ اتنی ناسمجھ نہیں تھی کہ اندازہ نہ لگا سکے کہ عالم شاہ کو اس سارے سلسلے سے الگ کر لیا گیا ہے۔ عالم شاہ کے والد ایک جاگیردار اور سیاست دان تھے، انہوں نے دیکھا ہوگا کہ بیٹا جذبات میں آکر پرائی آگ میں ہاتھ ڈال رہا ہے تو انہوں نے کسی بھی ترکیب سے اسے روک لیا ہوگا لیکن یہ سونیا خان عجیب عورت تھی کہ خود جان بوجھ کر اس پرائی آگ میں کودنے کے لیے تیار تھی..... وہ بھی اس لیے کہ ایک لڑکا جس سے اس کی کُل دو ملاقاتیں ہوئی تھیں، اسے اچھا لگا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے وفادار رہنے کی دعوے دار بھی تھی، ایسی صورت میں بشریٰ کے لیے مشکل تھا کہ ایک دم سے اس پر بھروسا کر لیتی۔

''اب میں چلتی ہوں۔ دوبارہ کسی دن چکر لگاؤں گی۔ تمہارے پاس میرا موبائل نمبر تو موجود ہے ہی، تم جب چاہو اور ضرورت محسوس کرو تو مجھے کال کرسکتی ہو۔ میں تمہارے اسپتال کے اب تک کے ڈیوز کلیئر کروا چکی ہوں اور آئندہ کے لیے بھی میں نے ہدایت کردی ہے کہ جب تم اسپتال سے ریلیز ہو تو بل مجھے بھجوا دیا جائے۔'' سونیا نے اس سے اپنی کسی بھی بات کے فوری جواب کے لیے اصرار نہیں کیا اور رخصت ہونے کے لیے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''آپ کو ڈیوز پے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں افورڈ کرسکتی ہوں۔'' اس کی دی اطلاع پر بشریٰ نے فوراً احتجاج کیا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم افورڈ کرسکتی ہو لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آگے تمہیں بہت رقم کی ضرورت پڑنے والی ہے اس لیے جو کچھ تمہارے پاس ہے، اسے محفوظ رہنے دو۔ میری بات الگ ہے۔ اللہ نے مجھے ضرورت سے زیادہ ہی نواز رکھا ہے اور اتنے بہت میں سے ڈیڑھ دو لاکھ کی رقم نکالنا بھرے برتن میں سے پانی کی ایک بوند نکالنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تم میرے اس عمل کو اپنے اوپر کوئی احسان بھی نہیں سمجھنا کیونکہ اصل میں یہ مجھ پر تمہارا احسان ہوگا کہ تم میرے اس تحفے کو قبول کرلو۔ تم معاذ کی اچھی دوست ہو اور میں اپنے آپ کو یہ اطمینان دلانا چاہتی ہوں کہ میں معاذ کے لیے کچھ نہیں کرسکی لیکن اس کی دوست کے لیے وہ کچھ کر رہی ہوں جو میرے اختیار میں ہے۔'' اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے مختصر وقفے میں بشریٰ نے دیکھ لیا تھا کہ باہر اس

UUNOVELS.COM

کا خاص باڈی گارڈ موجود ہے۔ اس کا یہ زبردست سا باڈی گارڈ اس بات کو جتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ خاصی اونچی حیثیت کی عورت ہے۔ بشریٰ نے بے ساختہ ہی ایک گہری سانس لی تو اس کے نتھنوں نے اس خوشبو کو محسوس کیا جو سونیا خان اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ آج کی اس ملاقات میں بھی وہ پوری تک سک سے تیار تھی اور کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ افسردہ و غم زدہ ہے اور اپنے دعوے کے مطابق جس شخص کے معاملے میں اس کا دل بے اختیار ہے، اس کے لیے اسے کوئی پریشانی لاحق ہے۔ شاید اس ''تیاری'' کا تعلق داراب خان کی ''وفاداری'' سے تھا۔

☆☆☆

''میں اور میرے دوست روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ہم نے سارا ضروری سامان اور اسلحہ ساتھ لے لیا تھا اور نکلنے ہی والے تھے کہ وہ پہلا فائر ہوا جس نے بھاؤ مجید کی جھونپڑی میں آگ بھڑکا دی۔ جواب میں یہاں سے بھی کسی نے فائر کیا۔ اس وقت ہم نہیں جانتے تھے کہ ہماری طرف سے فائر کرنے والا کون ہے لیکن یہ بات سمجھ گئے تھے کہ ڈیرے پر حملہ ہو گیا ہے۔ اسلحہ ہمارا تیار ہی تھا اس لیے ہم نے بھی پوزیشن سنبھال لی۔ ڈاکوؤں کے پاس ہم سے زیادہ اچھے ہتھیار ہوں گے لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ہماری طرف سے انہیں فوری جواب ملے گا۔ ان کے مقابلے میں ہم نسبتاً بلندی پر ہونے کی وجہ سے بھی بہتر پوزیشن میں تھے اس لیے ان کا حملہ کامیابی سے جھیل گئے۔ اصل کامیابی لیلیٰ کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ وہ بڑی ضدی اور تیز لڑکی ہے۔ میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا اس کے باوجود اس نے ہمارے پروگرام کا کھوج لگا لیا تھا اور ہمارے ساتھ جانے کے ارادے سے ہم سے پہلے ہی آگے جا کر چھپ گئی تھی لیکن معاملہ ہی دوسرا ہو گیا۔ اب معلوم نہیں خمیسو خان کو کیسے پتا چلا کہ لیلیٰ اس چٹان کے پیچھے ہے۔ اس نے خاموشی سے اسے گھیر کر بے ہوش کیا اور ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ اگر آپ اور میں وقت پر نہ پہنچے ہوتے تو حالات بالکل الٹ ہوتے۔ شکر ہے لیلیٰ بچ گئی اور خمیسو کے ہمارے ہاتھ آ جانے سے ہمیں ڈاکوؤں کو قابو میں رکھنے کا موقع مل گیا لیکن بدر میرا پیارا دوست اس لڑائی میں اپنی جان سے چلا گیا۔ سنا ہے تین ڈاکو بھی مرے ہیں لیکن ان کی موت میرے پیارے دوست کی موت کا صدمہ دور نہیں کر سکتی۔''

بولتے ہوئے مراد کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ مرنے والے لڑکے کی تدفین کی جا چکی تھی۔ ڈیرے والوں نے مل کر مجید کی جلی ہوئی جھونپڑی کی جگہ دوسری جھونپڑی کی تعمیر بھی شروع کر دی تھی۔ فی الحال اس کے بیوی بچے سجاول کی جھونپڑی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ خود ڈیرے والوں کے ساتھ مل کر اپنی جھونپڑی کی تعمیر میں مدد دے رہا تھا۔ مجموعی طور پر ڈیرے کی فضا غم آلود تھی اور اس غم زدہ ماحول میں مراد، لیلیٰ کے لگائے باغیچے کے پاس اس کے ساتھ بیٹھا اسے رات کے واقعات سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ باہمت لڑکا تھا اور یہ اس کی جرأت مندی ہی تھی کہ اس نے ڈاکوؤں کے پہرے کے باوجود اپنے ساتھیوں کے ساتھ بستی والوں کی خاطر یہاں سے نکلنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس منصوبہ بندی کے وقت یقیناً ان کے ذہنوں میں یہ بات بھی ہو گی کہ ان کی جان جا سکتی ہے لیکن اپنے ایک ساتھی کی موت نے مراد کو بہت رنجیدہ کر دیا تھا۔

''ہمت سے کام لو مراد! تم ایک بہادر لڑکے ہو اور تمہارا دوست بھی ایک بہادر لڑکا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ قربانی رائگاں نہیں جائے گی اور تم لوگوں کے لیے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ جو چلا گیا اس کے لیے اب کچھ نہیں کیا جا سکتا لیکن تم ایک دوسرا کام کر سکتے ہو۔ تم اپنے دوست کے ماں باپ کا خیال رکھا کرو، اس سے تمہارے دل کو بھی سکون ملے گا اور ان کا غم بھی ہلکا ہو گا۔ اولاد کا بدل تو کوئی نہیں ہو سکتا لیکن زخموں پر مرہم رکھنے کی ایک کوشش تو کی جا سکتی ہے۔''

وہ مراد کو نصیحت کر رہا تھا اور وہ اتنی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ اس کی نصیحت پر ضرور عمل کرے گا۔

''تم لوگ ادھر بیٹھے ہو؟ میں سارے میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔'' اچانک ہی لیلیٰ وہاں آ گئی اور ان دونوں کو وہاں بیٹھا دیکھ کر بولی۔

''کیوں کوئی کام تھا کیا؟'' مراد نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ لیلیٰ کو چھیڑتا، کوئی شرارتی فقرہ ایسا بولتا کہ وہ سیخ پا ہو جاتی لیکن ابھی وہ بہت بجھا ہوا اور اداس تھا۔

''سجاول چاچا تیرے لیے پریشان ہو رہا ہے۔ تو پرسوں رات کا سویا ہوا ہے اور زخمی بھی ہے لیکن آرام کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر گھوم رہا ہے تو ان کو پریشان تو ہونا ہے۔'' لیلیٰ کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

''میرے دل کو چین ہی نہیں ہے تو آرام کیسے کروں گا۔ بدر کا چہرہ مسلسل میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔'' مراد نے اپنی مجبوری بیان کی۔

''دل کو چین آتے آتے ہی آئے گا۔ غم کتنا ہی بڑا ہو،

آدمی کو اس پر کبھی نہ کبھی صبر آ ہی جاتا ہے لیکن دکھی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اپنے پیاروں کو پریشان کیا جائے۔ جا گھر جا کر تھوڑی دیر آرام کر لے ورنہ تیرے ماں پیو کے دل کو چین نہیں آئے گا۔'' اس بار لیلیٰ کے لہجے میں قدرے رعب تھا۔ معاذ نے بھی مراد کی پیٹھ پر تھپکی دے کر لیلیٰ کی خاموش تائید کی تو اسے اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا اور وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

''ہاتھی جیسے بدن میں چڑیا کا دل رکھا ہوا ہے۔ مرد کو اتنا کمزور دل کا نہیں ہونا چاہیے۔'' لیلیٰ نے اس کی ڈھیلی ڈھالی چال دیکھتے ہوئے معاذ کو مخاطب کیے بغیر تبصرہ کیا۔ وہ ابھی بہت کم عمر تھی لیکن اس کی عادت و اطوار دیکھ کر اس پر کسی پختہ کار عورت کا گمان ہونے لگتا تھا۔ فیضو نے اپنی بیوی کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے باعث لیلیٰ کی پرورش کچھ ایسے ڈھب سے کی تھی کہ وہ اپنی عمر سے بہت آگے نکل گئی تھی اور اس کے اندر سے وہ نرمی و نزاکت نکل گئی تھی جو اس کی عمر کی لڑکیوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ مزاج کی یہ سختی اسے مراد کی محبت سے بھی بیزار رکھتی تھی۔

''تم مراد کے لیے غلط الفاظ کا استعمال کر رہی ہو۔ وہ کمزور دل کا نہیں حساس اور نرم دل کا مالک ہے اور یہ خصوصیات کسی کی خامی نہیں، خوبی ہوتی ہیں۔ مراد کمزور دل کا مالک ہوتا تو یوں اپنے دوستوں کے ساتھ خطرہ مول لے کر ڈیرے سے باہر جانے کا منصوبہ نہ بناتا اور یوں ڈٹ کر ڈاکوؤں کا مقابلہ نہ کرتا۔ یہ اس کی بہادری اور پھرتی ہی تھی کہ تم ڈاکوؤں کے قبضے میں جانے سے بچ گئیں ورنہ اس وقت صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ کتنی بے جگری سے گولیوں کی بوچھاڑ میں تمہیں بچانے کے لیے اس چٹان کی طرف لپکا تھا جہاں تم خمیسو خان کے نرغے میں پھنس گئی تھیں۔ مراد کی یہ حرکت اس کی بہادری کے علاوہ تم سے بے حد محبت کی بھی نشانی ہے۔ ایسا شخص جو آپ کے لیے اپنی جان تک کی پروا نہ کرے، بہت قیمتی ہوتا ہے لیلیٰ! ایسے شخص کی ناقدری کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔ تم مراد کے ظاہر پر نہیں اس کے دل پر توجہ دیا کرو، وہ بے حد محبت کرنے والے دل کا مالک ہے۔'' معاذ نے اس کا تبصرہ سنا تو بے حد نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگا۔ لیلیٰ ہونٹ کاٹتی ہوئی خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ معاذ نے بھی مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور دھیرے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔ لیلیٰ سمجھدار لڑکی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ اس کے تھوڑے کہے کو بھی اچھی طرح سمجھ لے گی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے معاملے میں لیلیٰ بہت آگے تک جائے اور دکھ اٹھائے۔

وہ ان پہاڑوں پر کھلا پھول تھی اور اس کے لیے یہیں کی آب و ہوا موافق تھی۔ کہیں اور کسی اور ماحول میں یہ پھول اپنی خوشبو، رعنائی اور فطری خوب صورتی کھو بیٹھتا اور اسے تو ابھی خود اپنا ہی پتا نہیں تھا۔ ثوبیہ اور بشریٰ کی مثال اس کے سامنے تھی۔ دونوں لڑکیاں خوب صورتی اور ذہانت میں لاجواب تھیں اور دونوں ہی اس کی طرف مائل تھیں لیکن اس نے عام سی پسندیدگی کے علاوہ اپنے دل میں ان کے لیے کوئی خاص جذبہ محسوس نہیں کیا تھا اور لیلیٰ کے متعلق تو وہ بالکل بھی اس انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ اس سے عمر میں بہت چھوٹی اور بالکل مختلف مزاج کی لڑکی تھی۔ اپنی بے شمار صلاحیتوں کے باوجود وہ ایسی نہیں تھی کہ اسے اپنی طرف متوجہ کر پاتی اس لیے پہلے ہی قدم پر اسے روک دینا مناسب تھا۔ لیلیٰ کے متعلق سوچتا ہوا وہ اپنے لیے مخصوص جھونپڑے کے قریب پہنچا تو فیضو سے سامنا ہو گیا۔

''کہاں تھے سائیں؟ میں تم ہی کو دیکھ رہا تھا۔'' اسے دیکھتے ہی فیضو بولا۔

''بس یہیں قریب میں لیلیٰ کے باغیچے کے پاس بیٹھا مراد کو سمجھا رہا تھا۔ اپنے دوست کی موت نے اسے بہت اداس کر دیا ہے۔''

''دکھی تو سب ہیں بلکہ غصے میں ہیں اور یہ غصہ خمیسو خان پر نکالنا چاہتے ہیں۔ میں نے اور اداسجاول نے مل کر بہت مشکل سے انہیں یہ سمجھایا ہے کہ خمیسو کی زندگی ہماری سلامتی کی ضمانت ہے۔ جانی نقصان ڈاکوؤں کا ہم سے زیادہ ہوا ہے اور ان کا سردار بھی ہمارے قبضے میں ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے طیش میں ہوں گے لیکن اپنے سردار کی خاطر انہوں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھا ہوا ہے۔ اگر سردار ہی کو کچھ ہو گیا تو وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔'' مراد کی کیفیت کے بارے میں سن کر فیضو نے اسے بتایا۔

''آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں چاچا جی لیکن آپ اس طرح خمیسو خان کو کب تک اپنے پاس قید رکھ سکتے ہیں۔ زیادہ دن گزر گئے تب بھی اس کے ساتھیوں کی برداشت جواب دے جائے گی اور وہ اپنے سردار کو چھڑانے کے لیے یہاں دھاوا بول دیں گے۔ ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ آپ باقاعدہ معاہدہ کر کے خمیسو خان کو رہا کریں لیکن مجھے یاد ہے کہ معاہدہ کرنے کا بھی زیادہ فائدہ نہیں ہو

UUNOVELS.COM

گا۔ جو لوگ اپنے مفاد کے لیے دوسروں کی جان و مال کے دشمن بن جاتے ہیں، وہ کسی معاہدے کی پابندی کیسے کریں گے اور ان سے یہ پابندی کروائے گا کون.....؟'' معاذ نے اپنے اندیشے ظاہر کیے۔

''خود خمیسو خان یہ پابندی کروائے گا۔ آؤ میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔'' فیضو نے اسے جواب دیا تو اس کے ہونٹوں پر بہت مبہم اور پراسراری مسکراہٹ تھی۔

معاذ کچھ الجھا ہوا سا اس کے ساتھ چل پڑا۔ فیضو اسے اپنے ساتھ لے کر اس جھونپڑی میں پہنچا جہاں خمیسو خان کو رکھا گیا تھا۔ جھونپڑی کے اندر داخل ہو کر معاذ کو حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ خمیسو ایک چارپائی پر آرام سے لیٹا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ معاذ کے حساب سے اتنے خطرناک ڈاکو کو تو ہاتھ پیر باندھ کر بہت سخت پہرے میں رکھنا چاہیے تھا لیکن خمیسو وہاں ایسے مزے سے لیٹا ہوا تھا جیسے قیدی نہیں مہمان ہو۔ ان کی جھونپڑی میں آمد کو محسوس کر کے وہ اٹھ بیٹھا۔

''کیسے ہو خمیسو خان! کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' فیضو نے اس سے دریافت کیا۔

''بہت مزے میں ہوں فیضو چاچا! ایسا آرام تو پہلے کبھی نہیں ملا۔'' خمیسو نے نہایت احترام سے انہیں جواب دیا۔ دیکھنے میں وہ خود چالیس سال سے اوپر کا لگتا تھا لیکن فیضو سے ایسے مخاطب تھا جیسے خود کوئی نوعمر لڑکا ہو۔ اس کے اس اندازِ گفتگو سے بھی زیادہ معاذ کو اس کی فرمانبرداری پر حیرت تھی۔ اسے تو کسی بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح ہونا چاہیے تھا جو یوں قید کیے جانے پر سخت طیش کا اظہار کرتا لیکن وہ جس رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ غیر فطری سا تھا۔ ایک نامی گرامی ڈاکو اور ایسی فرمانبرداری.....

''تمہارے ڈیرے سے ایک آدمی تمہارا پوچھنے آیا تھا کہ تم کب تک واپس آ رہے ہو۔ میں نے کل صبح کا وقت دے دیا۔ ادھر سے تمہارے تین چار خاص بندے آئیں گے اور ان کے سامنے معاہدہ ہوگا کہ نہ تو آئندہ وہ ہمارے لوگوں کا راستہ روکیں گے اور نہ ہی ہمارے ڈیرے کی کسی عورت، بیٹی پر نظر رکھیں گے۔'' فیضو نے اسے بتایا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی فیضو چاچا! میں نے تم سے وعدہ کر لیا تھا تو سمجھو کہ میرا ہر آدمی اس کا پابند ہے۔''

''مجھے معلوم ہے خمیسو خان لیکن چار لوگوں میں بھی بات ہو جائے تو ٹھیک رہتا ہے۔''

''جیسی تمہاری مرضی فیضو چاچا!'' خمیسو خان کی فرمانبرداری عروج پر تھی۔

''ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ تھوڑی دیر میں کھانا آ جائے گا، تم کھا کر سو جانا۔'' فیضو نے یہ بات خمیسو خان کی آنکھوں میں جھانک کر کہی تھی اور اس نے کسی روبوٹ کی طرح اس ہدایت پر عمل کیا تھا۔

''یہ سب کیا ہے فیضو چاچا؟'' فیضو، معاذ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے باہر لایا تو اس نے حیرت سے اس کایا پلٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ ادھر اُدھر سے چلتے پھرتے اس نے خمیسو خان کے متعلق جو باتیں سنی تھیں، ان کے مطابق تو وہ بڑا خونخوار اور سفاک آدمی تھا جس سے رحم دلی کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اچھی خاصی پکی عمر کا آدمی ہو کر اس نے جس طرح لیلیٰ جیسی کم سن لڑکی پر نظر رکھی ہوئی تھی، اس سے بھی اس کا کردار واضح ہو جاتا تھا۔

''کچھ نہیں ہے پٹ! میں نے بس کھیل ہی کھیل میں اسے تھوڑا سا سبق پڑھایا ہوا ہے اور اس نے میرا پڑھایا سبق یاد کر لیا ہے۔'' فیضو اس کی حیرت پر ہنس دیا۔

''آپ کچھ چھپا رہے ہیں چاچا جی!'' معاذ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

''چھپانا ہوتا تو تجھے یہ سب دکھاتا ہی نہیں پٹ! پوری زندگی میں ایک تو ہی تو ملا ہے جسے یہ سب بتانے اور سکھانے کو دل چاہتا ہے۔'' فیضو نے اسے جواب دیا اور مزید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''کل رات تجھے تاروں سے کھیلنا سکھایا تھا نا، بس سارا کمال اسی کھیل کا ہے۔ میں برسوں سے یہ کھیل، کھیل رہا ہوں۔ میری نظریں روشنی کے ساتھ سفر کرتا اور اسے اپنے اندر اتارنا اچھی طرح جانتی ہیں۔ اپنے اندر بھری اس روشنی کی طاقت سے میں کسی کی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دماغ کو اپنے قابو میں کر سکتا ہوں۔ آدمی زیادہ مضبوط دماغ کا ہو تو اسے تھوڑا سا نشہ دے کر اس کا دماغ قابو کیا جا سکتا ہے۔ خمیسو کے ساتھ مجھے ایسا ہی کرنا پڑا تھا۔ اب اس کا دماغ میرے قابو میں ہے اور وہ وہی کرے گا جو میں اس سے کہوں گا لیکن میرے اس عمل کا اثر صرف ایک ہفتہ دس دن تک ہی اس کے دماغ پر رہ سکتا ہے اس لیے میں نے اسے پابند کر دیا ہے کہ وہ ہر ہفتے لازماً مجھ سے ملنے یہاں آئے گا۔'' فیضو اسے بتا رہا تھا اور حیرت سے سنتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لفظ ابھر رہا تھا ''ہپناٹزم.....'' ہپناٹزم کے بارے میں اسے زیادہ تو نہیں معلوم تھا لیکن اس نے سن رکھا تھا کہ اس علم کے ذریعے دوسروں کے دماغ کو قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ ہپناٹزم جاننے والوں کے بارے

UUNOVELS.COM

میں اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ارتکاز توجہ کے لیے یہ لوگ شمع بینی کی مشق کرتے ہیں۔ اسے فوراً ہی فیضو کا رات کو خود پر کروایا تجربہ یاد آیا۔ اس نے مروجہ طریقے سے ہٹ کر شمع بینی کے بجائے نجم بینی کی مشق کروائی تھی اور واقعی اسے لگا تھا کہ اس کے اندر روشنیاں بھر گئی ہوں۔ اس کی سوچوں سے بے نیاز فیضو اپنی کہے جا رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا۔

''مجھے یہ علم میرے پیو نے سکھایا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب ہم کھلے آسمان تلے لیٹے ہوتے تھے تو وہ مجھے یہ سب سکھاتا تھا لیکن میرا پیو بہت جلدی مر گیا تھا اور اس کے بعد میں فطرت کو اپنا استاد بنا کر سیکھتا رہا تھا۔ تاروں کے بعد میں نے چاند اور تھوڑی بہت سورج پر بھی یہ مشق کی لیکن سورج پر تجربہ ناکام رہا۔ ایک تو سورج کی بے تحاشا روشنی کو سہنا آسان نہیں، دوسرے اس مشق کے لیے اندھیرا ضروری ہے۔ آس پاس کی روشنی اس روشنی سے توجہ ہٹا دیتی ہے جس پر بندہ نظر گاڑ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ چاند سے خالی آسمان پر اندھیری راتوں میں ستاروں پر یہ مشق سب سے زیادہ کامیاب رہی اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی یہ علم سیکھو۔ میں اپنے بارے میں زیادہ بڑے دعوے نہیں کرتا پٹ، پر ساری عمر میں جو کچھ سیکھا ہے اس کے حساب سے میں نے تجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کی ہے۔ تو ان لوگوں میں سے ہے جنہیں سو ہنڑار ب آپ ہی بہت کچھ نواز کر بھیجتا ہے۔ تجھے پہلا تجربہ کروا کر میں اپنے اندازے کی سچائی بھی پرکھ چکا ہوں۔ تو پہلی بار میں ہی بہت آگے چلا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میرا پیو شروع شروع میں مجھے سکھاتا تھا تو میرے پلے کچھ نہیں پڑتا تھا۔ میں ایک سے دوسرے ستارے کی طرف بھاگتا رہتا تھا۔ ایک ستارے پر نظر جمانا سیکھا تو اس کی روشنی دنوں اپنے اندر اتارنا نہ آئی، بس یوں سمجھ لے کہ چیونٹی کی طرح رینگتے رینگتے میں یہاں تک پہنچا ہوں کہ آج خمیسو خان جیسے بندے کا دماغ بھی اپنے قبضے میں کر لیا ہے، پر مجھے یقین ہے کہ تو اس میدان میں گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگے گا۔ میں تجھے یہ سب اس لیے سکھانا چاہتا ہوں کہ ایک تو تجھ میں سیکھنے کی بہت زیادہ صلاحیت ہے، دوسرے تیرے اندر ایک روح ہے۔ یہ دو چیزیں ایک ساتھ ہوں تب ہی کسی علم کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر آدمی کی روح کا نیک ہونا بڑا ضروری ہے۔ ذہین تو کوئی بھی ہو سکتا ہے لیکن ذہین آدمی کی روح نیک نہ ہو تو دنیا میں اس کا علم تباہی اور بربادی لے کر آتا ہے۔ تجھ پر مجھے بھروسا ہے کہ تو میرے سکھائے ہوئے علم کو اللہ سائیں کی مخلوق کی بھلائی کے لیے استعمال کرے گا۔'' اپنی بات کے اختتام پر فیضو نے اسے بڑی پُراعتماد نظروں سے دیکھا جیسے اسے اپنے کہے ہر الفاظ پر بھروسا ہو۔

''میں آپ کے اس یقین کو قائم رکھنا چاہتا ہوں چاچا جی! آپ سے یہ علم سیکھنا میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے لیکن مجھے اپنے گھر والوں، خصوصاً ماں کی بہت فکر ہے۔ اب جبکہ میری صحت بھی ٹھیک ہے اور ڈاکوؤں کے ساتھ آپ لوگوں کا جھگڑا بھی ختم ہونے کو ہے تو میرا یہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہر گزرنے والا دن میری ماں پر کتنا بھاری ہوتا ہوگا۔ ان کی اور اپنے گھر کے دوسرے افراد کی تکلیف کا خیال مجھے یہاں ٹھہرنے اور کچھ سیکھنے نہیں دے گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ ابھی آپ مجھے اجازت دے دیں۔ زندگی نے پھر کبھی مہلت دی تو میں دوبارہ آپ کے پاس یہ علم سیکھنے آجاؤں گا۔'' معاذ نے نہایت عاجزی سے درخواست کی۔ اس کے کہے ہر لفظ میں سچائی تھی۔ وہ سچ مچ فیضو سے یہ علم سیکھنا چاہتا تھا لیکن ماں باپ اور بھائی بہن کی پریشانی کے خیال سے یہاں رکنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

''زندگی کا کچھ پتا نہیں پٹ! یہ بڑی بے وفا چیز ہے اور کبھی بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے تو دوبارہ یہاں آئے تو میں ہی موجود نہ ہوں پر تیری فکر بھی غلط نہیں ہے اور اچھی بات ہے کہ تجھے اپنی ماں کی بے چینی اور تکلیف کا احساس ہے۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ تو ٹھیک ہونے کے بعد زیادہ دن ادھر رکنے والا نہیں ہے لیکن تیری حالت بھی تو ایسی نہیں تھی کہ میں تجھ پر پہلے یہ بوجھ ڈال پاتا۔ سر کا گہرا گھاؤ سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ تیری جگہ کوئی عام چھوکرا ہوتا تو اس کے گھاؤ بھی اتنی جلدی نہیں بھرتے، پر میں نے تجھ سے کہا نا کہ تجھ میں کچھ خاص بات ہے۔'' فیضو خود کلامی کے انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔ یہ سن کر معاذ ہنس دیا اور بولا۔

''آپ کیوں مجھے اتنا خاص بنانے پر تلے ہوئے ہیں چاچا جی..... میں بس عام سا انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھ میں تھوڑی بہت صلاحیتیں دوسروں سے زیادہ ہوں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میں کوئی سپر ہیرو ہوں۔''

''سپر ہیرو کیا ہوتا ہے یہ تو مجھے خبر نہیں ہے پٹ اور نہ میں تجھ سے کسی بحث میں پڑنا چاہتا ہوں، ہاں میری تجھ سے اتنی درخواست ضرور ہے کہ تو صرف دو تین دن اور ٹھہر جا۔ ان دو تین دنوں میں، میں تجھ کو اتنی باتیں تو سکھا ہی دوں گا

UUNOVELS.COM

کہ تُو واپس جا کر اکیلے بھی مشق کرے گا تو کچھ نہ کچھ پانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دیکھ اب انکار نہ کرنا پٹ! مجھے لگتا ہے کہ یہ موقع دوبارہ ملنے والا نہیں ہے اور مجھ پر علم کو اپنے سینے سے دوسرے سینے میں اتارنے کا بوجھ ہے۔ ہر علم کا حق ہوتا ہے کہ اسے دوسروں تک بھی پہنچایا جائے لیکن ہر علم ایسا نہیں ہوتا کہ اسے کسی کو بھی سکھا دیا جائے۔ خاص علم سیکھنے کے حق دار وہی لوگ ہوتے ہیں جو اہل بھی ہوں اور مجھے اب جا کر ایک ایسا شخص ملا ہے جو اہل بھی ہے اور حق دار بھی..... تو میں بڑا بے چین ہو گیا ہوں اپنا قرض اتارنے کے لیے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں یہ قرض اتارے بغیر خود قبر میں نہ اتر جاؤں۔'' فیضو جس انکساری سے درخواست کر رہا تھا، اس پر معاذ کا دل تڑپ گیا۔ وہ شخص اس سے کچھ لینا نہیں بلکہ اسے کچھ دینا چاہتا تھا اور اس سے یوں درخواست کر رہا تھا جیسے وہ حاجت مند ہو۔ ایک ایسا شخص جو علم والا بھی تھا اور اس کا محسن بھی، اس طرح لجاجت سے پیش آئے، یہ معاذ سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ فیضو کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔

''مجھے اتنا بھی شرمندہ نہ کریں چاچا جی! آپ کے حکم پر میں دو تین دن اور یہاں رک جاتا ہوں۔ میرا وعدہ ہے کہ ان تین دنوں میں ایک اچھے شاگرد کی طرح آپ کی ہر بات مانوں گا اور جو کچھ آپ سکھائیں گے، اسے جی جان سے سیکھنے کی کوشش کروں گا بلکہ ہو سکا تو اپنے گھر واپس پہنچنے کے بعد جب بھی موقع ملا اپنی امی کی اجازت سے بہت سارے دنوں کے لیے آپ کے پاس آ کر رک جاؤں گا۔'' اس کے الفاظ فیضو کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھیر رہے تھے اور وہ یہ رنگ دیکھ کر اپنے دل میں عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ۔'' جاگنگ سوٹ میں ملبوس وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو استقبالیہ پر بیٹھی میڈم نازلی نے اسے دیکھ کر کہا۔ میڈم نازلی پچاس سال کے قریب ایک خوش شکل اور پستہ قامت عورت تھی جس نے چھوٹی سی چست قمیص کے ساتھ اس سے بھی زیادہ چست پاجامہ پہن رکھا تھا اور اس کا فربہ جسم اتنی چستی پر جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اتنی صبح صبح بھی وہ فل میک اپ میں تھی اور مسکارے اور آئی لائنر سے سجی اپنی آنکھیں بشریٰ کے چہرے پر جمائے گویا اس کا ایکسرے کر رہی تھی۔ بشریٰ رات ہی اس ویمن ہاسٹل میں شفٹ ہوئی تھی۔ شہر کے اچھے علاقے میں واقع اس ہاسٹل کے چارجز تھوڑے زیادہ تھے اور شہرت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ بشریٰ نے جان بوجھ کر اس ہاسٹل کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس طرح کے ہاسٹلز میں نظم و ضبط کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی اور وہاں رہنے والی خواتین کو اپنی آمد و رفت کے سلسلے میں کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا پڑتا۔ آج کل اس کے ذہن میں جو خیالات اور منصوبے پل رہے تھے، ان کی روشنی میں اسے ایسی ہی رہائش گاہ کی ضرورت تھی۔ ہونے کو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے کر وہاں رہنے لگتی لیکن اسے معلوم تھا کہ اکیلی رہنے والی لڑکی کے معمولات پر آس پاس رہنے والے ذرا زیادہ ہی نظر رکھتے ہیں۔ حفاظتی نقطۂ نظر سے بھی ہاسٹل ہی زیادہ مناسب تھا اور وہ خود کو یہاں محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ کل وہ سونیا خان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ سونیا کو معلوم تھا کہ اسے کب ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا جا رہا ہے اس لیے وہ اپنی گاڑی لے کر آ گئی تھی۔ بشریٰ نے ہاسٹل میں رہائش کے لیے آن لائن کمرا حاصل کیا تھا اور اسپتال سے سیدھی وہاں پہنچی تھی۔ ہاسٹل کے معاملے میں اس کے انتخاب پر سونیا خان نے اسے گہری نظروں سے دیکھا ضرور تھا لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا اور اسے ہاسٹل چھوڑ کر رخصت ہوتے وقت ایک بار پھر اپنی پیشکش دہرائی تھی کہ وہ جب چاہے اس کے گھر میں منتقل ہو سکتی ہے اور کسی بھی ضرورت کے لیے بلا تکلف اسے پکار سکتی ہے۔ فی الحال بشریٰ کے سامنے زیادہ واضح لائحہ عمل نہیں تھا لیکن وہ طے کر چکی تھی کہ اسے مجرموں کو معاف نہیں کرنا ہے۔ کچھ کرنے کے لیے جسمانی طور پر مکمل فٹ ہونا بہت ضروری تھا اس لیے اس نے اس طرف توجہ دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے لیے ایک لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔ صبح صبح جاگنگ کے لیے جانا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ ہاسٹل کے قریب ہی واقع ایک پبلک پارک تک جانے کا ارادہ لے کر نکلی تھی کہ میڈم نازلی کی ''گڈ مارننگ'' نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''جاگنگ کے لیے جا رہی ہو۔ یہ تو بہت اچھی عادت ہے۔ لڑکیوں کو اپنی اسمارٹنس کا خیال رکھنا چاہیے۔'' اس کے جاگنگ سوٹ کو دیکھ کر انہوں نے تبصرہ کیا۔ یہ سوٹ اور ضرورت کی چند چیزیں اس کے کہنے پر راحیلہ اس کے لیے خرید کر لائی تھی۔ اپنے والدین کی طرف سے بشریٰ سے زیادہ میل ملاپ پر پابندی عائد کیے جانے کے باوجود وہ حقِ دوستی نبھانے کے لیے کبھی کبھی اسپتال کا چکر لگا لیتی تھی جبکہ فون پر تو پابندی سے اس کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھی۔

''خوب صورت تو آپ بھی بہت ہیں پھر اپنی اسمارٹنس کا خیال رکھنا کیوں چھوڑ دیا؟''

میڈم نازلی کے تبصرے پر اس نے جوابی تبصرہ مع سوال داغ دیا جسے سن کر پہلے تو میڈم نے قہقہہ لگایا پھر بولی۔

''اب میری گاڑی بہت آگے نکل چکی ہے۔ عمر کی اس منزل پر اسمارٹ رہنے پر بھی عورت کسی کے لیے زیادہ قابل توجہ نہیں رہتی۔ ویسے بھی اگر میں اسمارٹ رہنے کے چکر میں تمہاری طرح صبح صبح جاگنگ کے لیے نکل جاؤں گی تو اس ہاسٹل میں رہنے والی پیاری پیاری لڑکیوں کا خیال کون رکھے گا۔ میں یہاں رہنے والی خواتین کی ضروریات کا خیال رکھتی ہوں تو بدلے میں میری زندگی بھی خوش حال گزر رہی ہے۔ تمہیں بھی اگر کبھی میری کسی خدمت کی ضرورت پڑے تو بلاتکلف کہہ دینا۔'' اپنی بات کے اختتام پر میڈم نازلی نے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری تو بشریٰ سمجھ گئی کہ خدمت سے ان کی کیا مراد ہے۔ وہ جس جگہ موجود تھی، وہاں اس قسم کی پیشکش زیادہ تعجب خیز نہیں تھی۔ اس لیے ذرا سا مسکرائی اور بولی۔

''میں آپ کی اس آفر کو یاد رکھوں گی۔ فی الحال مجھے اجازت دیجیے، میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ واپس آکر مجھے یونیورسٹی بھی جانا ہے۔''

''اوکے ڈارلنگ! وش یو بیسٹ آف لک۔'' میڈم نازلی نے ایک ادا سے ہاتھ ہلا کر اسے رخصت کی اجازت دی۔ اس کے بعد اس کا سارا دن بہت مصروف گزرا۔ یونیورسٹی میں اس کے کلاس فیلوز اور جاننے والے اس سے اس کے والدین کی موت پر تعزیت کرتے رہے۔ راحیلہ سمیت کچھ نے جاننا چاہا کہ اب وہ کہاں رہ رہی ہے۔ اس نے انہیں اپنی ہاسٹل میں رہائش کے متعلق نہیں بتایا اور کہہ دیا کہ وہ اپنے ایک دور کے عزیز کے گھر رہ رہی ہے اور ان کی درخواست پر اپنا پتا کسی کو بتانے سے قاصر ہے۔ وہ جن حالات سے گزری تھی ان کے بعد اس طرح کی شرط ایسی عجیب بھی نہیں تھی اس لیے کسی نے اس پر اپنا پتا بتانے پر زور بھی نہیں دیا۔ یونیورسٹی میں اس کا کامی اور سلطان سے بھی سامنا ہوا تھا لیکن دونوں فریقین نے ہی ایک دوسرے کو نظر انداز کر دیا۔ یونیورسٹی میں اس نے بہت زیادہ وقت نہیں گزارا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ ایک مارشل آرٹ کلب گئی اور وہاں اپنے داخلے کا انتظام کرنے کے بعد حنین کے گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ فی الحال اس کی گاڑی اس کے پاس نہیں تھی اس لیے وہ پبلک ٹرانسپورٹ ہی استعمال کر رہی تھی۔ حنین کے گھر اس کے والدین اور بہنوں سے مل کر اس کا دل مزید دکھ سے بھر گیا۔ اپنے ہونہار بیٹے اور بھائی کے اس بے دردی سے قتل کر دیے جانے پر وہ پانچ افراد گویا چلتی پھرتی لاشیں بن چکے تھے۔ حنین کی جدائی کے بے تحاشا دکھ سے گزرتے ہوئے بھی انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ انہیں پتا چلا کہ بشریٰ وہ لڑکی ہے جس کے والدین ڈکیتی کی واردات کے دوران بیک وقت ہلاک ہو گئے تھے تو وہ اپنے ساتھ اس کے دکھ پر بھی آنسو بہاتے رہے۔ انہوں نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا کہ وہ خود بیماری سے اٹھنے کے باوجود اتنا سفر طے کر کے تعزیت کے لیے ان کے گھر آئی ہے۔ وہ وضع دار لوگ تھے۔ بشریٰ کے انکار کے باوجود انہوں نے دوپہر کا کھانا کھائے بغیر اسے وہاں سے رخصت نہیں ہونے دیا۔

بشریٰ بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر پہنچی۔ وہ گھر جہاں اس نے اپنی زندگی کے کئی ماہ و سال گزارے تھے اور جسے عائشہ نے بڑے سلیقے سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا، دھول مٹی میں اٹا بالکل ویران پڑا تھا۔ سامان سے بھرا گھر دو افراد کے نہ ہونے سے بالکل خالی لگ رہا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی ایک ایک کمرے میں گھومتی رہی۔ یہ گھر اب سامان سمیت ہی فروخت کیا جانا تھا۔ اس نے عائشہ اور گلزار عاصم کے ملبوسات، دیگر ذاتی استعمال کی اشیا کے ساتھ ایک جگہ اکٹھے کر کے رکھ دیے تاکہ بعد میں انہیں کسی ضرورت مند کے حوالے کر دیا جائے۔ اپنا ذاتی سامان اور تصویروں کے البمز ایک الگ سوٹ کیس میں جمع کر کے رکھے۔ زیورات اور نقد رقم تو پہلے ہی وہاں سے غائب کر لی گئی تھی اس لیے ایسی کوئی چیز اسے نہیں ملی۔ گلزار عاصم نے اپنی گاڑی کچھ عرصے قبل ہی فروخت کی تھی اور اس کی جگہ کوئی دوسری مناسب قیمت کی سیکنڈ ہینڈ گاڑی لینے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس ارادے کی تکمیل سے قبل ہی اجل انہیں اچک کر لے گئی، سو گھر میں اس وقت کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ بشریٰ کی اپنی گاڑی اس پر ٹوٹنے والی قیامت سے پہلے کی ورکشاپ پر کھڑی تھی۔ ممکن تھا مکینک نے ٹھیک بھی کر دی ہو لیکن کون تھا جو گاڑی ورکشاپ سے لے کر آتا۔ اس نے سوچا کہ مکینک کو کال کر کے اس سے معلوم کر لے اور اگر گاڑی ٹھیک ہو چکی ہو تو اسے کہے کہ گھر پر بھجوا دے۔

مکینک کو فون کرنے کے ارادے سے اس نے اپنا موبائل بیگ سے نکالا تو اس پر سونیا کی متعدد مسڈ کالز موجود تھیں۔ یونیورسٹی میں کلاسز کے دوران اس نے موبائل

UUNOVELS.COM

سائیلنٹ پر کر دیا تھا اور دوبارہ موبائل دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب دیکھا تو مکینک سے پہلے سونیا کو کال کر بیٹھی، وہ اس کے لیے پریشان تھی اور پوچھ رہی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس نے سونیا کو اپنی، اپنے گھر پر موجودگی کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے سامان کا بھاری سوٹ کیس یہاں سے ہاسٹل شفٹ کرنے کے خیال سے مکینک کو اپنی گاڑی کے لیے کال کرنے جا رہی تھی تو اس کی اتنی مسڈ کالز دیکھ کر پہلے اسے فون کر بیٹھی۔

''تم مجھے ایڈریس بتاؤ۔ میں خود تمہارے گھر آجاتی ہوں۔ میری گاڑی میں تم آرام سے سوٹ کیس ہاسٹل لے جا سکتی ہو۔'' سن کر سونیا نے فوراً پیشکش کی۔ بشریٰ اسے زحمت دینے کے خیال سے متامل تھی لیکن اس کے اصرار پر اسے ایڈریس بتانا پڑا۔ فون بند کر کے سونیا کے انتظار میں وقت گزارتے ہوئے اس کا ذہن بہت سی الجھنوں کے ساتھ اس الجھن میں بھی گھرا ہوا تھا کہ کیا سونیا سچ مچ معاذ سے اتنی محبت کرتی ہے کہ صرف معاذ کے حوالے سے اس کا اتنا خیال رکھ رہی ہے؟ اس مطلب پرست دنیا میں کیا اب بھی ایسے دیوانے موجود ہیں؟ جواب تھا ''شاید ہاں.....''

☆☆☆

''تم جا رہے ہو معاذ سائیں؟'' اپنے لگائے پودوں میں موجود واحد پھول دار پودے پر نظریں جمائے معاذ سے یہ سوال کرتی لیلیٰ کا لہجہ بجھا ہوا تھا اور آنکھوں میں اداسی ہلکورے لے رہی تھی۔

''ہاں، اللہ کا شکر ہے کہ اب میں سفر کے لائق ہوں اور یہاں کے مسائل بھی حل ہو گئے ہیں تو اب میں یہاں سے جا سکتا ہوں۔'' معاذ نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ گھر واپس جانے کے خیال سے بہت خوش تھا اس لیے لیلیٰ کی اداسی کی طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔ خمیسو خان اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں طے پانے والے معاہدے کے بعد ان کے ساتھ واپس جا چکا تھا اور خود اس نے فیضو کے ساتھ اس کے علم کا اکتساب کرتے ہوئے شب و روز گزارے تھے۔ فیضو واقعی حیرت انگیز آدمی تھا اور اسے اس مختصر عرصے میں بھی اس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ فیضو نے اسے بہت سی ایسی چیزیں ذہن نشین کروائی تھیں جن کی اسے بعد میں بھی مشق کرتے رہنا تھا۔ کچھ خاص تحائف بھی دیے تھے جن کے بارے میں وہ پُریقین تھا کہ معاذ کو ان کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ معاذ کے لیے یہ سب عجیب ہونے کے باوجود دلچسپ تھا۔ پچھلے دو دن اس نے عجیب سحر انگیزی کے حصار میں گزارے تھے اور اپنی بے چین طبیعت کو خاصے سرور میں پایا تھا۔ اس کی افتادِ طبع اسے نت نئی چیزیں سیکھنے پر ہمیشہ ہی اکساتی رہتی تھی اور جو کچھ اس نے یہاں سیکھا تھا، وہ بہت ہی انوکھا تھا اس لیے ذرا زیادہ ہی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس خوشی میں گھر واپس لوٹنے کی خوشی شامل ہونے کے باعث وہ اتنا مگن تھا کہ لیلیٰ کے احساسات کو نظر انداز کر گیا تھا۔

''تم یہاں ہمارے ساتھ خوش نہیں تھے معاذ سائیں!'' لیلیٰ اداسی سے بولی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی خوشی میں اس کی اداسی کو فراموش کر گیا ہے۔ جلدی سے بولا۔

''یہ بات نہیں ہے لیلیٰ! تم لوگوں کے ساتھ میں نے اچھا وقت گزارا۔ تم لوگوں نے جس طرح میری خدمت کی اور مجھے زندگی کی طرف واپس لائے، اس احسان کی تو کوئی قیمت ہی نہیں ہے لیکن اس حقیقت کو تو تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ گھر ہر انسان کے لیے بے پناہ اہمیت رکھتا ہے اور ماں باپ سے بڑھ کر کسی تعلق کی اہمیت نہیں ہوتی۔ مجھے بھی اپنے والدین اور بھائی بہن کی پریشانی کا خیال ہے۔ میری گمشدگی پر ان کا ایک ایک دن کس عذاب میں گزر رہا ہوگا، یہ صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں اسی لیے تم لوگوں کی بے حد محبت اور خلوص کے باوجود مزید یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مزید رکا بھی تو کتنے دن رک سکتا ہوں۔ آخر ایک نہ ایک دن تو مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ میری دنیا، تمہاری دنیا سے بہت مختلف ہے۔ میں تمہاری دنیا میں ہمیشہ نہیں رہ سکتا اور تم میری دنیا میں خوش نہیں رہ سکتیں اس لیے اچھا ہے کہ ہم چند دنوں کے اس ساتھ کو ایک خوش گوار یاد کی طرح اپنے دلوں میں سنبھال کر رکھ لیں اور کبھی زندگی موقع دے تو ان یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے ملاقات کی راہ نکال لیں۔ مجھے موقع ملا تو میں پھر کبھی دوبارہ تم لوگوں سے ملنے یہاں آؤں گا۔ تمہیں موقع ملے تو تم چاچا جی اور مراد کے ساتھ مجھ سے ملنے شہر آجانا۔ میں نے اپنا پتا لکھ کر مراد کو دے دیا ہے۔ کراچی آکر اس پتے کی مدد سے تم لوگ مجھ تک پہنچ سکتے ہو۔'' لیلیٰ کے چھوٹے سے جملے میں کتنے شکوے چھپے ہوئے تھے، وہ سمجھ رہا تھا اس لیے اسے بہت کچھ سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ لیلیٰ بھی کوئی ناسمجھ لڑکی نہیں تھی۔ اپنی کم عمری کے باوجود اسے زندگی کا بہت تجربہ تھا اس لیے اس کی بات کے جواب میں کچھ دیر سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی رہی پھر عجیب سے انداز میں بولی۔

''تم یہ میرے لگائے پودے دیکھ رہے ہو نا معاذ سائیں! یہ سبزی ترکاری کے پودے کتنے فائدہ مند ہیں۔ یہ

ہمارا پیٹ بھرتے ہیں۔ ان سے ہمارے جانوروں کو خوراک ملتی ہے اور ان کی ہریالی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ ان سب کے بیچ ایک اکیلا پھول دار پودا ہے جس کا دیکھو تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ میرا پیٹ نہیں بھر سکتا لیکن یہ میرے دل، میری روح کو خوشی دیتا ہے اس لیے یہ پودا مجھے سب سے بڑھ کر پیارا لگتا ہے اور جب میں بہت دور سے پانی ڈھو کر لاتی ہوں تو سب سے پہلے اس پودے کو پانی ڈالتی ہوں۔ میں اس پودے کو سوکھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی معاذ سائیں۔'' وہ اَن پڑھ اور مہذب دنیا سے دور رہنے والی لڑکی اتنی گہری بات کر جائے گی، معاذ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنی مثال سے واضح کر دیا تھا کہ معاذ کی محبت کتنی ہی لاحاصل سہی، وہ اس محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ اس کا دل دکھ سے بھرنے لگا اور وہ افسوس سے صبح کی ابتدائی روشنی میں نہائی اس لڑکی کو دیکھنے لگا جس کی زندگی ان پہاڑوں کے بیچ پہلے ہی بہت سخت تھی اور اس نے ایک اور سختی کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ بہت دیر بعد وہ بولنے کے لائق ہوا تو بولا۔

''میرا تم پر کوئی زور نہیں ہے لیلیٰ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ایک اچھی زندگی گزارو۔ اچھی زندگی گزارنے کے لیے سب سے زیادہ محبت کرنے والے ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ مراد تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ اگر ہو سکے تو تم اس پیارے لڑکے کا ہاتھ تھام لینا۔''

''جو آپ کا حکم سائیں! چلو اب چل کر مانی (روٹی) کھا لو پھر تم کو سفر کے لیے نکلنا ہے۔'' بغیر کسی بحث یا اعتراض کے اس کی خواہش پر ہامی بھر کر وہ یوں کھڑی ہو کر اس سے بولنے لگی جیسے ان دونوں کے درمیان کسی حساس موضوع کے بجائے موسم کی صورت حال پر گفتگو ہوتی رہی ہو۔ معاذ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ کچھ دیر میں ناشتے سے فارغ ہو کر وہ وہاں سے روانگی کے لیے تیار تھا۔ زادِ راہ کے طور پر لیلیٰ نے کھانے پینے کا سامان باندھ کر دے دیا تھا۔ راہنمائی کے لیے ڈیرے سے ایک لڑکا اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ ان دونوں کو ایک ہی گھوڑے پر سفر کرنا تھا کیونکہ وہاں سواری کے لیے زیادہ گھوڑے موجود نہیں تھے اور پرسوں ہی چند لوگ عام آبادی کی طرف روانہ ہوئے تھے تاکہ یہاں سے اپنا مال لے جا کر فروخت کرنے اور ضرورت کی اجناس واپس لانے کا کام انجام پا سکے۔ مراد کی خواہش تھی کہ وہ معاذ کو پہاڑوں سے نیچے چھوڑنے جائے لیکن اس کے بازو کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا اس لیے معاذ نے خود سختی سے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

''تمہاری بہت یاد آئے گی معاذ سائیں۔'' وقتِ رخصت وہ سب سے گلے مل رہا تھا تو مراد نے اس کے گلے لگ کر بڑی محبت سے کہا۔

''میں بھی تم لوگوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔'' معاذ نے مسکراتے ہوئے اس کا شانہ تھپکا۔ ڈیرے کے تقریباً سب ہی لوگ اسے رخصت کرنے آئے تھے۔ وہ سب سے گلے مل کر ان کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ سب سے آخر میں وہ فیضو سے ملا اور بولا۔

''مجھے یقین ہے آپ کی کشش مجھے دوبارہ ضرور یہاں لائے گی چاچا جی!'' فیضو نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھڑا مسکراتا رہا۔ اس کے پہلو میں ہی لیلیٰ بھی کھڑی تھی۔ بالکل سپاٹ چہرے اور بے تاثر آنکھوں کے ساتھ لیکن معاذ جانتا تھا کہ بظاہر سخت اور سرد نظر آنے والی اس لڑکی کے اندر بھی بڑی نرمی اور حساسیت ہے۔ اس نے دھیرے سے لیلیٰ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ جانے والے لڑکے کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی لڑکے نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اس نے فضا میں ہاتھ لہرا کر سب کو خدا حافظ کہا۔ جواب میں بیک وقت بہت سے ہاتھ فضا میں لہرائے اور گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ اسے رخصت کرنے کے لیے آنے والے اپنی جگہ کھڑے دور جاتے گھوڑے اور اس کے سواروں کو دیکھتے رہے۔ معاذ بھی بار بار گردن موڑ کر انہیں دیکھتا رہا۔ آخر وہ سب اسے نظر آنا بند ہو گئے۔ اب وہ راستے کی طرف متوجہ تھا۔

راستہ ناہموار اور ٹیڑھا میڑھا تھا۔ ہر طرف ایک جیسی بھوری اور سلیٹی رنگت والی خشک اور بنجر پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ گرمی کا موسم نہیں تھا اور ابھی دن کا ابتدائی حصہ ہی تھا اس کے باوجود سورج کی تمازت کافی محسوس ہو رہی تھی۔ معاذ، فیضو کا دیا ہوا جوڑا پہنے ہوئے تھا اور اس کے سر پر بھاری پگڑی بھی موجود تھی جس کے بوجھ کے باوجود افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر سر پر یہ بھاری بل دار پگڑی نہ ہوتی تو کھوپڑی کے اندر اس کا بھیجا پکنے لگتا۔ یہ کیرتھر اس کیرتھر سے بہت مختلف تھا جس کی سیر کے لیے وہ اپنے یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ آیا تھا۔ اُس کیرتھر پر تو بہاری آئی ہوئی تھی اور ہر طرف سبزہ بکھرا ہوا تھا لیکن یہاں اس حصے میں بس بنجر اور خشک پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان سفر کرتے ہوئے دل عجیب سی وحشت محسوس کرتا تھا۔ راستے اتنے گنجلک تھے کہ انہیں ذہن نشین کرنا کسی عام بندے کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ کارنامہ وہی انجام دے سکتے تھے جو

ان پہاڑیوں کے باسی تھے۔ کیرتھر کے آس پاس آباد گاؤں دیہاتوں کی بات الگ تھی لیکن پہاڑوں پر ان کی سختیوں کے درمیان تو وہ رہ سکتے تھے جو سرپھرے تھے یا پھر جن کو ساری دنیا سے چھپ کر رہنے کے لیے محفوظ ٹھکانوں کی حاجت تھی۔ ڈاکوؤں نے ایسے ہی کیرتھر کی ناقابلِ رسائی پہاڑیوں میں اپنی کمین گاہیں بنا رکھی تھیں۔ معاذ کو یاد آیا کہ فیضو نے ایک گاؤں کا نام بتا کر اسے وہاں ایک بندے کا نام بتایا تھا اور کہا تھا کہ اگر کبھی یہاں آنے کی ضرورت پڑے تو اس بندے کے پاس چلے جانا۔ وہ تمہیں یہاں پہنچا دے گا۔ یقیناً فیضو جانتا ہوگا کہ خود معاذ اپنی یادداشت کے سہارے وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا یہاں کے راستے ہی ایسے نہ تھے کہ ایک آدھ بار میں کسی کو یاد ہو جاتے۔ بھٹکنے کی صورت میں زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ وہ اپنے کم گو راہبر کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور سوچتا رہا۔

سفر کے آغاز سے پہلے ہی اسے بتا دیا گیا تھا کہ سفر طویل اور دشوار ثابت ہوگا۔ اصل میں وہ کراچٹ سینٹر سے بہت دور کیرتھر کے اس حصے میں تھے جو بلوچستان کی حدود میں آتا تھا۔ دو دن پہلے فیضو نے اس پر ایک انکشاف بھی کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ڈیرے پر موجود اس سمیت ہر شخص کسی نہ کسی وجہ سے عام لوگوں سے ہٹ کر وہاں چھپ کر رہ رہا تھا۔ کسی کو خاندانی دشمنیوں نے اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، کوئی کسی جرم کا مرتکب ہونے کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے وہاں چھپا بیٹھا تھا، کسی نے قرض کے بوجھ سے جان چھڑانے میں ناکام ہو کر یہاں پناہ لے لی تھی۔ خود مراد کا باپ سجاول کسی زمانے میں نامی گرامی ڈکیت ہوتا تھا۔ اس کے ڈاکوں کی سب سے زیادہ شہرت تھی اس لیے جب وہ ڈکیتی کے تائب ہوا تو اس کے پاس عام لوگوں میں جا بسنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ ہی تائب ہونے والے دو تین ڈاکوؤں کے ساتھ ان ہی پہاڑوں میں بس گیا۔ ان کے خاندان بھی ان کے ساتھ تھے اور آبادیوں میں ان کے چند بہت قریبی اور بااعتماد عزیز ہی ایسے تھے جن سے ان کے خفیہ رابطے تھے۔ ان عزیزوں اور فیضو کی طرح پہاڑوں پر آنے والے چند لوگوں کے ذریعے وہ اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتے تھے۔ فیضو اور اس جیسے دوسرے مصیبت زدہ لوگوں کو سجاول نے ہمدردی میں پناہ دی تھی اور اب وہ سب وہاں ایک خاندان اور قبیلے کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ وہاں رہتے رہتے ان کی نسل جوان ہو گئی تھی اور اب شاید پہلے جیسے اندیشے اور خطرات باقی نہیں رہے تھے لیکن اب وہ عام آبادیوں میں واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہاڑ انہیں راس آ چکے ہیں اور یہاں جیسا سکون انہیں کہیں نہیں مل سکتا۔ شاید وہ اپنے اس خیال میں درست بھی تھے اسی لیے انہوں نے اپنے آپ کو عام لوگوں سے تقریباً کاٹ کر رکھا ہوا تھا اور اتنے برسوں بعد بھی مخصوص لوگوں کے علاوہ کسی کی ان تک رسائی نہیں تھی۔ وہ خود کو لوگوں کی نظروں میں لانا بھی نہیں چاہتے تھے اس لیے معاذ کو روانگی سے قبل اس سلسلے میں خصوصی ہدایات دی گئی تھیں اور اس سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ شہر پہنچنے کے بعد ان کے بارے میں کسی کو ایسی کوئی بات نہیں بتائے گا جو کسی کو ان تک رسائی دے سکے۔

معاذ نے بخوشی ان سے وعدہ کر لیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کا طرزِ زندگی دیکھا تھا۔ وہ بہت سخت زندگی گزار رہے تھے اور اس زندگی میں کسی جرم کا شائبہ تک نہیں تھا تو اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ ان کی پُرسکون زندگیوں میں خلل ڈالتا۔ وہ اس کے محسن تھے اور وہ اپنے محسنوں کو کوئی نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ان سے یہ اصرار بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اسے کراچٹ سینٹر پہنچائیں۔ وہ اس پر راضی ہو گیا تھا کہ وہ اسے سندھ کے کسی گاؤں تک پہنچا دیں تو آگے وہ خود اپنے لیے راہ تلاش کر لے گا چنانچہ اسے ان بے رحم پہاڑوں میں ایک طویل سفر کرنا تھا۔ سفر کی ابتدا نے ہی بتا دیا تھا کہ یہ سفر آسان نہیں ہوگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہی حلق میں کانٹے پڑنے لگتے تھے اور وہ چھاگل سے منہ لگا کر چند گھونٹ پانی پینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کا ہمسفر البتہ راستے کی ان سختیوں کا عادی تھا اور اس نے ایک آدھ بار ہی پانی پیا تھا۔

"ہم اس علاقے سے کافی آگے نکل گئے ہیں جہاں ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا ہے۔" دوپہر کے بعد اس کے ہمسفر و راہنما نے اسے آگاہ کیا۔ روانگی کے وقت ہی ان کے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے نہیں رکیں گے تاکہ دن کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ سفر طے ہو جائے۔ بھوک محسوس ہوتی تو وہ چلتے چلتے ہی اپنے پاس موجود چنے یا بھنی مکئی کھا کر گزارہ کر سکتے تھے لیکن دونوں ہی نے ابھی تک کچھ کھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور ان کا سفر مستقل جاری تھا۔ ڈاکوؤں والے علاقے سے آگے نکل کر اس کے ساتھی نے پیاسے گھوڑے کو پانی پلانے کے لیے گھوڑا روکا تو اسے اکڑی ہوئی پیٹھ کو سیدھا کرنے کا موقع ملا۔ گھڑسواری سے واقفیت الگ بات تھی لیکن گھوڑے کی پیٹھ پر اتنا لمبا سفر طے کرنے کا اس کا یہ پہلا موقع تھا۔ پھر وہ ابھی حال ہی میں

صحت یاب ہوا تھا۔ فیضو کے کے بہترین علاج کے باوجود اس کے جسم میں ہونے والی خون کی کمی ایک دم ہی تو پوری نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ کمزوری نے بھی اسے تھکانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ گھوڑے کے پانی پینے تک اس کے ساتھی نے اسے کچھ کھا لینے کا مشورہ دیا لیکن اس نے مٹھی بھر کھجی کے علاوہ کچھ نہیں کھایا۔ دوبارہ سفر شروع ہوا تو وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ بغیر رکے سفر کرنے کا مشورہ انہیں فیضو نے دیا تھا۔ خمیسو خان کو قابو میں کر لینے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ معاہدہ طے پا جانے کے باوجود وہ بہت زیادہ مطمئن نہیں تھا اور اسے خدشہ تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ خمیسو خان سے بغاوت کر کے بھی انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اپنے ایک گروپ کے کامیابی سے نکل جانے کے باوجود اندیشے مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے، اس لیے اپنے طور پر احتیاط کرنا ہی بہتر سمجھا جا رہا تھا۔ دوسرے حصے میں شروع ہونے والا ان کا یہ سفر اس وقت تک جاری رہا جب تک کیرتھر پر اندھیرے نہیں اترنے لگے۔ ویسے بھی اب موسم تبدیل ہو رہا تھا اور دن چھوٹے ہونے لگے تھے اس لیے رات ذرا جلدی اتر آتی تھی۔ شام گہری ہوئی تو وہ ایک مناسب جگہ دیکھ کر رک گئے اور آگ جلالی۔ ذرا دیر ستانے کے بعد کھانا کھانا شروع کر دیا۔ اس کا راہبر اسے بتانے لگا کہ اگر انہوں نے علی الصباح سفر کا آغاز کر دیا تو کل دوپہر تک اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ کھانے کے نام پر ان کے پاس روٹیاں، پیاز اور گڑ کی ڈلیاں موجود تھیں۔ یہی کھانا ایسا تھا جو گرمی کے باوجود خراب نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ سفر میں اسی طرح کا کھانا کھاتے تھے۔ معاذ کو یہ سب کھانے کا تجربہ نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ بڑے مزے سے اس کھانے کو کھا رہا تھا۔ پورے دن کی بھوک اور تھکن کے بعد شاید ہر چیز نعمت لگتی ہے۔ وہ بھی مزے سے اس فقیرانہ کھانے کو کھا رہا تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے اور اس کے ساتھی نے بیک وقت کھانے سے ہاتھ روک کر اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ چار گھڑسوار آندھی طوفان کی طرح ان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اپنے حلیے سے وہ ڈاکو لگتے تھے۔ معاذ نے بے ساختہ ہی بتیس بور کے اس ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے لیلیٰ نے روانگی کے وقت اپنی حفاظت کے لیے دیا تھا۔ اس کے ہاتھ بڑھاتے ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے قریب سے گزری اور کوئی چیخ کر بولا۔

"خبردار! ہتھیاروں کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ اگلی گولی تمہارے بھیجے کے اندر ہوگی۔"

معاذ کو اپنا ہاتھ پیچھے کرنا پڑا۔ اس اثنا میں وہ چاروں ان کے قریب آ کر رک چکے تھے اور خونخوار نظروں سے ان دونوں کو گھور رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہے سنگرام! تمہارے سردار سے ہمارا معاہدہ طے ہو گیا تھا کہ تم لوگ ہمیں پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے تنگ نہیں کرو گے پھر یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" معاذ کے ساتھی نے ایک ڈاکو کو شناخت کرتے ہوئے اس سے غصے سے پوچھا۔

"سردار کی تو....." سنگرام نامی ڈاکو نے خمیسو خان کو ایک گندی سی گالی دی اور بولا۔ "سردار پہلے تو زنانیوں کی طرح تم لوگوں کے قبضے میں چلا گیا اور پھر بزدلوں کی طرح اپنی جان بچانے کے لیے تم سے معاہدہ بھی کر بیٹھا لیکن میں ایسے کسی وعدے کو نہیں مانتا۔ اس جھگڑے میں میرا بھائی اور بھانجا اپنی جان سے گئے ہیں۔ میرے اس ساتھی کا جوان بیٹا مارا گیا ہے۔ ہمارے سینوں میں آگ لگی ہے۔ ہم سردار کی خاطر تمہیں شما نہیں کر سکتے۔ ہم سردار اور اس کے پٹھوؤں کو چھوڑ آئے ہیں اور اب ہم چار کا اپنا گروہ ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ تمہارے لوگ کیسے اس راستے پر سفر کرتے ہیں۔ ہمارے تین ساتھیوں کے بدلے تم سب اپنی جان سے جاؤ گے۔ ابھی تمہاری باری ہے۔ تمہارے بعد ان کا نمبر آئے گا جو یہاں سے نکل تو گئے ہیں لیکن کبھی واپس ڈیرے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔" بولتے بولتے سنگرام نے اپنی رائفل سے معاذ کے سر کا نشانہ باندھ لیا۔

"ٹھیک ہے تمہاری دشمنی ہم سے ہے۔ تم چاہو تو مجھے گولی مار سکتے ہو لیکن اس لڑکے کو جانے دو۔ اس کا تعلق ڈیرے سے نہیں ہے۔ یہ ہمارا مہمان ہے اور میں اسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔" معاذ کے ساتھی نے ملتجی لہجے میں سنگرام ڈاکو سے درخواست کی تو وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا پھر وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

"تم، تمہارا گھوڑا اور یہ چھوکرا کوئی نہیں بچے گا۔ ہمارے ساتھیوں کی موت کا حساب ڈیرے سے سمبندھ رکھنے والے ہر جاندار کو دینا ہوگا۔"

"لیکن....." معاذ کے ساتھی نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن سنگرام لبلبی دبا چکا تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے میں اس کے الفاظ اُن سنے رہ گئے تھے۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

UUNOVELS.COM

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

کہیں سے ایک آواز گونج رہی تھی۔ ایک صدا آرہی تھی۔ ''آجاؤ۔ آؤ میرے پاس..... تم بہت شریر ہو گئے ہو۔''

نہ جانے کتنے برسوں پہلے کسی نے مجھ سے یہ کہا تھا۔ میری ماں نے۔ ہاں، یہ آواز میری ماں ہی کی تھی جو چالیس برسوں کے بعد میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ماں دروازے کے باہر کھڑی ہو کر مجھے پکار رہی ہو۔ میری شرارت پر کہہ رہی ہو۔ ''بہت شریر ہو تم۔ بہت شریر۔''

میں ایک ٹرانس کے عالم میں بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوائیں بھی بہت طوفانی چل رہی تھیں۔ میرے بس میں تھا ہی نہیں کہ اتنی تیز بارش میں میری ماں دروازے پر کھڑی رہے اور میں اپنے بستر پر رہوں۔ میں اٹھ کر جانے لگا۔ اسی وقت کسی نے آ کر مجھے پکڑ

اپنا پن

منظر امام

کہاوت ہے کہ ''غیر مارے تو دھوپ میں ڈالے اور اپنا مارے تو چھائوں میں ڈالے'' یہ کس حد تک درست ہے اس کا فیصلہ تو اس کہانی کو پڑھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو پتھر اپنی جگہ چھوڑ دے وہ ٹھوکروں میں آجاتا ہے مگر جو اپنی جگہ پر قائم رہے وہ اپنا بھرم بھی بچالیتا ہے اگرچہ وہ ایک پتھر ہی تو ہوتا ہے۔

خون کے رشتوں میں محبت کا رنگ تلاش کرنے والے ایک باپ کی روداد

UUNOVELS.COM

کیا۔ ''ابو! کیا ہو گیا ہے؟ کہاں جا رہے ہیں؟''

''آواز سنو۔'' میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میری امی مجھے بلا رہی ہیں۔ وہ پکار رہی ہیں۔''

''کیا ہو گیا ہے ابو.....؟'' میری بہو نے کہا۔ ''ان کے تو انتقال کو بھی پندرہ برس ہو گئے ہیں، چلیں جا کر بستر پر لیٹ جائیں۔ آپ نے تو پورے گھر کو پریشان کر کے رکھا ہوا ہے۔''

میں بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

اب کیسے بتاتا کہ میں نے جو آواز سنی تھی، وہ میرا وہم نہیں تھا۔ کوئی دروازے پر تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ بہت پہلے مر چکی تھی لیکن اس سے کیا ہوا۔ وہ واپس بھی تو آ سکتی تھی۔ اپنے بیٹے کے پاس۔ مائیں تو ایسی ہی ہوتی ہیں جو ہر بندھن کو توڑنے کی قوت رکھتی ہیں۔

لیکن میں کیا بولتا؟ اپنی بہو سے کیا بحث کرتا؟ وہ تو ویسے ہی ہر وقت غصے میں رہتی تھی۔ شاید اسے اس بات کا غصہ تھا کہ میں ابھی تک زندہ کیوں ہوں۔ خوامخواہ اس پر اور اس کے شوہر پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ماں باپ سے اولاد کا رشتہ اس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کا ہوتا ہے لیکن پھر کوئی اجنبی آ کر اولاد کو ماں باپ سے چھین کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس وقت والدین سے رشتے ثانوی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

لیکن شاید مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ یہی تو زندگی کا تسلسل ہوتا ہے۔ یہ سفر اسی طور جاری رہتا ہے۔

میں اس رات دیر تک جاگتا رہا۔ دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا جس طرح اب تک دن گزرتے آئے ہیں۔

ناشتے کی میز پر بیٹے سے ملاقات ہوئی تو وہ غصے میں تھا۔

''کیا ہوا ہے ابو! آپ کیوں پریشان کرتے ہیں؟'' اس نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''پریشان کرتا ہوں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کس کو پریشان کرتا ہوں؟''

''نگینہ کو اور کس کو؟ وہ بتا رہی تھی کہ رات بھی آپ بستر سے اٹھ کر کہیں جا رہے تھے؟''

''بیٹے! میں تو دروازہ کھولنے جا رہا تھا۔''

''کس کے لیے دروازہ کھولنا تھا؟ کیا کسی چور کو بلانا ہے؟'' نگینہ نے غصے سے کہا۔

''بیٹا! میری ماں دروازے پر کھڑی تھی۔'' میں نے اداس ہو کر کہا۔

''جائیں جا کر سو جائیں۔ فراز بھی آپ کی فکر کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔''

''بیٹے! شاید تم کو نہ معلوم ہو کہ جب بچپن میں فراز بیمار ہوتا تھا تو میں ہی اس کے سرہانے رات بھر بیٹھا رہتا تھا۔ کیونکہ فراز کی ماں تو مر چکی تھی لیکن میں نے کبھی کسی سے نہیں کہا کہ میں اس کی فکر کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔''

بہو تنتناتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میرا کمرا میرے سامنے تھا لیکن مجھے اپنے کمرے کی طرف نہیں جانا تھا۔

میں نے اپنے کمرے، اپنے گھر پر ایک نظر ڈالی اور اس مکان سے باہر آ گیا۔ میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ کوئی راستہ نہیں تھا۔ بس گھر سے نکل آیا تھا۔

حالات چاہے جیسے بھی ہوں، ایک باپ کو کبھی اپنی اولاد کو بددعا نہیں دینی چاہیے۔

قدرت کا یہ عجیب قانون ہے۔ ماں کی بددعا نہیں لگتی لیکن باپ کی بددعا تیر کی طرح جا کر لگ جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے بیٹے کو کبھی بددعا نہیں دی۔ ہمیشہ اس کے لیے خیر ہی چاہا ہے۔ اس وقت بھی اس کی خیر کی دعا کرتے ہوئے اس گھر سے نکلا تھا۔

رات کا وقت تھا اور میں چلا جا رہا تھا۔ کسی منزل کے تعین کے بغیر۔ اچانک ایک گاڑی میرے پاس آ کر رک گئی۔

''ارے نصیر صاحب! کہاں جا رہے ہیں؟'' کسی نے پوچھا۔

میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ محلے کے ایک بڑے پیر اسٹور کا مالک امجد تھا۔ میں اکثر اس کے اسٹور پر چلا جایا کرتا۔ اس سے گپ شپ بھی ہو جاتی تھی۔ بہت معقول انسان تھا۔ پڑھا لکھا اور مہذب۔

''نصیر صاحب! خیر تو ہے نا؟ اس وقت رات کو کہاں جا رہے ہیں؟''

''بس بھائی مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔'' میں نے دکھ سے کہا۔

اس نے بہت غور سے میری طرف دیکھا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ''اچھا ایسا کریں، گاڑی میں بیٹھ جائیں۔'' اس نے اپنے برابر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ''بیٹھیں۔''

میں انکار نہیں کر سکا۔ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے راستے میں کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی میں کچھ بتانے کی قوت پا رہا تھا۔

وہ سیدھا مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اس وقت بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔ کچھ وقت کے لیے بارش رک گئی تھی لیکن

UUNOVELS.COM

اب پھر اس کا زور شروع ہو گیا تھا۔

امجد مجھے اندر لے آیا۔ اس نے میرے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلوا دیا تھا۔ شاندار ڈرائنگ روم تھا۔ قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ میں نے جوتے اتارنے چاہے لیکن وہ بول پڑا۔ ''ارے نصیر صاحب! ایسے ہی آجائیں۔''

''نہیں بھائی! میرے جوتے گیلے ہو چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں جوتے اتار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں اس کی ملازمہ ہمارے لیے چائے کی ٹرے لے کر آ گئی۔ چائے کے ساتھ کھانے پینے کی بھی چیزیں تھیں۔

''ارے امجد بھائی! یہ کیوں کر دیا؟''

''اس لیے کہ خود مجھے اس وقت چائے پینی تھی۔ سخت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ اگر آپ بھی میرا ساتھ دے دیں تو کیا حرج ہے؟''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ چائے پیتا رہا۔ میرے بدن میں ایک طمانیت سے گھل رہی تھی۔ اس کے اصرار پر میں نے بسکٹ وغیرہ بھی کھا لیے۔

چائے سے فارغ ہو کر میں نے کہا۔ ''اچھا امجد بھائی! اب مجھے اجازت دو۔ میں چلتا ہوں۔''

''لیکن نصیر صاحب! آپ جائیں گے کہاں؟''

''میں! کہیں نہیں۔ یا شاید کسی ایسی جگہ جہاں کچھ دن گزار سکوں۔'' میں نے کہا۔

''نصیر صاحب! اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں ایسے کئی واقعات دیکھ چکا ہوں۔ اپنوں سے مایوسی ہو جائے تو پھر غیروں ہی کی طرف دیکھا جاتا ہے اور منزلیں گرد ہو جاتی ہیں۔ چلیں آپ کچھ دنوں تک ہمارے یہاں رہ لیں۔''

اس کی ہمدردی کے یہ بول میرے لیے بہت تھے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں رو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اپنے آپ میں آیا تو اس بھلے آدمی نے میرے لیے گلاس میں پانی انڈیل دیا۔ ''یہ لیں، پانی پی لیں..... کچھ سکون مل جائے گا۔''

میں نے پانی پی لیا۔ سکون کا احساس ہوا۔

''چلیں، اب کہیں جانے کی بات نہ کریں۔ اسی گھر میں ہمارے ساتھ رہیں۔''

''تمہارے ساتھ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں تو کیا ہوا؟ اس کو بھی اپنا ہی گھر سمجھیں۔ کئی کمرے خالی پڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے لیے ایک کمرا ابھی ٹھیک کروا دیتا ہوں۔''

''امجد! تم یہ سب کس لیے کرو گے؟ تمہاری بیوی کو اعتراض ہوگا۔''

''کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ بھی میرے ہی مزاج کی ہے۔ اس کو تو خوشی ہوگی بلکہ تھمبریں۔ میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔ آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔''

میں دیکھتا اور سوچتا رہا۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

کچھ دیر میں وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے دو بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔

وہ بچے بہت پیارے اور آٹھ دس برس کے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔

سب نے آ کر بڑے سلیقے سے سلام کیا تھا۔ ''بچو! یہ تمہارے دادا ابو ہیں۔'' امجد نے بچوں کو بتایا۔

مجھے اس وقت اپنی پوتی یاد آ گئی جس کو میں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

میں نے اس بچی کو پیار کیا۔ اس وقت دو آنسو میری آنکھوں سے ٹپک پڑے تھے۔ اس کی بیوی کا نام نمرہ تھا۔

مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ امجد اور اس کی بیوی اتنے اچھے ہوں گے۔ انہوں نے مجھے ایک کمرا دے دیا جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس رات میں سوچتا رہا کہ اس دنیا میں اپنا کون ہوتا ہے اور پرایا کس کو کہتے ہیں۔

دوسری صبح میں نے ناشتا کیا۔ امجد کی بیوی نے مجھے کھانے کی میز پر آنے کی دعوت دی۔ یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں خود اپنے گھر میں ایسی توجہ کو ترستا رہا تھا۔ ناشتے کے بعد امجد نے مجھ سے کہا۔ ''نصیر صاحب! میں اپنے اسٹور پر جا رہا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔''

''نہیں بھائی! میرے پاس اس وقت سب کچھ ہے..... البتہ۔'' میں کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔

''جی جی فرمائیں۔''

''امجد! میں اپنے گھر سے اپنے کپڑے نہیں لایا ہوں۔ میں تمہیں چیک دے رہا ہوں۔ تھوڑے سے پیسے پڑے ہیں، وہ نکلوانا چاہتا ہوں۔ کچھ کپڑے خرید لوں گا۔''

''حد ہو گئی۔ اب کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا؟ اپنا چیک اپنے پاس رکھیں۔ میں لیتا آؤں گا۔''

کیا خلوص تھا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ خود میرے بیٹے اور بہو کو اس بات کی پروا بھی نہیں ہوگی کہ اس گھر میں ایک بوڑھا رہا کرتا تھا اور وہ کہیں چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہو نے تو شکرانے کی نماز ادا کی ہوگی۔

UUNOVELS.COM

شام کو امجد میرے لیے کئی جوڑے لے آیا تھا۔ میں نے اس کو پیسے دینے چاہے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

''کیا کر رہے ہیں آپ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ابھی تک ہمیں غیر سمجھ رہے ہیں؟''

امجد کا یہ رویہ مجھے بہت اچھا لگا۔ اس نے میری نظروں میں اپنا اچھا انسان ہونا ثابت کر دیا تھا۔ کیا رشتہ ہے میرا اس سے؟ کچھ بھی نہیں۔ میں اس کے اسٹور پر جا کر سامان لیا کرتا تھا۔ اس سے زیادہ کیا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک شام اس نے بتایا کہ میرا بیٹا فراز اس کے اسٹور پر کچھ لینے آیا تھا۔ بہت سی خریداری کر کے گیا ہے۔

''کیسا ہے وہ؟'' میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے بتایا۔

''میرے بارے میں کچھ بتایا اس نے؟''

''خود میں نے چھیڑا تھا اس کو۔ میں نے پوچھا تھا کیا بات ہے، آپ کے ابو دکھائی نہیں دے رہے..... تو اس نے بتایا کہ ہاں کچھ بیمار ہیں۔ اسی لیے گھر سے نہیں نکل رہے۔''

میرے سینے پر جیسے کسی نے گھونسا سا مار دیا ہو۔ جس اولاد سے میں نے اتنی محبت کی تھی، اس کو اپنے خونِ جگر سے پالا تھا..... اس کو اتنی بھی پروا نہیں تھی۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔ امجد کپڑوں کا پیکٹ دے کر چلا گیا تھا۔

میں نے اپنے کپڑے بدلے۔ امجد کا لایا ہوا سوٹ پہنا اور اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں پہنچ گیا۔ امجد کی بیوی میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ''اوہو انکل! یہ سوٹ تو آپ پر بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''شکریہ بیٹی۔'' میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے ایک بار پھر اپنی بہو نگینہ یاد آ گئی جس نے کبھی میری تعریف نہیں کی تھی۔ اس کو اس بات کی پروا بھی نہیں ہوتی تھی کہ میں نے کیا پہنا ہے۔

''انکل! میں آپ کے لیے فروٹ چاٹ لے کر آتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بیٹا! رہنے دو۔ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس میں تکلف کیسا ہے۔ میں ہر شام کو بناتی ہوں۔''

اس نے فروٹ چاٹ لا کر دی۔ واقعی بہت مزے دار تھی۔ اس دوران اس کی بیٹی بھی اپنے کمرے سے نکل کر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

وہ ایک پیاری بچی تھی۔ بالکل میری پوتی کی طرح۔ نمرہ نے اس کا نام فروا بتایا تھا۔ بیٹا ذیشان تھا۔ وہ بھی کمرے سے آ گیا تھا۔ وہ بھی بہت پیارا سا بچہ تھا۔

باتوں کے درمیان نمرہ نے مجھ سے کہا۔ ''انکل! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں بیٹا کہو۔''

''ہم دونوں نے آپ کے لیے ایک مشغلہ ڈھونڈا ہے۔ اگر برا نہ مانیں تو..... آپ کا وقت اچھا گزر جائے گا۔''

''ہاں بیٹا بتاؤ..... کیا ہے؟''

''انکل! فروا اور ذیشان دونوں اسکول جاتے ہیں۔ ایک ہی اسکول ہے۔ ویسے تو یہ وین پر جاتے ہیں لیکن کچھ دنوں سے وین والا بیمار ہے۔ امجد لے کر جاتے تھے لیکن وہ بھی کچھ دیر سے جاتے ہیں۔''

''ارے ارے..... میں سمجھ گیا۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''اس میں پریشانی کیا ہے۔ میرے لیے تو یہ خوشی کی بات ہو گی۔ میں لے جایا کروں گا۔''

''انکل! آپ کو زحمت ہو گی۔''

''ارے نہیں، ویسے بھی تو گھر پر ہی پڑا رہوں گا۔ تو کیوں نہ ان بچوں کے ساتھ ہی وقت گزر جائے۔ میں اپنی پوتی کو بھی تو اسکول لاتا لے جاتا تھا۔''

''انکل! ان دونوں کا اسکول بہت قریب ہے۔''

میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اسکول کا نام پوچھا۔ اس کا نام کچھ اور تھا۔ میری پوتی کسی اور اسکول میں تھی جو مخالف سمت میں تھا۔

''آپ کل میرے ساتھ چلیں گے۔'' نمرہ نے کہا۔ ''میں اسکول والوں سے کہہ دوں گی کہ اب آپ ہی بچوں کو لایا لے جایا کریں گے۔ ان کو انفارم کرنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ وہ بچوں کو لانے نہیں دیں گے۔''

''چلو، یہ تو اچھی بات ہے۔ اتنی احتیاط تو ہونی چاہیے۔''

دوسری صبح ناشتے کے بعد امجد نے مجھ سے کہا۔ ''نصیر صاحب! میں نے سنا ہے کہ نمرہ نے آپ کو ایک کام دے دیا ہے؟''

''نہیں میاں! کام کیسا؟ وہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہے۔ میرا وقت بھی گزر جائے گا اور بچوں میں میرا دل بھی لگا رہے گا۔''

''میں یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں آپ کو برا نہ لگے۔''

''ارے، اس میں برائی کی کیا بات ہے؟''

امجد کے جانے کے بعد نمرہ دونوں بچوں کو تیار کر کے لے آئی۔ ہم پیدل ہی چل دیے۔ اسکول قریب ہی تھا۔ بڑا

UUNOVELS.COM

اسکول تھا۔

نمرہ نے اسکول کی انتظامیہ کو میرے بارے میں بتا دیا کہ کل سے یہی بچوں کو لایا لے جایا کریں گے۔

شام ہوئی تو نمرہ نے امجد کو بتا دیا کہ کل سے انکل ہی بچوں کو لایا لے جایا کریں گے کیونکہ وین والا بہت نخرے کرنے لگا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے فیس بھی بہت کر دی ہے۔

امجد بھی یہ سن کر خوش ہو گیا تھا۔ ''نصیر صاحب! میں خود یہی سوچ رہا تھا کہ بچوں کا کیا ہو گا۔ کیونکہ وین والے کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اب آپ جیسا آدمی بچوں کے ساتھ ہو گا تو پھر کیا چاہیے؟''

اس کے بعد یہ ایک طرح سے میری ذمے داری ہو گئی۔ میں بہت پہلے بیدار ہوتا اور تیار ہو کر بچوں کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ بچوں کو بھی اب میرے ساتھ کا مزہ آنے لگا تھا۔ میں انہیں راستے میں کہانیاں سناتے ہوئے آیا جایا کرتا۔

بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر بچے نہ ہوں تو کائنات ویران ہو جائے۔ کبھی کبھی میں اداس ہو جاتا' مجھے اپنی پوتی یاد آ جاتی۔ کیسی ہو گی وہ؟ کیا کرتی ہو گی؟ اسکول وقت پر جاتی ہو گی یا نہیں؟

ایک رات میں نے امجد سے کہا۔ ''میاں! ایک کام کر دو۔''

''جی فرمائیں؟''

''کل دونوں بچوں کو تم اسکول پہنچا دینا۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بہت دن ہو گئے ہیں، اپنی پوتی کو دیکھے ہوئے۔ میں کل اس کے اسکول کی طرف نکل جاؤں گا۔ اس کا اسکول بالکل دوسری سمت میں ہے۔''

اور پہلی بار میں نے محسوس کیا جیسے امجد کو برا لگا ہے۔ اس نے زبان سے اظہار تو نہیں کیا لیکن شاید اسے یہ بات ناگوار گزری تھی کہ اسے کل صبح بچوں کو لے کر جانا پڑے گا۔

''ٹھیک ہے نصیر صاحب! چلے جایئے گا۔'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں کسی طرح بچوں کو لے جاؤں گا۔''

دوسری صبح میں اپنی پوتی کے اسکول پہنچ گیا۔ میں گیٹ سے کچھ فاصلے پر چھپ کے کھڑا ہوا تھا۔ بچے اسکول آ رہے تھے۔ پیدل، رکشا میں وین میں یا کاروں کے ذریعے۔ میں دیکھ رہا تھا لیکن مجھے اپنی پوتی دکھائی نہیں دی۔

مجھے بے قراری سی ہو گئی تھی۔ کیا ہوا ہے اس کو؟ وہ تو اسکول کا ناغہ نہیں کرتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بیمار پڑ گئی ہو؟ لیکن یہ کیسے معلوم ہو؟ کون بتائے گا مجھے؟ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں اپنی ساری انا اور تلخ یادوں کو بھول کر گھر چلا جاؤں۔ لیکن اس طرح جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح گھر واپس آ گیا۔ گھر ہے مراد امجد کا گھر ہے۔

اپنے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹ کر میں بہت دیر تک اپنی پوتی علینہ کو یاد کرتا رہا۔ امجد دونوں بچوں کو اسکول سے واپس لے آیا تھا۔

شام کو چائے دیتے وقت نمرہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا..... اپنی پوتی کو دیکھ آئے؟''

''نہیں، میں اس کو نہیں دیکھ سکا۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ شاید اسکول نہیں آئی تھی۔''

''اوہ۔'' اس نے عجیب سے انداز سے ہونٹ سکیڑ لیے۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل پھر جائیں گے؟''

مجھے اس کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''انکل! امجد کو کل بہت جلدی کسی کام سے کہیں جانا

عقل

سبزی والے ہڑتال کرتے ہیں تو سبزیاں سڑکوں پر پھینک دیتے ہیں۔ دودھ والے ہڑتال کرتے ہیں تو دودھ سڑکوں پر بہا دیتے ہیں۔ پتا نہیں ان ہینگ والوں کو کب عقل آئے گی۔

جواب

ماں غصے سے۔ ''ارے بے وقوف، نالائق صوفہ بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے، سونے کے لیے نہیں۔ اٹھ جلدی، ورنہ جوتا ماروں گی سر پر۔''

بچہ: ''مگر اماں جوتا پاؤں میں پہننے کے لیے ہوتا ہے بچوں کو مارنے کے لیے نہیں۔''

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ حیدر آباد

دور کا نظارہ

ہوٹل کے منیجر نے سیاح کو کمرہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کمرے کا کرایہ سو روپے اس لیے زیادہ ہے کہ کمرے کی کھڑکی سے آپ دور تک نظارہ کر سکتے ہیں۔''

سیاح نے جواب دیا۔ ''پھر آپ سو روپے فوراً کم کر دیں کیونکہ میری نظر کمزور ہے۔ میں دور کا نظارہ نہیں کر سکوں گا۔''

مرسلہ۔ محمد انور ندیم، اوکاڑہ

UUNOVELS.COM

ہے۔اسی لیے کل بچوں کو آپ ہی لے جائیں گے۔"

میں کیا کہہ سکتا تھا؟ دوسری صبح سے پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دل چاہتا تھا کہ میں کسی طرح اپنی علینہ کو جا کر دیکھ لوں لیکن کیسے جاتا؟ اسکول کے اوقات ہی وہی تھے، جوان دونوں کے تھے۔ اس لیے بس اسے یاد کر کے ہی رہ جاتا تھا۔

ایک صبح ناشتے کے بعد نمرہ نے مجھ سے کہا۔ "انکل! ایک کام کر دیں گے؟"

"ہاں کہو بیٹا۔"

"بیس کلو آٹا لے آئیں۔ گھر میں آٹا ختم ہو گیا ہے۔"

میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیس کلو اچھا خاصا وزن ہوتا ہے اور دکان بھی کچھ فاصلے پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار اتنی محنت کی تھی۔ گھر تک آتے آتے سانس پھولنے لگی تھی۔ گھر پہنچا تو ایک دوسرا مرحلہ سامنے تھا۔

"انکل! آپ تھک تو گئے ہیں لیکن آج دونوں بچوں کو اسکول سے جلدی لانا ہے۔"

"کیوں، خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں ہاں، خیریت ہے۔ میری چھوٹی بہن جدہ سے آ رہی ہے۔ اس کو لینے ائرپورٹ جانا ہے۔ امجد بھی کچھ دیر میں واپس آ جائیں گے۔ جب تک بچوں کو لے آئیں تا کہ میں ان کو تیار کر دوں۔"

میرے پاس اسکول کا کارڈ تھا جس کی بدولت میں بچوں کو لا لے جا سکتا تھا لیکن اس وقت اسکول جانا کھل گیا تھا۔ میں بہت بری طرح تھک چکا تھا۔ انکار کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ بہر حال بچوں کو لینے جانا ہی پڑا۔

بچوں کو لے کر آیا تو امجد بھی گھر پر تھا۔ وہ لوگ ائرپورٹ جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

"نصیر صاحب!" امجد نے کہا۔ "آپ تو گھر پر ہیں نا۔ ماسی آ جائے تو اس سے گھر کا کام کروا لیجیے گا۔"

نمرہ نے مجھے کام سمجھا دیے۔ وہ کام جو مجھے ماسی سے کروانا تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میری بہو نے کبھی اس قسم کی ذمے داری میرے سپرد نہیں کی تھی لیکن یہاں مجبوری تھی۔

ماسی آئی تو میں نے اسے سارے کام سمجھا دیے۔ دوپہر تک میں بہت تھک چکا تھا۔ شام کے وقت امجد، اس کی بیوی بچے اور نمرہ کی بہن بھی واپس آ گئے۔ پورے گھر میں ایک چہل پہل سی ہو گئی۔

امجد کی آوازیں، نمرہ کے قہقہے، بچوں کی چیخ و پکار۔ نمرہ کی بہن کی آوازیں۔ سب آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں اور میں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔

کسی کو کیا غرض تھی کہ آ کر دیکھ لیتا؟

اور شام ہوتے ہوتے ایک بار پھر اسی آواز نے مجھے متوجہ کر لیا۔ وہ آواز میری ماں کی تھی جو برسوں کی جدائی کے پردے سے ہوتی ہوئی میرے پاس آ رہی تھی۔ "کہاں ہو تم؟ ہر بار کیوں چھپ جاتے ہو؟ بہت شریر ہو گئے ہو۔"

وہی آواز..... اپنی طرف بلاتی ہوئی۔

میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ سب لوگ ڈرائنگ روم میں مصروف تھے۔ میری طرف کون دھیان دیتا؟ میں ایک بار پھر ایک گھر سے باہر آ گیا۔ فرق یہ تھا کہ پہلی بار اپنے گھر سے نکلا تھا..... اس بار امجد کے گھر سے باہر آ گیا تھا۔

کوئی منزل نہیں تھی۔ راستے تو تھے۔ دور تک پھیلے ہوئے..... لیکن ٹھکانا کوئی نہیں تھا۔ میں چلتا ہوا پارک کی طرف آ گیا جو میرے گھر کے پاس ہی تھا اور ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔

ہر طرف بچے کھیل رہے تھے۔ ان کی خوبصورت آوازیں پورے پارک میں پھیلی ہوئی تھیں۔

اور اچانک کسی نے مجھے آواز دی۔ "دادا ابو۔۔۔ دادا ابو۔"

کوئی مجھ سے آ کر لپٹ گیا۔ وہ علینہ تھی..... میری پوتی۔ میری جان۔ "دادا ابو! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ کیوں ہمیں چھوڑ دیا تھا؟"

علینہ کے پیچھے میرا بیٹا اور میری بہو بھی کھڑے تھے۔ فراز اچانک آ کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ "ابو کیا ہوا تھا؟ آپ کہاں چلے گئے تھے؟" اسی دوران بہو بھی آ کر لپٹ گئی۔

"آپ کہاں تھے۔ ہم نے کہاں کہاں آپ کو تلاش کیا ہے۔"

"دادا ابو! میں بیمار پڑ گئی تھی۔" علینہ نے کہا۔ "آپ نے تو آ کر پوچھا بھی نہیں کہ میں کیسی ہوں۔"

اور اس وقت میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "معاف کرنا بیٹا! اپنے دادا ابو کو معاف کر دو۔ اب مجھ سے غلطی نہیں ہو گی۔"

"اپنے کان پکڑیں۔" علینہ نے کہا۔

یہ ہمارا پرانا کھیل تھا۔ ہم دادا پوتی جب ایک دوسرے سے ناراض ہوتے تو یہی کیا کرتے۔

میں نے کان پکڑ لیے۔ اس وقت میں رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، اپنا، اپنا ہی ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اسی طرح گھر والوں سے ناراض ہو کر چلے جاتے ہیں لیکن گھر چھوڑتے وقت ذرا دیکھ لیں کہ بچے کہیں بیمار تو نہیں ہو جائیں گے۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

وکٹر اور اس کی گرل فرینڈ پنکی، اٹلانٹا سٹی کی ایک بڑے بار میں کام کرتے تھے۔ پنکی عام امریکن لڑکیوں کے برعکس چھوٹے قد کی تھی لیکن انتہائی خوب صورت، صحت مند اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ بار میں وکٹر سمیت دو لڑکے... کاؤنٹر پر بارٹینڈر کے طور پر کام کرتے تھے، ان کے علاوہ چھ لڑکیاں سرونگ گرل کی حیثیت سے ملازم تھیں لیکن سب سے زیادہ ٹپ پنکی کو ملتی تھی، اس کی وجہ اس کی خوش مزاجی اور دلکش مسکراہٹ تھی۔

پنکی دی گریٹ

احمد جعفری

جھگڑا یا انتقام چاہے جس نوعیت کا ہو اگر صلاح اور اصلاح کی گنجائش رکھ لی جائے تو اس سے نہ صرف اپنا ضمیر مطمئن رہتا ہے بلکہ کسی کا مستقبل تباہ ہونے سے بھی بچ جاتا ہے۔ یہی وہ بات تھی جو اس حسینہ کے دل کو پریشان رکھتی تھی مگر پھر اس نے دوسرے رستے کو اختیار کرکے اپنی پریشانی کا حل ڈھونڈ نکالا۔

غنڈا گردی کرنے والے وحشیوں کا سبق آموز ماجرا

UUNOVELS.COM

وکٹر لمبے قد کا میکسیکن امریکی تھا۔ غصے کا تیز اور رکھ رکھاؤ والا لڑکا تھا۔ بار کے رش آورز شام پانچ بجے سے ساڑھے گیارہ بجے رات تک تھے۔ بارہ بجے بار بند کر دیا جاتا تھا۔ صفائی ستھرائی کے بعد اسٹاف کو ساڑھے بارہ بجے چھٹی دے دی جاتی تھی۔

وکٹر سے دوستی کے بعد پنکی وکٹر کے ون روم اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئی تھی جو بار سے دس پندرہ منٹ کی واک پر ایک اچھی بلڈنگ میں تھا۔ وکٹر بار سے چھٹی کے بعد چند گھنٹے کی نیند لینے کے بعد صبح سویرے ایک کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ جاتا تھا جہاں وہ تین سالہ ڈپلوما کورس کی کلاس اٹینڈ کرتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا بار پر ڈیوٹی دینے پہنچ جاتا تھا۔ وہ اکثر پنکی سے کہا کرتا تھا کہ اس ڈپلوما کورس کے بعد مجھے کہیں نہ کہیں اچھی جاب مل جائے گی، اس کے بعد ہم باقاعدہ شادی کریں گے اور بچے بھی پیدا کریں گے۔ پنکی ایک کیئر فری لڑکی تھی وہ اکثر کہتی تھی، وکٹر کیوں اتنی محنت کرتے ہو ہماری اچھی خاصی انکم ہے اور ساتھ رہنے کی بنا پر سیونگ بھی ہو رہی ہے..... اتنی محنت مت کرو، زندگی کو انجوائے کرو۔"

امریکی معاشرہ بھی جدید دنیا کا ایک عجوبہ ہے۔ یہاں نوّے فیصد نوجوانوں کا کہنا تھا کہ بس اتنی محنت کرو کہ گزر بسر اچھی طرح ہو جائے۔ امریکا بڑا ملک ہے، پورا براعظم ہے، گھومو پھرو، جوانی کو انجوائے کرو۔ دوسری طرف دس فیصد ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک لمحہ ضائع کرنا گناہ سمجھتے ہیں جس فیلڈ میں گھستے ہیں وہاں کارنامے انجام دینے میں مدہوش ہو جاتے ہیں۔ ان کو کھانے پینے، سونے، آرام کرنے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ہجرت کر کے امریکا میں آباد ہوئے تھے۔ انہی لوگوں کی محنت اور لگن سے آج امریکا سپر پاور ہے اور خلانوردی میں کامیاب پیش قدمی کر رہا ہے۔

عام امریکی نوجوانوں کی طرح، پنکی کی بھی خواہش تھی کہ ہر سال نہیں تو کم از کم دو تین سال کے بعد ایک مرتبہ ہم اٹلانٹا سٹی سے قریب ترین امریکا کے انتہائی جنوب میں واقع مشہور ٹورسٹ سٹی میامی کا ہفتہ دس دن کے لیے ایک چکر ضرور لگایا کریں۔

میامی امریکی نوجوانوں کے لیے جنت سے کم نہیں ہے۔ سردیوں میں نیویارک، شکاگو اور دوسرے شمالی شہروں سے لوگوں کے غول کے غول، میامی آتے ہیں، ہر سال یہ صورتِ حال ہوتی ہے کہ میامی شہر اور آس پاس کے تمام ہوٹلز، موٹیلز، کنٹینر پارکس، ٹینٹ پارکس سیزن میں پوری طرح بھر جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے کچھ گروپ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بڑے خیمے اپنے ساتھ لاتے ہیں اور میامی کے آس پاس چھوٹی پہاڑیوں پر خیمہ زن ہو جاتے ہیں۔ دن بھر میامی کے ساحلوں، بازاروں میں ہلا گلا کرنے کے بعد رات کو اپنے خیموں میں آ کر میوزک بجاتے ہیں ڈانس کرتے ہیں۔ ہر قسم کی منشیات استعمال کرتے ہیں۔ ہر گروپ کے ساتھ لڑکیاں بھی ہوتی ہیں، نشے میں دھت ہو کر نیم عریاں ڈانس کرتی ہیں، وہ رات گئے تھک کر کسی بھی مرد کی بغل میں لیٹ کر سو جاتی ہیں۔

اخراجات کنٹرول کرنے اور ساتھ رہنے کی بنا پر وکٹر اور پنکی کے پاس دو سال میں اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ پنکی کے زور دینے پر وکٹر نے ایک پرانی مگر اچھی حالت والی کار خرید لی۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا خیمہ بھی تھا جس میں صرف دو آدمیوں کے سونے کی گنجائش تھی۔

جب سردیاں جوبن پر آئیں تو دونوں نے بار سے دس دن کی چھٹیاں لیں اور برسوں سے دل میں بسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے دونوں اپنی کار میں میامی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جوں جوں میامی شہر قریب آ رہا تھا ان کی کار کچھ پہاڑی راستوں سے گزرنے لگی۔ ایک سڑک پر ان کے آگے دس بارہ بائیک سواروں کا ایک گروپ جا رہا تھا۔ تمام بائیک اونچے ہینڈل والی ہیوی ڈیوٹی بائیکس تھیں۔ ہر بائیک کی پچھلی سیٹ پر نیکر اور بنیان پہنے ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ بائیک سوار شرارت کے موڈ میں تھے۔ وہ ان کی کار کو آگے جانے کا راستہ نہیں دے رہے تھے۔ ہر بائیک سوار لحیم شحیم، لمبے بال اور الجھی ہوئی بے ترتیب ڈاڑھی والا تھا۔

جونہی وکٹر اپنی کار سائڈ سے آگے نکالنا چاہتا تھا بائیک سوار کراس کر کے آگے آ کر اس کا راستہ روک لیتے تھے۔ وکٹر غصیلی طبیعت کا تھا۔ کئی دفعہ اس نے کوشش کی کہ ان کی بائیک کو ٹکر مار کر آگے نکل جائے مگر ہر دفعہ پنکی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے شانت کر دیتی۔ "وکٹر غصہ مت کرو۔ انجوائے کرو ہم تفریح کے لیے..... یہاں آئے ہیں۔ غصہ مت کرو پلیز۔"

جب پہاڑی سڑک ختم ہونے لگی تو بائیک سواروں نے انہیں راستہ دے دیا۔ جب وکٹر کی کار ان کے برابر سے گزرنے لگی تو سب نے مل کر شور مچایا۔ "ہرے ہرے"۔

بائیک پر سوار لڑکیوں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کی طرف کس اچھالے۔ پنکی نے بھی ہنستے ہوئے کس کا اشارہ کیا۔ پنکی بہت خوش تھی۔ ایک موڑ پر ان کے راستے جدا ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد وکٹر نے کہا۔ ''مائی گاڈ، کیسے اجڈ لوگ تھے۔ لمبے لمبے بال، بے ترتیب ڈاڑھیاں، معلوم ہوتا ہے کہ مہینوں سے نہائے بھی نہیں ہوں گے۔ ہپیوں کا زمانہ گزرے پچاس سال ہو گئے مگر یہ ابھی تک ہپی بنے پھر رہے ہیں۔''

میامی پہنچ کر وکٹر نے اپنا چھوٹا سا خیمہ ایک پارک میں لگایا۔ پارک والے معمولی پیسے چارج کرتے تھے۔ پارک میں ہر سہولت موجود تھی۔ لائن سے درجنوں واش روم بنے ہوئے تھے جگہ جگہ پانی کے نلکے تھے۔ فاصلے فاصلے پر دوسرے خیمے بھی لگے ہوئے تھے، کار پارکنگ کی سہولت بھی موجود تھی۔

وکٹر اور پنکی بہت لمبا سفر کر کے آئے تھے۔ دونوں تھکے ہوئے تھے اس لیے ڈنر کرتے ہی دونوں خیمے میں گھس کر سو گئے۔ صبح سویرے دونوں ساحل پر پہنچ گئے۔ ساحل پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ کچھ لوگ سمندر میں نہا رہے تھے، لڑکیاں مختصر ترین لباسوں میں ساحل پر گدوں پر لیٹی دھوپ کا مزہ لے رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی سمندر کی لہروں میں دور تک چلے گئے، ایک گھنٹے کے بعد دونوں سمندر سے نکل کر ایک ریسٹورنٹ میں ناشتے کے لیے آ گئے۔ یہاں انہوں نے اپنا چھوٹا سا بیگ رکھوایا ہوا تھا۔ جہاں دونوں نے دوسرے کپڑے پہنے اور ناشتے کے لیے ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ ناشتا کرتے ہوئے وکٹر نے کہا۔ ''پنکی! یہاں اصل رونق رات کو ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے ہم آگے چلتے ہیں۔ رات کو واپس آ جائیں گے۔''

''آگے کہاں وکٹر؟''

''پنکی! یہاں سے تقریباً پچاس میل دور ایک جزیرہ ہے اس کا نام ''کی ویسٹ'' ہے۔ سنا ہے وہاں غروب آفتاب کا منظر بڑا شاندار ہوتا ہے۔ میامی سے جزیرہ... کی ویسٹ تک سمندر پر پل بنا ہوا ہے۔ ہم دو گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

''گڈ، تو چلو پھر۔ وہیں ہم لنچ بھی کریں گے اور رات کو واپس آ جائیں گے۔''

وکٹر نے اپنی کار پارکنگ سے نکالی اور کی ویسٹ کو ملانے والے پل پر انٹر ہو گیا۔ یہاں انہیں دس ڈالر ٹول ٹیکس دینا پڑا۔ پل پر درجنوں کاریں کی ویسٹ کی جانب جا رہی تھیں۔ کی ویسٹ کے ساحل پر سیاحوں کا ہجوم تھا۔ امریکا کے کونے کونے سے لوگ یہاں آئے ہوئے تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں چھوٹی چھوٹی دکانیں ساحل کے ساتھ سجی ہوئی تھیں جن پر میامی اور کی ویسٹ کے سوونیئر بک رہے تھے۔ پنکی نے بھی چند چیزیں خریدیں۔ وکٹر نے ایک ریسٹورنٹ سے لنچ کے لیے برگر اور کولڈ ڈرنک پیک کروائے اور دونوں ساحل کے ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے ایک چھوٹی سی چٹان پر آ کر بیٹھ گئے۔ دونوں نے یہاں لنچ کیا پھر ایک شیٹ بچھا کر لیٹ گئے۔ لنچ کا خمار تھا۔

دھوپ کی ہلکی ہلکی خوشگوار تپش تھی اس لیے دونوں جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

جب دونوں بیدار ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ سورج سمندر کی اونچی لہروں میں اپنا منہ چھپانے والا تھا۔ اس وقت سورج کا رنگ ہلکا گلابی ہو رہا تھا۔ سب سیاح ساحل پر جمع تھے اور ڈوبتے سورج کا نظارہ کر رہے تھے۔

جوں ہی سورج کا آخری حصہ سمندر میں غائب ہوا تمام ساحل تالیوں سے گونج اٹھا۔ کچھ منچلوں نے اپنی ٹوپیاں اچھالیں۔ ساحل تاریکی میں ڈوب گیا لیکن دو منٹ بعد ہی ساحل پر لگی ہزاروں دودھیا لائٹس جل اٹھیں۔ عجیب مسحور کن منظر تھا۔

وکٹر نے کہا۔ ''پنکی چلو اٹھو واپس چلتے ہیں ورنہ پل پر گاڑیوں کا رش بڑھ جائے گا۔''

واپسی میں انہیں تین گھنٹے سے زیادہ لگے کیونکہ پل پر واپس جانے والوں کا رش تھا۔ میامی کے ساحل پر روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا، جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں گاتی بجاتی گھوم رہی تھیں۔ پنکی بہت انجوائے کر رہی تھی۔

انہوں نے ڈنر کیا اور ساحل پر پڑے ایک بڑے پتھر پر آ کر بیٹھ گئے۔ وکٹر نے سگریٹ جلایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہی اجڈ نوجوانوں کا گروپ جس نے پہاڑی سڑک پر ان کا راستہ روکا تھا، ان کے قریب سے گزرنے لگا۔ ہر ایک کے پاس میوزیکل انسٹرومنٹ تھے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے وکٹر اور پنکی کو پہچان لیا۔ لڑکیوں نے ناچتے کودتے ان کے گرد چکر لگانے شروع کر دیے۔ ہر لڑکی کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ لڑکیاں بے بی ڈول، بے بی ڈول کہتی ہوئی پنکی کے گرد ناچتے ہوئے چکر لگانے لگیں۔ لڑکے مختلف ساز اور انسٹرومنٹ لیے اونچی آواز میں میوزک بجا

رہے تھے۔ ایک لڑکی جس کی سڈول ٹانگیں بہت لمبی تھیں، ناچتے ہوئے پنکی کے پاس آئی۔ ''او مائی بیوٹی فل لٹل ڈول! اس سگریٹ کے صرف دو کش لگا لو۔ تم انجوائے کرو گی۔ صرف دو کش۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ہونٹوں سے سگریٹ نکالا اور پنکی کے گلابی ہونٹوں میں دبا دیا۔ پنکی نے دو کش لگائے۔ سگریٹ تیز منشیات سے بھرا ہوا تھا.... پنکی کھانسنے لگی چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لیے۔ پنکی کو عجیب سا محسوس ہوا جیسے وہ ہوا میں اڑتی ہوئی بادلوں کے درمیان رقص کر رہی ہو۔

وکٹر پنکی کی کیفیت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک پنکی اٹھی اور ان لڑکیوں کے ساتھ ناچنے لگی۔ لڑکیوں نے بھی اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ دوسری لڑکیوں نے بھی پنکی کو سگریٹ کے کش لگوائے۔ وہ گروپ ناچتے بجاتے ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ پنکی بھی ان کے ساتھ ناچتی ہوئی جا رہی تھی۔

وکٹر کا خیال تھا کہ پنکی کچھ دور جا کر واپس آ جائے گی مگر پنکی اس گروپ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی پھر وہ گروپ ایک موڑ کے بعد وکٹر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وکٹر پتھر پر بیٹھا ایک گھنٹے تک پنکی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ ساحل پر چھوٹے پہیوں والی فور وہیل گاڑیاں گھوم رہی تھیں جن پر صرف دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ یہ گاڑیاں کرائے پر ملتی تھیں۔ وکٹر نے بھی ایک گاڑی کرائے پر حاصل کی اور ساحل کے ساتھ ساتھ چلاتا ہوا کئی میل تک آگے چلا گیا لیکن اسے نہ وہ گروپ نظر آیا نہ ہی پنکی دکھائی دی۔ وکٹر مایوس ہو کر واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

وہ گروپ پنکی کو لے کر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر آیا۔ وہاں بہت بڑا ٹینٹ لگا ہوا تھا۔ پنکی پوری طرح منشیات کے نشے میں تھی۔ یہاں پورے گروپ نے کچھ دیر آرام کیا پھر ڈرنک کا دور چلا ایک بوتل پنکی کو بھی تھما دی گئی۔ پنکی کو بالکل احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ گروپ کے لڑکوں نے شور مچایا۔ ''آج کی رات لٹل ڈول کے نام''۔ اس کے ساتھ ہی تیز میوزک بجنے لگا۔ ''ون وے ٹکٹ۔ ون وے ٹکٹ۔ کم کم لٹل ڈول، سب لڑکے اور لڑکیاں مدہوش ہو کر ناچ رہے تھے۔ رات گئے سب تھک کر لیٹ گئے۔ پنکی مدہوش تھی اسے احساس ہی نہیں تھا کہ پوری رات اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا اور کون اس کے ساتھ خرمستی کرتا رہا۔

صبح سورج کی تیز روشنی میں اس کی آنکھ کھلی پہلے تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ نہ وہاں وہ خیمہ تھا، نہ ہی وہ گروپ موجود تھا۔ سب اس کو اکیلا چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اس نے جلدی جلدی پاس رکھے ہوئے اپنے کپڑے پہنے اور لڑکھڑاتی ہوئی ساحل کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ رات بھر اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے اور بہت برا ہوا ہے۔ ساحل پر آ کر اس نے بلیک کافی کے دو مگ پیے۔ اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے تو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس پارک کی طرف روانہ ہوئی جہاں اس کا خیمہ تھا اور اس کا وکٹر تھا۔

خیمے کے باہر وکٹر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ رت جگے کی بنا پر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے پنکی کو آتے دیکھا تو اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ پنکی بھی اس سے لپٹ گئی۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

''وکٹر! مجھے معاف کر دو انہوں نے مجھے منشیات پلائی۔ رات کو میرے ساتھ بہت برا ہوا اور بار بار ہوا وکٹر! مجھے معاف کر دو اور فوراً یہاں سے چلو۔''

وکٹر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ''پنکی میں انہیں چھوڑوں گا نہیں۔ وہ میری اصلیت سے واقف نہیں ہیں۔ .... پہلے تم شاور لو، چینج کرو پھر ہم بریک فاسٹ کے بعد اٹلانٹا سٹی واپس روانہ ہو جائیں گے۔''

وکٹر نے کار پارکنگ سے نکالی، اپنا تمام سامان رکھا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کوئی دو گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد انہیں ایک روڈ سائڈ کیفے کے سامنے آٹھ دس ہیوی بائیک کھڑی نظر آئیں۔ وکٹر نے کار ایک سائڈ پر روک دی۔ ''پنکی میرا خیال ہے کہ یہ بائیکس اسی گروپ کی ہیں، وہ لوگ کیفے میں ناشتا کر رہے ہیں، میں اندر جا کر چیک کرتا ہوں۔''

پنکی اس سے لپٹ گئی۔ ''نہیں، وکٹر ابھی نہیں۔ وہ وحشی آٹھ دس کی تعداد میں ہیں۔ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے وکٹر تمہیں میری قسم ہے تم ابھی یہاں سے چلو۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی پلیز چلو یہاں سے۔''

پنکی کے زور دینے پر اس نے کار اسٹارٹ کی اور آگے روانہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے بیک مرر میں دیکھا آٹھ دس بائیک سواروں کا گروپ ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ ''پنکی ہوشیار، وہ گروپ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔'' پنکی نے مڑ کر دیکھا۔ ''ہاں وکٹر یہ وہی وحشی گروپ ہے۔ وکٹر اسپیڈ بڑھاؤ۔''

چند منٹ کے بعد وہ گروپ ان کی کار کے بالکل پیچھے آ گیا۔ ایک بائیک سوار کار کی سائڈ پر آ گیا۔ اس نے پنکی کو پہچان لیا تھا، اس نے کہا۔ ''ہیلو لٹل ڈول رات کیسی گزری۔ مزہ آیا۔'' یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی دوسرا بائیک سوار اس کی جگہ آ گیا۔ اس نے اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی ایک آہنی زنجیر کھولی۔ زنجیر کے سرے پر چھوٹا سا گولا سا فنک تھا۔ اس نے زنجیر ایک دائرے میں گھمائی اور پوری طاقت سے وکٹر کی کار کی ونڈ اسکرین پر دے ماری۔ اسکرین پر جال سا بن گیا۔ وہ سوار آگے بڑھ گیا فوراً اس کی جگہ دوسرا سوار آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ویسی ہی زنجیر تھی۔ اس نے پہلے زنجیر کو ایک دائرے میں گھمایا اور پوری طاقت سے کار کی ونڈ اسکرین پر دے ماری۔ اسکرین کا گلاس لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے وکٹر اور پنکی کے چہروں سے ٹکرائے۔ پنکی کا چہرہ لہولہان ہو گیا وہ مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ کچھ ذرات وکٹر کی آنکھ میں گھس گئے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کار روکنے کی کوشش کی مگر کار بے قابو ہو کر سڑک سے اتر گئی اور ڈھلوان پر تیزی سے دوڑتی جا رہی تھی پھر کار ڈھلوان پر ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ وکٹر اور پنکی دونوں ہوش سے بیگانہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

وکٹر کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اسپتال کے بیڈ پر لیٹا پایا۔ ایک نرس اس کے قریب کھڑی اس کی پلکیں اٹھائے انجکشن کے ذریعے کوئی دوا بہت پریشر سے اس کی آنکھوں میں ڈال رہی تھی۔ وکٹر نے اٹھنے کی کوشش کی۔ نرس نے کہا۔ ''مسٹر لیٹے رہو۔ تمہاری آنکھیں واش کرنی ہیں۔ آنکھوں کو مسلنا نہیں۔ اندر شیشے کے ذرات ہیں انہیں واش آؤٹ کرنا ہے۔''

چند منٹ کے بعد نرس نے کہا۔ ''آنکھیں واش کر دی گئیں مگر ابھی آنکھیں مت کھولنا کم از کم آدھے گھنٹے تک۔''

آدھے گھنٹے کے بعد وکٹر نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اس کو ہر چیز دھندلی اور سرخی مائل نظر آ رہی تھی۔ اسی نرس نے وکٹر کی دونوں آنکھوں میں ڈراپر سے چند قطرے دوا کے ڈالے اور کمرے سے نکل گئی۔

وکٹر کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا، اس نے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھا وہاں گومز تھا اور میڈیکل ٹیپ لگی ہوئی تھی۔

کچھ دیر کے بعد وہی نرس ایک ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہیلو ینگ مین کیا فیل کر رہے ہو؟''

''ڈاکٹر اب مجھے صاف نظر آ رہا ہے مگر سر میں شدید درد ہے۔''

''وہ ایسی سیریس بات نہیں، ہم اس کی دوائیں دے رہے ہیں۔ شام تک سر درد بالکل ختم ہو جائے گا۔ تمہارے جسم میں کہیں بھی فریکچر نہیں ہوا ہے تمہیں کل ڈسچارج کر دیا جائے گا۔''

ڈاکٹر واپس جانے کے لیے مڑا تو وکٹر نے کہا۔ ''ڈاکٹر میرے ساتھ میری گرل فرینڈ تھی پنکی۔''

''وہ آپریشن روم میں ہے۔ اس کے چہرے پر کافی گہرے زخم آئے ہیں۔ ہونٹ کی داہنی باچھ دو انچ کے قریب کٹ گئی ہے۔ دوسرے گال پر تین انچ لمبا کٹ ہے اور بھی چھوٹے موٹے زخم ہیں امید ہے کہ دو گھنٹے کے بعد اسے کمرے میں شفٹ کر دیا جائے گا۔''

دوسرے دن وکٹر کو ڈسچارج کر دیا گیا۔ وکٹر فوراً پنکی کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک نرس موجود تھی۔ اس نے کہا۔ ''یہ ابھی دواؤں کے زیر اثر سو رہی ہے۔ تین دن تک اس کو بولنا بالکل منع ہے۔ ایک ہفتے تک غذا صرف ڈرپ سے دی جائے گی۔ آپ اس کے ساتھ کمرے میں رک سکتے ہیں۔''

نرس کے جانے کے بعد وکٹر نے پنکی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ چہرے پر بہت زیادہ سوجن تھی ہونٹ بھی سوج رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد وہی نرس داخل ہوئی۔ ''مسٹر وکٹر میرے ساتھ آیئے۔ دو پولیس آفیسرز آپ کا بیان لینے کے لیے آئے ہیں۔''

ایک کمرے میں دو پولیس آفیسرز اس کا بیان ریکارڈ کر رہے تھے۔ وکٹر نے انہیں بڑی تفصیل سے بتایا کہ کس طرح بائیک سواروں نے لوہے کی زنجیریں مار مار کر کار کی ونڈ اسکرین چکنا چور کر دی اور کس طرح حادثہ پیش آیا۔ اس نے بائیک سواروں کا حلیہ بھی بڑی تفصیل سے بتایا۔

ایک پولیس آفیسر نے کہا۔ ''بائیک سواروں کے پیچھے ایک جوڑا اپنی کار میں آ رہا تھا۔ انہوں نے پورا سین دیکھا تھا اور نائن ون ون کو حادثے کی اطلاع دی، اس لیے جلد ہی امدادی ٹیمیں موقع پر پہنچ گئیں اور آپ دونوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ آپ کی کار بھی وہاں سے نکال کر ورک شاپ پہنچا دی گئی ہے۔ کار میں... انشورنس کے کاغذات مل گئے تھے۔ اس لیے انشورنس کمپنی

UUNOVELS.COM

کو بھی انفارم کر دیا گیا ہے۔ میامی کے اسٹری اور ایگزٹ پوائنٹ پر لگے کیمروں کی مدد سے ہم آج ہی ان بائیک سواروں کی فوٹوز حاصل کر لیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم جلد ہی ان کو گھیر لیں گے۔ یہ حادثہ نہیں بلکہ اقدام قتل ہے۔ ہم چلتے ہیں شام کو اس ایریا کی شیرف مس جولی آپ سے ملنے آئیں گی۔''

ان کے جانے کے بعد وکٹر، پنکی کے کمرے میں آ گیا۔ پنکی جاگ رہی تھی وکٹر نے کہا۔ ''پنکی بولنے کی بالکل کوشش مت کرنا۔ ڈاکٹرز نے سختی سے منع کیا ہے۔ ایک ہفتے میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اور تمہیں ڈسچارج کر دیا جائے گا۔''

رات کو آٹھ بجے شیرف جولی بائیک سواروں کی کئی تصویروں کے ساتھ اسپتال پہنچ گئی۔ وکٹر نے تصویریں دیکھ کر دو تصویروں کو الگ کیا۔ ''شیرف یہ دونوں وہ ہیں جنہوں نے میری کار پر زنجیریں ماری تھیں۔ میں سو فیصد یقین سے یہ بات کر رہا ہوں۔''

پنکی کو بھی تصویریں دکھائی گئیں۔ اس نے بھی سر ہلا کر تصدیق کر دی۔

وکٹر کی گزارش پر شیرف جولی نے تمام بائیک سواروں کی تصویروں کی ایک ایک کاپی وکٹر کے حوالے کر دی۔ رخصت ہونے سے پہلے شیرف جولی نے بتایا کہ یہ تمام بائیکس.... ایک کار ہائرنگ ایجنسی سے کرائے پر حاصل کی گئی تھیں۔ وہاں انہوں نے اپنے نام اور پتے لکھوائے تھے جو جعلی ثابت ہوئے ہیں۔ بہرحال ہم ان کے پیچھے ہیں آپ لوگ اطمینان رکھیں۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد پنکی کو بہت سی دواؤں اور ہدایات کے ساتھ اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ ان کی کار مرمت کے بعد ورک شاپ سے آ گئی تھی چنانچہ دونوں فوراً اٹلانٹا سٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن وکٹر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے بار پہنچ گیا۔ وہاں تمام سرونگ گرلز اور دیگر عملے کو حادثے کی اطلاع مل چکی تھی۔ سب نے وکٹر اور پنکی کی خیریت دریافت کی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ سب کو یہ سن کر افسوس ہوا کہ پنکی چہرے کے زخموں کی وجہ سے کم از کم چار ماہ تک بار ڈیوٹی کرنے نہیں آئے گی۔ بار کا مالک بہت ہمدرد آدمی تھا۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے وکٹر کو بس ڈرائیور کی پارٹ ٹائم جاب دلوا دی۔ دن میں پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی، معاوضہ پچاس ڈالر فی گھنٹا۔

ایک دن صبح دونوں کچن ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ پنکی خاموش خاموش سی تھی۔ کچھ دیر کے بعد، پنکی نے کہا۔ ''وکٹر میرا چہرہ تو بگڑ گیا۔ میں آئینے میں اپنی شکل دیکھتی ہوں تو میرے آنسو نکل آتے ہیں۔ مرد کی نگاہ سب سے پہلے عورت کے چہرے پر ہی پڑتی ہے۔ وکٹر! مجھے بالکل سچ بتاؤ کیا تم پہلے کی طرح مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

وکٹر کو غصہ آ گیا۔ ''پنکی یہ کیسا سوال ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ میرے نزدیک تم پہلے سے زیادہ حسین ہو۔ میں تم سے جلد ہی شادی کرنے والا ہوں۔ میں تمہارے چہرے کی پلاسٹک سرجری کراؤں گا۔''

''وکٹر! پلاسٹک سرجری تو بہت مہنگی ہوتی ہے۔ اتنا سرمایہ ہمارے پاس کہاں ہے۔''

''پنکی اس کی فکر مت کرو۔ ایک مرتبہ پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم یا کوئی اور میری اصلیت سے واقف نہیں ہے۔ میں تمہیں قول دیتا ہوں کہ تمہارے چہرے کی پلاسٹک سرجری بھی ہو گی اور ان وحشی بائیک سواروں کو سخت ترین سزا بھی دی جائے گی۔ میں ایک ہفتے کے بعد میکسیکو جا رہا ہوں چند دن کے لیے اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پنکی حیرت سے وکٹر کو تکنے لگی۔ اس وقت وکٹر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ تمہاری اصلیت کیا ہے مگر خاموش رہی۔ وکٹر نے شاید اس کے تاثرات پڑھ لیے تھے۔ ''نہیں پنکی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا اس میں خطرہ ہے میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ میں تمہیں کسی حالت میں خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ بس اس ٹاپک پر مزید بات نہیں ہو گی۔''

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد وکٹر میکسیکو کے ایک ہوٹل میں چیک ان ہوا۔ اس نے ہوٹل کی شاپ سے ایک پری پیڈ ڈسپوزیبل سیل فون خریدا اور اپنے کمرے میں آ کر فون پر ایک مخصوص نمبر پنچ کیا۔ فوراً ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

وکٹر نے کہا۔ ''پاپا میں۔''

''بس ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم یقیناً کسی مسئلے سے دوچار ہو۔ تم ایسا کرو کہ شام کو اپنی بڑی بہن کے گھر چلے جاؤ۔ وہیں تم سے ملاقات ہو گی۔'' لائن کٹ گئی۔ وکٹر نے فون..... کموڈ میں بہا دیا۔

وکٹر نے سگریٹ جلایا اور اپنے فادر کے بارے میں

UUNOVELS.COM
Protected with trial version of Visual Watermark. Full version does not put this mark.

سوچنے لگا۔ اس کا باپ سسلی بیسڈ (اٹلی) مافیا فیملی کا سینئر ممبر تھا اور یہاں پورے میکسیکو میں اس کی حیثیت چیف ڈان کی تھی۔ ہر بڑے غیر قانونی کام میں اس کا ہاتھ ہوتا تھا۔ نمبر ون پر ٹنوں کے حساب سے منشیات کی درآمد اور خلیج میکسیکو کے ذریعے امریکا کو برآمد، اس کے علاوہ ہلکے اور بھاری اسلحے کی ڈیل، جوئے اور قحبہ خانے چلانا، اغوا برائے تاوان۔ وکٹر شروع ہی سے باپ کے ان کاموں کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ باپ سے علیحدہ ہو کر اپنی شادی شدہ بڑی بہن کے گھر رہنے لگا۔

وکٹر ہائی اسکول کلیئر کرتے ہی خاموشی سے امریکا کھسک گیا تھا۔ امریکا آ کر اسے اطلاع ملی کہ اس کے بڑے بھائی کو مخالف پارٹی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کے فادر پر بھی کئی دفعہ قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔

شام کو وہ اپنی بہن کے گھر پہنچا۔ وہ ایک فارم ہاؤس ٹائپ کا وسیع گھر تھا۔ گھر کی چھت پر ایک ٹاور سا بنا ہوا تھا۔ وکٹر کا خیال تھا کہ ٹاور کے کمرے میں یقیناً حفاظت کے لیے گن مین مورچہ زن ہوں گے۔

بیل بجاتے ہی دو بڑے کتے بھونکتے ہوئے گیٹ کی طرف آئے۔ انہوں نے گیٹ کی سلاخوں سے اپنی تھوتھنی نکال کر اسے سونگھنا شروع کر دیا۔ کتوں نے شاید اس کی بو پہچان لی تھی دونوں کتے خوشی سے دُم ہلانے لگے۔

اتنی دیر میں اس کی بہن آتی نظر آئی۔ اس نے کتوں کو کہا۔ ''ٹامی، شیلی سٹ ڈاؤن۔'' دونوں کتے بیٹھ گئے۔ بہن نے گیٹ کھول کر وکٹر کو اندر بلایا اور گلے سے لگا لیا۔ ''وکٹر پاپا نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تم آ رہے ہو۔ پاپا اندر بیٹھے ہیں آ جاؤ۔''

وکٹر کا باپ ڈرائنگ روم میں بیٹھا سگار کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر وکٹر کو گلے لگایا۔ ''وکٹر تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے بڑے بیٹے کو کھو دیا۔ اب میں تمہیں نہیں کھونا چاہتا۔ یہاں حالات ہمیشہ خطرناک ہی رہیں گے۔''

''پاپا آپ ان سے علیحدہ کیوں نہیں ہو جاتے آپ ریٹائر ہو جائیں۔''

''بیٹے مافیا سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا سوائے موت کے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم آج ہی واپس چلے جاؤ۔ پہلے تم اپنا مسئلہ بتاؤ۔''

اتنی دیر میں وکٹر کی بڑی بہن میگی ریفریشمنٹ کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ جب وہ جانے لگی تو وکٹر کے باپ نے کہا۔ ''اب دروازہ لاک کرتی جانا اب یہاں کوئی نہ آئے۔''

اس کے جانے کے بعد اس کے باپ نے کہا۔ ''ہاں اب بتاؤ کہ ایسا کیا مسئلہ ہے کہ تم یہاں آنے پر مجبور ہوئے۔''

وکٹر نے میامی میں پیش آنے والے حادثات بڑی تفصیل سے اسے بتا دیے۔ ساتھ ہی ان وحشی بائیک سواروں کی تصویریں بھی اسے تھما دیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی گرل فرینڈ پنکی کی دو تین حالیہ تصویریں سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''پاپا پنکی کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانی ہے۔''

اس کے باپ نے پنکی کی تصویر دیکھ کر کہا۔ ''اوہ یہ تو بچی کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ لڑکی کا سب سے بڑا سرمایہ تو اس کا چہرہ ہی ہوتا ہے۔''

اس نے سگار سلگایا۔ ''تمہارے مسئلے دو ہیں نمبر ایک تمہاری گرل فرینڈ کی پلاسٹک سرجری نمبر دو ان بدمعاشوں کو سزا دینا۔ دونوں کام ہو جائیں گے۔ تم بے فکر رہو۔ یہ تصویریں میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ وہاں اٹلانٹا میں ایک بہت مشہور پلاسٹک ..... سرجن ہے۔ سرجن جوزف ..... تمہیں اس کے کلینک کا پتا آسانی سے مل جائے گا۔ پنکی کو اس کے پاس لے جانا وہ کوئی سوال کیے بغیر سب کام کر دے گا۔ اس کو میں پے منٹ کر دوں گا۔ دوسرا کام ان بدمعاشوں کو سزا دینا۔ یہ کام بھی ہو جائے گا۔ میرے آدمی جلد ہی ان کو تلاش کر لیں گے مگر اس میں دیر لگے گی اور وکٹر تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ جب تک میں زندہ ہوں تم یہاں نہیں آؤ گے۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ میری موت کے بعد یہ دشمنیاں ختم ہو جائیں گی۔ میری ہدایت ہے کہ تم آج ہی امریکا روانہ ہو جاؤ۔ کوئی مسئلہ ہو تو اپنی بہن میگی کو بتا دینا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔'' اس نے وکٹر کو گلے لگایا اور چلا گیا۔

باپ کو رخصت کر کے میگی اندر آئی۔ ''وکٹر میرے بھائی میری خواہش تھی کہ تم کچھ دن یہاں رکتے لیکن پاپا کا حکم ہے آج ہی کسی بھی فلائٹ سے امریکا چلے جاؤ۔ تین گھنٹے کے بعد ایک فلائٹ شکاگو کے لیے جا رہی ہے۔ میں ائرپورٹ ڈراپ کر دوں گی اور یہ چھوٹا سا بیگ رکھو اس میں ایک لاکھ امریکی ڈالرز ہیں یہ میری طرف سے ہیں پاپا کی طرف سے نہیں۔''

☆☆☆

صبح سویرے وکٹر شکاگو سے ہوتا ہوا اٹلانٹا سٹی پہنچ گیا۔ اگلے منڈے کو شام چار بجے وکٹر اور پنکی سرجن

UUNOVELS.COM

جوزف کے کلینک کے آفس میں موجود تھے۔ کچھ دیر کے بعد نرس نے کہا۔ ''آیئے مسٹر وکٹر اینڈ مس پنکی۔ سرجن کمرے میں انتظار کر رہے ہیں۔''

سرجن چالیس بیالیس سال کا قریب مائل آدمی تھا۔ اس کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی موجود تھی۔ سرجن نے اٹھ کر وکٹر سے ہاتھ ملایا۔ ''مسٹر وکٹر! مجھے ہدایات سپر سے مل چکی ہیں۔ سب کام ہو جائے گا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' پھر اس نے لیڈی ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ''ڈاکٹر شیلا آپ پنکی کو دوسرے کمرے میں لے جائیں اور انہیں معائنے کے لیے تیار کریں۔''

پنکی ڈاکٹر شیلا کے ساتھ معائنہ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد شیلا نے دروازہ کھول کر سرجن جوزف کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وکٹر باہر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ سرجن نے سپر کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ یہ تو اس کے فادر کا کوڈ نیم ہے تو کیا یہ سرجن بھی مافیا کے سرد دل پر ہے۔

پنکی معائنہ روم میں ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اس کے اوپر ایک سفید چادر تھی اس کے کپڑے ایک کرسی پر رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت صرف انڈر ویئر میں تھی۔

ڈاکٹر نے آتے ہی پنکی کے اوپر سے چادر ہٹا دی۔ ''اوہ بے بی تمہاری باڈی بہت خوب صورت ہے۔'' پنکی شرما رہی تھی۔ سرجن نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے کا معائنہ کیا۔ زخموں کو دبا کر دیکھا، سرجن پنکی کے جسم اور چہرے پر لگے زخموں کے بارے میں اپنی اسسٹنٹ ڈاکٹر کو بتاتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر شیلا ایک نوٹ بک پر لکھتی جا رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد سرجن نے پنکی کو کپڑے پہننے کے لیے ہدایت کی اور تینوں باہر آ کر اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے سرجن نے کہا۔ ''مسٹر وکٹر! پنکی کی ایک ران پر زخم کا نشان ہے، دوسرا نشان بھی گہرا ہے۔ چہرے کے زخم تو نظر آ ہی رہے ہیں۔ آج میں نے صرف معائنہ کیا ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ نشانات اس طرح غائب کر دیے جائیں گے کہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ مگر پلاسٹک سرجری کا پروسیس بہت سلو ہوتا ہے اس میں تین مہینے لگیں گے۔ پنکی کو ہر پندرہ دن کے بعد یہاں آنا ہوگا۔ میں شیڈول بنا کر دے دیتا ہوں۔ آخری بات یہ ہے کہ آپ بالکل ریلیکس ہو کر جائیں ہر مسئلہ ختم ہو جائے گا، گڈ بائی۔''

پنکی کا علاج تین ماہ تک باقاعدگی سے ہوتا رہا۔ آخری سیشن کے بعد ڈاکٹر شیلا نے ایک بڑا آئینہ پنکی کے سامنے رکھا۔ پنکی بے اختیار چیخ پڑی۔ ''ڈاکٹر آپ نے تو کمال کر دیا۔ میرا چہرہ تو پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔''

☆☆☆

پنکی پلاسٹک سرجری کے بعد جب پہلی بار اپنی ڈیونی پر بار میں داخل ہوئی تو وہاں ایک جشن کا سماں تھا۔ بار کو جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ ہر جھنڈی پر پنکی کی تصویر تھی۔ بار کا مالک بھی خوش تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ آج ہر کسٹمر کو ایک ایک جام، بار کی طرف سے مفت پیش کیا جائے گا۔

اس طرح تین مہینے اور گزر گئے ایک رات ڈنر کے بعد، وکٹر اور پنکی سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ وکٹر کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ وکٹر نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ ''وکٹر یہ میں ہوں۔'' وکٹر اپنے باپ کی آواز پہچان گیا۔

''سنو وکٹر، میرے آدمیوں نے ان دو وحشی بائیک سواروں کو پکڑ لیا ہے جنہوں نے تمہاری کار پر آہنی زنجیریں برسائی تھیں۔ ان کی تصویریں دیکھو اور کنفرم کرو کہ یہی وہ بدمعاش ہیں یا نہیں۔ پنکی کو بھی دکھاؤ۔''

اس کے فوراً بعد دو تصویریں فون پر نمودار ہوئیں۔ وکٹر نے فون کا اسپیکر آن کر دیا تصویریں دیکھتے ہی دونوں چلا اٹھے۔ ''یہی ہیں۔ یہی ہیں جنہوں نے زنجیریں ماری تھیں۔ ہمیں سو فیصد یقین ہے۔''

فوراً فادر کی آواز آئی۔ ''اگر تم دونوں کو یقین ہے تو یہ بھی بتا دو کہ ان کو کیا سزا دی جائے۔ میرے آدمی کہتے ہیں کہ ان کو جنگل میں لے جا کر سر میں گولی مار کر پھینک دیتے ہیں۔ تم کیا کہتے ہو۔ میرا سوال خاص طور پر پنکی سے ہے۔''

پنکی نے کہا۔ ''سر کسی کی جان لینا اچھی بات نہیں ہے۔ میری طرف سے یہ سزا ہے کہ آپ دونوں کے سر گنجے کروا دیں اس کے بعد دونوں کے سروں پر تیز چاقو سے کم گہرے کٹ لگائیں..... اور ان کی ڈاڑھیاں صاف کر کے ہلکے تیزاب سے نقش بنوا دیں۔ اس کے بعد ان کے سیدھے ہاتھ کے پنجوں کی ہڈیاں توڑ دیں تاکہ آئندہ یہ لوگ ایسی حرکت کے قابل ہی نہ رہیں۔ بعد میں ان کو جنگل میں جا کر چھوڑ دیں میری نظر میں یہ مناسب سزا ہے۔''

''گریٹ پنکی یو آر ریئلی گریٹ۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ میری خواہش ہے اب تم دونوں باقاعدہ شادی کر لو اور فیملی بناؤ۔ تمام میٹریل سیل فون سے ڈیلیٹ کر دینا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، گڈ بائی۔''

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

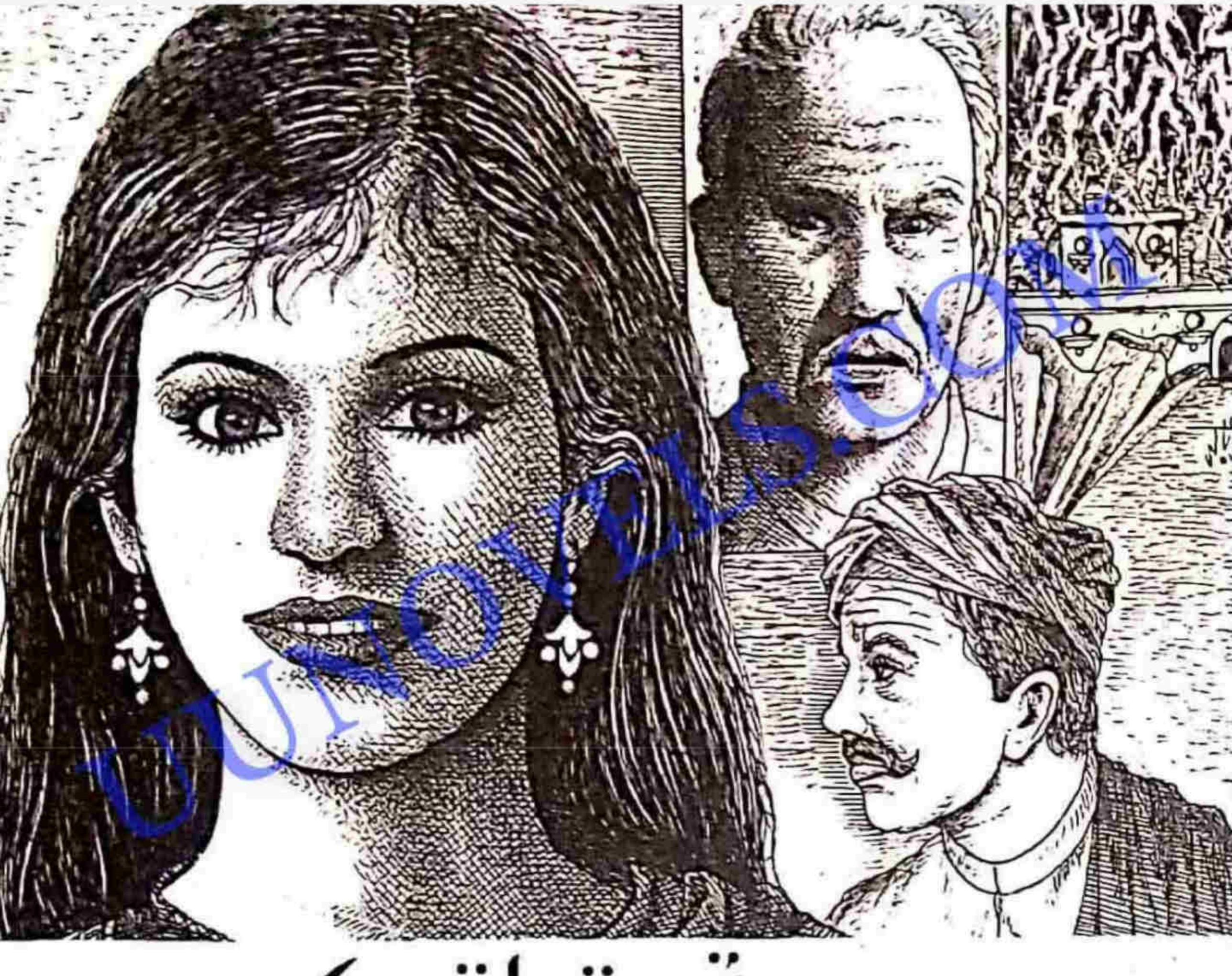

برقی تعلق

طاہر جاوید مغل

دنیا میں اکثر حیران کن واقعات جنم لیتے رہتے ہیں اور بے ضرر چیزوں سے نقصان اور خوفناک چیزوں سے انسان کو فائدہ ملتا رہا ہے۔ بالکل ایسے جیسے اس کمزور شخص نے اپنے دل کا تعلق آسمانی بجلی سے جوڑ کر خود کو طاقت ور کرلیا تھا مگر کیسے... یہی وہ سوال ہے جس نے ہر ایک کو چونکایا ہوا ہے۔

رستے ہوئے زخموں کا درد کم کرنے والے چند مرہم لمحوں کا قصہ

مناہل یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اپنے والدین کے ساتھ کینال گارڈن ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتی تھی۔ یہ ایک کینال کی کوٹھی تھی جس کا اپر پورشن ان کے پاس تھا۔ مالکِ مکان نچلے پورشن میں رہتے تھے۔ ان کو یہ لوگ بے تکلفی سے ''دادا انکل'' کہہ کر پکارتے تھے۔ دادا انکل کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ ان کی بیوی چار پانچ سال پہلے فوت ہوچکی تھیں۔ ایک بیٹا اور بیٹی کینیڈا میں سیٹل تھے۔ ضعیف العمر ہونے کے باوجود دادا انکل صحت مند اور خوش باش نظر

آتے تھے۔ مناہل اکثر ان کے پاس جا بیٹھتی اور ان کی دلچسپ باتیں سنتی۔ اس دوران میں اکثر دادا انکل کا واحد ملازم مغفور خوشی خوشی ان کے لیے چائے اور لوازمات کا بندوبست کر دیتا۔

آج صبح سے ہی مطلع ابر آلود تھا۔ مناہل ڈیڑھ بجے تک یونیورسٹی کی روٹ بس سے واپس آ چکی تھی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی امی کے ہاتھ کے خستہ خستہ آلو بھرے پراٹھے کے لقمے لے رہی تھی جب تیز بارش کے سبب اچانک لائٹ چلی گئی۔ مناہل کمرے سے نکل آئی۔ باہر تہ در تہ سرمئی گھٹاؤں کا منظر اسے سرشار کر گیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر بالکونی میں آ گئی۔ وہ مستی میں آ کر گرل کو تھامے دائیں بائیں جھول رہی تھی جب اسے نیچے برآمدے کی طرف سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ اس نے فوراً گرل کے اوپر جھک کر نیچے جھانکا تو اسے دادا انکل نظر آئے۔ وہ شرٹ اور ٹراؤزر پہنے بید کی آرام دہ کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کی گود میں ان کا پرانا ٹرانزسٹر ریڈیو تھا اور وہ اس سے برسرِ پیکار تھے۔ وہ ریڈیو کو گاہے بگاہے تھپڑ رسید کر کے اسے "زندہ" کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مناہل کے لبِ شریر مسکراہٹ کے انداز میں کھنچ گئے۔

"میں آ رہی ہوں دادا انکل۔" اس نے ترنگ میں آ کر کہا اور سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

اسے دیکھ کر دادا انکل کا چہرہ بھی خوشی سے تمتما اٹھا۔

"آخاہ، میری بیٹی آئی ہے۔" انہوں نے محبت بھری نظروں سے مناہل کو دیکھا اور اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔

دادا انکل کے تھپڑ رسید کرنے پر ریڈیو ایک لمحے کے لیے "کھڑ کھڑ" کرتا اور دوبارہ خاموش ہو جاتا۔

"دادا انکل! یہ آپ کیا کر رہے ہیں اس مسکین ریڈیو کے ساتھ۔ اتنے خوبصورت موسم میں آپ نے اس کے ساتھ جنگ چھیڑی ہوئی ہے۔"

دادا انکل مسکرائے تو ان کے چہرے پر پھیلا ہوا لکیروں کا جال، ان کی خوبصورت مسکراہٹ کے پیچھے کہیں اوجھل ہو گیا۔ بولے۔ "بیٹا! یہ جو پرانی، عمر رسیدہ چیزیں ہوتی ہیں نا۔۔ ان کو زندگی کی طرف لانے کے لیے ان سے جنگ بھی کرنا پڑے تو کرنی چاہیے۔ وہ کیا کہتے ہیں انگلش میں اولڈ از گولڈ۔"

اسی لمحے آسمان پر ایک جھماکے سے روشنی ہوئی اور پھر بجلی کی کڑک نے دل دہلا دیا۔ بارش کی تیز بوچھاڑیں باہر لان کے فرش اور پیڑوں کو بھگونے لگیں۔

"دادا انکل! میں نے سنا ہے کہ ایسے موسم میں باہر نہیں رہنا چاہیے۔ خطرناک ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر کسی شخص نے سیاہ رنگ کا لباس پہنا ہو تو بجلی اس کی طرف لپکتی ہے۔" مناہل نے آنکھوں میں مصنوعی خوف کا تاثر لاتے ہوئے دادا انکل کی سیاہ رنگ کی گرم شال کی طرف دیکھا۔

دادا انکل ہنسنے لگے، انہوں نے ریڈیو کو اب ایک طرف رکھ دیا تھا، بولے۔ "بیٹا! یہ جو گرجتی چمکتی آسمانی بجلیاں ہیں نا..... انہوں نے تمہارے دادا انکل کا کبھی کوئی نقصان نہیں کیا..... بلکہ اکثر فائدہ ہی کیا ہے۔" دادا انکل کی بوڑھی آنکھوں میں جیسے ماضی کے مناظر کروٹیں لینے لگے تھے۔

"آسمانی بجلی سے فائدہ؟" مناہل اپنی کرسی پر کچھ آگے کو جھک کر بولی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات تھے۔ "میں سمجھی نہیں دادا انکل! یہ..... کڑکڑاتی، ڈراتی، آسمانی بجلی کسی کا فائدہ کیسے کر سکتی ہے؟"

دادا انکل مسکرانے لگے۔ وہ اندر ہی اندر جیسے اپنے کسی خیال سے محظوظ ہو رہے تھے۔ "غفور بھئی! ہماری بیٹی آئی ہے۔ ہمارے لیے کچھ کھانے پینے کے لیے لے آؤ۔" انہوں نے ٹانگ پر ٹانگ جمائی اور کرسی پر کچھ نیم دراز سے ہو گئے۔ ان کی نگاہیں دور کہیں ماضی کے جھروکے میں جھانک رہی تھیں..... شاید کچھ یادگار لمحوں کو دیکھ رہی تھیں۔

مناہل ان کی بات سننے کے لیے بے چین تھی۔

وہ گویا ہوئے۔ "اس آسمانی بجلی سے جڑی، پہلی اچھی یاد جو میرے ذہن میں ہے وہ تب کی ہے جب میری عمر کوئی چھ سات سال رہی ہو گی۔ میں کوہاٹ کے دیہی علاقے میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں اپنا بچپن جی رہا تھا۔ یہ نیم سرسبز پہاڑوں کے دامن میں چالیس پچاس گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہ علاقے مدتوں سے غربت اور تنگدستی کے نرغے میں ہیں۔ میرے والد کے پاس تھوڑی سی زمین تھی جس پر کاشت کر کے وہ بہ مشکل بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ ہمارے علاقے میں بارشیں زیادہ تو نہیں ہوتی تھیں مگر جب ہوتی تھیں، تابڑ توڑ ہوتی تھیں۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ سیاہ بادل دھاڑ رہے تھے اور آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ ہمارے کچے پکے گھر اس طوفان میں لرز رہے تھے۔ یکا یک رونے چلانے کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ کہیں پاس سے ہی شعلے بھی بلند

UUNOVELS.COM

ہونے لگے تھے۔ اس وقت تو مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ کئی برس بعد معلوم ہوا کہ اس رات ہماری اس خستہ حال بستی پر بجلی گری تھی۔ ایک ہی قطار میں موجود چار گھروں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ بستر اور لکڑی کی دیگر اشیا جل گئی تھیں۔ ایک گھر تو مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ اس کی سرکنڈوں کی چھت راکھ ہوگئی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان متاثرہ گھروں کے بیچوں بیچ ہمارے گھر کو ذرا سا نقصان نہیں پہنچا۔ ایک اللہ والے نے کہا تھا کہ یہ اس بچے کی خوش بختی کی وجہ سے ہے، کچھ ذی نفس ایسے ہوتے ہیں جن سے برق آسمانی کو خاص تعلق ہوتا ہے اور ویسے بھی تو کہتے ہیں نا... کہ جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے؟''

مناہل محویت سے سن رہی تھی، بادلوں نے جیسے اپنے سارے ''بند'' کھول دیے۔ بارش پورے زور وشور سے برسنے لگی تو دادا انکل اور مناہل نے اپنی اپنی کرسیاں برآمدے کے شیڈ کے نیچے کچھ مزید اندر کی طرف کھسکا لیں۔ اسی دوران میں غفور نے بھی گرما گرم چائے، خستہ پکوڑوں اور نان خطائی کے ساتھ انہیں پیش کی۔ مناہل اور دادا انکل نے اپنے اپنے گرم کپ ہاتھوں میں تھام لیے۔ مناہل اب مشتاق نظروں سے دادا انکل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دادا انکل کے چہرے پر اب ایک دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے ایک خاص انداز سے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور جیسے اپنی ہی کسی بات پر ہنس پڑے۔ بولے۔ ''ہر عمر کے اپنے ہی تقاضے اور اپنے ہی انداز ہوتے ہیں۔ جوانی میں سوچوں کا انداز اور جذبات کا رنگ ڈھنگ کچھ مختلف ہوتا ہے۔ یہ جو تمہارے دادا انکل ہیں نا... انہوں نے بھی کسی وقت کسی کو چاہا تھا اور پھر اسے اپنا شریکِ حیات بھی بنالیا تھا۔''

مناہل مسکرائی۔ ''یعنی..... آپ کا مطلب ہے..... ثریا خالہ؟''

''ہاں''۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ثریا میری کزن تھی۔ ہم ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک ساتھ ہی پلے بڑھے، کھیلے کودے، گزرتے وقت کے ساتھ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور چاہت بھی پیدا ہوگئی۔ ثریا تو خیر اس معاملے میں محتاط تھی ہی، میں بھی کوشش کے باوجود اس سے پسندیدگی کا اظہار نہیں کر پاتا تھا۔ کئی دفعہ پکا ارادہ کیا کہ کہیں تنہائی ملی تو اس کا ہاتھ تھاموں گا اور صدقِ دل سے کہوں گا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔

''ثریا کے والد میرے پھوپا شاہد بھی ہماری ہی طرح معمولی سے کاشتکار تھے، پھپھو کی ایک بیٹی اکثر بیمار رہتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن موسم اچھا تھا اور اماں نے مجھے گڑ والے چاول ثریا کے ہاں دینے کے لیے بھیجا۔ وہاں پھپھو بھی ''پوڑے'' بنا رہی تھیں۔ انہوں نے ثریا سے کہا۔ ''بیٹی! بھائی کو اندر کمرے میں بٹھاؤ۔ میں ابھی بس تازہ پوڑے تفن میں ڈال کر لاتی ہوں۔ بھائی اور بھرجائی جی کو بڑے پسند ہیں۔''

''پھپھو کی ہدایت پر ہم دونوں کمرے میں آگئے۔ بادلوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ کھڑکیوں پر پڑے ہلکے پھلکے پردے ہوا کے زور سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ موٹی موٹی بوندیں ایک بار پھر پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر میں ثریا کو کچھ دن پہلے ہونے والی ایک لینڈ سلائڈنگ کے بارے میں بتانے لگا جس میں دو تین افراد کی جانیں چلی گئی تھیں۔ اسی دوران میں اچانک بجلی بڑے زور سے کڑکی۔ ثریا میری گفتگو سے پہلے ہی کچھ ڈری ہوئی تھی..... وہ بے اختیار، چیخ مار کر میرے ساتھ چمٹ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے؟ وہ ماورائی سے لمحے تھے لیکن بس چند لمحے تھے۔ پھر وہ ایکدم میری بانہوں سے نکل کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے کو گلابی رنگ نے ڈھانپ لیا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں..... اور شاید یہی وہ لمحہ تھا جب ہم دونوں نے ایک لمبا فاصلہ ایک جست میں طے کرلیا۔ میں نے اس کے ہاتھ تھامے اور پھر اس کے دائیں ہاتھ کو چوم لیا۔ وہ شرما کر بھاگ گئی۔ اس کے بعد سب کچھ ہی آسان ہوتا چلا گیا تھا۔ قدرت نے ہمیں ایک کرنا تھا اور اس کے لیے ہمارے راستے کھلنا شروع ہوگئے۔''

''یعنی ایک بار پھر آسمانی بجلی؟'' مناہل نے حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''شاید تم یہ سمجھو کہ میں مبالغہ آرائی کر رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے بیٹا جی! میں وہی بتا رہا ہوں جو میرے ساتھ بیتا۔ تم اسے اتفاق کہہ سکتی ہو... بلکہ بار بار کا اتفاق بھی کہہ سکتی ہو لیکن یہ سب کچھ میری زندگی میں ہوا ہے۔ کئی بار ہوا ہے۔''

مناہل ذرا شوخی سے بولی۔ ''یقین کریں مجھے آپ کی باتیں سن کر مزہ آرہا ہے۔ یہ بجلی تو آپ دونوں کے لیے بڑے کام کی چیز ثابت ہوئی۔ اس نے آپ کی جھجکتی ہوئی خاموش محبت کو زبان دے دی..... یعنی اے بگ بریک تھرو۔''

وہ دونوں بے تکلف دوستوں کی طرح اس بارے میں بات کرنے لگے۔ ماضی کے مناظر اور آوازوں کو تصور میں لاتے ہوئے دادا انکل کے چہرے پر ایک خوبصورت

مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔

مناہل نے چائے کا خالی کپ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''دادا انکل! بجلی کے حوالے سے اگلا کون سا واقعہ آپ کے ذہن میں ہے؟''

''میری شادی والا۔'' انہوں نے رسان سے جواب دیا۔ پھر ماضی کے دھندلکے میں گم ہوتے ہوئے بولے۔ ''ہمارے گاؤں اور ساتھ والے گاؤں کا ایک ہی چودھری تھا۔ ان علاقوں میں چودھری کو ملک بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارا ملک بڑا دبنگ اور رعب دار تھا۔ اس کا نام شہباز تھا۔ بدقسمتی سے ثریا کا باپ اس کی زمینوں پر کام کرتا تھا۔ ثریا کا باپ یعنی میرا پھوپا دن رات مشقت کرنے کے باوجود زندگی کی ضروریات اور ناگہانی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ملک شہباز کا مقروض رہتا تھا۔ میں نے بتایا ہے نا... کہ ثریا کی ایک چھوٹی بہن تھی جو اکثر بیمار رہتی تھی۔ اس کے علاج کے لیے بھی پھوپا کو ملک شہباز سے خاصا قرض لینا پڑا تھا۔ ملک بھی پھوپا کو خوشی خوشی قرض تلے دباتا چلا گیا کیونکہ اس کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ بالآخر ایک دن اس نے بے باک ہو کر ثریا کا ہاتھ مانگ لیا۔ اس وقت پھوپا کی ''پوزیشن'' اتنی خراب تھی کہ وہ اس چالیس پینتالیس سالہ شادی شدہ چودھری کو اپنی پھول سی بیٹی پر نظر رکھنے کے لیے کھری کھری نہ سنا سکے، البتہ ایک کام میں انہوں نے دلیری دکھائی۔ ملک کے علم میں لائے بغیر انہوں نے دو دن بعد میرا اور ثریا کا نکاح رکھ دیا۔ وہاں نکاح سے ایک دن پہلے ہی ملک شہباز کو کسی نہ کسی طرح اس بات کی بھنک پڑ گئی اور وہ آگ بگولا ہو گیا۔ وہ رات کا وقت تھا اور اگلے روز دوپہر کے وقت ہمارا نکاح تھا۔ ہمارے گاؤں سے ملک کے گاؤں کا فاصلہ چار میل کے قریب ہے۔ سوچو کیا ہوا ہوگا؟'' دادا انکل نے مناہل سے پوچھا۔

وہ اس روداد میں پوری دلچسپی لے رہی تھی۔ بولی۔

''ظاہر ہے کہ ملک شہباز آپ کا نکاح رکوانے کے لیے اپنے گاؤں سے چل پڑا ہوگا۔''

''ہاں، اس کا یہی ارادہ تھا مگر وہ آ نہیں سکا۔'' دادا انکل نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی ایک بارشی رات تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور آسمان سے لگاتار پانی برس رہا تھا۔ رات کے آخری پہر ملک شہباز کی حویلی کے پاس ہی اس کے ڈیرے پر بجلی گری۔ اس حادثے میں ملک کی پانچ بھینسیں مر گئیں۔ ملک کا چھوٹا بھائی ایاز ڈیرے پر ہی سو رہا تھا۔ وہ بھی سخت زخمی ہوا۔ اسے لے کر ملک کو فوراً پہلے تحصیل اسپتال اور پھر پشاور جانا پڑا۔ ملک ہمارے نکاح میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے نہیں پہنچ سکا.....''

مناہل حیرت کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہی تھی..... اگر یہ سب اتفاقات بھی تھے تو بڑے ''خوبصورت'' اور قابلِ غور تھے۔

دادا انکل ایک ضروری فون کال سننے کے بعد دوبارہ مناہل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بارش بدستور جاری تھی۔ وہ بولے۔ ''چلو بتاؤ اب تک کل کتنے مواقع ہو گئے جب آسمانی بجلی نے تمہارے دادا انکل کی ''فیور'' کی۔''

وہ انگلیوں پر گن کر بولی۔ ''تین ہو گئے۔''

وہ ماضی کی کھڑکی میں جھانکتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''یہ ہماری شادی سے قریباً چار ماہ بعد کی بات ہے۔ ثریا کی طبیعت خراب تھی۔ کھیتوں سے واپس آنے کے بعد میں نے اسے اپنی سائیکل کے کیریئر پر بٹھایا اور کچے پکے راستے پر چار میل کا فاصلہ طے کر کے اسپتال لے گیا۔ واپسی پر ہمیں کچھ دیر ہو گئی اور اندھیرا پھیل گیا۔ گہرے بادلوں کی وجہ سے یہ اندھیرا کچھ اور بھی گھٹا ٹوپ محسوس ہو رہا تھا۔ ہم آدھے راستے میں تھے جب تیز بارش شروع ہو گئی۔ یہاں رکنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں ڈرتے ڈرتے سائیکل کے پیڈل چلاتا رہا۔ دفعتاً بجلی زور سے چمکی اور مجھے یکا یک سائیکل کے بریک لگانا پڑے۔ ثریا بے چاری بھی چلا کر رہ گئی۔ میں سکتہ زدہ تھا۔ اگر آسمانی بجلی مجھے سامنے کا منظر نہ دکھاتی تو یقیناً ہم ایک سنگین حادثے کا شکار ہوتے۔ تقریباً پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر کچے پکے ڈھلوان راستے میں ایک گہرا شگاف نظر آ رہا تھا۔ پانی کے تیز بہاؤ نے کئی فٹ تک راستے کو نابید کر ڈالا تھا۔''

دادا انکل خاموش ہو کر مناہل کو دیکھنے لگے۔ وہ جیسے تصور ہی تصور میں اس واقعے کی خطرناکی اور سنسنی کو محسوس کر رہے تھے۔ مناہل نے بھی اس سنسنی کو محسوس کیا۔

ان دونوں نے کچھ دیر تک اس واقعے کے بارے میں بات کی، پھر دادا انکل بولے۔ ''اور اب سنو اس سلسلے کا سب سے اہم واقعہ۔ مجھے یقین ہے تمہاری حیرت میں اضافہ ہوگا..... اور تمہیں اپنے دادا انکل کی حاضر دماغی اور سمجھ بوجھ کا بھی تھوڑا بہت پتا چلے گا۔''

''وہ تو مجھے اب بھی پتا ہے۔''

''شکریہ۔'' انہوں نے کہا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ''کیا تم یقین کر سکتی ہو کہ تمہارے دادا انکل نے کسی وقت کسی شخص پر اپنے ہاتھوں سے گولی چلائی ہوگی؟''

UUNOVELS.COM

وہ ایک توقف کے بعد کہنے لگی۔ ''اگر ایسا ہوا ہے تو پھر غلطی سے ہی ہوا ہوگا..... یا پھر..... جس پر آپ نے گولی چلائی وہ کوئی بہت بُرا شخص ہوگا۔''

''تمہاری دوسری بات درست ہے۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملک شہباز میرا اور ثریا کا نکاح تو نہیں رکوا سکا تھا مگر اس کے سینے میں آگ بدستور سلگ رہی تھی۔ یہ ہماری شادی کے کوئی آٹھ دس ماہ بعد کی بات ہے۔ میں کوہاٹ شہر گیا ہوا تھا۔ دراصل میں ایف اے کے ایگزام دے رہا تھا۔ کھیت مزدوری کے ساتھ ساتھ، میں نے کوشش کر کے پڑھائی بھی جاری رکھی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے اس روز میں انگلش کا پرچہ دے کر شام چھ سات بجے کے قریب گاؤں واپس لوٹا تھا۔ ثریا اپنی امی کے گھر تھی، میں نے سوچا اسے لیتا ہوا جاؤں۔ میں ان کے گھر پہنچا تو وہاں پہلے سے کہرام مچا ہوا تھا۔ ملک شہباز، اپنا قرضہ واپس لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس نے پھوپا کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور انہیں بے دردی سے کھینچ رہا تھا۔ وہ انہیں پولیس چوکی لے جانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ گھر والے اس کی منتیں سماجتیں کر رہے تھے۔ وہ دھاڑ رہا تھا۔ ''نہیں، آج نہیں..... آج تو بالکل نہیں..... آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔'' اس کے تین مسلح کارندے اس کے ساتھ تھے اور باہر جیپ کے پاس کھڑے تھے۔

میں نے مداخلت کی اور پھوپا کا گریبان اس سے چھڑانا چاہا۔ وہ پھوپا کو چھوڑ کر مجھ پر پل پڑا۔ مجھے گھونسے مارے اور گرجا۔ ''اگر اتنا ہی ترس آ رہا ہے اس بڈھے پر تو پھر اپنی زنانی کو بھیج دے میرے ساتھ..... میں آج اپنا حق وصول کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

اس نے ثریا کی بات کی تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ بات ہاتھا پائی تک آئی تو ملک کی آواز پر اس کے گماشتے جو جیپ کے پاس اس کا انتظار کر رہے تھے، بھرّا مار کر گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے مجھے ملک سے علیحدہ کر کے، بے دردی سے زدوکوب کیا۔ اس وقت گھر میں تہلکہ سا مچ گیا جب انہوں نے مجھے گھسیٹ کر جیپ میں ڈالا اور پھر ثریا پر جھپٹے۔ وہ اسے بھی جیپ میں ڈالنا چاہتے تھے۔ پھوپا اور پھپھو، ملک شہباز سے معافی مانگنے لگے اور ہم دونوں کو کارندوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اپنی سی کوشش کرنے لگے۔ اردگرد کے لوگ ہکا بکا اپنے گھروں سے نکل آئے تھے اور یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ بہرطور کسی کی کوئی پیش نہ چلی۔ ملک شہباز مجھے اور ثریا کو اپنی جہازی سائز کی جیپ میں ڈال کر اپنے گاؤں اپنی حویلی میں لے آیا۔ میں زخمی حالت میں تھا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔''

بادل زور سے گرجا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ ملازم غفور تازہ چائے کے دو کپ میز پر رکھ گیا تھا۔ منال اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکائے، حیرت کی تصویر بنی، دادا انکل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مجھے تو یقین نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اس طرح مادر پدر آزاد ہوتے ہیں اور قانون کو اتنی دیدہ دلیری سے اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔'' وہ تاسف سے بولی۔

چوری

ایک عورت دکان سے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی، پولیس نے گرفتار کرلیا۔ عدالت میں پیش ہوئی تو جج نے پوچھا۔ ''خاتون! آپ نے دکان سے کیا چرایا؟''

عورت۔ ''جناب! میں نے اسٹرابیری کا ایک پیکٹ چرایا۔''

جج۔ ''اس پیکٹ میں کتنی اسٹرابیری تھیں؟''

عورت۔ ''اس میں چھ عدد اسٹرابیری تھیں۔''

جج۔ ''فی اسٹرابیری کے حساب سے تمہیں 6 دن جیل رہنے کی سزا دی جاتی ہے۔''

''لیکن جج صاحب۔'' اچانک عدالت کے ہال سے ایک آواز گونجی۔ ''اگر اجازت ہو تو فیصلہ لکھنے سے پہلے میری گزارش سن لیں۔''

جج نے اجازت دی تو آدمی کٹہرے میں آ گیا۔

جج۔ ''لیکن آپ کون ہیں؟''

آدمی۔ ''جناب! میں اس عورت کا شوہر ہوں۔''

جج۔ ''او کے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

آدمی۔ ''اس عورت نے صرف اسٹرابیری کا پیکٹ ہی نہیں بلکہ ایک پیکٹ چنے بھی چرائے تھے۔''

یہ سنتے ہی جج نے فیصلہ دیا کہ اس عورت کو فوراً رہا کیا جائے کیونکہ اس کے خاوند نے سچائی کی اعلیٰ مثال قائم کی اور اس کے بعد سے خاوند گھر سے لاپتا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

UUNOVELS.COM

''بٹیا جی! ہمارے پسماندہ دیہی علاقوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ ملک شہباز اس دور دراز علاقے میں خود ہی پولیس تھا، خود ہی جج اور خود ہی جیلر بھی۔ اکثر وڈیروں اور ملکوں کی طرح اس نے اپنی حویلی کے اندر ہی ایک حصے میں چھوٹی سی جیل بھی بنائی ہوئی تھی..... اس خبیث نے مجھے اور ثریا کو بھی اپنی اس نجی جیل میں پھینک دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چار پانچ پتھریلی کوٹھڑیاں تھیں جن میں سامنے کی طرف لوہے کی زنگ آلود سلاخیں لگی ہوئی تھیں، کچھ اور لوگ بھی یہاں موجود تھے۔ رات کے وقت بچوں کے رونے کی آواز بھی آتی تھی۔ ہم نے سخت اذیت کے عالم میں سات آٹھ روز وہاں گزارے۔ ثریا کو ایک دوسری کوٹھڑی میں دو عورتوں کے ساتھ بند کیا گیا تھا۔ وہ کمینہ ملک شہباز اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے طلاق لے کر اس سے نکاح کر لے۔ یوں اس کی عزت بھی بچی رہے گی اور وہ عیش بھی کرے گی۔ دوسری طرف وہ مجھ کو بھی بری طرح ڈرا دھمکا رہا تھا۔ وہ ثریا کو مجھ سے طلاق دلوانا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ نہ ثریا اس کی ہوس کے سامنے ہتھیار ڈال سکتی تھی اور نہ میں ''طلاق'' والی بات مان سکتا تھا۔

''وہ بھی ایک بادوباراں والی رات تھی۔ ملک شہباز اپنے شہری دوستوں کے ساتھ ایک روز پہلے کونج کے شکار کے لیے نکل گیا تھا۔ بہرحال اس کے کارندے حویلی میں اور اس نجی جیل میں پوری طرح چوکس تھے۔ رات نو بجے کے بعد ہماری جیل کا پہریدار بدلا تو اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ نشے میں ٹن ہے۔ موسم کی مناسبت سے وہ بے ہودہ فلمی گانے الاپتا رہا اور بوتل سے منہ لگا کر پیتا رہا۔ پھر اس کی بدبختی اور میری خوش قسمتی کہ وہ آہنی سلاخوں کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور وہیں پر سو گیا۔ سلاخوں سے اس کا فاصلہ چار فٹ کے قریب تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو سلاخوں کے اندر سے اپنا ہاتھ نکال کر اور بازو لمبا کر کے پہریدار تک پہنچا سکتا تھا۔ اس گرجتے برستے موسم میں، میں نے ایک بھرپور کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔ میں نے پہریدار کی بغلی جیب میں سے چابیوں کا گچھا نکال لیا۔ ثریا کی حفاظت کے خیال نے مجھے ہر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے چابی تلاش کر کے اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ پہریدار کی دونالی رائفل اس کے پاس ہی رکھی تھی۔ میں نے اس کی رائفل پر ہاتھ ڈالا تو وہ چونک کر جاگ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتا، میں نے رائفل کے وزنی دستے سے اس کے سر پر دو کراری ضربیں لگائیں اور اسے اناً فاناً فیل کر دیا، پھر میں ثریا والی کوٹھڑی کی طرف لپکا اور احتیاط سے اس کا دروازہ بھی کھول دیا، وہاں کسی بدنصیب مزارعے کے گھر کی دو عورتیں بھی چھوٹے بچوں سمیت بند تھیں۔ ان میں سے ایک جواں سال تھی اور اس کے ساتھ پہریداروں کا انچارج طاری خاں گاہے بگاہے زیادتی کرتا رہتا تھا۔ میں نے ان عورتوں سے کہا کہ موقع اچھا ہے، وہ بھی نکل چلیں مگر وہ اتنی خوفزدہ تھیں کہ انہوں نے انکار کر دیا۔ بہرحال میں اور ثریا وہاں سے نکلے اور ایک نیم تاریک راہداری میں احتیاط سے چلتے ہوئے حویلی کے احاطے کی طرف آ گئے۔ سامنے ہی لوہے کا وہ بڑا پھاٹک نظر آ رہا تھا جس میں سے گزر کر ہم آزاد فضا میں سانس لے سکتے تھے۔ مگر یہاں پر حسبِ اندیشہ ایک بڑی رکاوٹ موجود تھی۔ حویلی کی فصیل نما چار دیواری پر مین گیٹ کی طرف دو برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک برجی پر سفاک طبع طاری خاں موجود تھا۔ آٹومیٹک رائفل اس کے کندھے پر تھی اور اس کی عقابی نگاہیں قرب و جوار کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ گاہے بگاہے وہ اپنی طاقتور ٹارچ کی روشنی گیٹ پر بھی ڈال لیتا تھا۔ اس روشنی میں بارش کی بوچھاڑوں اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ ہوتا تھا اور کسی وقت طاری خاں کے سیاہ کپڑے بھی جھلک دکھاتے تھے۔ میں برآمدے کے ایک چوکور ستون کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ لرزتی کانپتی ثریا میرے بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ میں طاری خاں کو فائر مار کر اپنے راستے کی رکاوٹ صاف کروں اور چھوٹا گیٹ کھول کر ثریا سمیت نکل جاؤں لیکن عملی طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا اور ثریا بھی جانتی تھی کہ جونہی دونالی رائفل کا فائر ہوا، پوری حویلی جاگ جائے گی۔ اردگرد موجود مسلح پہریدار بھی، جو اس بارشی رات میں بے فکر ہو کر سو رہے تھے، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں گے۔ اس ایک فائر سے پوری حویلی میں کھلبلی مچ جائے گی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ طاری خاں کو شوٹ کروں یا پھر ثریا سمیت دوبارہ پکڑا جاؤں۔ میں زیادہ انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کوٹھڑی کے سامنے جو پہریدار بے ہوش پڑا تھا، وہ کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتا تھا۔''

ذرا توقف کر کے دادا انکل نے مناہل کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ''تمہارا کیا اندازہ ہے؟ پھر کیا ہوا ہوگا؟''

مناہل نے مبہوت لہجے میں کہا۔ ''بجلی نے پھر آپ کی

مدد کی۔"

"مگر کس طرح؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے دادا!..... وہ طاری خاں اونچی جگہ برجی میں کھڑا تھا۔ آپ نے بتایا ہے کہ اس کے کپڑے بھی کالے تھے..... ہو سکتا ہے کہ اس پر بجلی گری ہو۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوا۔" دادا انکل نے عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر..... ہو سکتا ہے کہ..... بجلی حویلی میں کہیں گری ہو..... جس کی وجہ سے افراتفری مچ گئی ہو اور آپ کو نکل جانے کا موقع مل گیا ہو؟"

انہوں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ مناہل سوچ رہی تھی اور سر کھجا رہی تھی۔

"کوئی اشارہ دیں نا... دادا انکل۔" وہ بولی۔

"اشارہ یہ ہے کہ اس رات بجلی نے نہیں بلکہ بجلی کی آواز نے میری مدد کی تھی۔"

وہ ایک بار پھر الجھن میں نظر آئی۔ آخر بے تاب ہو کر کہنے لگی۔ "آپ تو پہیلی بجھوا رہے ہیں۔ پلیز بتائیں نا.... پھر کیا ہوا؟"

وہ ماضی کے مناظر میں جھانکتے ہوئے بولے۔

"تھری ناٹ تھری کی دونالی رائفل میرے ہاتھوں میں تھی اور نگاہیں گرانڈیل طاری خاں پر جمی ہوئی تھیں مگر فائر کی آواز پوری حویلی کو جگا سکتی تھی۔ اچانک..... بالکل اچانک میری سمجھ میں آ گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اسلحہ شناس تھا اور فائر کرنا بھی جانتا تھا۔ میں نے ٹریگر پر انگلی رکھ لی اور نگاہیں برجی میں کھڑے طاری خاں پر جما دیں۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ بجلی زور سے چمکی..... میں نے انتظار کیا۔ بجلی کی چمک اور کڑک کے درمیانی وقفے کو نوٹ کیا۔ یہ چار یا پانچ سیکنڈ کا وقفہ تھا..... تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ بجلی کبھی زور سے چمکتی ہے اور کبھی نسبتاً آہستہ۔ بجلی کی چمک سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ کڑاکا کتنی زور کا ہے..... میں نے تھوڑا انتظار کیا..... جونہی بجلی کا ایک زوردار جھماکا ہوا میں نے سانس روک لی۔ پانچ تک گنا۔ پھر ایک ساعت شکن کڑاکا ہوا اور میں نے ٹریگر دبا دیا۔ رائفل میں دو گولیاں تھیں مگر میری پہلی گولی ہی نشانے پر لگ گئی تھی۔" دادا انکل خاموش ہو گئے اور معنی خیز نظروں سے مناہل کو دیکھنے لگے۔

وہ ہکا بکا تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ زوردار کڑک نے گولی کی آواز کو نگل لیا تھا۔ "اوہ مائی گاڈ۔" وہ بے ساختہ بڑبڑائی۔ "مم..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"مجھ پر یا بجلی پر؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"اپنی سماعت پر..... دادا انکل! یہ تو حیرت انگیز ہے اور بہت اسمارٹ بھی....."

وہ جیسے اس واقعے کے ڈرامائی تصور میں کھو سی گئی۔ بارش کچھ دیر دھیمی رہنے کے بعد پھر تیز ہو گئی تھی۔ دادا انکل نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "بٹیا! آگے کی بات نہیں سنو گی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولے۔ "اس سے آگے کی کہانی بالکل مختصر سی ہے۔ میں اور ثریا ملک کی حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی رات میں نے ثریا اور اپنی بوڑھی والدہ کے ساتھ گاؤں چھوڑ دیا۔ میں ایک دو ہفتے پشاور میں رہا اور پھر لاہور چلا آیا۔ مجھے کبھی یہ پتا نہیں چل سکا کہ جس طاری خاں کو میں نے نشانہ بنایا تھا وہ جانبر ہو گیا تھا یا مر گیا۔ بہرحال میں نے اپنی بوڑھی والدہ کے لیے اور ثریا کے لیے بہت محنت کی۔ خدا نے میرے دن پھیر دیے۔ پراپرٹی کے کام میں مجھے کافی فائدہ ہوا۔ ہمارے دو بچے ہوئے۔ میں نے اور ثریا نے زندگی کا سارا سرد گرم پورے پچپن سال تک اکٹھے دیکھا اور اب جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔" دادا انکل نے آخری الفاظ کے ساتھ اپنی روداد ختم کر دی۔

مناہل سوچ میں گم تھی..... اسے پتا تھا کہ دادا انکل نے وہی کچھ بتایا ہے جو ہوا ہے۔ تو کیا، یہ سب اتفاقات تھے..... یا پھر واقعی کچھ واقعات اور عوامل ایسے ہوتے ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر رہتے ہیں۔ بارش کا رخ، ہوا کی وجہ سے بدل گیا، وہ اندر تک آنے لگی۔ مناہل اور دادا انکل اندر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہی وقت تھا جب بجلی ایک بار پھر بڑے زور سے کڑکی۔ پہلے سے سہمی ہوئی مناہل نے لپک کر دادا انکل کا بازو تھام لیا۔

وہ بلند آواز میں ہنسے اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "بٹیا جی! کیا آپ کو اب بھی یقین نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے یہ بجلی آپ کو کچھ نہیں کہے گی؟" وہ کھسیانی ہو کر ہنسنے لگی۔ دادا انکل کا بوڑھا ٹرانزسسٹر ریڈیو اچانک ہی "زندہ" ہو گیا تھا۔ خبرنامے کی بڑی صاف آواز سنائی دینے لگی تھی۔ وہ مناہل کی طرف دیکھ کر بولے۔ "دیکھا نا.... بجلی نے جہاں میرے بڑے بڑے کام کیے..... وہاں ایسے چھوٹے چھوٹے کام بھی کر دیتی ہے۔"

دونوں ریڈیو کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ مناہل اب بھی حیرت کے ریلے میں تھی۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

حکمتِ عملی

ملک صفدر حیات

کبھی کبھی خدا کی قدرت یوں بھی مہربان ہوتی ہے کہ ایک مسئلہ حل کرتے کرتے درمیان میں چھپے ہوئے کئی دوسرے مسائل بھی خودبخود حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ملک صفدر کے چلائے ہوئے ایک تیر نے دو شکار کر ڈالے۔ پولیس کا کام تو ہے ہی مجرموں کا قلع قمع کرنا مگر تعجب خیز یہ بات ہے نئے کیس کی تفتیش میں بند فائلیں بھی کھل جاتی ہیں۔ ملک صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی کارنامہ انجام دے ڈالا تھا کہ طاقت کے نشے میں چور مجرمانہ سرگرمیوں کے بادشاہ جب چوہوں کے مانند جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈالے گئے تو گویا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

سچائی کی تلاش میں جان کی بازی لگانے والے

فرض شناس پولیس آفیسر کا جذبہ

نومبر کی ایک یخ بستہ رات میں اپنے کوارٹر میں گرم لحاف کے اندر بیٹھ کر چند ضروری فائلوں کا مطالعہ کر رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ لگ بھگ آدھی رات کا عمل تھا۔ میں عموماً عشا کی نماز کے بعد سونے کے لیے بستر پر لیٹ جایا کرتا ہوں کیونکہ مجھے علی الصباح بیدار ہوتا ہوتا ہے۔ یہ میرا برسوں کا معمول ہے لیکن کبھی کبھار کسی ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر مجھے اپنے اس معمول کی خلاف ورزی بھی کرنا پڑ جاتی ہے جیسا کہ آج میں نصف شب کے وقت بھی جاگ رہا تھا۔

دستک کی آواز دوبارہ سنائی دی تو میں حرارت بخش لحاف چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اب کی بار نسبتاً زیادہ زور سے میرے کوارٹر کا دروازہ بجایا گیا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا اور سبک خرامی سے چلتے ہوئے کوارٹر کے صحن کو عبور کرنے کے بعد بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ اس دوران میں ایک دفعہ پھر دستک دے دی گئی تھی۔

''لگتا ہے، کوئی بڑی مشکل میں ہے۔'' میں نے خود کلامی کی۔ ''اسی لیے پریشانی کے عالم میں مسلسل میرا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے.....''

میں نے اپنے عملے سے کہہ رکھا تھا کہ رات کے کسی بھی پہر میری ضرورت پیش آ جائے تو پہلی فرصت میں مجھے جگا دیا جائے۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ تھانے میں آدھی رات کو کوئی ٹیڑھا کیس آ گیا تھا جسے ہینڈل کرنے کے لیے مجھے یاد کیا جا رہا تھا لیکن جب میں نے اپنے کوارٹر کا بیرونی دروازہ کھولا تو ایک خلافِ توقع صورتِ حال نے میرا استقبال کیا۔

میں نے اپنے سامنے ایک عمر رسیدہ بوڑھے شخص کو کھڑے دیکھا۔ اس نے گرم کمبل اوڑھ رکھا تھا اور اس کے پاس مجھے ایک چھوٹا سا بچہ بھی نظر آیا جو بے ہوش تھا یا پھر گہری نیند سو رہا تھا۔ ضعیف شخص کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا بات ہے چاچا..... اتنی رات گئے میرا دروازہ کیوں کھٹکھٹا رہے ہو؟''

''تھانے دار پتر!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میرا نام امام دین ہے۔ میں اس وقت ایک مصیبت میں گرفتار ہوں لیکن کوئی میری مدد کرنے کو تیار نہیں۔ میں ادھر تھانے بھی گیا تھا مگر کسی نے میری بات نہیں سنی۔ مجبوراً مجھے آپ کے کوارٹر تک آنا پڑا۔ آپ ذرا اپنے عملے کو میری مدد کرنے کے لیے کہہ دیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی صرف دو دن ہی ہوئے تھے۔ لہٰذا میں اس علاقے کے وسنیکوں کو شکل صورت سے بالکل نہیں جانتا تھا۔ امام دین نامی اس شخص کی فریاد میں بڑا درد پایا جاتا تھا۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے بتاؤ، تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''

''میرا پوتا بہت بیمار ہے جی.....'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میرا بیٹا نظام دین گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے۔ میں اپنے پوتے سلام دین کو فوراً اسپتال لے کر جانا چاہتا ہوں لیکن اسپتال گاؤں سے پانچ میل دور ہے اور میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ میں نے تھانے کے سامنے ایک تانگا کھڑا دیکھا ہے۔ اگر آپ اپنے عملے کے کسی بندے کو اس تانگے میں میرے ساتھ اسپتال بھیج دیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا.....''

امام دین اپنی بپتا سنا چکا تو میں نے نرمی سے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ.....''

میرا کوارٹر تھانے کے پچھواڑے بنا ہوا تھا۔ میں امام دین کی درخواست پر اسے تھانے والے حصے کی طرف لے جا رہا تھا تاکہ اس کے پوتے سلام دین کو اسپتال بھجوانے کا بندوبست کر سکوں۔ میرے اس تعاون پر وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس مختصر سے، چند گز کے فاصلے کے درمیان میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہارے پوتے کو ہوا کیا ہے؟''

''تھوڑی دیر پہلے تک سلام دین درد کی شدت سے دہرا ہو رہا تھا، تھانے دار صاحب۔'' اس نے اپنے پوتے کو کمبل کے اندر چھپاتے ہوئے بتایا۔ ''ہم نے تمام گھریلو ٹوٹکے آزما کر دیکھ لیے مگر کسی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً اسے اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن یہ یہاں تک پہنچتے ہوئے سو گیا ہے یا پھر تکلیف کی زیادتی نے اسے بے ہوش کر دیا ہے۔''

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''سلام دین کس قسم کی تکلیف میں مبتلا تھا؟''

''بس جی، پیٹ کو پکڑ کر چلّا رہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے تو دردِ قولنج کا شک ہے۔ بچے دن بھر پتا نہیں، کیا الا بلا کھاتے رہتے ہیں اور آج کل تو موسم بھی کافی ٹھنڈا ہو رہا ہے.....''

''ہوں.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے امام دین سے استفسار کیا۔ ''تمہارا بیٹا نظام دین کہاں گیا ہوا ہے؟''

''وہ کوٹ لکھن گیا ہے جی۔'' اس نے بتایا۔ ''کل کسی وقت واپس آئے گا۔ بچے کی دونوں بہنیں اور ماں سخت پریشان ہیں۔ میں انہیں گھر میں چھوڑ کر ادھر آیا ہوں جناب۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں چاچا۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں ابھی تمہارے پوتے کو اسپتال پہنچانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم حوصلہ رکھو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے تمہارا بیٹا کرتا کیا ہے؟''

''اپنا خاندانی کام ہے سرکار۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''پیشے کے اعتبار سے میں موچی ہوں۔ گھر کے اندر ہی میں نے دکان بنائی ہوئی ہے۔ نظام دین میرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ ہم نئے جوتے بھی تیار کرتے ہیں اور پرانے جوتوں کی مرمت بھی کرتے ہیں۔ آپ اس علاقے میں نئے آئے ہیں اس لیے مجھے نہیں جانتے۔ آپ کبھی میری دکان پر تشریف لائیں۔ آپ کے لیے کوئی جوتا تیار کر کے مجھے خوشی ہوگی۔''

''امام دین! تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ میں اس علاقے میں نیا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی دو دن پہلے ہی یہاں کے تھانے میں میری پوسٹنگ ہوئی ہے۔ تم اپنے پوتے کے معاملے سے نمٹ جاؤ، پھر میں تمہاری دکان کا چکر لگاؤں گا۔''

''ست بسم اللہ جی.....'' وہ ممنونیت بھری آواز میں بولا۔ ''یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ آپ کا جب دل چاہے، میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے تھانے کے سامنے پہنچ گئے۔ اسی وقت میری نگاہ ایک کانسٹیبل پر پڑی۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ میرے نزدیک پہنچ کر مجھے سیلیوٹ کرتے ہوئے بولا۔

''یس سر!''

UUNOVELS.COM

''تمہارا نام نوید احمد ہی ہے نا؟'' میں نے شبینہ ڈیوٹی والے اس کانسٹیبل کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''جی ملک صاحب.....!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے سوال کیا۔ ''تھانے میں سب ٹھیک چل رہا ہے نا.....؟''

''جی..... بالکل.....'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''آپ ابھی تک سوئے نہیں۔ سب خیریت تو ہے نا.....؟''

''اگر سب ٹھیک چل رہا ہوتا تو اتنی رات کو مجھے اپنے کوارٹر سے اٹھ کر یہاں نہ آنا پڑتا نوید.....'' میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا پھر تانگے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم تانگا چلانا جانتے ہو؟''

''ملک صاحب! یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ حکم کریں، کرنا کیا ہے.....؟''

''امام دین کا پوتا بہت بیمار ہے۔'' میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''جلدی سے تانگا جوتو اور انہیں فوراً اسپتال پہنچاؤ۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا.....؟''

''میں سمجھ گیا ملک صاحب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔''

''نوید! میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو.....'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ تھانہ ''نائن ٹو فائیو'' والا کوئی سرکاری دفتر نہیں ہے۔ ہم عوام کے خدمت گار ہیں اور ہماری ڈیوٹی ''راؤنڈ دی کلاک'' ہے۔ جس وقت جو بھی فریادی ہمارے پاس آئے، ہمیں اس کی مدد کرنا ہے۔ اگر تم لوگوں نے امام دین کی بات توجہ سے سن لی ہوتی تو یہ اپنے مسئلے کے حل کے لیے میرے کوارٹر تک نہ پہنچتا.....''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے کے بعد ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کی ہدایت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا ملک صاحب۔''

میں امام دین کو کانسٹیبل نوید کے حوالے کر کے اپنے کوارٹر میں آیا۔

ٹھنڈے ٹھار بیرونی ماحول سے دوبارہ گرم بستر میں گھسنا بڑا سکون بخش اور خوش گوار تجربہ تھا اور اس آرام دہ صورتِ حال نے مجھ پر کسل مندی طاری کر دی۔ اب فائلوں میں مزید دماغ کھپانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے ایک طویل جماہی لی اور مذکورہ فائلوں کو بستر کے پہلو میں پڑی چوبی میز پر رکھا اور خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

ضلع نو بہ لیک سنگھ کی تحصیل پیر محل سے تعلق رکھنے والے اس تھانے کا چارج مجھے ہنگامی بنیادوں پر سونپا گیا تھا اور دو روز قبل ہی میں یہاں تعینات ہوا تھا۔ مجھ سے پہلے یہاں کے تھانہ انچارج کا نام قادر بخش تھا جو خطرناک ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی ہار گئے تھے۔ میری معلومات کے مطابق، قادر بخش شہید نہایت ہی اصول پرست اور ایمان دار پولیس آفیسر تھے۔ ان کی شہادت نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا تھا لہٰذا مجھے فوری طور پر پیر محل کے اس تھانے میں تعینات کر دیا گیا تھا تاکہ میں قادر بخش کے مشن کو پورا کر سکوں۔

آج کل تو ضلع نو بہ لیک سنگھ خاصا ترقی یافتہ ہو گیا ہے اور پیر محل تحصیل کی ایک اپنی آن اور شان ہے۔ موٹروے اور دیگر ہائی پاس نے آمد و رفت کے معاملات کو نہایت ہی سہل کر دیا ہے اور ضروریاتِ زندگی کی ہر شے یہاں مل جاتی ہے مگر یہ جس زمانے کا واقعہ ہے ان دنوں پیر محل ایک بڑا، قصبہ نما دیہات ہوا کرتا تھا۔ میرے تھانے کی حدود میں کوٹ لکھن، چک تین سو اڑتیس گ ب، حیات نگر، چک سات سو بیس گ ب، رجانہ اور چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب وغیرہ..... گاؤں دیہات شامل تھے۔ چک سات سو بیس گ ب سے دس میل کے فاصلے پر آج آپ کو جو ''کمالیہ وائلڈ لائف پارک'' دیکھنے کو ملتا ہے، وہ اس دور میں ''پیر محل جنگل'' کہلاتا تھا اور اسی جنگل میں سفاک ڈاکوؤں نے یہاں کے تھانہ انچارج قادر بخش کو ایک خونیں مقابلے میں شہید کر دیا تھا۔ پیر محل اور اس تھانے کے بارے میں تفصیلات بیان کرنا اس لیے بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ زیرِ نظر کہانی اسی ماحول اور پس منظر کے گرد گھومتی ہے۔

اگلی صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو میں نے کانسٹیبل نوید کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ نوید نے میرے سامنے حاضر ہو کر مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد استفسار کیا۔

''نوید! رات تم نے امام دین اور اس کے پوتے کو بہ خیریت پیر محل اسپتال پہنچا دیا تھا؟''

''جی ملک صاحب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا پھر دلچسپی بھرے لہجے میں مجھ سے سوال پوچھا۔ ''یہ بابا کون تھا سر جی.....؟''

''تھا ایک مصیبت زدہ بے چارہ.....'' میں نے

سرسری انداز میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔
''کیا تم اسے نہیں جانتے؟''
''نہیں ملک صاحب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پچھلی رات سے پہلے اس بابے کو کہیں نہیں دیکھا، جان پہچان تو بہت دور کی بات ہے جناب.....''
میں الجھ کر رہ گیا۔ لمحاتی سوچ بچار کے بعد میں نے کانسٹیبل سے دریافت کیا۔ ''نوید! تم کس گاؤں سے تعلق رکھتے ہو؟''
اس نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''چک سات سو بیس گ ب۔''
اس تھانے کی ایک جانب چک سات سو بیس گ ب اور دوسری طرف چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب واقع تھا۔ (چک بہ معنی دیہات) امام دین یقیناً انہی دو دیہاتوں میں سے کسی ایک کا رہنے والا تھا۔ نوید کے جواب نے مجھے مزید الجھا دیا تھا۔
''کمال ہے، تم امام دین موچی کو نہیں جانتے۔'' میں نے کانسٹیبل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں قریب ہی کے کسی گاؤں سے آیا ہے۔''
''ملک صاحب! میں اپنے چک کے علاوہ آلے دوالے کے تمام چک اور گاؤں دیہات سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''چک چھ سو بہتر گ ب میں امام دین نامی ایک موچی تو رہتا ہے لیکن گزشتہ رات میں نے جس بابے کو اسپتال پہنچایا ہے، وہ امام دین موچی نہیں تھا۔''
''پھر اس بڈھے شخص نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تو یہاں پر بالکل نیا ہوں۔ ان تین دنوں میں، میں نے بہ مشکل اپنے اسٹاف کے نام یاد کیے ہیں۔ امام دین کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور وہ بھی موسم سرما کی ایک یخ بستہ رات میں..... میں نے خود دیکھا تھا کہ اس نے ایک پانچ سالہ معصوم سے بچے کو اٹھا رکھا تھا جس کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی اور امام دین اپنے پوتے کو فی الفور اسپتال لے کر جانا چاہتا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آ گیا اور میں نے تمہیں اس کے ساتھ اسپتال جانے کا حکم دے دیا مگر..... تم تو مجھے کوئی اور ہی کہانی سنا رہے ہو۔''
''ملک صاحب! رات میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ بابا آپ کا کوئی پرانا شناسا ہے۔'' کانسٹیبل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور پھر اس وقت آپ غصے میں بھی تھے اس لیے میں نے کسی حیل حجت کے بغیر آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔''
''میں غصے میں اس لیے تھا کہ امام دین نے مجھ سے آپ لوگوں کی شکایت کی تھی۔'' میں نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم اگر امام دین کی فریاد سن لیتے تو اسے میرے کوارٹر کا دروازہ نہ کھٹکھٹانا پڑتا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پہلے تھانے آیا تھا لیکن آپ لوگوں نے اس کی مدد نہیں کی۔ ادھر سے مایوس ہونے کے بعد ہی وہ میرے پاس آیا تھا۔''
''ملک صاحب! وہ بابا اول درجے کا جھوٹا ہے۔'' کانسٹیبل نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''
میرے استفسار کے جواب میں نوید نے جو کچھ بتایا، وہ تشویشناک اور حیرت انگیز تھا۔ امام دین نامی وہ بوڑھا شخص میرے پاس آنے سے پہلے تھانے نہیں گیا تھا اور نہ ہی اس نے میرے عملے میں سے کسی سے کوئی بات کی تھی۔ اس صورت حال نے مجھے بے چین کر دیا۔ میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے تین سوالات سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ اگر وہ بوڑھا شخص امام دین موچی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ اس نے جس چار پانچ سالہ بے ہوش بچے کو اٹھا رکھا تھا، وہ اس کا پوتا سلام دین تھا یا نہیں؟ اور اگر کانسٹیبل کا بیان درست تھا تو پھر اس مشکوک بڈھے بابے نے اپنے کس مقصد کے حصول کی خاطر یہ تمام ڈراما رچایا تھا؟ یہ ہنسی مذاق کا کوئی کھیل تو ہونے سے رہا۔
''ملک صاحب.....'' مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر نوید نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''اس بابے کا معاملہ میری سمجھ سے تو باہر ہے جناب۔''
''جو چیز سمجھ اور عقل سے بالاتر ہو، اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسان کو فوراً کام سے لگ جانا چاہیے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لہٰذا تم پہلی فرصت میں پیر محل اسپتال روانہ ہو جاؤ اور امام دین نامی اس بابے کی خبر لو۔ اگر وہ فراڈ نہیں تھا تو اس کا پوتا سلام دین ابھی تک اسپتال میں موجود ہوگا اور وہ بڈھا خود بھی۔''
''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ مستعد انداز میں بولا۔ ''میں ابھی پیر محل کے لیے نکل رہا ہوں۔''
نوید احمد کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل عارف محمود کو اپنے پاس بلا لیا۔ عارف کا تعلق چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب سے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔
''کیا تم کسی امام دین موچی کو جانتے ہو؟''

UUNOVELS.COM

''بڑی چنگی طراں جانتا ہوں ملک صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''امام دین موچی کا تعلق میرے ہی گاؤں سے ہے۔''

''کیا اس کے بیٹے کا نام نظام دین ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی بالکل، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دونوں باپ، بیٹا اپنی دکان میں کام کرتے ہیں۔''

''نظام دین کے بیٹے کا کیا نام ہے؟''

''سلام دین۔'' عارف نے بتایا۔ ''نظام دین کی دو بیٹیاں فرزانہ اور ناہید ہیں جن کی عمریں علی الترتیب دس اور آٹھ سال ہیں۔ سلام دین اپنی بہنوں سے چھوٹا ہے جو لگ بھگ پانچ سال کا ہوگا۔ امام دین کو اپنے پوتے سے بہت محبت ہے اور سلام دین بھی ہر وقت اپنے دادا کی بغل میں گھسا رہتا ہے۔ امام دین کے لاڈ پیار نے بچے کو کافی حد تک ضدی اور خودسر بنا دیا ہے اور اس بات پر نظام دین اور اس کی بیوی شبانہ دونوں بہت پریشان ہیں لیکن ان میں، امام دین کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں ہے۔''

کانسٹیبل عارف نے مجھے جو معلومات فراہم کیں ان میں سے بیشتر باتیں نام نہاد امام دین گزشتہ رات مجھے بتا چکا تھا۔ اب اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ کل نصف شب جو امام دین میرے کوارٹر پر آیا تھا، وہ کوئی بہروپیا تھا۔ اس بڈھے نے امام دین موچی بن کر جو جذباتی کھیل کھیلا، یقیناً اس کے پیچھے اس بہروپیے کا کوئی مقصد پوشیدہ تھا اور مجھے ہر قیمت پر اس مقصد تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ اس تھانے کا چارج سنبھالنے کے بعد جو پہلا کیس میرے ہاتھ لگا تھا، وہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد، پراسرار اور دلچسپ کیس تھا۔

''ملک صاحب! آپ امام دین موچی کے بارے میں یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' کانسٹیبل عارف نے بڑے ادب سے سوال کیا۔ ''کیا اس بڈھے بابے سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟''

میں نے کانسٹیبل کے سوال کا جواب دینے کے بجائے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''عارف! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم دس پندرہ منٹ میں تمہارے گاؤں کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ میں ایک خاص مسئلے پر امام دین سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

عارف محمود نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور اطاعت مندی سے بولا۔ ''جو حکم ملک صاحب.....!''

کانسٹیبل عارف محمود نے مجھ سے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا تھا لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں درجنوں الجھن بھرے سوالات کو پڑھ لیا تھا۔ فی الحال، اس کے کسی سوال کا میرے پاس تسلی بخش جواب نہیں تھا۔ اس وقت میں جس نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھا اس نے میرا دماغ گھما کر رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

امام دین موچی کا گھر چک چھ سو بہتر بنا تیرہ گ ب کے وسطی حصے میں تھا۔ تھانے سے روانہ ہوتے وقت میں اے ایس آئی فرہاد باجوہ کو خصوصی ہدایات دے آیا تھا تاکہ میرے غیاب میں وہ تھانے کے معاملات کو ہینڈل کر لے۔ میرے تھانے کے عملے میں ایک اے ایس آئی، ایک حوالدار اور تین کانسٹیبل تھے۔ تھانے کی حدود کے مقابلے میں یہ نہایت ہی مختصر اسٹاف تھا لیکن مجھے انہی لوگوں سے امورِ تھانے داری نمٹانا تھے۔ اس زمانے میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کو آج کی طرح لامحدود آسانیاں اور دیگر وسائل حاصل نہیں تھے۔

ہم کچے راستے کو خیرباد کہہ کر چک کے اندر داخل ہوئے تو سامنے سے چار افراد آتے دکھائی دیے۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی عارف چونک اٹھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ کیا ملک صاحب.....!''

''کیا کہنا چاہتے ہو عارف؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم جس بندے کے پاس جا رہے ہیں وہ تو ادھر ہی آ رہا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، موچی امام دین؟''

''جی ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ان چار افراد میں جس شخص نے نیلا سویٹر پہن رکھا ہے، وہ امام دین ہی ہے۔'' پھر اس نے اضافہ کیا۔ ''اس کے ساتھ منظور تیلی، صادق کمہار اور دلدار لوہار ہے۔''

''یہ چاروں صبح ہی صبح کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ تو ان سے پوچھنے پر ہی پتا چل سکے گا ملک صاحب۔'' کانسٹیبل نے بڑا معقول جواب دیا۔

وہ چاروں ہماری جانب آ رہے تھے اور ہم دونوں ان کی طرف قدم بڑھا رہے تھے لہٰذا ایک منٹ کے اندر ہم ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ کانسٹیبل عارف نے جس نیلے سویٹر والے کو امام دین موچی بتایا تھا، وہ اگرچہ ایک عمر

UUNOVELS.COM

رسیدہ شخص تھا لیکن یہ وہ بوڑھا نہیں تھا جو گزشتہ رات میرے کوارٹر پر آیا تھا اور میں نے جسے اس کے پوتے سمیت اسپتال بھیجنے کا بندوبست کیا تھا۔

"لو جی..... ہم تو تھانے جا رہے تھے اور پولیس خود ہی یہاں پہنچ گئی۔" ان میں سے ایک نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ وہ دلدار لوہار تھا۔

منظور علی نے امام دین کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے اطمینان بخش انداز میں کہا۔ "چاچا! تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا۔"

صادق کمہار نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور بڑی معصومیت سے بولا۔ "نئے تھانے دار صاحب تو بڑے مستعد ہیں۔"

"امام دین.....!" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے امام دین موچی سے استفسار کیا۔ "مجھے بتاؤ، تم نے اپنے کس مسئلے کے لیے تھانے کا رخ کیا ہے اور..... وہ کبھی اتنی صبح؟"

"تھانے دار صاحب....." وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "میرا پوتا کہیں غائب ہو گیا ہے..... اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ہم رات سے اسے تلاش کر رہے ہیں۔ پورا چک چھان مارا ہے مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ ابھی ہم اسی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے تھانے جا رہے تھے کہ آپ راستے میں مل گئے....." پھر وہ کانسٹیبل عارف کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے گویا ہوا۔ "عارف تو ہمارے چک ہی کا وسنیک ہے۔ کیا اسی نے آپ کو میرے پوتے کے بارے میں بتایا ہے؟"

"نہیں۔ یہ اطلاع مجھے کہیں اور سے ملی ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا پھر پوچھا۔ "کیا تمہارے پوتے کا نام سلام دین ہے اور وہ لگ بھگ پانچ سال کا ایک گول مٹول پیارا سا بچہ ہے؟"

"جی بالکل....." وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "اس کا اصل نام سلام دین ہے مگر اسے سب سلامو کہتے ہیں۔"

"کیا سلامو کے باپ کا نام نظام دین ہے؟" میں نے امام دین کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "اور وہ کل سے موضع کوٹ لکھن گیا ہوا ہے۔ آج کسی وقت وہ کوٹ لکھن سے واپس آ جائے گا..... ہیں نا؟"

"ہاں جی....." وہ الجھن آمیز حیرت سے مجھے تکنے لگا۔ "آپ کو یہ ساری باتیں کیسے پتا چلیں؟"

امام دین اور اس کے ہم راہی بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب میں میری یہ پہلی انٹری بڑی سنسنی خیز اور تجسس آمیز ثابت ہوئی تھی۔ میں نے امام دین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"امام دین! میں تھانے دار ہوں ذرا وکھری ٹائپ کا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری بہو کا نام شبانہ ہے اور سلامو سے بڑی اس کی دو بہنیں فرزانہ اور ناہید ہیں مگر تمہاری آنکھوں کا تارا صرف ننھا سلامو ہے۔ کیا میں نے کچھ غلط کہا.....؟"

"نہیں سرکار..... آپ تو سولہ آنے ٹھیک بات کر رہے ہیں۔" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔

"مجھے بتاؤ، سلامو کتنے بجے غائب ہوا تھا؟" میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"صحیح ٹائم بتانا تو ممکن نہیں ہے جناب۔" وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "رات کو وہ اچھا خاصا سویا تھا۔ جب صبح ہم جاگے تو سلامو گھر میں موجود نہیں تھا۔"

"سلامو سوتا کہاں تھا؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"وہ ہمیشہ میرے پاس سوتا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "پچھلی رات بھی وہ میرے برابر، دوسری چارپائی پر سویا تھا جبکہ شبانہ، فرزانہ اور ناہید دوسرے کمرے میں سوئی تھیں۔ آج صبح جب میری آنکھ کھلی تو سلامو کی چارپائی خالی تھی۔ سب سے پہلے میں نے گھر کے اندر سلامو کو تلاش کیا پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے چک کا کونا کونا دیکھ ڈالا مگر وہ کہیں بھی نہیں ملا....." بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

"اور اب ہم سلامو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آپ کے پاس آ رہے تھے کہ آپ راستے میں مل گئے۔"

"سمجھ لو، میں نے تمہارے پوتے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی۔" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "اب تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ میں پھر کسی وقت تمہارے پاس آؤں گا یا تمہیں تھانے بلوا لوں گا۔ اگر تمہارا بیٹا نظام دین کوٹ لکھن سے واپس آ جائے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا.....؟"

"جی، میں سمجھ گیا۔" وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا پوتا مل جائے گا نا.....!"

"میں بہت جلد تمہارے پوتے کو بازیاب کر لوں گا۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

UUNOVELS.COM

امام دین غم سے بوجھل آواز میں بولا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرا سلامو گیا کہاں.....؟''

''تمہارے پوتے کو تمہاری ہی عمر کے ایک بڈھے بابے نے اغوا کرلیا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''لیکن تم فکر نہیں کرو۔ میں بہت جلد اس بڈھے کا سراغ لگالوں گا۔ وہ بڈھا مل گیا تو سمجھو، تمہارا پوتا بھی مل گیا۔''

''کون ہے وہ ظالم بڈھا اور اس نے میرے پھول جیسے پوتے کو کیوں اغوا کیا ہے؟'' امام دین نے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ''معصوم سلامو نے اس بڈھے کا کیا بگاڑا تھا؟''

''تمہاری طرح میرے ذہن میں بھی اس بڈھے کی ذات کے حوالے سے بہت سارے سوالات موجود ہیں امام دین۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور ان تمام سوالات کے جوابات کے لیے ہمیں آج شام تک یا پھر کل تک انتظار کرنا ہوگا۔''

میں نے امام دین موچی کو تسلی تشفی دی اور کانسٹیبل عارف محمود کے ساتھ ایک تانگے میں بیٹھ کر پیرمحل کے اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا۔ میں نے امام دین اور اس کے ساتھیوں منظور، صادق اور... دلدار کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ گزشتہ رات کوئی بوڑھا شخص امام ... دین بن کر میرے کوارٹر پر آیا تھا اور وہ اپنے بیمار پوتے کو فوری طور پر اسپتال لے جانا چاہتا تھا۔ اس مصیبت زدہ بڈھے پر ترس کھا کر میں نے اسے اسپتال پہنچانے کا بندوبست کردیا تھا۔ اس معاملے سے ابھی تک کانسٹیبل نوید احمد کلی طور پر اور کانسٹیبل عارف محمود جزوی طور پر آگاہ تھا۔ تھانے میں اور کسی کو اس واقعے کی خبر نہیں تھی۔ اسپتال کی طرف جاتے ہوئے میں نے کانسٹیبل عارف کو مزید تفصیلات بھی بتادیں۔

''ملک صاحب! جو بڈھا پچھلی رات امام دین موچی بن کر آپ کے کوارٹر پر آیا تھا، یقیناً وہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے۔'' عارف نے میری بات سننے کے بعد تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں جلد از جلد اس فراڈیے بڈھے کو گرفتار کرنا ہوگا۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''اسی سلسلے میں ہم پیرمحل اسپتال جارہے ہیں۔ مجھے امید ہے، وہاں سے اس بڈھے کا کوئی سراغ مل جائے گا.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''عارف! وہ بڈھا جو کوئی بھی ہے، یقیناً اس خطرناک کھیل میں وہ اکیلا نہیں ہے۔ ہم فرض کرلیتے ہیں کہ اس بڈھے نے یا اس کے کسی ساتھی نے اپنے کسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے امام دین موچی کے پوتے کو اغوا کرلیا لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نقلی امام دین نے اپنے کھیل میں ہمارے تھانے کو ملوث کیوں کیا؟ اس نے مجھ سے کئی ایک جھوٹ بولے اور بچے کی بیماری کی کہانی سنا کر میری ہمدردی حاصل کی..... کیوں..... اس نے اپنے اس گندے کھیل میں مجھے کیوں استعمال کیا..... آخر اس کی مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

''ملک صاحب! آپ کو اس تھانے کا چارج سنبھالے تو ابھی صرف تین دن ہوئے ہیں۔'' کانسٹیبل عارف نے اپنے عقل مند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اتنی جلدی آپ کا کوئی دشمن کیسے بن سکتا ہے؟ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔''

''اور کون سا چکر؟'' میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے شک ہورہا ہے کہ وہ بہروپیا ہمارے تھانے کو اس معاملے میں ملوث کرکے کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' وہ میرے استفسار کے جواب میں بولا۔ ''امام دین موچی کے پوتے کا اغوا اس کے کسی مذموم کھیل کی ایک کڑی ہے۔ اللہ رحم کرے..... پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔''

''عارف! تم اس تھانے میں کب سے ہو؟'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔

''لگ بھگ پانچ سال ہوگئے ہیں جناب۔'' اس نے بتایا۔

''تمہارا تعلق چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب سے ہے اور امام دین بھی اسی چک میں رہتا ہے لہٰذا اس امر میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں ہونا چاہیے کہ تم امام دین اور اس کے گھر کے دیگر افراد کو اچھی طرح جانتے ہوگے..... ہیں نا؟''

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''کیا ان کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ رہی ہے؟''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''نظام دین کا کبھی کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا ہو؟'' میں نے کرید کا عمل جاری رکھا۔

UUNOVELS.COM

''نہیں ملک صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''یہ باپ اور بیٹا اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان ہیں۔ سارا دن اپنی دکان میں مصروف رہتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے والے معاملات سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔''

''عارف! کیا تمہیں یہ بات عجیب سی نہیں لگ رہی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر پوچھا۔ ''ایک ایسی فیملی جو امن پسند اور صلح جو ہو، ان کے ایک پانچ سالہ معصوم بچے کو کوئی کیوں اٹھا لے جائے گا اور وہ بھی موسم سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار رات میں.....؟''

''آپ کی بات میں وزن تو ہے ملک صاحب.....'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''لیکن اس کے اندر ایک خرابی بھی موجود ہے جس کی وجہ سے اس معاملے کی چولیں ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں رہی ہیں۔''

''تمہارا اشارہ کس خرابی کی جانب ہے عارف؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ رات آپ نے اس تھکی امام دین موچی کے پاس جو پانچ سالہ بے ہوش بچہ دیکھا تھا، وہ اصلی امام دین کا پوتا سلام دین عرف سلامو ہی تھا؟'' کانسٹیبل عارف نے سرسراتی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

عارف کا یہ سوال پُراز ذہانت اور بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ میں نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ''بالکل نہیں۔ میں نے سلامو کو کبھی نہیں دیکھا اس لیے پہچاننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بڈھے نے مجھے جو بتایا، میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا لہٰذا میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ سلامو تھا یا کوئی اور بچہ!''

''اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ امام دین کے پوتے کو اغوا کر کے کہیں اور پہنچا دیا گیا ہو اور ہمارے تھانے کو گمراہ کرنے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا گیا ہو۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''یہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ گمبھیر بھی ہو سکتا ہے، جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔''

''تم تو سلامو کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہو نا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''جی ملک صاحب..... صد فیصد!''

''بس تو پھر کسی بھی گمبھیرتا کو اپنے حواس پر سوار نہیں ہونے دو۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تھوڑی ہی دیر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہونے والا ہے۔''

عارف نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تھوڑی دیر میں ایسا کیا ہونے والا ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دے گا۔ اس کے بعد ہم دونوں کے بیچ خاموشی چھا گئی۔ تاہم ہمارا تانگا سبک خرامی سے پیر محل کے اسپتال کی سمت رواں دواں رہا۔

◆◆◆

آج صبح چھ سو بہتر بنا تیرہ گ ب کا رخ کرنے سے پہلے میں نے کانسٹیبل نوید احمد کو پیر محل والے اسپتال بھیجا تھا تاکہ وہ رات والے بہروپیے امام دین اور اس کے بے ہوش پوتے کی اصلیت جان سکے۔ رات کو نوید کی نگرانی ہی میں، میں نے اس فراڈیے بڈھے کو تانگے پر سوار کر کے اسپتال بھجوایا تھا۔ اس وقت میری نظر میں وہ بڈھا بہت ہی پریشان حال اور مصیبت زدہ تھا لیکن اب میں اس کے مکر و فریب سے واقف ہو چکا تھا اسی لیے میں نے کانسٹیبل عارف کے ہمراہ اسپتال جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اس دروغ گو بڈھے کو چھاپ سکوں لیکن اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں کانسٹیبل نوید سے ملاقات ہو گئی۔

وہ اسپتال سے واپس آ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گیا اور بڑی جلدی میں ہمارے تانگے کی جانب بڑھا۔ اس کی چال اور چہرے کے تاثرات میں بے پناہ ہیجان پایا جاتا تھا۔ اس کی حالت نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی میں نے سوال داغ دیا۔ یہ سوال اپنے پیٹ میں کئی استفسارات چھپائے بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا نوید..... تم اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟ میں نے تمہیں جس کام کے لیے بھیجا تھا، اس کا کیا ہوا؟''

''غضب ہو گیا ملک صاحب۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''وہ بڈھا کوئی بہت ہی بڑا مجرم ہے۔ بچے کو اسپتال پہنچانے کے بعد وہ پتا نہیں، کہاں غائب ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا.....'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''وہ بچہ کہاں ہے اور اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بچہ ہوش میں آ گیا ہے اور اب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر اس پر توجہ دے رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ڈاکٹرز نے بچے اور بڈھے کے بارے میں تمہیں کیا بتایا ہے؟''

''رات کو میں نے ہی ان دونوں کو اسپتال پہنچایا تھا اس لیے اسپتال کے عملے نے مجھے بڑی تفصیل کے ساتھ ایک پراسرار کہانی سنائی ہے۔'' کانسٹیبل نوید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب میں نے انہیں اسپتال پہنچایا تھا تو رات

UUNOVELS.COM

کی ڈیوٹی والے ایک ڈاکٹر نے میری درخواست پر بچے کا چیک اپ شروع کر دیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا مگر اب پتا چلا ہے کہ بچے کے تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے کسی زود اثر خواب آور دوا کی مدد سے بے ہوش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کو شک تھا کہ بچے کو کلوروفارم میں بسا ہوا کوئی رومال سنگھا کر اغفیل کیا گیا تھا۔ اگر بروقت اسے فوری طبی امداد نہ دی جاتی تو اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی جبکہ اس بڈھے نے پہلے آپ کو اور بعد ازاں اسپتال کے عملے کو بچے کے پیٹ کے درد کی جو کہانی سنائی تھی، وہ اصل صورتِ حال سے لگا نہیں کھاتی تھی لہٰذا ڈاکٹر نے اس بڈھے کا انٹرویو کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس دوران میں وہ بڈھا غائب ہو چکا تھا۔ اسے اسپتال کے ہر حصے میں تلاش کیا گیا مگر وہ کہیں بھی نہیں ملا.....'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹرز نے بچے کے علاج کی طرف سے کوئی غفلت نہیں کی اور کوشش کر کے اسے ہوش میں لے آئے ہیں۔ وہ پولیس والوں کا انتظار کر رہے تھے تاکہ اس بچے کو ہمارے سپرد کیا جائے۔ میں یہاں پہنچا اور مجھے ان تمام حالات کا علم ہوا تو میں سیدھا آپ کی طرف چل پڑا تاکہ اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کیا جائے۔''

کانسٹیبل نوید مجھے حالات سے آگاہ کر چکا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم ابھی چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب سے آ رہے ہیں۔ وہاں کے وسنیک اصلی امام دین موچی کے پوتے کو پچھلی رات کسی نے سوتے میں اغوا کر لیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اسپتال میں زیرِ علاج بچہ امام دین موچی کا پوتا سلام دین عرف سلامو ہی ہو۔ تم دونوں میں سے ایک اسپتال میں موجود رہ کر بچے پر کڑی حفاظتی نگاہ رکھے اور دوسرا چک جا کر امام دین موچی کو لے کر اسپتال پہنچے تاکہ بچے کی شناخت کا معاملہ حل ہو سکے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں واپس اسپتال جاتا ہوں۔'' کانسٹیبل نوید صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بولا۔ ''اور عارف امام دین موچی کو اپنے ساتھ لے کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ اگر وہ بچہ امام دین موچی کا اغوا شدہ پوتا سلامو ہی ہے تو پھر ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''اگر امام دین موچی اس امر کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اسپتال میں زیرِ علاج بچہ اس کا پوتا سلامو ہی ہے تو آپ لوگ بچے کو ڈسچارج کروا کر امام دین کے ساتھ ہی تھانے لے آئیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بنیادی طور پر اغوا کا کیس ہے لہٰذا قانونی کاغذی کارروائی ضروری ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' نوید اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ واپس تھانے جا رہے ہیں؟''

''ہاں.....'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دغاباز بدمعاش اس بڈھے کا سراغ لگانے کے لیے سرگرم عمل ہونا ہے اور اس کے لیے فوری طور پر تھانے جانا ضروری ہے۔''

دونوں کانسٹیبلز کو ان کا کام سمجھانے کے بعد میں تھانے آ گیا۔ اس وقت تک دوپہر ہو چکی تھی۔ میں جیسے ہی اپنے کمرے میں پہنچا، اے ایس آئی فرہاد باجوہ میرے پاس آ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ملک صاحب! سب خیریت تو ہے نا۔ آج آپ صبح ہی صبح کس مصروفیت میں الجھ گئے ہیں؟''

''فرہاد! میں تو پچھلی رات ہی سے اس معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''گزشتہ شب چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب سے ایک پانچ سالہ بچے کو اغوا کر لیا گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''بہرحال مذکورہ بچے کو بازیاب کر لیا گیا ہے۔ وہ اس وقت پیر محل کے اسپتال میں ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں کانسٹیبل نوید اور عارف اس بچے کو لے کر تھانے پہنچ جائیں گے۔''

''ملک صاحب! یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔'' اے ایس آئی شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور آپ نے مجھ سے ذکر تک کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ آخر ایسی کیا ناراضی.....؟''

''فرہاد! آج کیا تاریخ ہے؟'' میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے استفسار کیا۔

اس نے شک زدہ نگاہ سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''پچیس نومبر۔''

''میں نے بائیس نومبر کو اس تھانے کا چارج سنبھالا ہے یعنی یہاں کام کرتے ہوئے ابھی مجھے صرف تین دن ہی ہوئے ہیں۔'' میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا فرہاد؟''

''نو سر!'' اس نے گردن کو نفی میں حرکت دی اور بولا۔ ''آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔''

''کیا ان تین روز سے پہلے بھی ہم دونوں کہیں مل چکے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''بائیس نومبر سے قبل بھی کیا ہمارے درمیان کسی قسم کا تعلق واسطہ رہا ہے؟''

UUNOVELS.COM

''ہرگز نہیں سر.....'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''تو پھر میرا تم سے خفا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''دراصل پچھلی رات سے اب تک حالات اتنے پراسرار انداز میں پیش آئے ہیں کہ میں اپنے عملے کو ڈھنگ سے کچھ بتا ہی نہیں پایا۔ بہرحال، میں سمجھتا ہوں، آج شام تک ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔''

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو آپ مجھے بھی اس بارے میں کچھ بتائیں۔'' اے ایس آئی گہری دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہیں..... ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تھانے کے عملے کو اپنی ایک ٹیم سمجھتا ہوں اور ان کے مکمل یقینی تعاون کے ساتھ ہی آگے بڑھتا ہوں۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے اے ایس آئی فرہاد باجوہ کو نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر مختلف قسم کے تاثرات ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! مجھے تو اس پراسرار بڈھے کی رات والی کارروائی سے کسی خطرناک سازش کی بو آ رہی ہے۔ اس کے مقاصد جو بھی رہے ہوں لیکن یہ تو واضح ہے کہ اس نے ہمارے تھانے کو اس کھیل میں ملوث کرنے کی کوشش کی ہے، خصوصاً آپ کو.....!''

''ہوں.....'' اے ایس آئی کے تجزیے سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فرہاد! تمہاری بات دل کو لگتی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نام نہاد امام دین موچی کو مجھ سے کیا بیر تھا۔ اس نے اپنے اسکرپٹ میں مجھے کیوں انٹر کیا؟''

''میں بھی اسی حوالے سے سوچ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کوئی لنک ذہن میں نہیں آ رہا۔''

''تمہیں اس تھانے میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میں پچھلے دو سال سے ادھر ہی ہوں۔''

''پھر تو تمہیں قادر بخش صاحب کے ساتھ کام کرنے کا بھرپور موقع ملا ہو گا؟''

''جی بالکل!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''قادر بخش صاحب بڑے ہی دبنگ اور نڈر پولیس آفیسر تھے۔ انہوں نے ڈاکوؤں کے خلاف بڑی جواں مردی سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔'' بات کے اختتام تک پہنچتے ہوئے وہ خاصا رنجیدہ ہو گیا تھا۔

''کہیں کوئی راکھ میں دبی ہوئی چنگاری تو نہیں سلگ اٹھی۔'' میں نے اے ایس آئی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ڈاکوؤں نے قادر بخش صاحب کو ختم کر دیا ہے لیکن ان کی مذموم کارروائیاں تو اب بھی جاری ہوں گی بلکہ پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ وہ سرگرمِ عمل ہوں گے۔''

''قادر بخش صاحب کو لگ بھگ ایک ماہ پہلے یعنی اکتوبر کے آخری ہفتے میں شہید کیا گیا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس کے بعد اب تک ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جسے جبرو کے گروہ سے منسوب کیا جا سکے۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ لوگ ایک ماہ کا وقفہ دے کر دوبارہ میدانِ لوٹ مار میں اتر آئے ہوں اور یہ پراسرار بڈھا انہی کا کوئی مہرہ ہو۔''

''جبرو...'' ڈاکوؤں کے سرغنہ کا نام تھا۔ اس کے گروہ میں، اس کے علاوہ آٹھ مزید ڈاکو بتائے جاتے تھے جن کے ناموں سے کوئی واقف نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے ان کی شکل دیکھی تھی۔ وہ لوگ واردات کے دوران میں اپنے چہروں پر ڈھاٹے لگا کر رکھتے تھے۔ وہ تمام لڑائی بھڑائی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے ماہر تھے۔ جبرو کا نام عبدالجبار بتایا جاتا تھا جو بگڑ کر ''جبرو'' ہو گیا تھا۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کے سردار کا نام بھی اصلی تھا یا نہیں.....!

''ہاں..... ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے فرہاد باجوہ کے خیالات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم جنگل والے مشن میں قادر بخش صاحب کے ساتھ تھے؟''

''نہیں ملک صاحب!'' اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''میں اس روز کسی محکمہ جاتی کام سے شورکوٹ گیا ہوا تھا۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس مشن میں شہید قادر بخش کے ساتھ عملے کا کون کون بندہ تھا؟''

''صرف کانسٹیبل امجد علی ان کے ساتھ تھا۔'' فرہاد باجوہ نے بتایا۔ ''امجد کے مطابق، قادر بخش صاحب نے اسے جنگل کے بائیں جانب والے حصے کی طرف بڑھنے کے لیے کہا تھا اور وہ خود دائیں سمت والے حصے کی جانب بڑھ گئے تھے۔''

UUNOVELS.COM

''مطلب یہ کہ امجد علی نے انچارج صاحب کو اپنی آنکھوں سے شہید ہوتے نہیں دیکھا؟''

''امجد کا تو یہی بیان ہے ملک صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''مزید تفصیلات کے لیے آپ اس کا انٹرویو کرلیں۔''

''وہ تو میں کروں گا ہی.....'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''مجھے فوری طور پر ایک کھوجی کی ضرورت ہے۔ کیا اس شعبے کا کوئی بندہ مل جائے گا۔ میں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے ایک ضروری کام نمٹانا چاہتا ہوں۔''

''جی..... میں رجو کو بلاتا ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ رمضان عرف رجو ایک عمر رسیدہ اور تجربہ کار کھوجی ہے اور ادھر نزدیک ہی رہتا ہے۔''

اے ایس آئی فرہاد باجوہ کی مستعدی قابلِ دید اور قابلِ داد تھی۔ اس نے جو کہا، آدھے گھنٹے کے اندر وہ کر بھی دکھایا۔ ظہر کی اذان کے بعد میں نے کھوجی رجو کو تھکی امام دین موچی کے کھرے کے حوالے سے اچھی طرح سمجھانے کے بعد کام سے لگا دیا۔ رجو کی عمر لگ بھگ پینسٹھ سال رہی ہوگی تاہم اس کی صحت کو قابلِ رشک کہا جاسکتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ ہاتھ پاؤں کا چاق و چوبند اور صحیح الدماغ شخص تھا۔ فرہاد نے میرے سامنے کھوجی کی پیشہ ورانہ مہارت کی کافی تعریف کی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ رجو اس تعریف پر کتنے فیصد پورا اترتا تھا۔

میں دوپہر کے کھانے اور ظہر کی نماز سے فارغ ہوا تو دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اسی وقت دونوں کانسٹیبلو پیر محل اسپتال سے امام دین موچی اور اس کے پوتے سلامو کو لے کر تھانے پہنچ گئے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے کمرے میں بلالیا۔ بچہ اب ہوش و حواس میں تھا اور اپنے دادا کے پاس خاصا خوش اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ اس فراڈیے نام نہاد امام دین نے کسی زود اثر دوا کی مدد سے سلامو پر جو مصنوعی نیند طاری کی تھی، وہ اب اس کے اثرات سے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے سلامو کے اغوا اور بہ حفاظت بازیابی کے حوالے سے ضروری کاغذی کارروائی کرنے کے بعد امام دین سے کہا۔

''چاچا! اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہیں تمہارا پوتا زندہ سلامت مل گیا۔ اب تم اس کی حفاظت کا خاص خیال رکھنا۔''

''سوہنے رب کے علاوہ میں آپ کا بھی بے حد شکر گزار ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ احسان مندانہ انداز میں بولا۔ ''یہ سب آپ کی محنت اور بھاگ دوڑ کا نتیجہ ہے کہ آپ کے وعدے کے مطابق، سلامو مجھے مل گیا۔ باقی جہاں تک سلامو کی حفاظت کی بات ہے تو میں نے اس سلسلے میں پہلے بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اب یہ ہے کہ میں حد سے زیادہ محتاط رہوں گا۔ انسان کے ہاتھ میں تو صرف کوشش کرنا ہی ہے۔ اس سے آگے جو رب کی مرضی.....!''

''میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں امام دین۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انسان کو خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی بساط بھر کوشش جاری رکھنا چاہیے اور نتائج کو اللہ پر چھوڑ دینے ہی میں عافیت ہے، باقی ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ کارخانۂ قدرت میں ہر اچھے یا برے کام کے ہونے کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔''

اس کے بعد میں نے کانسٹیبل عارف محمود کی معیت اور حفاظت میں امام دین موچی اور اس کے پانچ سالہ پوتے کو ایک تانگے پر سوار کرکے چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب کی جانب روانہ کردیا۔

مغرب سے چند منٹ پہلے کھوجی رمضان عرف رجو نے مجھے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کردی۔ اس کی پیشہ ورانہ تحقیق اور لامحدود تجربے کے مطابق، تھکی امام دین موچی تھانے کے شمال مشرق سے چلتے ہوئے میرے کوارٹر تک پہنچا تھا پھر وہ میری ہم راہی میں کوارٹر سے تھانے کے سامنے والے حصے میں آیا اور تانگے پر سوار ہوکر پیر محل اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا تھا۔ رجو نے مجھے یہ بھی بتایا کہ شمال مشرق میں، جس راستے پر امام دین کا کھرا ملا وہ راستہ سیدھا حیات نگر کو جاتا تھا۔ میرے تھانے سے حیات نگر کا فاصلہ لگ بھگ چار میل تھا۔ میں نے کھوجی بابا سے پوچھا۔

''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ وہ پاکھنڈی بڈھا حیات نگر سے پیدل چلتے ہوئے میرے کوارٹر تک آیا تھا اور وہ بھی ایک پانچ سالہ بچے کو اٹھا کر.....''

''نہیں ملک صاحب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ابھی جس مقام کی نشاندہی کی ہے، وہ اس تھانے سے حیات نگر کی طرف جاتے ہوئے کم و بیش ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ اس مقام سے پیدل چلتے ہوئے آپ کے کوارٹر تک پہنچا تھا لیکن پیچھے سے وہ ایک گھوڑے پر سوار ہوکر مذکورہ مقام تک آیا تھا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کررہے ہو کہ جھوٹا امام دین حیات نگر سے ایک گھوڑے پر سوار ہوکر میرے تھانے سے ایک فرلانگ کے فاصلے تک پہنچا، پھر اس

نے گھوڑا چھوڑ دیا اور پیدل مارچ کرتے ہوئے وہ میرے کوارٹر کے دروازے تک چلا آیا تھا؟''

''میں کم و بیش یہی کہنا چاہتا ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ کم و بیش کیا ہوتا ہے چاچا.....؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے کھوجی رمجو کو گھورا اور کہا۔ ''یہ بجھارتوں والی گفتگو مجھے پسند نہیں۔ جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو۔''

''میں دعوے سے تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا مطلوبہ شخص یعنی نام نہاد امام دین موچی حیات نگر ہی سے ادھر آیا تھا البتہ یہ طے ہے کہ وہ اسی سمت سے سفر کرتے ہوئے تھانے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر پہنچا تھا۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''گھوڑے کے سموں کے دباؤ سے میں نے بہ خوبی اندازہ لگا لیا ہے کہ دراصل وہ دو گھڑ سوار تھے جن میں سے ایک یعنی وہ فراڈیا امام دین مذکورہ مقام تک آنے کے بعد گھوڑے سے اتر گیا اور دوسرا گھڑ سوار، گھوڑے کو واپس لے گیا۔ اگر مجھے اس گھوڑے کے واپسی کے سفر کا کھرا نکالنے کا موقع ملے تو میں آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا سکوں گا کہ وہ گھڑ سوار نقلی امام دین کو یہاں اتارنے کے بعد خود کہاں گیا تھا۔''

کھوجی رمجو انکشاف پر انکشاف کیے جا رہا تھا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دھوکے باز بڈھا کسی آرگنائزڈ کرائم کا حصہ تھا اور اس گھناؤنے کھیل میں اس کے علاوہ بھی کئی افراد شامل تھے اسی لیے اسے ایک خاص مقام پر ڈراپ کرنے کے لیے کوئی گھڑ سوار وہاں تک آیا تھا۔

''رمجو چاچا!'' میں نے کھوجی کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس شاطر بڈھے کے ساتھ ایک پانچ سالہ بچہ بھی تھا۔ کیا تمہیں اس ایک فرلانگ کے راستے میں اس بچے کے پاؤں کے نشانات بھی کہیں دیکھنے کو ملے ہیں؟''

''نہ جی.....'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ گھوڑے پر سواری کے دوران میں اس بڈھے نے بچے کو اپنی گود میں سنبھال رکھا تھا اور گھوڑے سے اترنے کے بعد بھی اس نے بچے کو ایک لمحے کے لیے بھی زمین پر نہیں رکھا تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے کہیں پر بھی اس بچے کے قدموں کے نشانات نہیں ملے۔ اس نے تمام وقت بچے کو اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا۔''

''اس کا ایک اور مطلب بھی ہو سکتا ہے ملک صاحب.....'' رمجو سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ کیا چاچا؟''

''ممکن ہے، چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب میں سے کسی نے وہ بچہ اس نقلی امام دین کے حوالے کیا ہو۔'' رمجو نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتایا۔

''ہوں۔'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رمجو نے ایک خاص پہلو کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میرے تھانے کے شمال میں چک چھ سو بہتر اور جنوب میں چک سات سو بیس اس طرح واقع تھا کہ تھانے اور چک چھ سو بہتر کے بیچ بہت کم فاصلہ تھا اور حیات نگر، تھانے کے شمال مشرق میں چار میل کی دوری پر تھا اور نقلی امام دین اسی سمت سے تھانے تک پہنچا تھا۔ رمجو کی بات میں وزن تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ پانچ سالہ بچہ اس بڈھے کو چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ میں سے کسی نے دیا ہو۔ جو بھی تھا، یہ صورت حال خاصی الجھن زدہ اور فکر انگیز تھی۔ اس نام نہاد امام دین کی تھانے میں آمد اور پھر وہاں سے پیر محل اسپتال کی جانب جامد بہت ہی پراسرار اور معنی خیز تھی اور مجھے جلد از جلد اس اسرار کی تہ میں اتر کر اس مکار بڈھے کی اصلیت کو بے نقاب کرنا تھا۔

''کل کا کیا پروگرام ہے ملک صاحب؟'' کھوجی رمجو کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ ''کیا کل گھوڑے کے کھرے کا تعاقب کرتے ہوئے مجھے حیات نگر کی طرف جانا ہے؟''

''نہیں چاچا! حیات نگر کو ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کل صبح میں تمہیں ایک کانسٹیبل کی معیت میں پیر محل اسپتال کی جانب روانہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ وہ بڈھا اسپتال سے نکل کر کدھر گیا ہے۔ وہ شاطر بڈھا ایک بار ہتھے چڑھ گیا تو پھر میں اس کی زبان ہی سے باقی کے حقائق اگلوا لوں گا۔''

''جو حکم ملک صاحب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''میں کل صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔''

اس کے بعد رمضان عرف رمجو کھوجی مجھے سلام کر کے تھانے سے رخصت ہو گیا۔

رمجو کے جانے کے بعد میں حالاتِ حاضرہ پر غور کرنے لگا۔ دوسرے معاملات کے علاوہ یہ بات بڑی اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی کہ امام دین موچی کے پوتے سلام دین عرف سلامو کا کردار صرف میری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس کھیل میں شامل کیا گیا تھا۔ اس بڈھے کو سلامو

UUNOVELS.COM

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ورنہ وہ اسے اسپتال میں چھوڑ کر غائب نہ ہو جاتا۔ اب سوال رہا یہ کہ وہ میری ہمدردی کا طالب کیوں تھا؟ تو اسی نکتے نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ جب تک میں اس راز سے مکمل آگاہی حاصل نہ کر لیتا، مجھے ذہنی سکون حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

ابھی تک جو حالات و واقعات منظرِ عام پر آ چکے تھے ان کا کوئی سر پیر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بہت سارے معاملات سامنے تھے مگر ان میں ربط و ضبط نظر نہیں آتا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ اس میں سے کچھ بھی بے معنی اور خوامخواہ نہیں تھا۔ یہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھیں مگر ان کے جوڑ اور پیوند واضح نہیں تھے اور یہی لاعلمی بہ الفاظِ دیگر کم علمی ذہن کو الجھاتی تھی۔ بہرحال مجھے اس بات کا یقین تھا کہ آئندہ روز میں اس کیس کی بہت ساری گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

آج دن بھر کی دوڑ دھوپ نے مجھے بری طرح تھکا ڈالا تھا لہٰذا رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے عشا کی نماز ادا کی اور نیند پوری کرنے کے لیے گرم بستر میں گھس گیا۔ گزشتہ رات میں مناسب نیند نہیں لے سکا تھا اور اگلے روز کس قسم کی مصروفیت قدرت نے میرے کھاتے میں لکھ رکھی تھی، اس کا مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔

☆☆☆

چھبیس نومبر کی صبح میں نے ضروری ہدایات دے کر کانسٹیبل نوید احمد کے ساتھ کھوجی رجو کو پیر محل اسپتال کی جانب روانہ کر دیا تاکہ اس کمینے بڈھے کے غیاب کا سراغ لگایا جا سکے۔ وقوعہ کی رات نوید احمد ہی نے اس بڈھے اور امام دین موچی کے بے ہوش پوتے سلامو کو تھانے سے اسپتال پہنچایا تھا۔ اس کے بعد میں نے کانسٹیبل امجد علی کو اپنے پاس بلا لیا۔

امجد کا تعلق رجانہ سے تھا اور وہ گزشتہ دس سال سے اس تھانے میں تھا۔ کانسٹیبل امجد علی اور حوالدار شجاع الدین اس تھانے میں سب سے زیادہ پرانے تھے۔ شجاع الدین کو بھی کم و بیش اتنا ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ حوالدار شجاع الدین ضلع سرگودھا کا رہنے والا تھا جبکہ اے ایس آئی فرہاد باجوہ کا تعلق ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) سے تھا۔ بس میرے اسٹاف میں یہی پانچ افراد شامل تھے۔ ایک حوالدار، ایک اے ایس آئی اور تین کانسٹیبلو.....!

امجد علی ایک بھاری بھرکم اور پستہ قامت پولیس اہلکار تھا۔ اس کی ایک ایک ادا سے سستی اور کاہلی ٹپکتی تھی۔ مجھے اس بات پر خاصی حیرت تھی کہ امجد علی جیسے کاہل الوجود شخص کو تھانہ انچارج قادر بخش صاحب نے ڈاکوؤں والے خطرناک مشن میں اپنے ساتھ کیوں رکھا تھا؟ اے ایس آئی فرہاد باجوہ نے گزشتہ روز مجھے بتایا تھا کہ جب قادر بخش صاحب کی شہادت ہوئی تو کانسٹیبل امجد علی ان کے ہمراہ تھا۔ میں نے ابھی امجد علی کو اسی لیے اپنے کمرے میں بلایا تھا تاکہ اس اندوہناک واقعے کے بارے میں اس سے پوچھ تاچھ کر سکوں۔

وہ مجھے سلام کرنے کے بعد اٹین شن کھڑا ہو گیا تاہم اس کی استادگی میں وہ کرنٹ نظر نہیں آتا تھا جو ایک پولیس اہلکار کا خاصہ ہوتا ہے۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

''بیٹھ جاؤ امجد!''

اس نے ایک کرسی کھینچ کر فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

چند منٹ اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد میں اصل موضوع پر آ گیا اور امجد علی سے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، تم اور حوالدار اس تھانے میں سب سے پرانے ہو۔ تمہیں سابق شہید تھانہ انچارج کے ساتھ کام کرنے کا بھرپور موقع ملا ہو گا؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شجاع الدین مجھ سے ایک دو ماہ سینئر ہے۔ جب میں نے اس تھانے میں ڈیوٹی جوائن کی تو وہ پہلے سے موجود تھا اور جہاں تک قادر بخش صاحب کے ساتھ کام کرنے کی بات ہے تو.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے ان کی موت کا گہرا صدمہ ہے ملک صاحب۔ کاش انہوں نے میری بات مان لی ہوتی تو..... آج وہ زندہ ہوتے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''امجد! میں سمجھا نہیں..... انچارج صاحب نے تمہاری کون سی بات نہیں مانی تھی؟''

آپ کو یہ کہانی پڑھتے ہوئے یقیناً ایسا محسوس ہو رہا ہو گا کہ میں نے اس دھوکے باز بڈھے کو تلاش کرنے کے ساتھ ہی سابق تھانہ انچارج شہید قادر بخش کو پیش آنے والے افسوسناک واقعے کی تفتیش بھی شروع کر دی ہے۔ آپ کے محسوسات بالکل درست سمت میں محوِ سفر ہیں۔ جب مجھے اس تھانے کا چارج سونپا گیا تھا تو ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے میرے سینئر آفیسرز نے مجھے خاص طور پر یہ تاکید کی تھی کہ دورانِ تھانے داری میں دیگر فرائض کی ادائی کے

ساتھ ہی، خود کو محفوظ رکھتے ہوئے میں نے قادر بخش کی شہادت کے معمے کو بھی حل کرنا ہے لہٰذا یہ منصوبہ بیک آف دی مائنڈ پوری طرح ایکٹیویٹ تھا اور میں موقع محل دیکھتے ہوئے اس ذیل میں اپنی تحقیق کو بھی آگے بڑھا رہا تھا۔

''اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قادر بخش صاحب انتہائی نڈر اور دلیر پولیس آفیسر تھے۔'' امجد علی نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''لیکن جانتے بوجھتے ہوئے خود کو موت کے منہ میں دھکیلنا میرے خیال میں بہادری نہیں ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں انہیں روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ باز نہیں آئے۔ انہوں نے میری ایک نہ سنی اور گھنے جنگل کا رخ کر لیا.....''

''ایک منٹ!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ جنگل والے اس مشن میں صرف تم ہی ان کے ساتھ تھے۔ مجھے کھل کر بتاؤ کہ اس روز کیا واقعہ پیش آیا تھا اور انچارج صاحب نے تمہاری کون سی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں پوری تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں وہی تو آپ کو بتا رہا تھا ملک صاحب.....!'' وہ شاکی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی تھی جو اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ بہرحال، میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے امجد! میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ اب میں تمہیں نہیں ٹوکوں گا۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔''

''اس روز میں اور قادر بخش صاحب کہیں سے واپس آ رہے تھے۔'' وہ شروع ہو گیا۔ ''وہ عصر کا وقت تھا۔ جب ہم گھوڑوں پر سوار پیر کل جنگل کے نزدیک سے گزرے تو ہمیں ایک سمت سے چند گھڑ سوار جنگل کے اندر داخل ہوتے دکھائی دیے۔ ان کے گھوڑوں کی رفتار اور چہروں پر موجود ڈھاٹوں نے ہمیں بتا دیا کہ وہ یقیناً جبرو کا گروہ ہے۔ قادر بخش صاحب نے مجھ سے کہا۔

''امجد! ہمیں ان کے تعاقب میں جنگل کے اندر گھس جانا چاہیے۔ جبرو اور اس کے گروہ نے اس پورے علاقے میں اندھیر مچا رکھی ہے۔ یہ اچھا موقع ہے ان لوگوں پر قابو پانے کا۔ میں تو کافی دنوں سے انہیں چھاپنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''سر! آپ کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔'' میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان ڈاکوؤں کو قابو کرنے کے لیے ہمارے پاس اس وقت طاقت بہت کم ہے۔ ہمیں زیادہ مسلح نفری کے ساتھ ان پر ہلّا بولنا چاہیے۔ میں نہتا ہوں اور آپ کے پاس سروس ریوالور کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں ان خطرناک مسلح ڈاکوؤں پر اس وقت ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔''

''یا ابھی یا پھر کبھی نہیں.....'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر عجیب سے لہجے میں بولے۔ ''اگر کہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم تھانے چلے جاؤ۔ میں اکیلا ہی یہ مہم سر کر لوں گا۔ انسان کو ہتھیاروں سے زیادہ قوتِ بازو اور اپنے عزم پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں نے ان شیطانوں کو جنگل میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے لہٰذا انہیں چھوڑنے یا نظر انداز کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم میرے ساتھ آ رہے ہو یا.....؟''

انہوں نے آخری جملہ بڑے چیلنج کرنے والے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے خم ٹھونک کر کہا۔ ''سر! مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا۔ میں ایسا بزدل نہیں ہوں کہ اس سنگین صورتِ حال میں آپ کو اکیلا چھوڑ دوں۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ دانستہ خود کو ہلاکت میں ڈالنا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔''

''پولیس ڈیپارٹمنٹ میں فرض کی ادائی کے دوران میں بعض اوقات عقل و خرد کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے امجد!'' انہوں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ہم اپنی جان کی سلامتی کی فکر میں پڑے رہے تو عوام کی حفاظت کون کرے گا..... تم میرے ساتھ جنگل میں جا رہے ہو نا؟''

''یس سر!'' میں نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

پھر قادر بخش صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں جنگل کے بائیں حصے میں داخل ہو کر جنگل کے قلب کی طرف بڑھوں۔ وہ دائیں حصے میں جا کر جنگل کے قلب کی سمت بڑھیں گے۔ اس طرح کسی مقام پر ہمارا ملاپ ہو جائے گا۔ انہوں نے جبرو اور اس کے ساتھی ڈاکوؤں کو گھیرنے کے لیے جو پلان بنایا تھا اس میں، ان کی ہدایات کے مطابق میں نے ان کا ساتھ دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے گھوڑے کو اسی سمت ایڑ لگا دی جدھر سے فائرنگ کی آواز ابھری تھی۔ اس صورتِ حال نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوطرفہ فائرنگ کا مطلب یہی تھا کہ قادر بخش ڈاکوؤں پر اور ڈاکو قادر بخش پر گولیاں چلا رہے تھے۔''

''اوہ..... دوطرفہ فائرنگ تو واقعی بہت خطرناک ہوتی ہے۔'' میں نے پُرتشویش انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

UUNOVELS.COM

''گولیاں برسنے کا دورانیہ بہت کم تھا ملک صاحب..... یہی کوئی دو تین منٹ۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''پھر گھنے جنگل میں چہار سُو خاموشی چھا گئی تھی۔''

''تب تم نے کیا کیا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

''ملک صاحب! اس خونیں صورتِ حال سے تو میں سناٹے میں آ گیا تھا۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ''میری سوچ جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ جب میرے حواس بجا ہوئے تو مجھے سر کی فکر نے آن گھیرا۔ میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر انچارج صاحب کو پکارنا شروع کر دیا۔ میں ان کا نام لے کر بہ آوازِ بلند پکار رہا تھا مگر ان کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ اس دوران میں، میں گھوڑے پر سوار آگے ہی آگے بڑھتا بھی جا رہا تھا۔ میرا رخ اسی جانب تھا جدھر میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن جنگل گھنا ہونے کی وجہ سے جنگل کے اندرونی حصے میں روشنی بہت کم تھی پھر.....''

اس نے اچانک رک کر سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''پھر کیا امجد؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''پھر میری آنکھوں نے ایک وحشت ناک منظر دیکھا۔'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''جنگل کے بیچوں بیچ میں نے انچارج صاحب کو اپنے ہی خون میں لت پت پڑے دیکھا۔ وہ ڈاکوؤں کی چلائی ہوئی گولیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کی لاش کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب میرے پاس صرف دو ہی راستے تھے۔''

اس نے توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی اور اداس نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے ''دو راستوں'' کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا بلکہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ تھکی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

''یا تو میں قادر بخش صاحب کی لاش کو جنگل میں چھوڑ کر تھانے آتا اور یہاں سے عملے کے دیگر افراد کو ساتھ لے کر جائے وقوعہ پر پہنچتا۔ یہ تو تھا پہلا راستہ..... اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں انچارج صاحب کی لاش کو گھوڑے پر لاد کر تھانے لے آتا۔''

''اور تم نے پہلے راستے کا انتخاب کیا تھا۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''ہیں نا؟''

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی ملک صاحب؟''

''میں نے قادر بخش صاحب کو پیش آنے والے واقعے سے متعلق فائل کا مطالعہ کیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اسی فائل کے اندر تمہارا حلفیہ بیان بھی لگا ہوا ہے۔''

''میرے پاس اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا ملک صاحب۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات تو طے تھی کہ جبرو اور اس کے ساتھی ڈاکو انچارج صاحب کو شہید کرنے کے بعد پھر ادھر کا رخ نہ کرتے لہٰذا میں نے جائے واردات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کو مناسب نہیں جانا تھا۔ بعد ازاں حوالدار شجاع الدین نے جنگل میں جا کر موقع کی کارروائی مکمل کی تھی۔''

میں نے قادر بخش صاحب کی شہادت کے حوالے سے اپنے تھانے کے عملے سے فرداً فرداً بات کی تھی۔ صرف کانسٹیبل امجد علی ہی باقی بچا تھا جسے میں نے ابھی پکڑ رکھا تھا۔ میں اس سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اچانک رونما ہونے والی سنسنی خیز صورتِ حال نے ہماری اس گفتگو کو ہنگامی بریک لگا دیے تھے کیونکہ کانسٹیبل نوید احمد پیر محل سے واپس آ گیا تھا۔

وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت نظر آئی۔ قبل اس کے کہ وہ لب کشا ہوتا، میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''نوید! لگتا ہے، تم راستے ہی سے لوٹ آئے ہو۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''ملک صاحب! اگر خیریت ہوتی تو میں اتنی جلدی واپس نہ آتا۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہم اسپتال کے نزدیک پہنچنے ہی والے تھے کہ ایک ایسی خبر ملی جس نے ہمارے ہوش اڑا دیے چنانچہ آگے بڑھنے کے بجائے ہم واپس آ گئے ہیں۔''

''اور وہ خبر کیا ہے؟'' میں نے سرسراتی آواز میں استفسار کیا۔

''جو نقلی امام دین پرسوں رات پیر محل اسپتال سے اچانک غائب ہو گیا تھا، اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔'' کانسٹیبل نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''اس کی لاش جھاڑیوں کے اندر سے ملی ہے۔''

''کون سی جھاڑیاں؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''جو راستہ پیر محل اسپتال سے حیات نگر کی طرف جاتا ہے، اسی کچے راستے پر اسپتال سے لگ بھگ دو فرلانگ کے فاصلے پر راہ گزر کے کنارے موجود جھاڑیوں کے اندر سے۔'' نوید احمد نے بتایا۔ ''دو افراد اس واقعے کی اطلاع

UUNOVELS.COM

دینے تھانے کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں ہم سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے پولیس یونیفارم میں دیکھا تو سارا ماجرا کہہ سنایا۔اس کے بعد ہی میں نے آگے بڑھنے کے بجائے واپسی کے سفر کا فیصلہ کیا تا کہ آپ کو اس واقعے کی اطلاع دے سکوں۔"

"تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے اس دغاباز بڈھے کی لاش کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟" میں نے سوالیہ نظر سے نوید کو گھورا۔

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

"وہ کوئی اور بوڑھا شخص بھی تو ہوسکتا ہے۔" میں نے امکانی بات کی۔ "جب تم نے مذکورہ لاش کو خود نہیں دیکھا تو پھر تم اس کے بارے میں اتنے پُروثوق کیوں ہو کہ وہ ہمارے مطلوبہ بڈھے ہی کی لاش ہے؟"

"جن دو افراد نے لاش کے بارے میں مجھے بتایا، میں انہیں بھی اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔" کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ان کا بیان کردہ، لاش کا حلیہ تو اسی دھوکے باز بڈھے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ باقی آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔"

"تم ان دونوں بندوں کو میرے پاس بھیج دو اور خود میرے ساتھ پیرمحل جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس دوران میں، میں ان اطلاع کنندگان سے پوچھ تاچھ کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب!" وہ مستعدی سے بولا۔ "میں روانگی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

نوید احمد میرے کمرے سے نکلنے لگا تو میں نے امجد علی کو بھی جانے کا اشارہ کر دیا کیونکہ میں ان دو اطلاع کنندگان سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

مذکورہ افراد میں سے ایک کا نام سلیم اور دوسرے کا جمیل تھا۔ وہ دونوں کھیت مزدور تھے اور پیرمحل کے نواحی علاقے سے ان کا تعلق تھا۔ میں نے باری باری دونوں سے چند اہم سوالات کیے اور اسی نتیجے پر پہنچا جہاں تھوڑی دیر پہلے کانسٹیبل نوید احمد پہنچ چکا تھا۔ پیرمحل اسپتال سے دو فرلانگ کے فاصلے پر جھاڑیوں کے اندر سے جو لاش ملی تھی وہ اسی چال باز بوڑھے کی تھی جسے میں بڑی شدومد سے تلاش کر رہا تھا۔

ٹھیک دس منٹ کے بعد میں جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

پیرمحل شہر سے موضع حیات نگر چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور حیات نگر سے پیرمحل کا جنگل لگ بھگ نو میل کی مسافت پر ہے۔ یہ کُل پندرہ میل کا راستہ خطِ مستقیم میں نہیں بلکہ آپ اسے نصف بیضوی قوس نما سمجھ لیں۔ پیرمحل سے نکل کر جنگل کا رخ کریں تو جنوبی سمت میں جھکتے ہوئے حیات نگر کو چھو کر گزرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیات نگر میرے تھانے سے شمال مشرق میں محض چار میل کی دوری پر تھا۔ جس مقام پر تھکی امام دین موچی کی لاش ملی تھی وہ پیرمحل سے محض دو فرلانگ دور تھا، چونکہ یہ کچا راستہ سیدھا حیات نگر کو جاتا تھا اس لیے سوچا جا سکتا تھا کہ وہ بڈھا پیرمحل کے اسپتال سے نکل کر حیات نگر کی سمت رواں دواں تھا۔

"حیات نگر" اس وقت میرے ذہن پر سوار تھا اور میں کانسٹیبل نوید کے ہمراہ جائے وقوعہ کی طرف جاتے ہوئے اسی گاؤں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جس شاطر بڈھے کی لاش کو میں دیکھنے جا رہا تھا، وہ اور موضع حیات نگر ایک دوسرے کے ساتھ نتھی نظر آتے تھے۔ کھوجی رمجو نے گزشتہ شام مجھے جو رپورٹ دی تھی اس کے مطابق، امام دین موچی (میرا مطلوبہ چال باز شخص) کسی گھوڑے پر سوار ہو کر حیات نگر کی سمت ہی سے میرے تھانے کی طرف آیا تھا اور تھانے سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر وہ گھوڑے سے اتر گیا تھا۔ مذکورہ گھوڑے پر کوئی اور شخص بھی سوار تھا جو تھکی امام دین کو وہاں ڈراپ کر کے واپس چلا گیا تھا۔ صورتِ حال قدم در قدم دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں انہی گنجلک خیالات کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی لاش کو دیکھتے ہی میں نے اور نوید احمد نے فوراً پہچان لیا۔ وہ بدبخت وہی بڈھا تھا جس نے غلط بیانی کر کے ایک روز پہلے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد بڑی بیدردی سے ڈنڈا ڈولی کر کے کچے راستے کے کنارے اُگی ہوئی بے ترتیب جھاڑیوں میں پھینک دیا گیا تھا۔

میں نے وہاں موجود لوگوں میں سے دو افراد کی مدد سے لاش کو جھاڑیوں میں سے نکال کر ہموار زمین پر ڈال دیا اور بڑی باریک بینی سے اس کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔

بڈھے کے سر کے عقبی حصے کو بڑے وحشیانہ انداز میں نشانہ بنا کر اس کی کھوپڑی کو چٹخا دیا گیا تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کسی نے اس کی بے خبری میں عقب سے لاٹھی کا وار کیا تھا۔ پھٹے ہوئے سر کی حالت بتاتی تھی کہ مقتول بڈھے کے سر کو ایک سے زیادہ مرتبہ نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس

خوفناک حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین بوس ہو گیا تھا۔ بعدازاں اس کی موت کا یقین ہو جانے پر قاتل یا قاتلوں نے اسے اٹھا کر جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا۔ مقتول کی چٹخی ہوئی کھوپڑی سے خارج ہونے والا خون پوری طرح جم چکا تھا اور زخم کی حالت بتاتی تھی کہ اسے اس دنیا سے رخصت ہوئے کم و بیش تیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس موٹے حساب کے مطابق، چوبیس نومبر کو آدھی رات کے بعد جب وہ پیرمحل اسپتال سے غائب ہوا تھا تو حیات نگر کی طرف جاتے ہوئے اسے سفاکی سے ٹھکانے لگا دیا گیا تھا۔

چند باتیں روزِ روشن کے مانند عیاں تھیں۔ اول، وہ بڈھا کسی خطرناک شخص کے اشاروں پر ناچ رہا تھا، یعنی وہ اس نامعلوم سازش کا ایک معمولی سا مہرہ تھا۔ دوم، اسے حیات نگر سے کسی خاص مقصد کی خاطر میرے کوارٹر تک پہنچایا گیا تھا تاکہ وہ میری ہمدردی حاصل کرنے کے بعد میرے توسط سے پیرمحل کے اسپتال تک پہنچ جائے۔ سوم، اسے حکم دیا گیا تھا کہ بچے کو اسپتال پہنچانے کے بعد اسے سب کی نظر بچا کر چپکے سے حیات نگر کی طرف پیدل چل پڑنا ہے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ چہارم، اس کا قاتل بھی اسپتال ہی سے اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا اور دو فرلانگ کے فاصلے پر قاتل نے بڑی بیدردی سے اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ قاتل کوئی ایک شخص بھی ہو سکتا تھا اور ایک سے زیادہ افراد بھی۔ پنجم، عین ممکن تھا کہ اس بڈھے کا قاتل بھی اسی سازشی کردار کا بھیجا ہوا ہو جس کے احکامات کی تعمیل میں بڈھے نے یہ سارا کشٹ اٹھایا تھا اور..... یہ پانچواں نکتہ خاصا سنگین اور فکر انگیز تھا۔

جائے وقوعہ پر درجن بھر افراد موجود تھے۔ میں نے فرداً فرداً ان سب سے مقتول کے بارے میں مختلف سوالات کیے لیکن ان کی جانب سے ایک بھی ایسا جواب موصول نہیں ہوا جو اس معاملے پر روشنی ڈال سکے۔ ان میں سے کوئی بھی مقتول کو جانتا نہیں تھا۔ گویا وہ سب کے لیے اجنبی تھا۔

میں نے وقوعہ کی کارروائی کو مکمل کرنے کے بعد کانسٹیبل سے کہا۔ ''نوید! تم اس بے نام بڈھے کی لاش کو... بغرض پوسٹ مارٹم پیرمحل کے اسپتال لے جاؤ اور پھر وہاں سے سیدھا تھانے چلے جانا۔''

''اور آپ ملک صاحب.....؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''میں ذرا حیات نگر کے دورے پر جا رہا ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اب تک کے حالات کے منظر میں حیات نگر کی حیثیت کلیدی نظر آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے، وہاں سے مجھے کوئی ایسا اشارہ مل جائے جو اس پیچ در پیچ الجھی ہوئی صورتِ حال پر روشنی ڈال سکے۔''

وہ تفہیمی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ گیا ملک صاحب۔'' پھر پوچھا۔ ''اگر میں بڈھے کی لاش کو تانگے میں ڈال کر اسپتال لے جاؤں گا تو پھر آپ حیات نگر کیسے جائیں گے۔ یہ گاؤں یہاں سے لگ بھگ چھ میل کی دوری پر ہے۔''

''میرا خیال ہے، قدرت نے میری سواری کا بندوبست کر دیا ہے۔'' میں نے شمال مغرب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پُرمعنی انداز میں کہا۔

کانسٹیبل نوید نے گردن اٹھا کر اسی سمت میں دیکھا جدھر میں نے اشارہ کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہونٹوں سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ ''اوہ.....!''

مذکورہ جانب گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شہ سوار گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ہماری طرف آ رہا ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا، خاصی جلدی میں نظر آتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گرد و غبار کے طوفان میں سے نکل کر ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''نوید! اس گھڑسوار کو روکو۔''

نوید نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

اتنے لوگوں کو ایک جگہ جمع پا کر اس گھڑسوار نے ویسے بھی گھوڑے کی رفتار کم کر دی تھی۔ پھر جب اس کی نظر دو باوردی پولیس اہلکاروں پر پڑی تو وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور الجھن زدہ نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''یہاں کیا ہوا ہے؟''

''یہاں جو بھی ہوا ہے اس کے بارے میں تمہیں بعد میں بتا دیا جائے گا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''میں چک تین سو اڑتیس گ ب سے آ رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور حیات نگر جا رہا ہوں۔''

''کیا ادھر حیات نگر میں کوئی خوفناک آگ بھڑک اٹھی ہے جو تم اس طوفانی رفتار سے ادھر جا رہے ہو؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''نہیں جناب..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی

UUNOVELS.COM

سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''گھوڑے کو دوڑانا میرا شوق ہے۔ مجھے اس سے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔''

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا نیا تھانہ انچارج ہوں۔'' میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کیا نام ہے اور تم ادھر چک تین سو اڑتیس گ ب میں رہتے ہو یا تمہارا تعلق حیات نگر سے ہے؟''

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھانے دار صاحب۔'' وہ باادب، باملاحظہ، ہوشیار انداز میں بولا۔ ''میں درحقیقت چک تین سو اڑتیس گ ب کا وسنیک ہوں اور اس وقت حیات نگر کسی سے ملنے جارہا ہوں۔ میرا نام بالاجٹ ہے۔ میں اپنے گاؤں میں زمینداری کرتا ہوں۔'' پھر اس نے خود ہی وضاحت کر دی۔ ''میرا اصل نام اقبال حسن ہے مگر ''بالاجٹ'' مشہور ہو گیا ہے۔''

میں نے سر کو اثباتی جنبش دینے کے بعد پوچھا۔ ''حیات نگر کس بندے سے ملنے جارہے ہو اور تمہیں اس بندے سے کیا کام ہے؟''

''اس بندے کا نام فدا حسین ہے جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''اور میں اس سے اپنی ایک امانت واپس لینے جارہا ہوں۔''

میرے استفسار پر اقبال حسن عرف بالاجٹ نے مجھے بتایا کہ اس کے دو ہزار روپے فدا حسین کی طرف تھے جن کی وصولی کے لیے وہ حیات نگر جارہا تھا۔ اس زمانے کے دو ہزار روپے آج کل کے کئی لاکھ سمجھ لیں۔ فدا حسین بھی ایک زمیندار تھا اور ان دونوں میں رقم کا لین دین چلتا رہتا تھا۔

''کیا تم اکثر حیات نگر جاتے رہتے ہو؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی بالکل۔''

''پھر تو تم حیات نگر میں بسنے والے لوگوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہو گے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں..... میں تقریباً وہاں کے سبھی لوگوں کو جانتا ہوں۔'' اس نے الجھن بھرے انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن آپ مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

نامعلوم بڈھے کی لاش کو تفصیلی معائنے کے بعد ایک چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں نے بالاجٹ کے سوال کا براہِ راست جواب دینے کے بجائے لاش کے چہرے والے حصے کے اوپر سے چادر ہٹادی اور پوچھا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟''

''نن..... نہیں.....'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ تو چک تین سو اڑتیس گ ب میں اور نہ ہی حیات نگر میں.....'' پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ بزرگ کون ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے؟''

''انہی دونوں سوالات کے جوابات مجھے بھی درکار ہیں بالاجٹ.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حیات نگر جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے گھوڑے پر وہاں تک پہنچادو گے؟''

''کیوں نہیں جناب..... ضرور لے جاؤں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''نوید! تم لاش کو لے کر فوراً اسپتال روانہ ہو جاؤ۔''

''جی ملک صاحب! میں نکل رہا ہوں۔'' کانسٹیبل نے مستعد لہجے میں جواب دیا۔

میں بالاجٹ کے عقب میں، اس کے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ بالاجٹ نے گھوڑا حیات نگر کی طرف بڑھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر میں گھوڑے کو بھگاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟''

''گھوڑے کی تیز رفتاری کے حوالے سے تو کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''البتہ، اس دوڑ کے مابعد اثرات میرے لیے قابلِ اعتراض ہو سکتے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب.....!'' وہ گھڑ سواری پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''مابعد اثرات سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''اگر تم ریس کورس کے ٹریک پر یا کسی صاف ستھری پختہ سڑک پر اپنے گھوڑے کو ہوا سے باتیں کرنے میں لگا دیتے تو میں یقیناً اس سفر سے لطف اندوز ہوتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس وقت ہم بالکل کچے راستے کی مسافرت پر ہیں۔ اگر تم اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاؤ گے تو ہمارے چاروں طرف دھول مٹی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا جو میری یونیفارم کا سواستیاناس مار ڈالے گا اور یہ مجھے کسی بھی قیمت پر قابلِ قبول نہیں ہے۔''

''سمجھ گیا جناب۔'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

اس کے بعد بالاجٹ درمیانی رفتار سے گھوڑے کو آگے بڑھانے لگا۔ دورانِ سفر میں، ہمارے بیچ ہلکی پھلکی

UUNOVELS.COM

گفتگو کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اقبال حسن عرف بالا جٹ کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ وہ ایک خوش شکل گبرو جوان تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اس نے نرگس نامی، اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے محبت کی شادی کی تھی۔ ان کے دو بچے بھی تھے۔ ان کی شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور یہ بندھن بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے مقام پر قائم ودائم تھا۔

لو میرج (محبت کی شادی) کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں عمومی تصور یہی ہے کہ ایسی شادیاں جلد یا بہ دیر ناکامی سے ہمکنار ہو جاتی ہیں۔ اس تصور میں کسی حد تک سچائی بھی موجود ہے مگر اسے فارمولا یا اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض محبت کی شادیاں مثالی اور کماحقہ، کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

بالا جٹ نے مجھے بتایا کہ اسے پولیس میں بھرتی ہونے کا بہت شوق تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''پھر تم نے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے کیا کیا؟''

''میں کچھ بھی نہیں کر پایا تھانے دار صاحب۔'' وہ قدرے مایوسی سے بولا۔ ''اباجی کے حکم کے سامنے میں مجبور ہو گیا تھا۔''

''تمہارے اباجی نے ایسا کون سا افلاطونی حکم دے دیا تھا کہ تمہیں اپنے ارمانوں کا خون کرنا پڑا؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں جی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے پاس پندرہ ایکڑ زرعی اراضی ہے۔ اباجی نے میرے دادا کے زمانے سے زمینداری ہی کی ہے۔ جب میں جوان ہوا تو میں نے بھی کھیتی باڑی کے کاموں میں اباجی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا پھر جب میں نے پولیس میں بھرتی ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تو اباجی نے مجھ سے کہا۔

''بالا پتر! میں اب بیمار رہنے لگا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ کاشت کاری کے معاملات کو تن تنہا دیکھ سکوں۔ اگر تم پولیس میں بھرتی ہو گئے تو تمہیں گھر سے جانا پڑے گا اور ہمارا زمینداری کا کام بری طرح متاثر ہو جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارا آبائی پیشہ بے نشان ہو کر رہ جائے۔ آگے تمہاری مرضی ہے.....!''

''تھانے دار صاحب! میں نے کبھی بھی اپنی مرضی کو اباجی کی مرضی کے آگے نہیں رکھا تھا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اس لیے میں نے اباجی کی خواہش کے سامنے گردن جھکاتے ہوئے اپنے ذہن سے پولیس سروس کا خیال نکال دیا۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر تصحیل لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مگر یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو اباجی بھی اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ میں ان کے حکم کے مطابق کاشت کاری کر رہا ہوں اور الحمدللہ! ایک کامیاب زمیندار ہوں۔''

''بالا جٹ!'' میں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس دنیا میں بہت کم ایسے خوش نصیب والدین ہوں گے جنہیں تمہارے جیسے نیک اور فرماں بردار بیٹے ملے ہوں گے۔ تم نے اپنے اباجی کی بات مان کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ اللہ تم سے بہت خوش ہے۔ تم زندگی میں کبھی بھی کسی سے نہیں ہارو گے۔ کیا تمہاری والدہ حیات ہیں؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ ''امی جی کافی کمزور ہو گئی ہیں۔ اباجی کی موت کے غم نے انہیں توڑ کر رکھ دیا ہے۔''

''اپنی بوڑھی والدہ کی خدمت میں کوئی کمی نہیں آنے دینا۔'' میں نے اسے نصیحت کی۔ ''جو لوگ اپنے والدین کی خدمت کرتے ہیں، ان کے آرام کا خیال رکھتے ہیں اور ان کا کہنا مانتے ہیں، اللہ اور اللہ کا رسول ایسے افراد کو پسند فرماتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں جگہ پر سرخرو ہوتے ہیں۔''

''جی..... میں اور میری بیوی نرگس پوری کوشش کرتے ہیں کہ امی جی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔'' اس نے کہا۔ ''باقی اگر ہم لوگوں سے جانے، اَن جانے میں کوئی خطا ہو جاتی ہے تو اللہ ہمیں معاف کرے۔''

''آمین.....!'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

ہم اسی طرح باتیں کرتے ہوئے حیات نگر پہنچ گئے۔

''آپ کو حیات نگر میں جس کے بھی گھر جانا ہو، بتا دیں۔'' بالا جٹ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو وہیں پہنچا دوں گا۔''

''نہیں بالا..... بس، تم مجھے یہیں اتار دو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ابھی میں نے سوچا نہیں کہ مجھے کدھر جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ گھوڑا روکتے ہوئے بولا۔ ''جو آپ کا حکم.....!''

پہلے میں گھوڑے کی پیٹھ سے اترا، اس کے بعد بالا جٹ بھی نیچے اتر آیا۔ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''بالا! تمہارے اس بے لوث تعاون کے لیے میں دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم کسی وقت تھانے آ کر مجھ سے ملنا۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ ”جی، میں آجاؤں گا پر..... سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ مجھے تھانے کیوں بلا رہے ہیں؟“

”کیا تھانے آنے سے ڈر لگ رہا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں جناب..... ڈرنے والی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”بس تو پھر تم چلے آنا۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ ”باقی کی باتیں ادھر تھانے میں بیٹھ کر ہی کریں گے۔“

”اچھا جی..... ٹھیک ہے۔“ وہ اطاعت مندانہ لہجے میں بولا۔

☆☆☆

موضع حیات نگر لگ بھگ سات سو نفوس کا ایک متوسط گاؤں ہے۔ اس زمانے میں وہاں کم و بیش ڈیڑھ سو گھر آباد تھے۔ آج کل کے بارے میں، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس گاؤں پر چودھری مختار کی حکمرانی تھی۔ میں چودھری مختار کے حوالے سے زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ بس مجھے اتنا ہی پتا چلا تھا کہ وہ ایک رعب داب والا اوکھا قسم کا چودھری تھا۔ میں نے سرِدست چودھری مختار ہی سے ”بسم اللہ“ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی حویلی کی جانب قدم بڑھا دیے۔

مذکورہ حویلی گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھی۔ میں چونکہ اس وقت یونیفارم میں تھا لہٰذا میں جہاں سے بھی گزرتا، لوگ چونک کر شک زدہ نظر سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں لوگوں کی پروا کیے بغیر سبک خرامی سے چلتے ہوئے چودھری مختار کے دولت خانے پر پہنچ گیا جہاں ایک حیرت میری منتظر تھی۔

میں جیسے ہی حویلی کے سامنے پہنچا، مجھے حویلی کے گیٹ پر چودھری مختار کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے دائیں اور بائیں چند حاشیہ بردار بھی موجود تھے۔ چودھری مختار کی عمر پچپن کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک چاق و چوبند شخص تھا۔ اس کے سر کے بال گھنگرالے تھے اور چہرے کی سب سے نمایاں شے اس کی گاما ٹائپ مونچھیں تھیں۔ وہ اس وقت زرق برق ریشمی لباس میں ملبوس تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ خوش دلی سے بولا۔

”ست بسم اللہ ملک صاحب! میرے نصیب کہ آپ یہاں تشریف لے آئے۔ مجھے حکم کیا ہوتا، میں تھانے میں حاضر ہو جاتا۔ آپ کی تعیناتی کا مجھے پتا چلا تھا اور میں خود آپ کے پاس آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”آپ بڑے باخبر چودھری ہیں مختار صاحب!“ میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”آپ کو میری تعیناتی کی خبر ہو گئی، یہ میرے لیے حیرت کی بات نہیں لیکن میرے حیات نگر میں قدم رکھتے ہی آپ کو میری آمد کی اطلاع مل گئی، یہ خاصے اچنبھے کی بات ہے۔ لگتا ہے، آپ کا جاسوسی کا نظام بڑا فعال ہے.....؟“

”بس جناب! یہ سب بھی بہت ضروری ہے۔“ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ آپ حیات نگر میں تشریف لائے ہیں، میں آپ کے استقبال کی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

خاطر حویلی کے اندر سے نکل کر گیٹ پر کھڑا ہو گیا۔"

"یہ تو آپ کی محبت اور بڑاپن ہے چودھری صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بس، حالات ہی کچھ اس طرح پیش آئے ہیں کہ آپ سے ملاقات ضروری ہو گئی۔"

"ایسا کیا ہو گیا ہے ملک صاحب.....؟" وہ پُرتشویش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "آئیں، اندر بیٹھ کر سکون سے بات کرتے ہیں۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں چودھری مختار کے روبرو اس کی حویلی کے کشادہ آراستہ و پیراستہ عالی شان ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے ایک گھریلو ملازم کو میری خاطر مدارات کے حوالے سے ہدایات جاری کیں۔ جب مذکورہ ملازم وہاں سے رخصت ہو گیا تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"ملک صاحب! آپ کن حالات کا ذکر کر رہے تھے جو آپ کو آج مجھ سے ملانے کا سبب بن گئے ہیں؟"

جواب میں، میں نے چودھری مختار کو نامعلوم شاطر بڈھے کی المناک موت کے بارے میں بتا دیا تاہم میں نے چودھری سے اس رات کا ذکر نہیں کیا جب مذکورہ بڈھے نے مجھے بے وقوف بنایا تھا البتہ اصلی امام دین موچی اور اس کے پوتے کا ذکر بھی اس جواب میں شامل تھا۔

چودھری نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر سنسنی خیز لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! مجھے اس مقتول بابے کے کچھن ٹھیک نہیں لگ رہے۔ میں چک چھ سو بہتر بٹا تیرہ گ ب والے موچی امام دین کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اور اس کا بیٹا نظام دین بھلے مانس انسان ہیں۔ اس بڈھے کو ان لوگوں سے کیا بیر تھا جو اس گھر کا معصوم بچہ اغوا کر کے پیر محل کے اسپتال پہنچا دیا اور پھر خود وہاں سے غائب ہو گیا بلکہ آپ نے بتایا ہے کہ اب تو اس منحوس بڈھے کو کسی نے موت کے گھاٹ بھی اتار دیا ہے۔ کافی الجھے ہوئے حالات ہیں جناب عالی.....!"

"حالات تو واقعتاً بے حد الجھے ہوئے ہیں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "سب سے اہم معاملہ اس پراسرار بڈھے کی شناخت کا ہے۔ اگر اس نامراد کا نام اور پتا معلوم ہو جاتا تو اس کیس کو حل کرنے میں خاصی آسانی ہو جاتی۔ میں نے ابھی تک جو تفتیش کی ہے اس کے مطابق، وہ چک تین سو اڑتیس، چک سات سو بیس، چک چھ سو بہتر اور پیر محل وغیرہ کا تو رہنے والا نہیں۔ حیات نگر میری آمد کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکوں۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا جو میری حویلی تشریف لے آئے۔" وہ پُرخلوص نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! میں نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ حیات نگر کی جانب سے تھانے کو سدا تعاون کی پیشکش رہی ہے لیکن آپ سے پہلے والے تھانہ انچارج..... خیر چھوڑیں اس بات کو....." اس نے دانستہ جملے کو ادھورا چھوڑا پھر لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی آپ کے سامنے ہی پتا چلا لیتا ہوں کہ کہیں آپ کا مطلوبہ مقتول میرے گاؤں کا وسنیک تو نہیں تھا۔"

ادھر چودھری مختار کی بات ختم ہوئی، ادھر ایک ملازم کنگ سائز ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ مذکورہ ٹرے میں لوازمات خورونوش کی بہتات دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ چودھری مختار ایک مہمان نواز شخص تھا۔ کھانے پینے کے سامان کو میز پر سجانے کے بعد ملازم واپس جانے لگا تو چودھری نے اس سے پوچھا۔

"کرمو! کیا بدری اور قدری اس وقت حویلی میں موجود ہیں؟"

"جی چودھری صاحب.....!" کرمو نامی اس ملازم نے بتایا۔ "قدری تو صبح سے حویلی ہی میں ہے اور بدری ابھی باہر سے آیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم بدری کو میرے پاس بھیج دو۔"

"جو حکم چودھری صاحب۔" کرمو سر تسلیم خم کرتے ہوئے بولا۔

ملازم کے جانے کے بعد چودھری نے مجھ سے کہا۔

"ملک صاحب! آپ پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں اس لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی نعمتیں آپ کے سامنے حاضر ہیں۔ ان کے احترام اور قدرت کے شکرانے میں شروع ہو جائیں۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کا نمبر ہے۔"

ملازم میرے سامنے میز پر جو انواع و اقسام کی اشیا سجا کر گیا تھا، وہ دو وقت کے کھانے سے بھی مقدار میں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ میں نے نعمتِ خداوندی سے کما حقہ انصاف کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"چودھری صاحب! اس بھرپور دسترخوان کے بعد دوپہر کیا، شام اور رات کے کھانے کی گنجائش بھی کہیں نظ

نہیں آتی۔ آپ مزید کسی اہتمام کی زحمت نہ کریں اور میرے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔"

"میں نے اسی سلسلے میں بدری کو یہاں بلایا ہے ملک صاحب۔" چودھری بڑے اعتماد سے بولا۔ "اور کھانے کے اہتمام سے بھلا زحمت کا کیا لینا دینا۔ یہ تو روز کا معمول ہے۔"

میں نے کھانے اور کھلانے کے موضوع کو فی الحال ایک طرف رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "لگتا ہے، یہ بدری اور قدری آپ کے خاص بندے ہیں؟"

"ملک صاحب! آپ ایک ذہین اور موقع شناس پولیس آفیسر ہیں۔ آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔" وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بدر عرف بدری اور قادر عرف قدری جڑواں بھائی ہیں اور میرے خاص خدمت گاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ کرموں نے بتایا ہے کہ بدری ابھی باہر سے آیا ہے، میں نے اسی لیے اسے یہاں بلایا ہے کہ اس کے پاس تازہ ترین خبریں ہوں گی۔"

"اوہ..... ویری گڈ!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسی وقت بدری ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد وہ چودھری مختار کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ بدری ایک تنومند اور قوی الجثہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی کرختگی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور دراز قامت تھا۔ یقیناً بدری کا جڑواں بھائی قدری بھی اسی کینڈے کا ہوگا۔ وہ لڑائی بھڑائی اور دنگا فساد کا بھی ماہر دکھائی دیتا تھا۔ چودھریوں اور وڈیروں کو بدری ٹائپ کے خدمت گاروں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

"ہاں بھئی بدری! تم کہاں سے آ رہے ہو؟" چودھری مختار نے اس سے پوچھا۔ "اور باہر کی کیا خبریں ہیں؟"

بدری نے چودھری کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ایک بار پھر مجھے دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک ہچکچاہٹ سی ہلکورے لیتی دیکھی۔ بدری کی اس کیفیت کو کائیاں چودھری نے بھی فوراً محسوس کر لیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"یہ ملک صفدر حیات صاحب ہیں بدری۔ ہمارے علاقے کے نئے تھانہ انچارج....." پھر اس نے اپنایت بھرے انداز میں اضافہ کیا۔ "ملک صاحب اپنے ہی ہیں اور ایک قتل کے کیس کی تفتیش کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تم ان کے سامنے ہر بات بلا جھجک کہہ سکتے ہو۔"

"چودھری صاحب! میں ذرا پیر محل کی طرف گیا تھا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور میرے پاس ایک خاص الخاص خبر ہے۔"

میں نے بدری کے ڈرامائی انداز پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا اور ٹھہری ہوئی نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا مگر چودھری مختار نے سرسراتے ہوئے لہجے میں بدری سے استفسار کیا۔

"بدری! تم کون سی خاص خبر کی بات کر رہے ہو؟"

"ادھر پیر محل اسپتال سے کچھ فاصلے پر کسی بوڑھے شخص کی لاش ملی ہے۔" بدری نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "ابھی تک اس کی شناخت نہیں ہو سکی۔ پولیس اس کی لاش کو چیر پھاڑ کے لیے اسپتال لے گئی ہے۔"

"کیا تم نے مقتول کا چہرہ اپنے آنکھوں سے دیکھا ہے؟" چودھری نے بدری سے پوچھا۔

"جی چودھری صاحب۔" بدری اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جب لاش کو اسپتال لے جانے والا تانگا میرے نزدیک سے گزرا تو میں نے تانگے میں موجود پولیس اہلکار سے درخواست کی کہ وہ مجھے صورتِ حال کے بارے میں کچھ بتائے۔ یہ جان کر کہ کسی نامعلوم لاوارث شخص کو بڑی بیدردی سے قتل کر کے اس کی لاش کو جھاڑیوں میں پھینک دیا گیا ہے، میرے اندر بڑا شدید نوعیت کا تجسس جاگ اٹھا تھا اور میں اس معاملے کی حقیقت جاننے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"لاش کو لے کر جانے والا پولیس اہلکار کوئی اچھا انسان تھا۔ اس نے میری درخواست پر تانگا رکوا کر مجھے بوڑھے کی لاش کا چہرہ دکھا دیا اور وہ چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مقتول کا حیات نگر سے کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے.....؟" چودھری مختار نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

"میرا یہی مطلب ہے چودھری صاحب.....!" بدری نے بڑے ادب سے کہا۔ "حیات نگر ہی کیا، اس بڈھے کا آلے دوالے کے بھی کسی دیہات سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے۔ میں نے اس بدقسمت بڈھے کو کہیں بھی نہیں دیکھا۔ پتا نہیں، وہ کون تھا... کہاں سے آیا تھا اور کس نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"ٹھیک ہے بدری! تم جاؤ اور قدری کو بھی اس حوالے سے ہوشیار کر دو۔" چودھری نے گمبھیر انداز میں کہا۔

UUNOVELS.COM

''تم دونوں کو اپنی آنکھیں اور کان پوری طرح کھلے رکھنا ہیں اور..... اگر اس اجنبی مقتول بڈھے کے بارے میں کوئی معمولی سی بات بھی پتا چلے تو فوراً مجھے بتانا ہے..... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بڑی چنگی طرح سمجھ گیا چودھری صاحب!'' وہ کسی بے دام کے غلام کے مانند اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر، گردن خم کرتے ہوئے فدویانہ انداز میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ ہم دونوں بہت مستعد رہیں گے۔''

بدری کے جانے کے بعد چودھری مختار نے مجھ سے کہا۔ ''اگر میں غلط نہیں تو بدری اسی مقتول بڈھے کا چہرہ دیکھ کر آیا ہے جس کی جان کاری کے لیے آپ بڑے بے تاب ہو رہے ہیں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں چودھری صاحب۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''پتا نہیں، وہ بوڑھا شخص کون تھا؟ اس نے کس کے حکم پر امام دین موچی کے پوتے سلامو کو اغوا کر کے اسپتال پہنچایا؟ اور پھر کس کے ہاتھوں موت کی نیند جا سویا.....؟''

''آپ پریشان نہ ہوں ملک صاحب.....!'' چودھری مختار نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''ان شاء اللہ! بہت جلد ہر اسرار سے پردہ اٹھ جائے گا۔ آپ اپنا تحقیقاتی کام جاری رکھیں اور میں بھی اس سلسلے میں کوشش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہم اس مقتول بڈھے کے بارے میں سب کچھ جان جائیں گے۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ اس کا حیات نگر سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ وہ دن دور نہیں جب ہم اس کے حوالے سے مکمل جان کاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

وہ اپنی گفتگو کے دوران میں ''ہم'' کا صیغہ استعمال کر رہا تھا جس سے خلوص اور اپنایت جھلکتی تھی۔ مجھے چودھری کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کے اس بے لوث تعاون کا بہت شکریہ چودھری صاحب!''

''ملک صاحب! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں نے جو کیا اور جو کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، وہ سب تو میرا فرض ہے جناب۔'' وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ''آپ بھلے انسان ہیں اس لیے میرے خلوص پر شک نہیں کر رہے۔ میں یہی بات قادر بخش کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس نے کبھی مجھ پر بھروسا نہیں کیا۔ خیر، گزری بسری باتوں کا تذکرہ کرنے کا کیا فائدہ.....''

چودھری نے دانستہ بات کو لپیٹ دیا تو میں چونک اٹھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھی اس نے سابق تھانہ انچارج شہید قادر بخش کے ذکر پر اچانک خاموشی اختیار کر کے موضوعِ گفتگو کو کسی اور جانب موڑ دیا تھا۔ میں چودھری کے اس رویے کا سبب جانے بغیر نہ رہ سکا۔

''چودھری صاحب'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں کہ سابق تھانہ انچارج سے آپ کو کافی شکایات رہی ہیں؟''

''مجھے نہیں، بلکہ اُسے مجھ سے شکایات تھیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''حالانکہ میں نے کبھی اس کے کسی معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائی تھی۔ میری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ قانون کا احترام کروں اور جہاں تک ممکن ہو، قانون کی مدد کروں مگر یہ بات قادر بخش کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ آخری دنوں میں وہ ڈاکوؤں کے گروہ کے حوالے سے بڑا سرگرم رہا تھا اور جبرو کو اس کے ساتھی ڈاکوؤں سمیت گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لیے انتہائی پُرعزم تھا۔ میں اس کے مقصد اور ہمت کا سب سے بڑا قدرداں تھا اور میں نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے سلسلے میں اسے اپنے بھرپور تعاون کی پیشکش بھی کی تھی لیکن اس نے میری مدد لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ ''ون مین شو'' قسم کا کردار تھا ملک صاحب اور ہر چیز کا کریڈٹ خود ہی لینے کا خواہش مند.....!''

''بس چودھری صاحب!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''ہر شخص کے کام کرنے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔''

''اس سلسلے میں، آپ کا انداز مجھے پسند آیا ہے ملک صاحب.....'' وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں امید کرتا ہوں کہ ہماری خوب جمے گی۔''

''ان شاء اللہ ضرور.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب میں اجازت چاہوں گا چودھری صاحب۔''

''آپ کھانا کھائے بغیر بھلا کس طرح جا سکتے ہیں۔'' وہ اپنایت بھرے لہجے میں بولا۔

''بہت کچھ کھا پی لیا چودھری صاحب۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''آپ کا کھانا مجھ پر ادھار رہا۔ ان شاء اللہ، میں بہت جلدی یہ قرض وصول کرنے آپ کی حویلی دوبارہ آؤں گا۔''

''میری باہیں اور اس حویلی کے دروازے آپ کو ہمیشہ کھلے ملیں گے ملک صاحب!'' وہ جذبات میں ڈوبے

UUNOVELS.COM

ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے بڑی کوشش کی کہ کبھی قادر بخش بھی میری حویلی کو روشنی بخشے مگر اس ضدی شخص نے ایک بار بھی میرے غریب خانے میں قدم رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بہرحال ..'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک رنجیدہ سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہاں آ کر مجھے عزت دی۔''

''ان شاءاللہ! بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''سابق تھانہ انچارج صاحب نے جبرو اور اس کے گروہ کو نتھ ڈالنے کے لیے آپ سے مدد نہیں لی لیکن میں ضرور لوں گا چودھری صاحب۔ اس سلسلے میں کسی وقت بیٹھ کر ہم تفصیلی گفتگو کریں گے اور ایک جامع لائحہ عمل کے بعد کوئی ٹھوس اقدام کریں گے۔''

''مجھے بہت خوشی ہوگی ملک صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔ ''یہ خبیث ڈاکو صرف پولیس ہی کا نہیں بلکہ اس علاقے کے ہر شخص کا مسئلہ ہیں۔ میرے گاؤں کے لوگ کئی بار ان کے ہاتھوں لٹ چکے ہیں اور پھر آپ کے لیے تو سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ ان شیطانوں نے آپ کے ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر قادر بخش کی جان لی ہے۔''

''واقعی.....'' میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جبرو اور اس کے ساتھیوں کے اس قصور کو تو میں کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا۔ شہید قادر بخش کا خون بہت جلد رنگ دکھا کر رہے گا چودھری صاحب۔ ان مردودوں کا خاتمہ میرے ہی ہاتھوں سے ہوگا۔''

اچانک میرے لہجے میں بے پناہ کڑواہٹ شامل ہو گئی تھی۔ چودھری مختار نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ واپس تھانے کیسے جائیں گے؟ اگر آپ کہیں تو میں آپ کے لیے کسی سواری کا بندوبست کروا دیتا ہوں؟''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے کہا۔ ''میرے پاس ایک سواری ہے تو لیکن اسے چیک کرنا پڑے گا۔''

''چیک کرنا پڑے گا۔'' چودھری نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں پایا ملک صاحب۔''

''آپ کے حیات نگر میں ایک چھوٹا زمیندار فدا حسین رہتا ہے۔'' میں نے چودھری کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''اس کے گھر میں بالاجٹ نامی ایک مہمان آیا ہوا ہے۔ اگر بالاجٹ ابھی تک رخصت نہیں ہوا تو آپ اس بندے کو یہاں بلا لیں۔ میں اس کے ساتھ تھانے چلا جاؤں گا۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ملک صاحب۔'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی کسی کو فدا حسین کے گھر بھیج کر بالاجٹ کا پتا کراتا ہوں جناب۔''

میں نے چودھری مختار کے ساتھ اچھی خاصی گپ شپ کر لی تھی اور مجھے امید تھی کہ اس دوران میں بالاجٹ نے بھی اپنا کام نمٹا لیا ہوگا۔ اس نے راستے میں مجھے بتایا تھا کہ وہ زیادہ دیر حیات نگر میں قیام نہیں کرے گا۔ بس، اسے فدا حسین سے اپنی رقم لینا ہے۔ اس کے بعد وہ واپس اپنے گاؤں چک تین سو اڑتیس گ ب روانہ ہو جائے گا۔

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ جب چودھری مختار کا بھیجا ہوا بندہ فدا حسین کے گھر پہنچا تو بالاجٹ وہاں سے روانہ ہو ہی رہا تھا۔ چودھری کے بلاوے کو وہ نظر انداز نہ کر سکا اور فی الفور حویلی چلا آیا تھا۔

میں نے چودھری مختار سے الوداعی مصافحہ کیا پھر بالاجٹ کے نزدیک پہنچ کر قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی تھانے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کیا تمہارا گھوڑا مجھے وہاں تک لے جائے گا؟''

''بالکل لے جائے گا سرکار۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ آ جائیں۔''

میں گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے بالاجٹ نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

میں پچھلے چند روز سے جبرو کو چھاپنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ایک جری افسر کو شہید کر کے گویا ہماری ناک کاٹ ڈالی تھی اور ہمیں یہ پیغام دیا تھا کہ پولیس اس کے پاؤں کی جوتی ہے۔ میں نے اس واقعے کو کچھ زیادہ ہی اپنے دل و دماغ پر سوار کر لیا تھا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی آبرو کا یہی تقاضا تھا کہ جلد از جلد جبرو اور اس کے گروہ کو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا جائے۔ میں نے اس ذیل میں جو منصوبہ بندی کی تھی اس کے مرکزی کردار کے طور پر مجھے ایک ایسے نڈر اور بہادر شخص کی تلاش تھی جو جبرو اور اس کے گروہ کے لیے شناسا نہ ہو اور میرے تھانے کا عملہ بھی جس کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔ میں نے تھانے کے عملے کا ذکر اس لیے کیا کہ ابھی میں ان میں سے کسی پر اندھا اعتماد نہیں کر سکتا تھا اور..... یہ بالاجٹ میرے منصوبے کی تکمیل کے لیے بالکل مناسب بندہ تھا۔ میں نے مزید تسلی کی خاطر اس سے پوچھ لیا۔

''بالا! کیا تم نے جبرو ڈاکو کا نام سنا ہے؟''

''جی، تھانے دار صاحب! جبرو کو تو ہر کوئی جانتا ہے۔'' اس نے گھڑ سواری جاری رکھتے ہوئے اثبات میں

جواب دیا۔ ''اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس علاقے میں تھرتھلی مچا رکھی ہے۔ یہ ڈاکو چھپنے کے لیے پیرئل جنگل کو استعمال کرتے ہیں۔''

''مجھ سے پہلے اس تھانے میں جو انچارج صاحب ہوا کرتے تھے، وہ اسی جبرو کے گروہ سے پولیس مقابلہ کرتے ہوئے ایک ماہ پہلے شہید ہو گئے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے دل میں جبرو کے لیے بہت زیادہ غم و غصہ بھرا ہوا ہے۔ میں پہلی فرصت میں اس گروہ کو گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک ایسے بہادر اور قابل بھروسا آدمی کی ضرورت ہے جو بے چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کرے۔''

''آپ کے خیالات تو بہت نیک اور قابلِ تعریف ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ ستائشی انداز میں بولا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کے تھانے میں کوئی ایسا قابلِ اعتماد اور فرماں بردار شخص نہیں ہے؟''

''تم نے بہت ہی اہم سوال کیا ہے بالا.....'' میں نے غیر محسوس انداز میں اسے گھنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً میرے عملے میں ایک سے زیادہ افراد موجود ہوں گے لیکن مجھے یہ تھانہ جوائن کیے ابھی چار پانچ دن ہی ہوئے ہیں اس لیے میں آنکھیں بند کر کے کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا اور میں اس مشن میں اپنے عملے کے کسی بندے کو استعمال بھی نہیں کرنا چاہتا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ تھانے دار صاحب؟'' اس نے میری بات میں دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں..... بہت ہی خاص وجہ ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس بات کے امکانات ہیں کہ میرے عملے کو جبرو اور اس کے ساتھی پہچانتے ہوں۔ اس طرح کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔ میں فرنٹ پر کسی اجنبی چہرے کو رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا عملہ درپردہ اس کی مدد کرے گا۔''

''تو آپ کو کسی ایسے اجنبی بہادر شخص کی تلاش ہے جسے جبرو اور اس کا گروہ بالکل نہ جانتے ہوں؟''

''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو بالا.....'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن میں اس سے بھی کچھ زیادہ چاہتا ہوں۔''

''کیا زیادہ؟'' اس نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ اس بندے کو میرے تھانے کا عملہ بھی نہ جانتا ہو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تمہاری نظر میں ہے کوئی ایسا بندہ؟''

''ہے تو..... مگر پتا نہیں، آپ کیا سوچیں گے.....'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

''میں کچھ نہیں سوچوں گا۔ تم بتاؤ.....'' میں نے ہمت بندھانے والے انداز میں کہا۔

''اگر آپ کو..... کوئی اعتراض نہ ہو تو.....'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بڑے اعتماد سے بولا۔ ''تو میں..... اس مشن کے لیے خود کو پیش کرتا ہوں۔''

میں ایک طویل، گہری اور آسودہ سانس لے کر رہ گیا۔

''کیا ہوا تھانے دار صاحب؟'' اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا میری بات آپ کو بری لگ گئی؟''

''نہیں بالا.....'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔''

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ بے چینی سے مستفسر ہوا۔

''اصل میں یہ مشن بہت ہی اہم اور خاص الخاص ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جس میں بہادری کے ساتھ ہی رازداری کی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

''سمجھ رہا ہوں تھانے دار صاحب!'' وہ تڑ سے بولا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے ہر راز کو میں اپنا ذاتی راز سمجھ کر، سینے میں دبا کر رکھوں گا۔''

''اور تمہیں پولیس میں جانے کا بھی بہت شوق تھا؟''

''جی، جی.....'' وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے بالا..... میں تمہارا یہ شوق پورا کر دیتا ہوں۔'' میں نے فراخ دلی سے کہا۔ ''تم اس مشن میں، سادہ لباس میں وہی کام کرو گے جو پولیس اہلکار یونیفارم پہن کر کرتے ہیں مگر ایک بات ذہن نشین کر لو کہ اس معاملے میں رازداری اور وفاداری بہت ضروری ہے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا۔ ''کل تم کسی وقت تھانے آ کر مجھ سے ملو۔ پھر میں تمہیں اس مشن کی تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔''

''جو حکم جناب کا.....'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

تھانے سے تھوڑے فاصلے پر میں نے بالا سے گھوڑا روکنے کے لیے کہا۔ اس نے گھوڑا روکنے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ ''خیریت ہے نا؟''

''میں نہیں چاہتا کہ میرے عملے کا کوئی آدمی مجھے

UUNOVELS.COM

تمہارے ساتھ دیکھے۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے میں یہیں اتر رہا ہوں۔ کل جب تم مجھ سے ملنے آؤ تو یہی ظاہر کرنا جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔''

''سمجھ گیا جناب.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آج ادھر جائے وقوعہ پر آپ کے ایک کانسٹیبل نے مجھے دیکھا تھا۔ اگر اس نے پہچان لیا تو.....؟''

بالاجٹ نے ایک اہم نکتے کی جانب توجہ دلائی تھی۔ جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت کانسٹیبل نوید احمد بھی میرے ساتھ تھا لیکن مجھے نہیں لگتا تھا کہ نوید نے اس پر زیادہ توجہ دی ہو۔

''تم اس کانسٹیبل کی فکر نہ کرو۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''اس نے تمہیں بہت قریب سے نہیں دیکھا لیکن پھر بھی احتیاطاً کل تم تھانے آتے ہوئے اپنے حلیے وغیرہ میں تھوڑی تبدیلی کر لینا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ تمہارا فرضی نام ہے، علی نواز کھرل!''

''سمجھ گیا تھانے دار صاحب!'' وہ مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے بالاجٹ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد رخصت کر دیا۔

☆☆☆

کارخانۂ قدرت میں ہر کام کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ دو روز قبل اگر نصف شب نقلی امام دین موچی نے میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک نہ دی ہوتی تو اسی رات میں اس نتیجے پر پہنچ جاتا جہاں اس وقت کھڑا تھا۔ جب چوبیس نومبر کی رات میرے دروازے پر دستک ہوئی، میں ضروری فائلوں کے مطالعے میں مصروف تھا۔ امام دین موچی بن کر آنے والے اس بڈھے کی وجہ سے مجھے ان فائلوں کو ایک طرف رکھ کر اس کی مدد کے لیے کوارٹر سے باہر نکلنا پڑا تھا۔ پھر اس کے بعد حالات اتنی تیزی سے پیش آئے کہ مجھے دوبارہ ان فائلوں کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ آج پچیس نومبر کی رات تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ستائیس نومبر کی تاریخ شروع ہونے والی تھی۔ اگرچہ آج دن بھر کی دوڑ دھوپ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں ان تینوں فائلوں کو لے کر بیٹھ گیا تھا۔

ان تینوں فائلوں کے کور الگ الگ رنگ کے تھے۔ ایک نیلی، ایک پیلی اور ایک سرخ فائل تھی۔ نیلی فائل کو تو میں نے دو روز قبل اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ ابھی میں نے پیلی فائل کا بھی مطالعہ کر ڈالا لیکن جب میں سرخ فائل کی جانب

بات تو سچ ہے

☆ دنیا کو اپنی کمزوری کبھی بھی نہ بتاؤ کیونکہ دنیا آپ کے ساتھ کھیلنے میں بہت دلچسپی رکھتی ہے۔

☆ زندگی تو بڑی سستی ہے..... گزارنے کے طریقے مہنگے ہیں۔

☆ بہترین دنوں کے لیے..... بُرے دنوں سے لڑنا پڑتا ہے۔

☆ میں نے لوگوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا کیونکہ لوگ وہ نہیں ہوتے جو نظر آتے ہیں۔

☆ زندگی کے اخبار میں سب سے خوب صورت صفحہ بچوں کا صفحہ ہوتا ہے۔

☆ سانس کی موت سے پہلے بہت سی موتیں ہو چکی ہوتی ہیں۔ ہم سانس کے بند ہونے کو موت سمجھتے ہیں حالانکہ سانس کا بند ہونا تو اعلان ہے ان تمام موتوں کا جو آپ مر رہے ہیں۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

شوق

ایک صاحب کو دعوتیں اڑانے کا بہت شوق تھا چنانچہ جہاں شامیانے اور قناتیں دیکھتے، سوٹ بوٹ پہن کر پہنچ جاتے۔ ایک دفعہ ایسے میں ایک موقع پر کچھ لوگوں کو شک گزرا تو انہوں نے پوچھا۔ ''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

وہ صاحب رٹا رٹایا فقرہ بولے۔ ''دلہن کی طرف سے۔''

''کس بدبخت کی شادی ہو رہی ہے، یہاں تو چہلم ہے۔''

یہ سننا تھا کہ وہ صاحب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

جواب حاضر ہے

ایک بیوی اپنے شوہر کی بدذوقی سے بڑی تنگ تھی، آخر ایک دن پھٹ پڑی۔ ''آپ جو چیز بھی گھر میں لاتے ہیں، نہایت خراب ہوتی ہے۔ نہ جانے کس کباڑ خانے سے اٹھا کر لے آتے ہیں۔''

شوہر نے ایک نظر اپنی بیوی کو دیکھا۔ پھر ٹھنڈی اور لمبی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ''بی بی..... تمہیں بھی تو اس گھر میں، میں ہی لایا تھا۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

UUNOVELS.COM

متوجہ ہوا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے جیسے ہی لال فائل کو کھولا، اس کی اندرونی حالت کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔

فائل کے اندر ایک عجیب قسم کی افراتفری اور ابتری مچی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے بہت جلدی میں اس فائل کے اندر لگے ہوئے کاغذات کو نوچ ڈالا ہو۔ فائل کا تسمہ (ڈوری) بند تھا تاہم کاغذات کی حالت بہت خراب تھی۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ کسی شخص نے جنونی انداز میں فائل کے اندر سے کاغذات کھینچ کر نکال لیے تھے۔ جب میں ان فائلوں کو اپنے کوارٹر پر لے کر آیا تھا تو یہ تینوں نارمل حالت میں تھیں مگر اب ان میں سے سرخ فائل فریاد کناں نظر آتی تھی۔

''اس کا مطلب ہے، سرخ فائل کے ساتھ جو بھی ہوا وہ ادھر میرے کوارٹر کے اندر ہی پیش آیا ہے۔'' یہ خیال بجلی کے کوندے کے مانند میرے ذہن میں چمکا۔

اگلے ہی لمحے میری سوچ نے حقیقتِ حال تک رسائی حاصل کر لی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ فراڈیے امام دین موچی کا اس رات فریادی بن کر میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک دینا خالی از علت نہیں تھا۔ مجھے کوارٹر سے باہر لانے کا مقصد یہی تھا کہ اس مختصر سے وقفے سے فائدہ اٹھا کر کوئی میرے کوارٹر میں گھسے اور سرخ فائل میں سے اہم کاغذات پھاڑ کر لے جائے..... وہ چور کون تھا اور سرخ فائل سے اس کا کیا تعلق تھا؟

ان سوالات نے مجھے حد درجہ بے چین کر دیا۔ سرخ فائل کے اندر ایسا کچھ بھی نہیں بچا تھا جس سے میں یہ اندازہ قائم کر سکتا کہ وہاں کس نوعیت کے کاغذات لگے ہوئے تھے۔ مذکورہ فائل میں تسمے میں پھنسی ہوئی اصل کاغذات کی باقیات سے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ وہ پرزے تھے جو فائل میں لگے کاغذات کو کھینچ کر نکالنے کے بعد تسمے کے اندر پھنسے رہ گئے تھے۔ میں نے فوری طور پر اے ایس آئی فرہاد باجوہ کو اپنے کوارٹر میں بلا لیا۔

آدھی رات کے وقت میرے بلاوے نے اے ایس آئی کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! سب خیریت تو ہے نا؟''

''اگر خیریت ہوتی تو میں اتنی رات گئے تمہیں اپنے پاس نہ بلاتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ بھی اپنے کوارٹر پر.....''

''آخر معاملہ کیا ہے؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''کچھ بتائیں تو سہی.....؟''

''فرہاد.....!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''معاملہ سنگین نوعیت کا ہے۔ کیا میں تمہاری وفاداری پر بھروسا کر سکتا ہوں؟''

''میں قسم کھا کر تو آپ کو یقین نہیں دلا سکتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اپنے ضمیر اور اپنے رب کو جواب دہ ہوں اور یہ دونوں جانتے ہیں کہ میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کا وفادار ہوں۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا ملک صاحب۔''

''انسان کے ضمیر اور اس کے پروردگار سے بڑھ کر کوئی اور چیز ہو ہی نہیں سکتی۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔''

آئندہ پانچ منٹ کے اندر میں نے اے ایس آئی کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''اس لحاظ سے امام دین موچی کی آمد کا راز کھل گیا ملک صاحب۔ جس شخص نے بھی اس بڈھے کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا، اسی نے اسے موت کے گھاٹ بھی اتارا ہوگا۔''

''یہ سب تو میری سمجھ میں بھی آ رہا ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''نیلی اور پیلی دونوں فائلیں سلامت ہیں اور میں نے ان کا مطالعہ بھی کر لیا ہے۔ اس سرخ فائل کو جب میں نے کھول کر دیکھا تو اس کے اندر پڑھنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ سابق تھانہ انچارج شہید قادر بخش صاحب نے اس فائل کے اندر کون سا راز چھپا رکھا تھا جو اگر کسی کے خلاف استعمال ہو جاتا تو اس کا دھڑن تختہ ہو سکتا تھا اسی لیے اس نے سرخ فائل کے اندر لگے ہوئے کاغذات کو چوری کروا لیا ہے؟''

''مجھے کبھی اس فائل کو کھول کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا ملک صاحب.....'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس لیے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اس حوالے سے میرا جو اندازہ ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔''

فرہاد باجوہ نے جس انداز سے بات کی تھی، اس نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اور تمہارا اندازہ کیا ہے؟''

''قادر بخش صاحب جبر و اور اس کے پشت پناہ کے حوالے سے ثبوت اکٹھا کر رہے تھے تاکہ وہ اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک سکیں۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ مذکورہ ثبوتوں کو اسی سرخ فائل میں جمع کر رہے تھے۔ اسی لیے وہ اس فائل کو بہت حفاظت کے ساتھ اپنے پاس تالا بند رکھتے تھے۔''

''ایسی حفاظت اور احتیاط کا کیا فائدہ کہ دشمن آپ

UUNOVELS.COM

کے راز سے واقف ہو جائے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''قادر بخش صاحب جس کسی کے خلاف بھی یہ ثبوت جمع کر رہے تھے، وہ جانتا تھا کہ یہ تمام اہم کاغذات سرخ فائل کے اندر لگے ہوئے ہیں اسی لیے اس نے تھکی امام دین موچی کا استعمال کر کے اپنے خلاف جانے والے تمام ثبوتوں کو چوری کروا لیا اور وہ بھی مجھ سمیت پورے تھانے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر.....!''

''ملک صاحب! جو بھی ہوا، بہت بُرا ہوا۔'' وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''جو بُرا ہو چکا اسے ٹھیک بھی ہم نے ہی کرنا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ تمام معاملات ہم دونوں کے بیچ ہی رہنا چاہئیں..... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ پھر الجھن زدہ انداز میں اضافہ کیا۔ ''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس سرخ فائل کے بارے میں جبرو کو کیسے معلوم ہوا؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اندر کوئی چور چھپا ہوا ہے جو پولیس ڈیپارٹمنٹ سے زیادہ ڈاکوؤں کے ساتھ وفاداری نبھانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولا۔ ''ایسا کون ہو سکتا ہے ملک صاحب؟''

''میں اس غدار کو کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے بے نقاب کر دوں گا فرہاد.....'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''بس، اس کام کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں ہر نوعیت کی معاونت کے لیے تیار ہوں ملک صاحب۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ حکم کریں۔''

''تم نے تھوڑی دیر پہلے جبرو کے ساتھ اس کے کسی پشت پناہ کا بھی ذکر کیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''قادر بخش صاحب ڈاکوؤں کے گروہ کے ساتھ ہی ان کے پشت پناہ کو بھی کیفر کردار تک پہنچانا چاہتے تھے۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ جبرو اینڈ کمپنی کی پشت پناہی کون کر رہا تھا؟''

''قادر بخش صاحب نے اس سارے معاملے کو بہت زیادہ سیکرٹ رکھا ہوا تھا۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔ ''وہ اس علاقے کے کسی بااثر اور طاقتور شخص کا ذکر کرتے تھے مگر کبھی کسی کا نام نہیں لیا۔''

''پیر محل جنگل کے نزدیک صرف دو گاؤں ہیں۔ نجیب آباد جنگل سے تین میل کے فاصلے پر مشرقی سمت میں اور حیات نگر جنگل سے نو میل کی دوری پر مغربی جانب۔'' میں نے کہا۔ ''نجیب آباد ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور میرے خیال میں وہاں ایسا کوئی بااثر شخص موجود نہیں جو خطرناک ڈاکوؤں کے ایک گروہ کی پشت پناہی کا حوصلہ رکھتا ہو۔ باقی رہ گیا حیات نگر.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں آج دن میں حیات نگر کے چودھری مختار سے ایک بھرپور ملاقات کر کے آیا ہوں۔ وہ خاصا تگڑے والا زمیندار ہے اور میں نے چودھری مختار کو قادر بخش سے خاصا خفا بھی پایا ہے۔ تمہارے خیال میں کیا چودھری مختار، جبرو کے گروہ کا پشت پناہ ہو سکتا ہے؟''

''یہ ناممکن تو نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں.....'' میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فرہاد! میں نے جبرو اور اس کے ساتھیوں کو گھیرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے جس میں ایک شخص علی نواز کھرل کو بھی استعمال کیا جائے گا۔ وہ بندہ کل مجھ سے ملنے تھانے آ رہا ہے لیکن تھانے کے عملے کو میرے اس منصوبے کی خبر نہیں ہو گی۔ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اب تم میرے اس منصوبے میں شامل ہو.....''

''سمجھ گیا جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''اور وہ منصوبہ کیا ہے؟''

''کل علی نواز کھرل ہمیں بتائے گا کہ وہ اپنے قیمتی سامان سے بھرا ہوا ایک صندوق نجیب آباد پہنچانا چاہتا ہے لیکن راستے میں جنگل پڑتا ہے اور اسے ڈر ہے کہ ڈاکو کہیں اسے لوٹ نہ لیں لہٰذا وہ پولیس سے تعاون چاہتا ہے۔'' میں نے اے ایس آئی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''درحقیقت اس صندوق کے اندر کچھ بھی نہیں ہو گا۔ یہ چال جبرو کے ہمدرد کو پھانسنے کے لیے ہے۔ کل تھانے میں یہ خبر گرم کر دی جائے گی کہ علی نواز کھرل ایک بیش بہا صندوق نجیب آباد لے کر جا رہا ہے۔ ہمارے اندر موجود کالی بھیڑ فوراً یہ اطلاع جبرو یا اس کے پشت پناہ تک پہنچائے گی جس کے نتیجے میں ڈاکوؤں کا گروہ سرگرم ہو جائے گا اور ہمیں یہ موقع مل جائے گا کہ انہیں پکڑ سکیں۔''

''آپ کا منصوبہ تو شاندار ہے ملک صاحب۔'' اے ایس آئی توصیفی انداز میں بولا اور پوچھا۔ ''کیا علی نواز کھرل کل ہی اپنے صندوق کو نجیب آباد لے جائے گا؟''

''نہیں، کل وہ صرف پولیس سے تعاون کی درخواست

UUNOVELS.COM

کرنے آئے گا۔'' میں نے بتایا۔ ''صندوق کی منتقلی کا پروگرام پرسوں صبح کا رکھا جائے گا تاکہ ہمارے درمیان جبرو کا وفادار بہ آسانی اس تک یہ اطلاع پہنچا سکے۔ علی نواز اپنے اس صندوق کو تانگے میں رکھ کر تھانے لائے گا پھر ہم حفاظت کے خیال سے اس کے ساتھ اپنے عملے کے ایک آدمی کو لگا دیں گے لیکن جبرو اور اس کے گروہ کو چھاپنے کا بندوبست ہم پہلے سے کر لیں گے۔ ڈاکو جیسے ہی علی نواز والے تانگے پر دھاوا بولیں گے، ہم انہیں گھیر کر گرفتار کر لیں گے۔''

اس کے بعد میں نے اے ایس آئی کو بتایا کہ متوقع جائے وقوعہ کے نزدیک ہم کس طرح اپنے مسلح آدمیوں کو چھپا دیں گے۔ اس راستے پر درختوں کی بہتات تھی اور ایک جانب جنگل بھی شروع ہو جاتا تھا لہٰذا دو چار مسلح افراد کو وہاں چھپا دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

''علی نواز کھرل کے ساتھ ہمارے عملے کا کون سا بندہ جائے گا؟'' اے ایس آئی نے پوچھا۔

''اس کا فیصلہ میں کل کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''جب علی نواز کھرل کے قیمتی صندوق کی خبر تھانے کے اندر پھیل جائے گی تو ہمیں اپنے عملے پر خصوصی توجہ دینا ہو گی کیونکہ مخبر جو کوئی بھی ہے، اسے اس خبر سے بہت زیادہ خوشی محسوس ہو گی۔''

''اور وہ فوری طور پر، جبرو کو یہ اطلاع دینے کے لیے بے چین ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس کام کے لیے اسے یقیناً تھانے سے باہر جانا پڑے گا۔ اس طرح اس کالی بھیڑ کی نشاندہی ہو جائے گی۔ بعدازاں ہم اپنے منصوبے کے مطابق، جبرو اور اس کے ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیں گے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہم چاہیں تو جبرو کے نمک خوار کو، بے نقاب ہوتے ہی گرفتار کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس سے جبرو کی گرفتاری کا معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔''

فرہاد باجوہ نے مجھ سے مکمل اتفاق کیا۔ پھر ہمارے درمیان کل اور پرسوں کی ہنگامی مصروفیات کے حوالے سے بات ہونے لگی۔ لگ بھگ ایک بجے رات میں نے اے ایس آئی کو رخصت کیا اور سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا۔ اس رات مجھے آسانی سے نیند نہیں آ سکی تھی۔

☆☆☆

آئندہ روز یعنی ستائیس نومبر کی دوپہر تک میں نے تمام ضروری کام نمٹا لیے۔ بالاجٹ، علی نواز کھرل کے روپ میں ایک دم بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نوید احمد تو اسے کیا پہچانتا، وہ تو میری پہچان میں بھی بڑی مشکل سے آیا تھا۔ الغرض، تھانے میں یہ سنسنی خیز خبر گردش کرنے لگی کہ علی نواز کھرل نامی یہ شخص کل صبح طلائی زیورات، ہیرے جواہرات اور دیگر نوادرات سے بھرا ہوا ایک بڑا صندوق پولیس کی حفاظت میں نجیب آباد لے کر جانے والا ہے۔

لگ بھگ ایک بجے کانسٹیبل امجد علی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر میں چونک اٹھا اور پوچھا۔ ''کیا ہوا امجد! تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''میری اماں کی طبیعت بہت خراب ہے ملک صاحب.....'' وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ ''اگر آپ مجھے ایک دن کی چھٹی دے دیں تو بڑی نوازش ہو گی۔ میں کل واپس آ جاؤں گا۔''

''اوہ..... تمہاری والدہ کی طبیعت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''ماں اس دنیا کی سب سے عظیم ہستی ہے امجد اس لیے میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔ ''لیکن تم کل صبح ہی رجانہ سے لوٹ آنا۔ میں تمہیں علی نواز کھرل کے ساتھ نجیب آباد بھیجنا چاہتا ہوں۔ میری نظر میں تم اس تھانے کے سب سے زیادہ قابلِ بھروسا اہلکار ہو۔''

وہ اپنی تعریف سن کر خوشی سے چمک اٹھا پھر یقین دہانی کرانے والے انداز میں بولا۔ ''جی ضرور..... میں کل صبح ہی واپس آ جاؤں گا۔''

وہ مجھے سلام کر کے جانے لگا تو میں نے اسے دروازے پر روک لیا۔ ''ایک منٹ امجد.....'' میں نے کہا۔ ''اس دن ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ میں پوچھنا بھول گیا تھا کہ وقوعہ کی سہ پہر تم اور قادر بخش صاحب کدھر سے واپس آ رہے تھے جب جنگل کے اندر ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں انچارج صاحب کی شہادت ہوئی؟''

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ امجد نے تب گول مول بات کی تھی۔ اس کے یہ الفاظ ''اس روز میں اور قادر بخش صاحب کہیں سے واپس آ رہے تھے'' میری یادداشت میں محفوظ تھے۔ اس نے کسی جگہ کا باقاعدہ نام نہیں لیا تھا لیکن اس وقت اس نے میرے استفسار کے جواب میں جو کچھ

UUNOVELS.COM

بتایا، وہ چونکا دینے والا تھا۔

''ملک صاحب! یہ ایک روز پہلے کی ہی تو بات ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز ہم نجیب آباد کی طرف سے تھانے کی جانب آرہے تھے۔''

میری یادداشت اتنی بھی گئی گزری نہیں تھی کہ میں گزشتہ روز کی بات کو یاد نہ رکھ سکوں۔ وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا لیکن میں نے اسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ میں نے اس کی دروغ گوئی پکڑ لی ہے۔ یہ اس کی میرے سامنے دوسری غلط بیانی تھی۔ میں پہلے ہی اس کی طرف سے خاصا محتاط ہو چکا تھا اور حالیہ استفسارات بھی اسی ذیل میں تھے تاکہ اپنے شک کو یقین میں بدل سکوں۔

''میں ہی بھول گیا ہوں گا امجد!'' میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تم نے یقیناً بتایا ہوگا۔ بس، کل کا دن اتنا افراتفری میں گزرا کہ دماغ ٹھکانے پر نہیں رہا..... خیر، تم جاؤ..... اور ذہن میں رکھنا کہ تمہیں کل صبح ہی رجانہ سے واپس آنا ہے۔''

''جی..... میں نے آپ کی ہدایت کو اپنے ذہن میں نقش کرلیا ہے ملک صاحب۔'' وہ فدویانہ انداز میں بولا۔

امجد علی کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل نوید احمد کو اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے ابھی امجد علی کی پہلی غلط بیانی کا ذکر کیا ہے۔ اس دروغ گوئی کا تعلق شہید قادر بخش کے سروس ریوالور سے تھا۔ امجد نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز جنگل میں دوطرفہ فائرنگ ہوئی تھی جبکہ وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے والے حوالدار شجاع الدین نے مجھے بتایا تھا کہ انچارج صاحب کے ریوالور کے تمام چیمبرز بھرے ہوئے تھے یعنی انہوں نے اپنے ریوالور سے ڈاکوؤں پر ایک فائر بھی نہیں کیا تھا۔

''جی ملک صاحب!'' نوید نے میرے پاس آکر... بہ آوازِ بلند کہا۔ ''حکم سر جی۔''

''اس رات کو اچھی طرح یاد کرو جب میں نے تمہیں بہروپیے امام دین کے ساتھ پیر محل اسپتال بھیجا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے سب یاد ہے جناب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں اس وقت تھانے کے سامنے والے حصے میں کھڑا تھا اور آپ نے آواز دے کر مجھے اپنے پاس بلا لیا تھا۔''

''کیا اس وقت امجد علی تھانے کے اندر موجود تھا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''نہیں جناب.....'' نوید نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ تو کوئی ایک گھنٹا پہلے یہ کہہ کر تھانے سے نکل گیا تھا کہ تھوڑی دیر میں واپس آجائے گا۔''

''تو کیا وہ تھوڑی دیر میں واپس آگیا تھا؟''

''ایک گھنٹے تک تو نہیں لوٹا تھا اور اس کے بعد آپ نے مجھے اسپتال بھیج دیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور اے ایس آئی کو میرے پاس بھیج دو۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

نوید کے رخصت ہونے کے دو منٹ بعد فرہاد باجوہ میرے سامنے حاضر ہوگیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کے چہرے سے دبا دبا جوش جھلک رہا ہے۔ لگتا ہے، آپ نے کوئی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے؟''

''کامیابی ہے تو بڑی لیکن ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسے تکمیل تک تم پہنچاؤ گے..... کیسے؟ اس بات کا فیصلہ بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔''

وہ دلچسپی بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ جیسا چاہیں گے، ہوجائے گا۔''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اے ایس آئی کو امجد علی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ عین تبھی امام دین کی آمد سے قبل اس کا تھانے سے غائب ہوجانا، جنگل والے واقعے کے حوالے سے دو بڑے جھوٹ بولنا اور قیمتی صندوق کی خبر گرم ہوتے ہی اس کی ماں کی بیماری کا سامنے آجانا..... یہ تمام باتیں غیر معمولی اہمیت کی حامل تھیں جو امجد علی کی ذات کو میری نظر میں مشکوک بناتی تھیں۔

''ملک صاحب! آپ نے جس کالی بھیڑ کا ذکر کیا تھا وہ امجد کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔'' میری بات کو توجہ سے سننے کے بعد فرہاد باجوہ نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنی ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے کہیں اور گیا ہے۔ اغلب امکان اسی بات کا ہے کہ وہ جبرو یا اس کے گروہ کے کسی بندے کو یہ بتانے گیا ہے کہ کل صبح جنگل کے قریب سے اس کی نگرانی اور حفاظت میں ایک بیش بہا خزانہ نجیب آباد پہنچایا جانے والا ہے۔''

''امجد جہاں بھی گیا ہے، اس کا پتا چلانا بہت ضروری ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''آپ فکر نہ کریں۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ''میں شام سے پہلے آپ کو پکی رپورٹ دوں گا۔''

فرہاد باجوہ نے یہ بات اتنے اعتماد سے کی تھی کہ میں

مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

اے ایس آئی فرہاد باجوہ آف لائل پوری میری توقع سے کہیں زیادہ مستعد ثابت ہوا تھا۔ اس نے ستائیس نومبر کا سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے کئی ایک خوش خبری بھری باتیں بتا دیں جن میں سرفہرست امجد کے جھوٹ کا پوسٹ مارٹم تھا۔ فرہاد کے مطابق، امجد کی ماں رجانہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اور وہ خود رجانہ کے بجائے حیات نگر جا پہنچا تھا۔ یہ رات اس نے حیات نگر میں چودھری مختار کی حویلی میں گزارنا تھی اور صبح واپس تھانے آ جانا تھا۔

''تم خود تو تھانے سے باہر نہیں گئے۔'' میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر تم نے رجانہ اور حیات نگر کی خبریں کیسے جمع کر لیں؟''

''اس سلسلے میں، میں نے اپنے دو بھروسے کے بندوں سے کام لیا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک کو میں نے فوری طور پر امجد کے تعاقب میں بھیجا اور دوسرے کو رجانہ جانے کی ہدایت کی۔ ان دو کاموں کے لیے چار پانچ گھنٹے کافی تھے اور اب تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس رات سرخ فائل کے ساتھ بھی ساری گڑبڑ اسی لفنگے امجد نے کی ہو گی۔ یہ بات صرف تھانے کے عملے کو ہی پتا تھی کہ دیگر دو فائلوں کے ساتھ آپ سرخ فائل بھی اپنے کوارٹر پر لے گئے ہیں۔''

''تم نے اس غدار کے لیے لفنگے کا لفظ استعمال کیا ہے فرہاد.....'' میں نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''میں اس کمینے کو ننگا کر کے ماروں گا۔ میں امجد کا وہ حشر کرنے والا ہوں کہ آئندہ کسی پولیس اہلکار کو ڈیپارٹمنٹ کی عزت اور حرمت کے ساتھ کھلواڑ کرنے کی جرأت نہ ہو۔ سمجھ لو کہ آج ہی رات شہید قادر بخش کا خون رنگ لے آئے گا۔ انہیں اٹھائیس اکتوبر کی سہ پہر میں شہید کر دیا گیا تھا۔ میں اٹھائیس نومبر کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ان کی موت کے ذمے داروں کو حوالات میں پہنچا دوں گا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ وقوعہ کے روز انچارج صاحب اور ڈاکوؤں کے درمیان کوئی پولیس مقابلہ نہیں ہوا تھا۔ انہیں دھوکے سے جنگل کے اندر پہنچا کر بڑی بے رحمی سے ہلاک کر دیا گیا تھا اور اس سازش میں امجد علی پیش پیش رہا تھا۔''

''آپ کی باتوں سے تو یہی لگ رہا ہے کہ آپ آج رات چودھری مختار کی حویلی پر ریڈ کرنے والے ہیں؟'' فرہاد نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں بالکل ٹھیک لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور وہ کل صبح والا پروگرام.....'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''شاید اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ امجد علی، چودھری مختار کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ یہ حقیقت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ چودھری مختار ڈاکوؤں کا پشت پناہ ہے۔ اس تناظر میں قوی امید کی جا سکتی ہے کہ آج رات ڈاکوؤں کا وہ خطرناک گروہ یا کم از کم جبرو بھی حویلی کے اندر موجود ہو گا۔ وہ لوگ اس بات کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں گے کہ کل کس طرح قیمتی سامان سے بھرے ہوئے صندوق کو لوٹنا ہے..... تم کیا کہتے ہو؟''

''میں آپ کے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے مطلوبہ تمام افراد آج کی رات چودھری مختار کی حویلی میں موجود ہوں گے لہٰذا ہمیں کسی بھی قیمت پر اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

ہم دونوں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ غدار پولیس اہلکار تھانے سے دور تھا لہٰذا ہماری حکمتِ عملی کو دشمنوں تک پہنچانے والا کوئی نہیں تھا۔ گویا ہماری کامیابی کا صد فیصد امکان تھا۔

اس رات میں نے چودھری مختار کی حویلی پر دھاوا بول کر اپنا ٹارگٹ پورا کر لیا۔

اگلے روز بالاجٹ، علی نواز کھرل کے روپ میں ایک بڑا چوبی صندوق تانگے میں رکھ کر تھانے پہنچا تو میں اسے سیدھا حوالات لے گیا۔ حوالات کے اندر بہت سارے لوگوں کو دیکھ کر اس نے حیرت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے ملک صاحب.....؟''

''یہ سب..... چودھری مختار، جبرو ڈاکو، اس کے چار ساتھی اور ایک میرے تھانے کا گندا انڈا امجد ہے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں اسے بتایا۔ ''تم اس صندوق کو تھانے میں رکھوا دو۔ ہو سکتا ہے، پھر کسی مہم میں اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش آ جائے۔''

میری بات بالاجٹ کی سمجھ میں آئی یا نہیں آئی، میں اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ میری حکمتِ عملی سے وہ بہت زیادہ متاثر نہیں آ رہا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

UUNOVELS.COM

کیسی عجیب بات تھی کہ وہ پانی کی گہرائیوں میں اتر کر تہ آب کی خبر لاتی تھی مگر اپنے محبوب کی ظاہری محبت کے جھانسے میں از خود گرفتار تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بظاہر اس پر فدا ہونے والے عاشق کی نظر اس کے اس ہنر پر تھی جو دولت کے انبار میں اضافے کا سبب تھا۔

لمبی چھلانگ لگانے کے فن میں ماہر حسینہ کے محض دو قدم کا احوال

پرستار

ایم الیاس

اشوکا فائیو اسٹار ہوٹل کے وسیع و عریض اور خواب ناک ماحول والے ہال میں روشنیوں کے جھماکے ہو رہے تھے جس نے فضا کو حسین اور رنگین بنا دیا تھا۔ زرد، سرخ، سبز اور نقرئی روشنیاں ہر طرف چکراتی پھر رہی تھیں۔ ہوٹل کے ڈانس فلور پر بجلیاں کوند رہی تھیں جہاں جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں محبت اور خود سپردگی سے جھانکتے ہوئے محو رقص تھے۔ نوجوان اور حسین چہرے قیمتی، بھڑکیلے اور دلکش ملبوسات میں ادھر سے

UUNOVELS.COM

ادھر لہراتے دل میں آنکھوں کے راستے اتر رہے تھے۔ جذبات بھی بھڑک رہے تھے۔

ان میں..... آزاد خیال مقامی نوجوان، وجیہہ اور دراز قد لڑکے اور متناسب جسم کی پرکشش اور حسین لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے منچلے دوست اور غیر ملکی مہمان بھی..... ہر طرف کہا گہی، سرور وانبساط کا دور دورہ تھا جس سے رونق اور رنگینی دوچند ہو گئی تھی۔ ہر لمحہ پُرکیف اور سحر انگیز ہونے لگا تھا۔ مردوں کے بازوؤں کے حلقے میں عریاں، مرمریں اور گداز کمریں شاخ گل کی طرح لچک رہی تھیں۔ لڑکیاں تھرکتی، بل کھاتی اور لہراتی دلوں کو بر مار ہی تھیں کہ اچانک ہی موسیقی کی دلکش آواز کچھ دیر کے لیے تھم گئی۔ سارے جوڑے ایک دم سے ساکت ہو گئے تھے۔ اپنی اپنی جگہ جامد اور بت بن گئے تھے۔

کیونکہ اس ہال کے داخلی دروازے سے رادھا ہال میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ اعزاز صرف اس کو حاصل تھا کہ اس کی آمد پر کائنات جیسے تھم جاتی تھی۔ وہ کوئی بہت حسین نہ تھی لیکن اس میں ایسی جاذبیت اور مقناطیسی کشش تھی کہ مرد پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے مگر یہ اعزاز اس کی بے پناہ جسمانی کشش کے باعث بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایسی لڑکیوں کی بہتات نہیں تو کمی بھی نہ تھی۔ وہ ایک عظیم فنکارہ تھی جس کے قدردانوں اور پرستاروں کی کوئی کمی نہ تھی۔

اس کے ساتھ اس کا محبوب اور منگیتر رام چندر بھی تھا جو خوب صورت، وجیہہ اور خوش پوشاک بھی تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اس وقت بھی بہت ہی اعلیٰ قسم کے ڈبل بریسٹ سوٹ میں ملبوس تھا جو اس نے خاص طور پر آج کے ڈنر کے لیے منتخب کیا تھا اور اس میں اس کی شخصیت اور جاذب نظر ہو گئی تھی۔ اس کے گھنے بھونرے جیسے سیاہ اور چمک دار بال تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور اس کے بالوں کی طرح سیاہ ہی تھیں۔ اس نے بڑی نفاست سے کنگھی کی ہوئی تھی۔

اس کے مقابلے میں رادھا قبول صورت اور شاخ گل جیسے جسم کی مالک لڑکی تھی۔ وہ ایک ساٹھ فٹ اونچے مچان پر چڑھنے کے بعد ایک ٹینک میں چھلانگ لگاتی تھی اور اس ٹینک میں اس کے منگیتر کے کہنے کے مطابق صرف پانچ فٹ پانی ہوتا تھا۔ پھر رادھا کے اس ٹینک میں چھلانگ لگانے سے صرف چند منٹ پہلے اس ٹینک کے پانی میں پیٹرول چھڑکا جاتا تھا اور پھر رام چندر خود اس میں آگ لگاتا تھا اور پھر شعلے بلند ہوتے اور رادھا چھلانگ لگا دیتی تھی اور شعلوں کے بیچ میں آ کر گرتی تھی۔

"رادھا.....! دیکھا تم نے..... یہ سب تمہارے کتنے دیوانے ہیں اور تمہارے سحر میں کتنے گرفتار ہیں؟" رام چندر نے آ کر اس کے کان میں سرگوشی کی تو رادھا کے شیریں ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔

رادھا یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی اور سمجھتی بھی تھی کہ لوگ صرف اس کی فن کاری اور مہارت کے دیوانے نہیں بلکہ اس کی بے پناہ جسمانی کشش کے دیوانے تھے۔ جب وہ مچان پر کھڑی ہوتی تھی تو کئی نگاہیں بیک وقت اس کی طرف اٹھ جایا کرتی تھیں۔

"آیئے مس! آپ یہاں تشریف رکھیں۔"

ہال میں کھڑے ہوئے ویٹر نے ان دونوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا جو جگہ ان کے لیے مخصوص تھی۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی موسیقی کی مدھر دھنیں پھر بکھرنے لگی تھیں اور جوڑے دوبارہ محو رقص ہو گئے۔

"ہیلو ایوری باڈی۔"

آنے والے نے نزدیک آ کر کہا تو رام چندر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ راجندر تھا۔ اس فائیو اسٹارز ہوٹل کے مالک کا بیٹا جس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی اور وہ رادھا کا شیدائی اور پرستار تھا۔ اسے دیکھ کے رام چندر کا موڈ ہمیشہ کی طرح خراب ہو گیا تھا۔

"رادھا! کیسی ہو؟" راجندر نے رادھا کے پہلو والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" رادھا کے جواب دینے سے پہلے ہی رام چندر درمیان میں بول پڑا۔ وہ اپنے منگیتر ہونے کا اظہار کہیں بھی کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ خاص طور پر وہ راجندر کے سامنے اپنی برتری کا کچھ زیادہ ہی مظاہرہ کرتا تھا۔

"تم تو جانتے ہی ہو کہ رادھا شو شروع ہونے سے پہلے کچھ دیر آرام کرتی ہے۔ ابھی یہ چائے پیے گی اور پھر آرام کرے گی کیونکہ شو شروع ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی ہے۔"

"رادھا جو کام کرتی ہے وہ ہے بھی تو مشکل۔" راجندر نے تعریفی انداز سے کہتے ہوئے رادھا کی طرف دیکھا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔" رام چندر نے تائید کی۔ "واقعی بہت مشکل کام ہے، اگر کوئی مجھے اس کام کے لیے لاکھوں کا معاوضہ بھی دے تو میں اس کی پیشکش ٹھکرا دوں گا۔" رام چندر ہنسا۔

"میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں

ہے۔ رادھا کے علاوہ کوئی اور یہ کام کر بھی نہیں سکتا اور نہ ہی اتنی بلندی پر اور نہ ہی پانچ فٹ گہرے پانی میں۔'' راجندر نے کہا پھر وہ اپنی بات مکمل کر کے رام چندر کی طرف مڑا۔

''اور بھلا تمہیں کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تمہیں یوں ہی لاکھوں روپے مل جاتے ہیں۔'' اس نے رادھا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ رام چندر اسے غصے سے دیکھ کر رہ گیا۔ اگر اس سے یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتا۔ راجندر اس ہوٹل کے مالک کا بیٹا تھا۔ اس ہوٹل سے اس کا اور رادھا کا معاہدہ تھا۔

''میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے حیرت انگیز اور خوف ناک کرتب دیکھے ہیں لیکن میرے لیے یہ کرتب حیران کر دینے والا اور رگوں میں لہو منجمد کر دینے والا ہے۔'' راجندر نے کہا تو رام چندر قہقہہ مار کے ہنسا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ رادھا کرتب دکھا کر خطرہ مول لیتی ہے۔ یہ آئیڈیا بھی اس کا اپنا تھا۔ اس نے اپنے کرتب میں شعلے بلند کرنے کے بارے میں سوچا تھا کہ سنسنی خیزی اور دیکھنے والوں کا لہو ان کی رگوں میں منجمد ہو جائے۔ ان شعلوں ہی کا کمال ہے کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف ہوتی ہے۔'' رام چندر نے اس طرح سے کہا جیسے اس معاملے میں اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ ''ہاں، تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔'' رام چندر نے راجندر کی تائید کی۔ ''اس بات کو ماننا پڑے گا کہ اس ہوٹل میں رادھا کے شو سے جتنی آمدنی ہوتی ہے، اتنی کسی بھی ہوٹل میں نہیں ہوتی۔''

''میں جانتا ہوں کہ یہاں پر کھانے کے اتنے زیادہ آرڈرز پورے کیے گئے ہیں... جتنے ہر دھرم کے خاص خاص تہواروں کے موقع پر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف رادھا ہوتی ہے۔'' رام چندر نے فخریہ انداز میں یوں کہا جیسے رادھا پر اپنی ملکیت اور اجارہ داری جما رہا ہو۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم خاصی دولت کما چکے ہو، اب تو اس غریب کا پیچھا چھوڑ دو۔'' راجندر نے درمیان میں اسے چھیڑا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے رادھا اپنے ہی قبضے میں رکھتی ہے، ویسے ہمارا تم لوگوں سے جو معاہدہ ہوا تھا ہم اس کے تحت ہی کام کرتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا شو اس قدر کامیاب ہو گا اور روز بروز بے پناہ مقبولیت حاصل کرتا جائے گا۔ اب تمہارے پتا جی کا کہنا ہے کہ وہ آئندہ کے لیے بھی ہم سے معاہدہ کریں گے لیکن میں یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آئندہ ہونے والا معاہدہ پہلی شرط پر نہیں ہو گا۔'' رام چندر نے بلا جھجک خالص کاروباری لہجے میں کہا۔

''کیا مصیبت ہے رام چندر..... ہر وقت تم پیسے ہی کی بات کرتے ہو؟'' رادھا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ اب تک وہ لاتعلق ہی بیٹھی رہی تھی۔ اسے رام چندر کی بات ناگوار لگی تھی۔

''پیسے کے بغیر بھلا اس دنیا میں کوئی بات ممکن ہے؟'' رام چندر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

رام چندر کی بات پر یک لخت وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے جسم پر سیاہ ریشمی چمک دار لباس اس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ مختلف جگہوں سے جھلملا رہا تھا۔ پھر وہ یہاں رکی نہیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''تم نے اسے پھر ناراض کر دیا؟'' راجندر نے ہنستے ہوئے رام چندر سے کہا۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا اس کا خوش گوار موڈ خراب کر کے۔''

''وہ میری منگیتر ہے، یہ تم بہت اچھی طرح سے جانتے ہو۔'' رام چندر نے ناگواری سے کہا۔ ''تمہیں اس بات کا کوئی حق نہیں کہ ہمارے معاملات میں بولو۔ میں ہر بات کہنے کا حق رکھتا ہوں، اسی طرح وہ بھی۔''

''تم نہ صرف جذباتی ہو رہے ہو بلکہ تمہیں غصہ بھی بہت آ رہا ہے۔'' راجندر نے پھر ہنستے ہوئے کہا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے ایک سمت بڑھ گیا۔

رادھا سیدھی ہال سے اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ اس نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا تھا کہ اس کے منگیتر رام چندر کو اس کی آمدنی میں زیادہ دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے۔ اس کے قرب اور من مانی میں گرم جوشی نہیں رہی تھی بلکہ رسمی انداز سا ہوتا جیسے وہ اپنی کوئی ذمے داری بہ وجہ مجبوری ادا کر رہا ہو۔ جبکہ رادھا کو اس دولت کی کوئی پروا نہیں رہی تھی جسے وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر حاصل کرتی تھی۔ یہ سب کچھ تو وہ صرف رام چندر کے لیے کر رہی تھی تاکہ شادی کے بعد زندگی سکھ اور آرام و سکون سے گزر سکے۔

رام چندر سے اس کی ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ اس سنسار میں نہیں رہے تھے۔ جب سے وہ اتنے بڑے سنسار میں اکیلی رہ گئی تھی، تب سے خود ہی کوئی نہ کوئی کام کر کے اپنی گزر اوقات کر لیتی تھی۔ ایک بار اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ وہ ڈانسر

UUNOVELS.COM

بن جائے۔ ڈانس سے اسے بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ جب بھی کوئی فلم دیکھ کر آتی اور اس میں ڈانس ہوتا تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے ناچتی تھی پھر اپنی ماں سے پوچھتی کہ میرا ڈانس کیسا ہے؟ ماں اسے سینے سے لگا کے پیار کرتی، سراہتی اور شاباشی دیتی رہتی تھی پھر جب اس نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی سہیلی کی ماں نے جو خود بھی ایک کلب میں ڈانسر تھی، اسے مشورہ دیا کہ وہ کسی ڈانسنگ اسکول میں تربیت حاصل کرے۔ مستقبل میں وہ ایک ایسی ڈانسر بن سکتی ہے کہ اسے فلموں میں بھی لیا جا سکتا ہے پھر اس نے اچھا ڈانس سیکھنے کے لیے باقاعدہ تربیت حاصل کی اور پھر اسے ایک ہوٹل میں ڈانسر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ ان دنوں ممبئی میں ایسے ہوٹل عام ہو رہے تھے جہاں گاہکوں کی تفریح طبع کے لیے شام کے وقت ڈانس شو کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ گو کہ کوئی فلم ایسی نہ ہوتی جس میں ڈانس بولڈ نہ ہوتے ہوں۔ ہوٹلوں میں جو فلمی گانوں پر رقص پسند ہوتے تھے وہ بولڈ قسم کے ہوتے تھے۔ اس نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ لوگ ڈانس کم جسم زیادہ دیکھتے ہیں۔ پھر اس کا جسم جو شاخِ گل کی طرح لچکیلا، متناسب، پُرکشش اور گداز تھا۔ جب وہ تھرکتا، بل کھاتا اور وہ ترچھی ہو ہو کر ناچتی تو دیکھنے والوں کے دل پر بجلیاں گرتی تھیں۔ وہ اس قدر مقبول ہو گئی تھی کہ اس کے پرستار روز ہی اس ہوٹل کا رخ کرنے لگے۔

وہیں اس کی ملاقات رام چندر سے ہوئی تھی۔ رام چندر اس کے رقص، جسم اور شباب کی حشر سامانیاں دیکھ کر ایسا متاثر ہوا تھا کہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ دونوں مختلف ہوٹلوں میں رقص کر کے خاصا کمانے لگے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں کام کم ملنے لگا کیونکہ تقریباً تمام ہوٹلوں میں ڈانس شو ہونے لگے تھے۔ وہ ڈانس شو ایسے ہوتے تھے کہ امریکا، یورپ کے نائٹ کلب بن گئے تھے۔ چونکہ وہ ڈانس شو مختصر لباس میں پیش کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے کام ملنا بند ہو گیا۔ نوبت فاقوں تک آ گئی تھی۔ ہوٹلز کی انتظامیہ وقت کے تقاضے، تماشائیوں کی پسند اور دوسرے ہوٹلوں سے کاروباری مقابلے کے پیشِ نظر یہ چاہتے تھے کہ وہ کم لباس پہنے..... اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ عورت ہے، ڈانسر ہے، طوائف نہیں..... فلپائن، بینکاک اور ہانگ کانگ کی طوائفوں نے آ کر ہندوستانی رقاصاؤں کی جگہ لے لی تھی۔ اس طرح ہوٹل والوں کی چاندی ہو جاتی تھی کیونکہ ہوٹل والوں کو ایسی ہی ڈانسر کی ضرورت تھی اس لیے انہیں کام نہیں ملتا تھا کیونکہ غیر ملکی طوائفوں کا جو طوفان آیا ہوا تھا اس سے ان کے بزنس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رادھا بہت اچھی اور ماہر تیراک بھی تھی۔ اس کی جسمانی کشش، متناسب جسم کا راز اس کی تیراکی میں تھا۔ اس نے کئی تیراکی کے کلبوں میں جا کے سکھانا شروع کیا تھا۔ وہ شام کے وقت بہترین اور اونچی اونچی چھلانگیں لگاتی تھی اور دن میں تیراکی سکھاتی تھی۔ رات میں ڈانس کا شوق پورا کرتی تھی۔ رات کا کھانا وہ اور رام چندر ایک ساتھ ہی کھاتے تھے لیکن یہ کام بھی زیادہ عرصہ چل نہ سکا اور نوبت ذاتی اشیا کی فروخت پر آ گئی۔ ایسے میں رام چندر کو خیال آیا کہ رادھا بہت اچھی تیراک ہے۔ رادھا ہی کا ایک اور جملہ اس کے ذہن میں آیا جس نے بعد میں ان دونوں کی کایا پلٹ دی۔

''میں اتنی مہارت رکھتی ہوں کہ سو ڈیڑھ سو فٹ کی اونچائی سے پیلے نما جگہ میں بھی چھلانگ لگا سکتی ہوں۔''

رادھا نے ایک بار بڑے فخریہ انداز میں اس سے کہا تھا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا کہ رادھا نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ وہ اترانے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ رام چندر کے ذہن نے اس بات پر خود بہ خود منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس نے رادھا سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنی تیراکی، کی صلاحیت کو استعمال کرے تو ان کے برے دن پھر سکتے ہیں۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ ساٹھ فٹ کی بلندی سے پانی کے چھوٹے ٹینک میں جس میں آگ لگی ہوئی ہو..... کودنے کا مظاہرہ کرے تو لوگ ششدر رہ جائیں گے۔ یہ شو ضرور چلے گا اور وہ کامیاب ہوں گے۔ ایسا شو اس شہر میں کیا پورے ملک میں نہیں ہوتا ہے۔ اس نے ایک ایسی فلم میں یہ مظاہرہ دیکھا تھا جس میں سرکس کے کرتب دکھائے گئے تھے۔

رادھا نے اس کی بات مان لی۔ کیونکہ وہ یہ کام بڑی آسانی اور مہارت سے کر سکتی تھی۔ رام چندر نے کئی ایسے ایجنٹس سے بات کی جو اس طرح کے تحیر زدہ اور چونکا دینے والے شو کرواتے تھے پھر انہیں مختلف مقامات پر کرتب دکھانے کے کنٹریکٹ مل گئے۔ رادھا نے سوچا تھا کہ وہ کچھ عرصے تک یہ کرتب دکھائے گی۔ اس لیے کہ اسے بے حجابی کی حالت میں آنا پڑتا تھا۔ لوگوں کی نگاہیں نیزوں کی انی کی طرح اس کے انگ انگ میں پیوست ہوتی تھیں اور جب ان کے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ رام چندر کوئی اور منافع بخش کاروبار کر سکے تو وہ یہ کام چھوڑ دے گی۔ وہ اس کرتب کو ایک لمبے عرصے تک جاری رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

مگر اب رام چندر کسی صورت تیار نہیں تھا کہ وہ یہ کام

UUNOVELS.COM

چھوڑ دے۔اب وہ خود کوئی کام نہیں کرتا تھا۔حد تو یہ تھی کہ وہ جو ہوٹلوں میں کوئی نہ کوئی جز وقتی کام کر لیتا تھا اس نے وہ بھی چھوڑ دیا تھا۔

رادھا ایک خودکار مشین کی طرح اپنا کام کرتی جا رہی تھی۔اب اسے رام چندر کے اظہارِ محبت میں وہ والہانہ پن اور گرم جوشی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ تھکاوٹ اور بیزاری کی بو آنے لگی تھی۔پہلے بھی اس نے ایسا محسوس کیا تھا تو اسے اپنا واہمہ سمجھا تھا لیکن یہ ایک حقیقت تھی جسے وہ جھٹلا نہیں سکتی تھی۔اب وہ لوگوں کے جھوٹے جملوں پر دھیان دینے لگی تھی جنہیں پہلے اس نے کبھی اہمیت اور توجہ نہیں دی تھی۔

کل بھی جب وہ کرتب کا مظاہرہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ رہی تھی تو اس نے اپنے دو مداحوں کی گفتگو سنی تھی۔

''کیا تم نے پہلے کبھی مس رادھا کے کرتب کا مظاہرہ دیکھا ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں..... میں اس کا شو اب تک کوئی تین مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔وہ جو کرتب کرتی ہے وہ بہت ہی حیرت انگیز اور نہایت سنسنی خیز ہوتا ہے۔میں نے پہلے کبھی ایسا کرتب کہیں نہیں دیکھا۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''مجھے اس کا کرتب اتنا اچھا لگتا ہے کہ میں تقریباً روز ہی رات کو یہاں آتا ہوں۔''

''میں خود بھی روز ہی آنے لگا ہوں۔مجھے خود بھی ڈر سا لگتا ہے کہ کہیں وہ کرتب دکھاتے ہوئے خود کو ہلاک نہ کر بیٹھے۔میں اس منظر کو کھونا نہیں چاہتا۔کرتب جس قدر سنسنی خیز ہے اس کا جسم بھی ایسا ہی ہے۔انگ انگ سے مستی ابلی پڑتی ہے۔اس نے کیا متناسب جسم پایا ہے۔'' دوسرے نے قہقہہ لگایا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔

''آج کل رادھا بہت کامیاب اور اونچی جا رہی ہے۔'' یہ راجندر کی آواز تھی جو اس کا دم بھرتا تھا۔

''بھئی، میری تو بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ وہ اگلے ماہ کے آخر تک ہلاک نہ ہو۔اس کے بعد چاہے اسے کچھ بھی ہو جائے کیونکہ اس وقت تک ہمارا معاہدہ مکمل ہو جائے گا۔ہم اس وقت تک خوب کما لیں گے۔نیا معاہدہ ہونے کی صورت میں ہماری ایسی آمدنی نہ ہو سکے گی جو اب ہو رہی ہے۔''

راجندر نے یہ بات بڑی سفاکی اور خود غرضی سے کہی تھی۔تب اسے راجندر کی اصل شخصیت اور کمینگی کا علم ہوا تھا۔

وہ کافی دیر تک ان خیالات کے بھنور میں پھنسی بستر پر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔پھر ایک ملازم نے آ کر اسے اطلاع دی کہ اس کے شو کا وقت ہونے والا ہے پھر وہ بستر سے نکل کر سنگار میز کے سامنے آ بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد ہوٹل کے وسیع و عریض ہال میں گونجنے والی مدھر موسیقی تھم گئی۔ہال میں جو روشنیاں جگمگا رہی تھیں وہ بھی مدھم پڑ گئی تھیں اور روشنی کی ایک تیز لکیر ٹینک پر مرکوز تھی جو دور کونے میں رکھا تھا۔روشنی کی تیز لکیر اس وقت رام چندر پر بھی پڑ رہی تھی جو ٹینک کے قریب کھڑا ہوا تھا۔چند لمحے اس نے ہال کا جائزہ لینے کے بعد بولنا شروع کیا۔

''خواتین و حضرات! اب آپ اس صدی کا سب سے خطرناک اور بہترین مظاہرہ دیکھیں گے۔مس رادھا جو دنیا کی بہترین چھلانگ لگانے والی خاتون ہیں، اب ساٹھ فٹ کی اونچائی سے ایک پانچ فٹ کے پانی کے ٹینک میں چھلانگ لگائیں گی۔جو آگ سے روشن ہو گا۔یہ ایک ایسا مظاہرہ ہے جو پہلے کبھی پیش نہیں کیا گیا اور اس کا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی ان کی طرح مظاہرہ کرے گا تو وہ اسے ایک لاکھ روپے کا انعام دیں گی۔خواتین و حضرات! مجھے یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے کہ میں اس عظیم مظاہرے کے لیے مس رادھا کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔''

اس اعلان کے ختم ہونے پر پُرشور تالیوں نے اس کا سواگت کیا اور پھر اسٹیج کی بلندی پر ایک مختی سی شبیہ ابھری جو دوڑتی ہوئی ٹینک کی طرف بڑھی۔پھر وہ ناظرین کے سامنے کسی شاخِ گل کی طرح جھک گئی تھی۔اس نے ایک ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔اس کے سر پر غسل کی ٹوپی تھی اور اس کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اسٹیج پر آنے کے لیے خاص میک اپ نہیں کیا تھا۔

چند لمحوں کے بعد رادھا نے ڈریسنگ گاؤن اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔وہ پیراکی کے لباس میں تھی۔اس کا چہرہ جسم کے مقابلے میں خوب صورت نہیں تھا لیکن جسم شعلہ مجسم تھا۔روشنی کی تیز لہر اس کے تعاقب میں تھی جس نے اسے اور نمایاں کر دیا تھا۔کون سی نگاہ تھی جو اسے اپنے اندر جذب نہیں کر رہی تھی۔اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دنیا کے سامنے بے لباس ہو کر رہ گئی ہے۔وہ روز ہی ایسا محسوس کرتی تھی۔اس نے گاؤن اتارنے کے بعد سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دی تھیں۔ساتھ ہی ساتھ ایک شخص ٹینک میں موجود پانی کی سطح پر پیٹرول چھڑک رہا تھا۔قریب کھڑے رام چندر کے ہاتھ میں مشعل تھی اور نظریں اوپر چڑھتی ہوئی رادھا پر جمی تھیں جو بلندی پر پہنچ کر ایک مچان پر کھڑی ہو گئی تھی۔

''کیا تم تیار ہو رادھا؟'' رام چندر نے چیخ کر پوچھا۔

''ہاں۔'' رادھا نے اپنا سر ہلایا اور خوب صورت

UUNOVELS.COM

ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے جواب دیا۔

"او کے، اب تم چھلانگ لگا دو۔" رام چندر نے بلند آواز میں کہا۔ اتنا کہہ کر اس نے مشعل کو پانی کی سطح سے چھو دیا۔

شعلے ایک دم سے بھڑک اٹھے اور بلند ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر خوف کا احساس ہوتا تھا۔ اسی لمحے رادھا نے چھلانگ لگا دی۔ وہ روشنی کی لکیر کی طرح تیزی سے نیچے آئی اور شعلوں میں ڈوب گئی جو اس کے پانی میں گرتے ہی بجھ گئے تھے۔ ایک پل کے بعد وہ پانی کی سطح پر کسی مچھلی کی طرح ابھری اور ٹینک سے باہر آ گئی۔

لوگ بے تحاشا تالیاں بجا بجا کے اس کے اس عظیم کرتب کی داد دینے لگے۔ جوان سیٹیاں بجا کر داد دے رہے تھے۔ رام چندر نے بجلی کی سی تیزی سے اسے گاؤن پہنا دیا تھا تاکہ اس کا نیم عریاں جسم بھیگ کے جو آتش فشاں کی طرح دہک اٹھا تھا، ندیدی اور للچائی ہوئی نظروں سے چھپ جائے۔ رادھا جھک جھک کے ان کی داد کا جواب دلکش مسکراہٹ سے دے رہی تھی پھر وہ دوڑتی ہوئی لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہال کے بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی۔ ہال کی روشنیاں پھر تیز ہو گئی تھیں۔ ویٹر بھی سرعت سے حرکت میں آ گئے تھے۔

رادھا نے کمرے میں پہنچ کے گاؤن اتار کے ایک طرف ڈال دیا۔ پیراکی کا لباس اتار کے تولیے سے اپنا جسم اچھی طرح خشک کیا اور کپڑے پہن کر بستر پر بے سدھ سی ہو کر دراز ہو گئی۔ اسے خود پر غصہ بھی آتا تھا اور رونا بھی..... اس نے رام چندر کی خاطر خود کو کٹھ پتلی بنا لیا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسے سچے دل سے چاہتی تھی۔ اس کی محبت میں تصنع، کھوٹ اور ضرورت شامل نہ تھی۔ یہ پیار ایک عورت کا تھا۔ رام چندر اس کی پہلی محبت تھا۔ رام چندر کی نظر میں صرف اور صرف پیسے کی قدر تھی جسے وہ پوجتا تھا۔

چند لمحوں کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ رام چندر اندر داخل ہوا۔

"اوہ رادھا..... میری جان! تم نے تو آج بھی کمال کر دیا۔ سارے تماشائی پاگل ہو رہے ہیں۔ وہ تمہیں بے تحاشا داد دے رہے ہیں۔ میں کتنا خوش ہوں جان..... تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتی ہو۔"

رام چندر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا اور رادھا اس کی طرف دیکھ رہی تھی کہ کہیں وہ بستر پر نہ آ جائے۔ وہ اسے کسی طرح خوش کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ بستر کی طرف بڑھتا تو اٹھ بیٹھتی تاکہ مزاحمت کرے۔

"ارے ہاں رادھا! میں تمہیں ایک بات بتانا ہی بھول گیا۔ ایک بوڑھا جوڑا جو تم سے ملنے آیا ہے، میں نے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بے انتہا اصرار کر رہے تھے۔ چنانچہ مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔" رام چندر نے کہا۔

"میں کسی سے نہیں ملوں گی۔" رادھا نے رکھائی سے کہا۔ "ان سے معذرت کر لو۔"

"نہیں رادھا! میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ تمہیں ان سے ملوا دوں گا۔ آخر میری بھی تو کچھ عزت ہے۔"

رام چندر یہ کہتا ہوا کمرے سے نکلا۔ اس نے رادھا کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ رادھا بستر سے نکل آئی۔

رام چندر اس جوڑے کو بلا کے اندر لے آیا۔ وہ ایک بوڑھا جوڑا تھا۔

"ہمیں آپ کا کرتب بہت پسند آیا۔" بوڑھی عورت نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ تعریفی لہجے میں بولی۔ "نہایت شاندار کرتب جو ہم نے اب تک نہیں دیکھا۔"

"کیا یہ آپ کے پتی ہیں؟" رادھا نے پوچھا۔ اس کا اشارہ ساتھ والے بوڑھے کی طرف تھا۔

"ہاں۔" بوڑھی عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"دراصل ایک زمانے میں، میں بھی تمہاری طرح روسی سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی جب وہ ہندوستان آیا تھا۔ لوگ بھی میرے کام کو بہت پسند کرتے تھے۔ پورے ملک میں میری دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب تو کوئی میرے کام اور نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ یہ جھولے کا کرتب ہوتا تھا جو زمین سے تیس فٹ اونچا ہوتا تھا۔ نیچے جال ہوتا تھا۔ گرنے کی صورت میں جان اور جسم بھی بچ جاتا تھا پھر جال ہٹا لیا جاتا تھا۔ تب لوگ دم سادھے دیکھتے تھے۔ مجھے یہ کرنا ہوتا تھا کہ جھولتے ہوئے دوسرے جھولے کو پکڑنا ہوتا تھا جو جھولتا رہتا تھا۔ ذرا سی بھی چوک موت کی بھینٹ چڑھا دیتی۔ اب تو میں گمنامی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ تمہارا کرتب دیکھا تو میرا ماضی حال بن گیا۔ میرا دل اش اش کر اٹھا اور بے اختیار داد دینے چلی آئی۔"

یہ کہہ کر عورت نے اسے چوم لیا پھر وہ چلی گئی لیکن رادھا بہت دیر تک فکرمندی سے اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

"اوہ رادھا جانی! یہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا ہے؟" اسے چپ دیکھ کے رام چندر نے پوچھا۔

"رام چندر! کیا تم نے اس بوڑھی عورت کی باتیں

نہیں سنیں؟ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ کچھ عرصے پہلے اتنی مشہور تھی کہ بچہ بچہ اسے جانتا تھا۔ آج .... وہ گمنامی کی زندگی گزار رہی ہے۔ آج وہ اپنا تعارف کراتی ہے تو کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں ہے۔"

"ارے یہ کیا؟" رام چندر نے حیرت سے کہا۔ "یہ تم رو کیوں رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" رادھا نے سرہانے والی میز سے رومال اٹھا کے اس میں آنسو جذب کیے پھر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "آج رات میں دوسرا شو ہرگز نہیں کروں گی۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں؟" رام چندر کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔

"آخر اس سے فائدہ کیا ہے؟ حاصل کیا ہے؟ صرف چند سو روپے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالوں؟ جبکہ مجھے پتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد لوگ مجھے پہچانیں گے بھی نہیں۔" رادھا نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن کیا تم اپنے پرستاروں کو مایوس کر دو گی جو تمہارے دیوانے ہیں؟" رام چندر نے اسے سمجھایا۔

"پرستار؟" اس نے حقارت سے کہا۔ "جنہیں کھانے پینے کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔ جن کے پاس اتنی دولت ہے کہ کوئی حساب نہیں ہے۔ انہیں کرتب سے زیادہ میرے تو بہ شکن جسم سے دلچسپی ہے۔ وہ میرے حسن و شباب کے پرستار ہیں۔ تم کیوں بھولتے ہو کہ میں ایک عورت ہوں۔ کیا میں ان کی نگاہیں نہیں پہچانتی ہوں جو سوئیوں کی طرح بدن کے انگ انگ میں چبھتی ہیں؟ ان کی ہوسناکی سے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں عورت ہی نہیں دیکھی ہو۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ ان ہوس پرستوں نے مجھے غلط سمجھا ہوا تھا۔ انہوں نے تم سے رابطہ کیا تھا کہ ایک معقول معاوضے پر راتیں کالی کیا کروں؟ میں ان پرستاروں کے لیے کھلونا نہیں بن سکتی اور نہ ان کی پرہوس نگاہوں کا نشانہ۔"

"لیکن تم اب تک کرتب دکھاتی رہی ہو۔" رام چندر نے کہا۔ "کیا تمہیں اس بات سے انکار ہے کہ تم اپنی خوشی اور رضامندی سے اس کام پر آمادہ ہوئی تھیں؟" رام چندر نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں، میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں۔" رادھا نے جواب دیا۔ "اس وقت حالات ہی ایسے تھے جس نے مجھے مجبور کیا اور میں نے تمہاری تجویز کو مان لیا لیکن میں اب بہت تھک چکی ہوں۔ کیونکہ اب میرے اعصاب قابو میں نہیں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں کوئی غلطی کر کے خود کو ہلاک نہ کر بیٹھوں۔"

"رادھا..... رادھا..... پلیز خود کو سنبھالو۔" وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسے کیسے کام چلے گا۔ تمہیں ہار نہیں ماننی چاہیے رادھا۔"

"تم نہیں جانتے کہ اوپر پہنچ کے کیسے لگتا ہے؟ جب میں اس اونچائی پر کھڑی ہو کر نیچے دیکھتی ہوں، ٹینک کی طرف..... تو..... تم سمجھ نہیں سکتے..... میری بات کا یقین کرو..... اگر آج رات میں نے دوبارہ شو کیا تو میں ہمت کھو دوں گی۔ میں شاید بے ہوش ہو جاؤں گی۔ رام چندر!

اقوال زریں

☆ وفا سیکھنی ہے تو مچھلی سے سیکھو جو پانی سے جدا ہو کر مر جاتی ہے۔

☆ وفا سیکھنی ہے تو پھول سے سیکھو، جو ٹہنی سے جدا ہو کر مرجھا جاتا ہے۔

☆ وفا سیکھنی ہے تو پودے سے سیکھو، جو مٹی سے الگ ہو کر سوکھ جاتا ہے۔

☆ وفا سیکھنی ہے تو کتے سے سیکھو، جو بچا کھچا کھا کر مالک اور اس کے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔

☆ پاؤں کی لغزش کے بعد سنبھلا جا سکتا ہے لیکن زبان کی لغزش کے بعد سنبھلنا ناممکن ہے۔

☆ چابی جب تک استعمال میں رہتی ہے، وہ صاف اور چمکیلی رہتی ہے یعنی انسان کو ہر وقت مصروف رہنا چاہیے۔

☆ یاد رکھ دنیا کی دولت صرف قبر تک ہے، اس کے بعد اعمال کی دولت ساتھ دیتی ہے۔

☆ دنیا کی ہر چیز مٹ جائے گی مگر اعمال نہ مٹیں گے۔

☆ جھوٹ جائز نہیں مگر رفع شر کے خیال سے اگر ضرورت ہو تو جائز ہے۔

☆ یاد رکھو، ہر نئی چیز اچھی لگتی ہے مگر دوستی جتنی پرانی ہو اتنی ہی عمدہ اور مضبوط ہوتی ہے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

UUNOVELS.COM

بھگوان کے لیے تم مجھے اس عذاب سے نکالو..... مجھے یوں لگتا ہے کہ ہر بار کرتب دکھانے کے بعد میں موت کے منہ سے نکلتی ہوں۔"

"اگر تم آج ہمت ہار گئیں تو پھر مظاہرہ نہیں کر سکو گی..... تمہاری یہ سوچ اور کمزوری تمہیں کھا جائے گی۔ تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ..... تم کم ہمتی کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" رام چندر نے کہا۔

"نہیں..... رام چندر..... صرف آج..... آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... آج میں دوبارہ کرتب نہیں دکھا سکتی۔" رادھا نے التجا کی۔ "پلیز، مجھے آج کے لیے معاف کر دو۔"

"اوہ رادھا! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمہیں پتا ہے ہوٹل کا مالک تمہاری کتنی عزت کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسے تمہاری ذات کی وجہ سے بہت زبردست مالی منافع ہوتا ہے۔ اگر وہ تم سے مایوس ہو گیا تو ہم کیا کریں گے؟ ہمارے پرانے تنگدستی اور احساسِ محرومی کے دن لوٹ آئیں گے اور پھر ہم فاقے کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیا تمہیں کوئی احساس اور خیال نہیں؟"

"میں کچھ نہیں جانتی رام چندر! میں نے تم سے کہا نا کہ میں تھک چکی ہوں۔ اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے سہارے کی..... اب تمہارے پاس اتنی رقم ہے کہ ہم کوئی... بھی دوسرا کاروبار کر سکتے ہیں۔ بہت سارے منافع بخش کاروبار لوگ کر رہے ہیں۔ تم مجھے اس عذاب ناک اذیت سے نکال کیوں نہیں دیتے؟ میں بستر کی نہیں تمہاری محبت کی ساتھی بھی ہوں۔" رادھا روہانسی ہونے لگی۔

"رادھا، تمہیں پتا ہے کہ ابھی ہوٹل کے مالک سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ اگلے ماہ کے لیے بھی کنٹریکٹ کرنا چاہتا ہے اور میں نے اس بار رقم دگنی کر دی ہے۔ ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ تم ہمت تو کرو میری جان۔" رام چندر نے اسے سمجھایا۔

"نہیں..... ہرگز نہیں..... رام چندر.....! اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں خود کو ہلاک کر لوں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔" رادھا نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ "میں نے تمہاری ہر بات مانی ہے، کیا تم میری التجا بھی نہیں مان سکتے؟"

"دیکھو رادھا! اگر تم نے اس کی آفر قبول کر لی تو ہمیں ساری زندگی کچھ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ زندگی سکون اور عیش، راحت اور آرام سے گزرے گی۔ اس مہینے کے ختم ہونے میں صرف چند دن باقی ہیں اور پھر ایک مہینا اور....." رام چندر نے اسے قریب کر کے اصرار کیا۔ "تم مایوسی کی باتیں نہ کرو۔"

"میں مرنا نہیں چاہتی کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔

"میں جانتا ہوں۔ میں بھی تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ دیکھو جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے میں نے کسی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ مجھے تمہاری محبت کا احساس ہے۔ اس لیے کہ تم نے ساری محبت مجھ پر نچھاور کر دی۔ ہمیں کبھی اتنی دولت نہیں ملی تھی اور نہ ہی آئندہ شاید ہی ملے۔ یہ ایک سنہری موقع ہے، اسے ضائع نہ کرو۔ کیونکہ زندگی میں سنہری مواقع بار بار نہیں ملتے۔ ابھی لوہا گرم ہے اور ابھی اس پر چوٹ لگانے کا مناسب وقت ہے۔"

اس نے اپنی بات ختم کی تو رادھا نے اس کی طرف ویران اور خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ اب یہ بات اس پر واضح ہو گئی تھی کہ رام چندر خودغرض ہے اور رام چندر کی نظر میں اس کے جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر اہمیت تھی تو صرف دولت کی جبکہ وہ چاہتی تھی اور اس کی آرزو تھی کہ جب وہ مرے تو رام چندر کے قدموں میں..... لیکن.....؟

"آخر مجھے لوگ بار بار کیوں دیکھنے آتے ہیں؟ کیا میرا نیم عریاں بدن اور سنسنی خیز تناسب..... لیکن مجھ جیسی لڑکیاں اور عورتیں سرِ راہ، فلموں میں، انٹرنیٹ اور موبائل فون پر بھی جلوے دکھاتی ہیں۔ نہیں..... یہ بات نہیں..... صرف اس لیے کہ وہ مجھے کرتب کے دوران مرتا ہوا دیکھیں... انہیں موت کا دل خراش منظر دیکھ کے خوشی ہو گی۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

"نہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ "یہ تم پاگلوں کی طرح کیا سوچ رہی ہو میری جان؟"

"جب میں مر جاؤں گی تو لوگ مجھے چھ سات دنوں ہی میں اس لیے بھول جائیں گے کہ سنسار میں اس قدر رنگینیاں، تفریحات اور دلچسپیاں ہیں کہ وہ کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ کیا یہی پرستار ہیں؟ دیوانے ہیں؟ نہیں..... کوئی پرستار نہیں۔ یہ صرف وقت کے پرستار ہیں۔ خودغرض، خود پرست اور مطلبی۔" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اچھا میری جان۔" رام چندر نے اداسی سے کہا۔ "اگر تمہاری مرضی نہیں ہے آج رات شو کرنے کی تو مت کرو۔"

"میں صرف آج کی بات نہیں کر رہی ہوں بلکہ ہمیشہ

کی بات کر رہی ہوں۔ تم یہ مت سمجھو کہ میں پاگل ہو گئی ہوں یا اس بوڑھی عورت سے مل کر میرا دماغ چل گیا ہے بلکہ میں اس کے بارے میں کافی عرصے سے سوچ رہی ہوں۔ میں اب کام نہیں کر سکتی۔ تمہیں پتا ہے آج ابھی جب میں نے یہ مظاہرہ کیا تو میرے جسم کا روم روم کانپ رہا تھا اور جب میں نے شعلے اگلتے مینک میں چھلانگ لگائی تھی تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نہیں جانتی ... کہ کرتب کیسے کامیاب ہو گیا۔ مجھ پر دیا کرو، جب مجھے ہوش آیا تو میں مینک سے باہر ابھری تھی۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے، داد دے رہے تھے۔'' رادھا اتنا کہہ کر سسکنے لگی۔

رام چندر چپ ہو گیا تھا۔ رادھا شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔ اس میں رادھا کا ہی کمال نہیں تھا، اس کے جسم کا بھی تھا۔ اس کا انگ انگ ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا تھا۔ ایسا پُرشباب گداز بدن تھا کہ وہ پیراکی کے لباس میں قیامت ڈھاتی تھی۔ تماش بینوں میں اکثریت اس کی حشر سامانیوں سے محظوظ ہوتے ہوئے موبائل فون میں عکس بند کر لیتے تھے۔ اب ان کے سارے مسائل اور احساسِ محرومیاں دم توڑ چکی تھیں۔ اگر رادھا اسی طرح اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتی رہتی تو اس کے پاس بے پناہ دولت جمع ہو جاتی۔ اس کا پروگرام تھا کہ جب تک لوگ ان سے بور نہیں ہو جاتے وہ شو کرتے رہیں گے اور بعد میں ان کے پاس ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے بہت دولت ہو گی لیکن رادھا تو راستے ہی میں ہمت ہار بیٹھی تھی اور اس نے بغیر کسی وارننگ کے کام نہ کرنے کا فیصلہ سنا دیا تھا جو اچانک اور غیر متوقع تھا۔

رام چندر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ وہ رادھا کو اداس اور پریشان دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ رادھا نے کڑے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ اس وقت کو کبھی نہیں بھولا تھا جب ایک وقت وہ سارا دن بھوکے رہے تھے اور اسے اس مصیبت سے رادھا نے نکالا تھا۔

''جانِ من! جانتی ہو، اگر تم یہ کام چھوڑ دو تو کیا ہو گا؟ تمام ہوٹلوں میں ہمارے کنٹریکٹ متاثر ہوں گے اور ہمارا کاروبار ختم ہو کے رہ جائے گا۔'' اس نے کہا۔

''ہو جانے دو..... میں کہیں اور نوکری کر لوں گی۔'' رادھا نے بے پروائی سے کہا۔ ''بھگوان کا یہ سنسار بہت بڑا ہے۔''

''کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہیں مانگنے پر نوکری فوراً مل جائے گی؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ممبئی شہر میں روزانہ کتنے ہزار لڑکے اور لڑکیاں نوکری کے لیے خوار ہوتے ہیں۔ لڑکیاں..... وہ تو آلودہ ہونے کی شرط بھی پوری کرنے کو تیار ہیں پھر بھی انہیں نوکری نہیں مل رہی۔'' رام چندر نے غصے سے کہا تو رادھا پھر رونے لگی۔

''بھگوان کے لیے چپ ہو جاؤ رادھا۔ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔'' رام چندر نے بے چارگی سے کہا۔

''اب ہم دونوں کو آرام کی ضرورت ہے۔ تم میری یہ بات مان کیوں نہیں لیتے؟'' رادھا ضد سے بولی۔

''میں مانتا ہوں اور جانتا ہوں کہ ہمارے پاس اتنی رقم ہے کہ ہم دو ایک برس تک آرام سے بیٹھ کے کھا سکتے ہیں لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟ اس کے بعد فاقے شروع ہو جائیں گے۔ پھر پہلے ہی کی طرح ہماری چیزیں بکیں گی اور ہم پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مختلف ہوٹلوں میں قلیل معاوضے پر رقص کریں گے۔ کیا تم ان کی شرائط پر نامناسب رقص کرنا پسند کرو گی؟ ان غیر ملکی طوائفوں کی طرح..... نہیں..... تم انسان سے حیوان نہیں بنو گی۔''

''میں جانتی ہوں، تم سمجھتے ہو کہ میرا یہ فیصلہ احمقانہ ہے۔'' رادھا نے کہا۔

''نہیں، یہ بات نہیں رادھا۔'' رام چندر نے مسکراتے ہوئے رادھا کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔ ''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ہر حال میں خوش رہو۔ تم جانتی ہو کہ دنیا میں تمہارے علاوہ میرا کوئی اور نہیں ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا پرستار ہوں۔''

وہ رادھا کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ رادھا حیران تھی کہ وہ اسے اپنا ہمدرد سمجھے یا کوئی لالچی شخص جو اسے طرح طرح سے دولت کمانے کے لیے اکسا رہا تھا اور جسے محبت کے دعوے کے باوجود اس کی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس ایک لمحے میں اسے ساری دنیا بڑی چال باز اور مطلبی سی لگی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی چھا گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہاں کوئی کسی کا پرستار نہیں ہے۔ سب مطلب کی دنیا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیوں..... کیا ہوا رادھا؟'' رام چندر کے چہرے پر شدید حیرت چھا گئی۔

اس نے رادھا کے بدلے ہوئے انداز کو محسوس کر لیا تھا۔ رادھا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور سنگار میز کی طرف بڑھ گئی۔ ''میرا خیال ہے اب وقت آ گیا ہے کہ میں تیار ہو جاؤں۔'' رادھا نے ... بے خودی کے عالم میں کہا۔

UUNOVELS.COM

''میں شو کروں گی..... آج کی رات بھی اور آج کے بعد ہر رات دو شو کروں گی۔ جب تک لوگ بور نہیں ہو جاتے اور مجھے دیکھ دیکھ کے محظوظ نہیں ہوتے رہتے یا میں خود کو ہلاک نہیں کر لیتی۔ تا وقتیکہ اپنے جسمانی نشیب و فراز سے بھی انہیں دیوانہ بناتی رہوں گی۔ میرے لیے بھلا اور راستہ کہاں ہے؟ میں کرتب نہیں دکھاؤں گی تو میرے پرستار مجھ سے ناراض ہو جائیں گے اور ہمارا پچھلا وقت لوٹ آئے گا۔ میں اب دوبارہ ان چھوٹے چھوٹے تاریک کمروں میں واپس جانا نہیں چاہتی۔ میں بھوکی رہنا نہیں چاہتی۔ میں صرف اس لیے یہ کام چھوڑنا نہیں چاہتی کہ میرا جسم تھک گیا ہے اور میں خوف زدہ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اگر میں مزید ایک ماہ کرتب دکھاؤں گی تو ہمارے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے گی کہ تم کسی دوسرے کاروبار کے بارے میں سوچ سکو یا پھر کوئی اور راستہ ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''نہیں جانِ من! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم خود پر جبر کر کے یہ کام کرو۔ اگر تم خوش نہیں ہو تو کرتب کا کام چھوڑ دو، ہم کوئی اور کام ڈھونڈ لیں گے۔ ہم پہلے ہی فاقے جھیل چکے ہیں۔ ہم پھر ایک بار وہی زندگی گزار سکتے ہیں۔'' رام چندر نے کہا تو اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

رادھا نے اس کی کوئی بات جیسے سنی نہیں تھی۔ پھر اس نے دوسرا لباس پہن لیا۔ اس نے کبھی اس حالت میں کرتب نہیں دکھایا تھا۔ اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے سوچا کہ پرستار اس کے کرتب سے زیادہ اس کے بجلی بھرے بدن کو دیکھ کر خوش ہوں گے پھر وہ عجیب انداز سے مسکرا دی اور دل میں خود کو سراہنے لگی۔

''میں پرستاروں کو مایوس نہیں کر سکتی۔'' اس نے آہستہ سے خود کو مخاطب کیا اور رام چندر کی طرف بڑھ گئی اور اس کے گلے میں اپنی عریاں، مرمریں اور گداز باہیں حمائل کر کے اس کی آنکھوں میں خود سپردگی سے جھانکنے لگی۔

''آج مجھے اس طرح سے رخصت کرو جیسے پہلی بار کرتب دکھانے کے لیے کیا تھا۔'' رادھا نے عجیب والہانہ پن سے کہا تو رام چندر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اسے یاد تھا۔ وہ یادگار لمحات اور دن کیسے بھول سکتا تھا جب پہلی بار کرتب کا مظاہرہ دکھانے کے لیے وہ جا رہی تھی تو تب اس نے رادھا کو بازوؤں میں لے کر چہرے پر چند لمحوں تک کے لیے جھکا رہا تھا۔ دونوں جذباتی ہو گئے تھے۔ آج رادھا نے وہی فرمائش کر دی تھی۔ اس نے رادھا کی سابقہ خواہش پوری کر دی تو وہ مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو رام چندر کے جذبات قابو میں نہ رہتے۔ وہ بہک جاتا، کیونکہ رادھا ایسی حالت میں تھی کہ کسی بھی مرد کا جذبات پر قابو پانا مشکل تھا۔ پھر وہ شو نہیں ہو پاتا۔

''اب ٹھیک ہے جان! تم میری ایک بات یاد رکھنا۔ لوگ میرے پرستار ہیں اور میں تمہاری..... آج میں کرتب لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے کر رہی ہوں۔ خصوصی کرتب۔ اس لیے کہ میں صرف تمہاری پرستار ہوں رام چندر۔'' وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔

جب وہ مظاہرہ کرنے کے لیے اپنے کمرے سے نکل کے رام چندر کے ساتھ نیچے ہال کی طرف جا رہی تھی تو وہ سوچ رہی تھی کہ جو لوگ اس امید پر شو دیکھنے آئے ہیں ....کہ کہیں رادھا کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے۔ وہ انہیں مزید مایوس نہیں کرے گی آج وہ اس کرتب کو آخری حدوں تک پہنچا دے گی۔

ہال میں داخل ہوتے ہوئے اسے تالیوں کے شور کی آواز آج زیادہ ہی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی وجہ اس کا لباس اور موجودہ حالت تھی۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ لیکن بڑی تمکنت سے سیڑھی کی طرف بڑھی۔ روشنی کی تیز لکیر اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کی زد میں وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے دنیا اسے فطری حالت میں دیکھ رہی ہے۔

آٹھ فٹ اونچی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اس کے قدم کپکپا رہے تھے۔ وہ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی چھوٹے مچان تک پہنچ کے رک گئی۔ نیچے پرستار دم بخود بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔

پھر جب وہ چھوٹے مچان پر کھڑی ٹینک کو دیکھ رہی تھی تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نیچے ہر چیز چکرا رہی ہو اور جب رام چندر نے ٹینک کی سطح پر پھیلے ہوئے پانی میں آگ لگائی اور اسے کود جانے کے لیے کہا تو وہ لڑکھڑاتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھی اور اس نے بغیر اندازے کے نیچے چھلانگ لگا دی۔

وہ تیزی سے نیچے آئی تھی اور ٹینک سے چند فٹ دور پختہ فرش سے اس کا سر ٹکرایا تھا۔ اس کا جسم ایک لمحے کے لیے اکڑا اور پھر ڈھیلا پڑ گیا لیکن مشہور کرتب دکھانے والی رادھا اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ رام چندر پاگلوں کی طرح منہ کھولے ٹینک کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ ٹینک میں جلتی آگ کو گھور رہا تھا اور اس کی رادھا اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ اس کی جگہ وہی تھی کہ وہ اس کی پرستار تھی۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

دوسرا قیدی

عبدالرب بھٹی

بعض اوقات اپنی ملکیت کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر انسان کسی کی شراکت کو گمان میں بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ یہ تو پھر اس کی محبوب بیوی تھی جس کی سوچوں پر بھی اس نے اپنے نام کا پہرا لگا رکھا تھا مگر یہ کیا... یہ دوسرا نام کس طرح اس کے نام سے جڑ گیا۔ بس یہی گتھی سلجھاتے سلجھاتے وہ ایسی بلا میں گرفتار ہوا کہ اسے پھر کسی کا ہوش نہ رہا۔

جاں نثار کرنے والے ایک قاتل عاشق کی انتہا پسندی

آج کی رات مجھے ایک بڑی مصلوب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ سینہ جکڑا جاتا تھا اور سانس بھی کھینچ کر آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج میرا دم نکل ہی جائے گا۔ کاش... کہ نکل ہی جاتا، اس رات کی عذاب ناکیوں سے تو میری جان چھوٹ جاتی۔ یہ رات..... جواب مجھے ہر دن، ہر لمحہ اور ہر پل کسی بھاری سل کی طرح پیستی ہی رہے گی..... یہ رات..... جواب مجھ پر ایک بھیانک سائے کی طرح مسلط رہے گی۔ مجھے تڑپاتی اور اذیتیں دیتی رہے گی۔

فرزانہ کی جدائی کا غم کیا کم تھا کہ اب یہ دوسرے غم کا پہاڑ بھی مجھ پر آن گرا تھا۔ ایک غم پر انسان آنسو بہاتا ہے لیکن دوہرے غم پر اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔

جیل کی اس کوٹھڑی کی قید مجھے گوارا تھی، حتیٰ کہ وہ غم بھی میرے لیے کسی حد تک قابل برداشت ہو جاتا جس کا زخم اب بھی مجھے رستا ہوا محسوس ہو رہا ہے لیکن..... لیکن..... آہ.....! اب میں کیا کروں کہ..... اس دوسرے زخم نے پہلے والے زخم کو بھی بری طرح چھیل کر رکھ ڈالا۔

کاش! مجھے عمر قید کی سزا نہ ہوتی، اس کے بجائے تختہ دار کو میرا مقدر بنا دیا جاتا۔ کم از کم اس عذاب ناک گھڑیوں سے تو جان چھوٹ جاتی، یا پھر یہ..... منحوس قیدی یہاں نہ آتا..... کہ بے خبری بھی تو ایک نعمت ہوتی ہے۔ اسی بے خبری میں ایک ہی غم کو سہتے ہوئے میں اپنی باقی عمر گزار دیتا مگر اس نئے غم نے تو میری روح تک کو تڑپا دیا تھا۔

مگر کیا واقعی اس دوسرے آنے والے قیدی کا کوئی قصور تھا؟ جو مجھ سے ذرا فاصلے پر ننگی اینٹوں کے فرش پر بوسیدہ سا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس نے میری روح کو خاموشی سی کچوکا لگایا تھا۔ میں تو اس سے کہہ بھی نہ پایا تھا اپنا غم.....

☆☆☆

بالآخر آج میں نے اس سے کہہ ہی ڈالا۔

''فری! یقین کرو میرا..... میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی، یا پھر کبھی مجھے وقت ہی نہ ملا ہو، لو بھلا..... محبت کے لیے کوئی وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' میں خود ہی اپنے سوال کا جواب دے کر ہنس پڑا۔ وہ بھی ہنس دی۔ میں نے تصحیح کی۔ ''میرا مطلب تھا کہ تم سے شادی سے پہلے میں نے کسی لڑکی کو ایسی نگاہ سے دیکھا ہی نہیں تھا، تو محبت کیا کرتا، لیکن اب میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ پہلے تمہیں امی جان اور باجی نے دیکھا اور میرے لیے پسند کیا۔ اب تم میری بھی پسند بن چکی ہو۔ ہاں! میرے جیسے لوگ شادی کے بعد اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں، تم بھی مجھے اسی گرفت میں سمجھو۔''

اس نے عروسی گھونگٹ تلے اپنی مسکان کی جھلک مجھے دکھا کر سر نہوڑا دیا تھا۔

مجھے اعتراف تھا کہ فرزانہ نے میری زندگی کو، میرے گھر کو جنت بنا دیا تھا۔ وہ اتنی ہی حسین تھی اور مجھ سے محبت کرنے والی بیوی بھی۔

''چلیں جی! اب بہت ہو گیا آرام..... کاروبار زندگی پر بھی اب کچھ توجہ دیں۔'' اس روز فرزانہ نے بڑی محبت سے مجھے جگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''اوہو..... نہیں بھئی، کون کم بخت نئی نئی شادی اور تم جیسی حسین اور پیار کرنے والی بیوی سے اتنی جلدی دور ہوتا ہے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''خدانخواستہ، ہم دور کیوں ہونے لگے.....'' اس نے فوراً کہا۔

میں بستر پر لیٹا بڑی محبت پاش نظروں سے اسے خود پر جھکے دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے اس کا مرمریں ہاتھ تھام کر بیڈ کے کنارے پر بٹھا دیا اور خود ایک کہنی اور تکیے کے سہارے نیم دراز ہو کر بولا۔ ''فری! تم مجھ سے شادی کر کے خوش تو ہو نا؟''

میرے اس سوال پر اس کے نرم لبوں پر گداز سی مسکان چمکی اور وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''کیوں نہیں خوش ہوں گی بھلا؟ کیا کمی ہے میرے پاس۔ تم، تمہاری بے لوث چاہت، یہ خوب صورت گھر، زندگی کی ساری سہولیات..... لیکن تمہاری محبت ہی میرے لیے کافی ہے۔''

''لو یو فری!'' میں خوش ہو گیا۔

''می ٹو۔'' وہ بھی مسکرائی اور پھر جیسے اسے یاد آ گیا۔ جھٹ سے بولی۔ ''اچھا چلیں، اب اٹھیں اور دفتر کی راہ لیں۔''

☆☆☆

فرزانہ کی محبت میرے لیے سب کچھ تھی۔ میں اسے پا کر بے حد خوش تھا۔ میرا کوئی بڑا کام نہیں تھا مگر جتنا بھی تھا اللہ کا شکر تھا کہ اچھی گزر ہو جاتی تھی۔ میں نئے پرانے فلیٹوں اور مکانوں کی تزئین و آرائش کے ٹھیکے وغیرہ لیا کرتا تھا۔

اس روز شادی کے بعد میرا سائٹ پر یہ پہلا دن تھا۔ سچی بات تھی کہ میرا جی ہی نہیں لگ رہا تھا۔ فرزانہ کا حسین و جمیل چہرہ، اس کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز کی کیف آور ساعتیں یاد کر کے میرے وجود میں میٹھا میٹھا سرور سا اٹھ رہا تھا۔ کام پر بھی میری کم ہی توجہ رہی۔ جلدی جاتا تو ڈر تھا فرزانہ ناراض ہو جائے گی، ناچار ٹائم پاس کرتا رہا۔ حالانکہ مجھے شام سے رات بھی ہو جایا کرتی تھی۔

دوپہر تک نہ جانے کس طرح میں نے بے چینی سے وقت گزارا۔ کہاں تو کام میں رات ہو جاتی تھی اور وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا، اب تو جیسے ایک ایک پل گن کر گزار رہا تھا۔ میں نے سوچا کام میں کافی وقت گزار لیا، فرزانہ کو کون سا

UUNOVELS.COM

معلوم تھا کہ میں کب گھر واپس آتا ہوں مگر وہ بھی ایک کائیاں تھی۔ لہٰذا دو بجے جب میں نے گھر کی راہ لی تو سارے راستے فرزانہ کے ہی لطافت بھرے خیالات و تصورات میں کھویا رہا۔ اس نے میرا مسکرا کر استقبال کیا۔ وہ گھر کے معمول کے امور میں مصروف تھی۔

''کیا آپ ہر روز ہی اسی وقت گھر آتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ اسے شاید شبہ ہو گیا تھا کہ میں جلدی آ گیا ہوں۔ پھر مجھ سے بھی جھوٹ نہیں بولا گیا۔

''نہیں، شام اور کبھی رات ہو جاتی ہے۔ تو کیا تم نہیں چاہتی..... کہ میں آج جلدی گھر آ جاؤں؟''

وہ میری بات پر کھنکتے ہوئے انداز میں ہنس دی۔ میں نے پیار سے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ خود سپردگی کے دوران بولی۔

''ایسی بات نہیں، میں سمجھ گئی تھی کہ آج آپ جلدی گھر آ جائیں گے۔''

''ظاہر ہے بھئی، نئی نئی شادی جو ہوئی ہے۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''چلو آج باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔''

''اس دوپہر کی گرمی میں.....؟'' وہ حیران ہوئی۔

''شام کو چلیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''میں ذرا کچھ کام نمٹا لوں۔''

شام کو ہم باہر نکل گئے۔ میرے پاس پرانے ماڈل کی مگر اچھی کنڈیشن کی... مہران کار تھی۔ ہم باہر سیر کرتے رہے اور رات کا کھانا بھی اچھے ہوٹل میں کھایا۔

غرضیکہ فرزانہ کے ساتھ میرے روز و شب بہت مسرور اور راحت میں گزرنے لگے۔ ان دنوں میرے کام سے لوٹنے کی واپسی کا وقت کم و بیش سہ پہر یا شام تک ہی ہوتا تھا۔ رات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

ایک دن میں سہ پہر میں گھر پہنچا۔ میرا کام ایسا تھا کہ میں سائٹ پر ہی کبھی کبھار کھا لیا کرتا تھا، ایسا میں فرزانہ کی وجہ سے کرتا تھا۔ ورنہ وہ میرے انتظار میں بے چاری بھوکی بیٹھی رہتی تھی۔ تاہم یوں ہوتا کہ جب وہ کوئی خاص یا میری پسندیدہ ڈش بناتی تھی تو میں دوپہر میں آ کر کھا لیتا اور پھر سائٹ پر نکل جاتا، یا پھر فون کر دیتا کہ آج دوپہر کا کھانا میں گھر پر ہی کھاؤں گا۔

سو میں گھر پہنچا اور ابھی دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ میں نے اپنے گھر سے ایک خاتون کو نکلتے دیکھا۔ فرزانہ بھی شاید اسے دروازے تک ہی چھوڑنے آئی تھی کیونکہ میں نے دروازے پر اس کی جھلک

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

اپریل کے شمارے

کی دلچسپ و سنسنی خیز

کہانیوں کی ایک جھلک

■ اولین صفحات ■

چند سیکنڈ میں کیا سے کیا رونما ہو سکتا ہے۔ جھلملاتی جگمگاتی سانس لیتی زندگی سے موت تک کا لمحاتی فاصلہ طے کرتی تحیر خیز داستاں..... **امجد رئیس** کے قلم سے

■ انا گیر ■

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان..... **امجد جاوید**

کے زور آور قلم کا امتحان.....

■ الاؤ ■

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی..... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی**

کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

محبتوں اور رفاقتوں کے دامن کو تار تار کرتی کہانی کے پیچ و خم.....

دوستی اور دشمنی کے فاصلے طے کرتی پر انتقام کہانی.....

چٹنی نکتہ چٹنی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

بھی دیکھی تھی۔

''کوئی سہیلی تھی تمہاری؟'' میں نے اندر داخل ہوتے ہی فرزانہ سے پوچھا۔

''جی ہاں!'' فرزانہ نے جواب دیا۔

میں فرزانہ کی محض چند ایک سہیلیوں سے ہی واقف تھا' وہ بھی اسی حد تک کہ کبھی کبھار میں انہیں اپنے گھر آتے جاتے دیکھ لیا کرتا تھا۔ یہ بھی کوئی سہیلی ہی ہوگی۔

لیکن اس دن میں نے محسوس کیا کہ فرزانہ کچھ چپ چپ سی تھی۔ میں یہی سمجھا شاید کچھ تھکی ہوئی ہو۔

یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی۔ اس روز کام زیادہ تھا اور میں اسے ادھورا چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا۔ ایک فلیٹ کا کام آخری مراحل پر تھا اور کسٹمر بضد تھا کہ آج ہی نمٹا کر جاؤں۔ اس نے فیملی سمیت اپنے نئے فلیٹ میں شفٹ ہونا تھا۔

اس دن میں شادی کے بعد پہلی بار اتنا دیر سے گھر پہنچا۔ ایک ڈپلی کیٹ چابی میرے پاس بھی ہوتی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو فرزانہ مجھے نظر نہ آئی۔ میں اس کے کمرے کی طرف بڑھا تو اسے میں نے میز پر بیٹھے دیکھا، اس کے سامنے کاغذوں کا کوئی پلندا رکھا تھا، جن میں سے ایک کاوہ جائزہ بھی لے رہی تھی، وہ مجھے کوئی خط نما کاغذ ہی محسوس ہوا تھا۔

وہ اسے پڑھنے میں اس قدر محو تھی کہ میری آہٹ بھی نہ پاسکی، مجھے حیرت ہوئی اور میں مسکرا کر کھنکھار دیا تو وہ یوں اچھلی جیسے ابھی کرسی سے گر ہی پڑے گی۔ میں خود بھی گھبرا گیا اور جلدی سے اسے سنبھالنے کو لپکا ہی تھا کہ اس نے مجھے دیکھتے ہی جلدی سے سنبھالا لیا اور فوراً ہی وہ پلندا جیسے تیسے سمیٹ کر دراز میں رکھ دیا پھر مسکراتے ہوئے میرے استقبال کے لیے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی مسکرا دیا۔ وہ میرے قریب آگئی، آج جانے کیوں مجھے اس کی مسکراہٹ مصنوعی سی محسوس ہوئی تھی۔

''آج آپ کو زیادہ دیر نہیں ہوگئی؟''

''ہاں! ہوتو گئی ہے، کیا تم پریشان ہوگئیں؟'' میں نے ذرا غور سے اس کے خوب صورت چہرے پر نگاہ جمائی۔ وہ ایک دم جیسے بنتے ہوئے بولی۔

''آں..... ہاں! نہیں، ایسی تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ شادی کے بعد پہلی بار ہی ایسا ہوا ہے نا، چلیں آپ ذرا فریش ہو جائیں تو میں کھانا لگاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا اور ساتھ ہی میری نظریں میز کی اس دراز پر بھی لگی ہوئی تھیں جس میں اس نے مجھے دیکھتے ہی کاغذوں کا وہ پلندا سا رکھ دیا تھا۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے کھول کر دیکھ لوں مگر کچھ اچھا نہیں لگا۔ سوچا کہیں فرزانہ بُرا نہ مان جائے، ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس کی آواز سنائی دی۔

''آپ گئے نہیں واش روم ابھی تک؟''

''ہاں! جارہا ہوں۔'' میں نے کہا اور کمرے سے نکلا۔

اس دن کے بعد میں محسوس کرنے لگا تھا کہ فرزانہ باتیں کرتے کرتے اچانک کہیں کھو سی جاتی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں؟ میں سوچتا.... جہاں محبت زیادہ ہوتی ہے تو خوامخواہ ہی دل و دماغ نامعلوم سے شکوک وشبہات کی آماجگاہ بننے لگتے ہیں۔

لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ ایک بات میرے ذہن سے نہیں نکلی، میں وہ پلندا دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک دن میں جی کڑا کر کے اس میز کے قریب چلا گیا۔ فرزانہ اس وقت بھی کچن میں تھی۔ میں نے دراز کھولنا چاہی تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ لاک ہے۔ میری پیشانی پر شکن سی ابھر آئی۔ ایسا کیوں تھا؟ فرزانہ نے اس سے پہلے تو اس دراز کو لاک نہیں کیا تھا کیونکہ میں اس میں اپنے کچھ ضروری اور چھوٹے موٹے بل اور واؤچرز رکھا کرتا تھا۔ تو پھر وہ کہاں گئے؟ دوسری اہم بات یہ تھی کہ یہ دراز کبھی لاک رہتی ہی نہیں تھی۔

میں فرزانہ سے دراز لاک کرنے کی وجہ تو نہ پوچھ سکا البتہ اس بہانے میں نے ان بلوں اور واؤچرز کا پوچھ لیا جو میں دراز میں رکھا کرتا تھا۔

''وہ میں نے بیڈروم کی سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیے ہیں اور اب آئندہ آپ اپنے چھوٹے موٹے کاغذات وہیں رکھا کیجیے۔'' فرزانہ نے جواب میں کہا۔ میں پھر الجھ گیا۔ مجھے اس کا مطلب یہی لگا تھا کہ اب میں اس دراز کو نہ کھولا کروں یا پھر بالفاظِ دیگر میرا اس دراز کو ہاتھ لگانا گویا ممنوعہ قرار پایا۔ میں نے جرح کرنا مناسب نہیں سمجھا اور مجھے کھد بھد بھی لگ گئی کہ آخر دیکھوں تو اس دراز میں رکھا کیا ہے جسے وہ اب ہر وقت لاک رکھنے لگی تھی۔

ایک دن میں نے اس کی چابی سے وہ دراز کھول لی۔ فرزانہ اس وقت باتھ روم میں تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ گھنٹے بھر سے پہلے نہیں نکلے گی۔

میں نے دھڑکتے دل سے دراز کھولی اور اس کے اندر مجھے وہی پلندا نظر آیا۔ اسے دیکھنے پر عقدہ کھلا کہ وہ کچھ پرانے خطوط کا پلندا تھا، جس پر ہلکے گلابی رنگ کا ربن

UUNOVELS.COM

بندھا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے ایک خط نکالا اور پھر ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا..... اس کے بعد چوتھے خط کو پڑھنے یا دیکھنے کی مجھ میں ہمت ہی کب رہی تھی ..... ایک لمحے کو تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ فرزانہ، میری محبوب بیوی..... جس سے میں بے انتہا پیار کرتا تھا، وہ ایسی مکار، دھوکے باز اور فریبی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے اپنے دوسرے روپ سے کس قدر بے وقوف بنائے ہوئے تھی۔

آج مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا تھا کہ اس کے دل میں کوئی اور بسا ہوا تھا، میں نہیں..... وہ تو کسی اور ہی کے خوابوں میں الجھی ہوئی تھی جن کی تعبیر کے حصول کے لیے وہ مجھے یوں مکر اور فریب کے جال میں الجھائے ہوئے تھی۔

اب مجھے پتا چلا کہ اس روز وہ کیوں اچانک مجھے دیکھ کر یک دم گھبرا گئی تھی اور خطوط کا یہ پلندا جلدی سے دراز میں چھپا دیا تھا۔ کیوں اس نے میرے کاغذات اس دراز سے نکال کر خواب گاہ کی بیڈ سائڈ ٹیبل میں رکھنا شروع کر دیے تھے اور اب اس میز کی دراز کو وہ مستقل لاک میں کیوں رکھنے لگی تھی۔

یہ سارے عشقیہ خطوط تھے، اس کے کسی عاشق نامراد نے لکھے تھے۔ اس کا نام جواد تھا اور اس نے بھی اپنے ہر خط میں فرزانہ کو ''فری'' کہہ کر ہی مخاطب کیا تھا۔ مجھ میں مزید پڑھنے کا حوصلہ کب رہا تھا۔

ایسا انسان جو بے انتہا محبت کرتا ہو، اس کے دل کو ایسی کوئی چوٹ لگ جائے تو چند لمحوں کے لیے وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے اندر کی دنیا تہ و بالا ہو جاتی ہے، اس کا مان ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کی بے وفائی پر بکھر جاتا ہے۔ میرے حواس بھی بکھرنے لگے۔ بدقسمتی سے جب میں اس نفرت و غیظ کی آگ میں جل رہا تھا تو فرزانہ بھی وہاں آ گئی اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی مرمریں گردن دبوچ لی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں یک دم پھیل گئیں۔ ان میں حیرت بھی تھی اور خوف بھی.... میں اس کی گردن دباتا ہی چلا گیا۔

میں اس کے دم توڑتے اور موت کی زردی میں لتھڑے ہوئے چہرے کے وہ آخری تاثرات کبھی نہیں بھلا سکتا تھا جب وہاں .... ایک بے بس سی التجا ٹوٹ کر ابھری تھی اور پھر معدوم ہو گئی۔

ہوش تو مجھے تب آیا جب وہ بے جان جسم کی صورت فرش پر گر چکی تھی۔ پانی سر سے گزرا تو میں بھی سن ہو کر رہ گیا تھا۔

پولیس مجھے فرزانہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر کے لے گئی اور اس کے بعد مجھے عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔

اب جیل کی یہ تنگ و تاریک کوٹھڑی تھی اور میرا سیاہ مقدر تھا اور میں خود..... کبھی دل میں کسک اٹھتی کہ مجھے یوں انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ وہ اگر کسی اور سے محبت کرتی تھی تو میں اسے طلاق ہی دے دیتا۔ نہ جانے کس مجبوری کے تحت اس نے مجھ سے شادی کر لی تھی جبکہ محبت وہ کسی جواد نامی شخص سے کرتی تھی۔ پھر خیال آتا کہ وہ مجھے اس طرح دھوکے میں رکھے ہوئے تھی اور یوں اب بھی اس کے اپنے محبوب سے خفیہ تعلقات استوار ہوں گے۔ پھر مجھ پر غیظ کا دیو حاوی ہونے لگتا اور میں سوچتا کہ میں نے فرزانہ کو قتل کر کے ٹھیک ہی کیا۔

انہی دنوں ایک اور قیدی کو لایا گیا۔ اسے سات سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ وہ بھی میری ہی عمر کا تھا۔

میرا اپنا غم اس قدر تھا کہ مجھے تو کسی سے بات تک کرنے کا یارا نہ رہا تھا، میں نے بس ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی تھی اور پھر اپنے خول میں سما گیا تھا۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

مجھے بے تعلق پا کر اسی نے مجھ سے بات کی۔ میں اکھڑے ہوئے پلاستر کی دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''کالی تقدیر۔''

''اس منحوس جگہ میں سب کی ایسی ہی تقدیر ہوتی ہے۔'' وہ شاید میرا مطلب سمجھ کر بولا۔ ''میرا نام جہانگیر ہے۔ جرم میرا اتنا ہی ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی مگر افسوس کامیاب نہ ہو سکا.....'' وہ اپنی سنانے لگ گیا اور میں اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ شاید اس لیے کہ ہمارا جرم مشترکہ تھا۔

''تمہاری بیوی نے بے وفائی کی تھی؟'' میں نے پہلی بار اس کی جانب غور سے تکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! کاش کہ وہ میرے ہاتھوں زندہ نہ بچتی اب وہ بڑے مزے سے اپنے یار کے ساتھ گل چھرّے اڑا رہی ہو گی۔'' جہانگیر تلخی سے بولا۔

''مگر میں کامیاب رہا۔'' میں نے جیسے فخریہ انداز میں بتایا تو وہ چونکا۔

''کیا؟ کیا تم بھی..... میری طرح اپنی بیوی کی بے وفائی کا شکار.....''

''ہاں!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا تھا اس کی بے وفائی کا؟'' جہانگیر نے پوچھا۔

UUNOVELS.COM

''میں نے اس کے اور اس کے عاشق نامراد کے عشقیہ خطوط پکڑے تھے، جسے اس نے مجھ سے شادی کے بعد بھی سنبھالے رکھا تھا۔''

میری بات سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''حیرت انگیز، ہمارا درد اتنا مشترکہ ہوسکتا ہے، مجھے یقین نہیں آتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں نے بھی اپنی بیوی کے عشقیہ خطوط دیکھ لیے تھے۔ بس! پھر میں آپے میں نہ رہا اور اس کی گردن دبوچ لی، مگر بدقسمتی سے وہ بچ گئی۔''

اسی وقت ایک سنتری نے سلاخ دار دروازے پر ڈنڈا بجایا۔

''چل اوئے جہانگیرے! تیری ملاقات آئی ہے۔''

''میری ملاقات؟'' جہانگیر نے چونک کر گردن اس کی طرف موڑتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا۔

غیر ارادی طور پر میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ وہاں ایک خاتون کھڑی تھی۔ مدھم مدھم سی روشنی میں مجھے اس کے چہرے کے نقوش واضح نظر نہیں آرہے تھے مگر جہانگیر شاید اسے پہچان گیا تھا اور لپک کر اس کی جانب بڑھا۔ پھر میں نے اسے غصے سے کہتے سنا۔

''تُو..... کیا لینے آئی ہے اب.....؟ میری تباہی کا تماشا دیکھنے کے لیے یا پھر.....'' وہ فرطِ غیظ تلے اپنا جملہ پورا نہ کرسکا۔ مجھے خوامخواہ ہی اشتیاق ہوا اور میں ان کی جانب تکتے ہوئے ان کی باتیں غور سے سننے لگا۔

''مم..... مجھے معاف کردو..... جہانگیر! میں اب بھی قسم کھاتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ وہ سب میرے ماضی کی ایک نادانی تھی۔ کیا مجھے معافی کا بھی حق نہیں دے سکتے تم؟'' اس خاتون نے جہانگیر سے نہایت دلگیر اور ملتجیانہ لہجے میں کہا تو یکا یک میرے اندر ایک چھناکا ہوا۔

میں بھی تو فرزانہ کو موقع دے سکتا تھا معافی کا..... مگر..... میں نے تو اسے بولنے کا موقع ہی کب دیا تھا۔ یہ سوچ کر میرے اندر کا درد بڑھنے لگا، زخم گہرا ہونے لگا۔

''معافی؟'' مجھے جہانگیر کی غصیلی آواز سنائی دی۔ ''تم اگر مجھ سے یہ سب پوشیدہ نہ رکھتیں تو شاید میں تمہیں معاف کردیتا، مگر تم نے وہ خطوط اب تک سنبھالے ہوئے تھے..... کیوں؟ اس لیے کہ اپنے یار نامراد کی یادیں تازہ کر سکو۔'' جہانگیر کے لہجے میں زہریلا طنز تھا۔

''یہی مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔'' اس خاتون نے سسکتے ہوئے کہا۔ میں اب غور سے اس خاتون کا چہرہ دیکھنے لگا تو وہ مجھے کچھ شناسا سا معلوم ہوئی۔ پھر میں نے دیکھا، اس خاتون نے اپنی چادر کے اندر سے ہاتھ نکالا اور اس میں گلابی ربن میں بندھے خطوط کا پلندا سلاخوں سے جہانگیر کی طرف بڑھا دیا۔ ''لو..... اب تم خود ہی انہیں ضائع کرڈالو، تاکہ تمہاری تسلی ہوجائے۔''

جہانگیر نے وہ پلندا اس سے لے کر غصے سے اچھال دیا۔ اس کا ربن کھل گیا اور وہ کچھ باہر اور اندر گرے۔ میں سناٹے میں آگیا۔

ایک خط میری جانب بھی کھسک آیا اور میں نے بے اختیار اسے اٹھالیا۔ میری پھٹی پھٹی نظریں اس خط پر جمی ہوئی تھیں۔ میں ایک خط پھر دوسرا خط اٹھا کر دیکھنے لگا اور مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ میں وہی خط دیکھ رہا تھا جو میں نے فرزانہ کے پاس بھی دیکھے تھے۔

میں بت سا بن گیا پھر میرے کانوں میں جہانگیر کی بیوی کی آواز ابھری۔

''کاش! میں یہ خطوط تمہارے خوف سے سنبھالنے کے لیے اپنی سہیلی فرزانہ کو نہ دیتی تو اتنی بڑی قیامت مجھ پر نہ ٹوٹتی۔''

''فرزانہ.....!'' میرے اندر پھر چھناکا ہوا۔ میں دیوانوں کی طرح اس خاتون کی طرف دیکھنے لگا اور تب ہی میں اسے پہچان گیا۔ وہ واقعی فرزانہ کی سہیلی تھی۔ میں نے اسے ایک دن اپنے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ میرا اندر سائیں سائیں کرنے لگا، میری مجبور سی آنکھوں کے سامنے فرزانہ کا حیرت بھرا اور پھر موت کی زردی میں لپٹا ایک بے بس سی التجا کرتا چہرہ رقص کرنے لگا۔ تب ہی میں نے جہانگیر کو کہتے سنا.....

''تم اب دفع ہوجاؤ میری نظروں کے سامنے سے..... میں نے تمہارا نام بھی اپنے دل سے کھرچ ڈالا ہے..... تم اب میری فریحہ..... میری فری نہیں ہو..... جاؤ دور ہوجاؤ میری نظروں سے.....''

''فریحہ..... فری..... فرزانہ..... فری.....''

یہ دو نام میرے دل و دماغ میں آسیبی چمگادڑوں کی طرح گردش کرنے لگے تھے..... کاش میں اتنی جلدی نہ کرتا..... کاش اسے کچھ بولنے کا موقع بھی دیتا۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

کلارا پار کر کے سامنے سچ بولنا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ مثلاً یہ کہ تم ٹائیجیریا میں ایک کھیت مزدور ہو اور تم ساری عمر میں مونگ پھلی اور لوبیا کی کاشت کرتے رہے لیکن تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ تمہیں صرف اتنا ملتا ہے کہ دو وقت کی روٹی کھالو یا بازار سے کوئی چھوٹی موٹی چیز خرید لو۔ مثلاً بارش سے بچنے کے لیے چھتری یا ہاتھ میں باندھنے کے لیے گھڑی۔۔۔۔ پھر ایک دن کونڈو گا، میں ایک شخص تمہیں ملتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ تمہارے جیسے

موت کے گھر میں زندگی تلاش کرنے والے کی بے وقوفیاں

فطری اصول ہے کہ تباہی کے بعد انسان پناہ کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی اسی معرکہ آرائی میں مصروف تھے مگر... ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط ثابت کرنے کا فن جانتا تھا کیونکہ ایک کے گھر میں دوسرے کو پناہ تو مل سکتی ہے لیکن... ایک کے جسم میں دوسری روح کو زندگی نہیں مل سکتی۔

پناہ کی تلاش

تنویر ریاض

UUNOVELS.COM

ایک آدمی کو جانتا ہے جو اس وقت جرمنی میں ہے اور ایک خوب صورت شہر کی سڑکیں صاف کرتا ہے۔ اگر تمہیں بھی جھاڑو دینا آتی ہے اور تمہاری بیوی ٹوائلٹ برش کا استعمال جانتی ہے تو اس شہر میں کئی محل نما ہوٹل اور درجنوں ٹوائلٹ ہیں۔ بھول جاؤ کہ تم نے کبھی فلش ٹوائلٹ نہیں دیکھا یا تمہاری بیوی کو ٹوائلٹ برش استعمال کرنا نہیں آتا اور اس آدمی سے کہو کہ ہاں میں اور میری بیوی یہ کام کر سکتے ہیں..... تو وہ آدمی کہتا ہے کہ تم دونوں مل کر اتنے پیسے کما لو گے جس سے نہ صرف تمہاری رہائش اور خوراک کے اخراجات پورے ہو سکیں گے بلکہ تم کچھ رقم اپنے والدین کو بھی بھیج سکو گے جو ان کی سال بھر کی ضروریات کے لیے کافی ہو گی۔

جب کلارا پار کر پوچھے کہ تم جرمنی کیوں آئے تو تم اسے یہ کہانی سنا دینا کہ تمہیں اپنے کام سے اتنی آمدنی نہیں ہو رہی تھی جس سے تمہارا پیٹ بھر سکے۔ اس لیے تم یہاں وہ گندا کام بھی کرنے کے لیے تیار ہو جو کوئی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تمہاری بات کا یقین کرے گی کیونکہ تم نے اسے سچ بتا دیا اور وہ تمہیں واپس نائیجیریا بھیج دے گی۔

اس لیے بہتر ہے کہ اس سے جھوٹ بولا جائے۔ اسے بتاؤ کہ تم بم سے خوف زدہ ہو کر جرمنی آئے ہو اور ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہو جو ہلاک ہونے کے بجائے صرف زخمی ہوئے جب ایک عورت نے مارکیٹ میں اپنے آپ کو بم سے اڑا لیا۔ اسے وہ زخم دکھاؤ جو بم پھٹنے سے تمہارے جسم پر آیا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جس وقت وہ بم پھٹا، تم مارکیٹ میں نہیں تھے۔ اس کے لیے تمہیں ایک اور جھوٹ بولنا ہو گا اور بچپن میں لگی ہوئی چوٹ یا کوئی مصنوعی زخم دکھا کر اسے مطمئن کرنا ہو گا پھر تم اسے بتاؤ گے کہ کس طرح لیبیا کا صحرا پار کیا اور ایک خستہ حال کشتی میں سوار ہو کر سمندری راستہ طے کیا۔ اس سفر کے دوران تمہارے چار ساتھی سمندر میں ڈوب گئے پھر تم ٹرین کے ذریعے یہاں آئے اور اپنی کہانی سنا رہے ہو۔ شاید کلارا پار کر تمہاری بات پر یقین کر کے تمہیں اس ملک میں اور سڑکوں کی صفائی یا ہوٹلوں کے ٹوائلٹ صاف کرنے کی اجازت دے دے۔

لیکن کلارا پار کر کو اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ وہ ایک اچھی سراغ رساں ہے اور اس نے تمہارے جیسے لوگوں سے کئی کہانیاں سن رکھی ہیں۔ ان میں دوسرے ملکوں مثلاً افغانستان، اریٹیریا، صومالیہ، کانگو اور خاص کر شام کے لوگ شامل ہیں۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اتنی صفائی سے جھوٹ بولو کہ اس کے بعد جرمنی میں پناہ مل جائے لیکن کلارا پار کر نے بہت سے زخم دیکھے ہیں۔ ان میں بموں، گولیوں، کوڑوں اور ہتھکڑیوں سے لگنے والے زخم شامل ہیں۔ اس نے دماغ پر لگنے والے زخم بھی دیکھے ہیں جو نظر نہیں آتے۔ اس لیے وہ یقیناً بہت اچھی سراغ رساں ہے..... جو وہ زخم بھی دیکھ لیتی ہے جو لوگ اکثر اس سے چھپاتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم اسے مصنوعی زخم دکھاؤ گے تو وہ کبھی یقین نہیں کرے گی اور تمہیں نائیجیریا واپس بھیج دیا جائے گا۔

جرمنی میں پناہ مانگنے والوں کے انٹرویو کرتے ہوئے کلارا پار کر نے درخواست گزاروں سے اکثر ایک جیسی ذاتی نوعیت کی کہانیاں سنیں۔ اگر اریٹیریا سے آئے ہوئے ایک شخص نے پولیس کے ظلم و تشدد کی کہانیاں سنا کر جرمنی میں پناہ حاصل کر لی تو اس کے بعد آنے والے دو اریٹیریائی باشندے بالکل ویسی ہی کہانیاں سنانے لگ جاتے ہیں یا اگر اس نے ایک افغان لڑکے کو اس لیے جرمنی میں رہنے کی اجازت دے دی کیونکہ اس کی عمر سولہ سال تھی جبکہ اس نے ایک بیس سالہ لڑکے کو واپس کر دیا۔ اس کے باوجود اگلے تین افغان لڑکے پناہ حاصل کرنے آ گئے جو سنِ بلوغت میں داخل ہو رہے تھے حالانکہ ان کے چہروں پر بڑی بڑی ڈاڑھیاں تھیں۔ اس لیے وہی لوگ پناہ حاصل کر سکتے ہیں جن کی کہانی میں جان ہو۔

ہر روز صبح ہوتے ہی ایک کے بعد دوسری کہانی سامنے آ جاتی۔ گزشتہ دو سال سے کلارا کی یہی مصروفیت تھی، خصوصاً جب سے شامیوں کے لیے جرمنی کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ وہ ترکی سے خشکی اور یونان سے سمندر کے راستے آ رہے تھے۔

وہ دن بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے ہیری ایفل موجود تھا۔ اس کی خدمات فوج سے مستعار لی گئی تھیں کیونکہ شام سے آنے والوں کی وجہ سے کام بہت بڑھ گیا تھا۔ انہیں نہ صرف یہ کہ بہت سے انٹرویوز کرنے پڑ رہے تھے بلکہ پناہ گزینوں کے لیے رہائش کا انتظام کرنے کے علاوہ سوشل ویلفیئر سروس کی سہولت بھی مہیا کرنی تھی۔ اس لیے ہیری ایفل کو مدد کے لیے بلایا گیا۔ وہ افغانستان میں رہ چکا تھا اور جانتا تھا کہ کن علاقوں سے لوگ راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں۔

اس روز صبح پہلے گھنٹے میں انہوں نے تین افراد کے انٹرویوز کیے۔ ان میں سے ایک آدمی کے کندھے پر بڑا

UUNOVELS.COM

سا زخم تھا اور چہرے پر چھوٹے چھوٹے داغ پڑے ہوئے تھے۔ وہ دھماکا خیز مواد پھٹنے سے زخمی ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ شامی ہے جبکہ وہ عراق سے بھاگا ہوا ایک فوجی تھا۔ اس کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ اپیل کرنا ایک صبر آزما اور طویل مرحلہ تھا لیکن کلارا جانتی تھی کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور اسے بالآخر عراق واپس جانا پڑے گا۔

اب احمد ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ اور بہت اچھی انگریزی بولتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے مترجم کو دوسری ٹیم کے ساتھ کام کرنے کے لیے بھیج دیا۔ ''انہوں نے حلب میں ہیلی کاپٹروں سے بیرل بم گرائے۔'' احمد نے کہا۔ ''یہ ہیلی کاپٹر جیٹ کے مقابلے میں نیچی پرواز کرتے ہیں اس لیے ان بموں کو آسمان سے نیچے گرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بیرل ایک گرتے ہوئے مُردہ پرندے کے مانند ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ کہاں جا رہا ہے۔ ہوا اسے کسی بھی جانب دھکیل سکتی ہے۔ اگر ہوا مہربان ہے تو یہ آپ کے بجائے کسی اور پر جا کر گرے گا۔ اس کا دھماکا بہت زوردار ہوتا ہے اور ارد گرد کی ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسی لیے باقی سپاہیوں کے سوا زیادہ تر لوگ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

ہیری ایفل نے کہا۔ ''ہم نے بیرل بم کے بارے میں کئی مرتبہ سنا ہے۔ تم حلب میں کہاں رہتے تھے؟''

''میں حلب کے مشرقی حصے میں رہتا تھا۔''

''کون سے علاقے میں؟''

''حیدرلیا۔''

کلارا نے لکھنا شروع کر دیا۔ یہ تفصیلات بہت اہم تھیں۔ اگر احمد، حلب کا رہنے والا تھا تو وہ وہاں کے علاقوں، سڑکوں اور ہوٹلوں کے بارے میں جانتا ہو گا۔ ہیری نے اس سے گھر کا پتا، اسکول کا نام جہاں سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور اس بیکری کے بارے میں پوچھا جہاں سے اس کی فیملی ناشتے کا سامان خریدتی تھی۔ کسی بھی جھوٹے شخص کے لیے علاقے کا نام بتانا آسان تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ بیکری کا مالک ایک موٹا، گنجا اور گھنی مونچھوں والا شخص تھا یا جس اسکول میں اس نے تعلیم حاصل کی ہے، وہاں کھیل کے میدان میں گھاس لگی ہوئی تھی۔

''حیدرلیا ایک عرصے سے باغیوں کے قبضے میں ہے۔'' احمد نے کہا۔ ''شروع میں بہت سے لوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا لیکن بعد میں وہ بُرے بن گئے۔ ان میں سے کچھ سزاؤں کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ ان میں غیر ملکی جنگجو بھی ہیں جو کٹر مذہبی تھے۔ کچھ عرصے بعد وہاں خوراک کی قلت ہو گئی چنانچہ ہم نے شہر کے مغربی حصے میں منتقل ہونے کا فیصلہ کیا جو حکومت کے کنٹرول میں تھا۔ ہم وہاں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھ رہے تھے۔''

''مغربی حلب..... کس علاقے میں؟''

''میں صلاح الدین میں رہتا تھا۔''

کلارا نے یہ نام بھی اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ اس نے دوسرے مہاجرین سے اس علاقے اور اس پر کنٹرول کے لیے ہونے والی شدید لڑائی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ جہاں رہائشی علاقے ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے تھے۔

احمد نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے صلاح الدین کا علاقہ محفوظ تھا لیکن بعد میں یہ بھی خطرناک ہو گیا۔ اس کی ایک گلی میں باغی تو دوسری گلی میں سرکاری فوجی نظر آنے لگے۔ لہٰذا میں وہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔''

ہیری نے کہا۔ ''تم خوش قسمت تھے جو اتنا عرصہ وہاں محفوظ رہے۔''

''وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔'' احمد نے کہا۔ ''اگر فوج کے بیرل بم سے بچ گئے تو باغیوں کے 'جیرا' کا نشانہ بن سکتے تھے۔''

کلارا نے یہ لفظ 'جیرا' بھی لکھ لیا۔ اب وہ منتظر تھی کہ احمد اس کی وضاحت کس طرح کرتا ہے۔ ''یہ ایک خاص قسم کے بم ہیں جو باغی پروپین کنستر سے بناتے ہیں۔'' احمد نے کہا۔ ''وہ ان میں کیلیں اور بولٹ بھر کر توپوں سے فائر کرتے ہیں جو پائپوں سے بنائی جاتی ہیں۔''

''وہ پائپ کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟'' ہیری نے پوچھا۔

''سیوریج اور متروکہ عمارتوں کی پائپ لائنوں سے اور یہ بم دو کلومیٹر تک جا سکتے ہیں۔''

یہ انٹرویو ایک گھنٹا جاری رہا۔ احمد نے بتایا کہ وہ کس طرح مشرقی اور مغربی حلب کے درمیان سفر کرتا رہا۔ کہیں اسے کھلے عام چلنے کا موقع مل جاتا اور کہیں وہ چھپ کر گولی چلانے والوں کو چکما دے کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس نے بتایا کہ اس کی امیدیں دم توڑ گئیں جب صلاح الدین میں رہنا ناممکن ہو گیا اور اس کے دل میں حلب سے نکلنے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔

UUNOVELS.COM

ہیری ایفل نے پوچھا۔ ''تم نے صلاح الدین میں کتنا عرصہ قیام کیا؟''

''صرف اتنے دن کہ میں وہاں سے نکل سکوں۔ وہاں حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ میں نے اس وقت وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا جب باغیوں نے سرکاری فوجوں کو گھیرے میں لے لیا۔''

''محاصرہ؟''

''ہاں، لگتا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ حلب پر قبضہ ہونے والا ہے اور اس کے بعد کیا ہو گا، میں یہ جاننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک ٹرک والے کو رشوت دی جو دمشق جا رہا تھا۔ وہاں میرے ایک چچا اور کزن تھے۔''

''وہ کس قسم کا ٹرک تھا؟''

''اس ٹرک میں حلب کے لیے خوراک کا سامان اور دیگر اشیا آتی تھیں اور وہ خالی ہو کر دمشق جاتا تھا تا کہ دوبارہ سامان بھر کر واپس آئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں اسے حلب آنے سے نہ روک لیں کیونکہ باغیوں کا محاصرہ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔''

کلارا نے کہا۔ ''پلیز! تم ہمیں دمشق کے سفر کے بارے میں بتاؤ۔''

''یہ بہت مشکل سفر تھا جبکہ جنگ سے پہلے ہم بہ آسانی ہائی وے پر سفر کر سکتے تھے لیکن اب وہ بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ باغیوں نے ہائی وے پر بھی حملہ کیا تھا۔ لہٰذا اس ٹرک کو صحرا سے گزرنا پڑا۔ ہم کافی دیر بعد سڑک پر آئے۔''

''کتنی دیر بعد؟'' ہیری نے کہا۔

''ویسے تو تین گھنٹے لگتے ہیں لیکن ہمیں باغیوں سے بچنے کے لیے صحرا سے گزرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں آٹھ یا نو گھنٹے لگ گئے۔''

اس کے بعد احمد نے دمشق میں گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں بتایا۔ یہاں وہ حلب کے مقابلے میں زیادہ محفوظ تھا لیکن وہ فوجی خدمت میں زیادہ تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ ''میں کس طرح اس فوج میں خدمات انجام دے سکتا تھا جس نے میرے دوستوں اور ہمسایوں پر بم برسائے۔'' چنانچہ اس نے شام چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

''مجھے حلب میں ہی رہنا چاہیے تھا۔ وہ ترکی سے بہت قریب ہے۔ اب مجھے واپس حلب جانا تھا تا کہ وہاں سے سرحد عبور کر سکوں۔''

''تم لبنان کیوں نہیں گئے؟ کیا وہ دمشق سے قریب نہیں ہے؟''

''لبنان کے حالات بھی خراب ہیں اور وہاں سے سمندر کے ذریعے یورپ جانا ہوتا ہے۔ مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ میں اچھا تیراک نہیں ہوں اور میں نے سنا ہے کہ یونان کے ساحل پر کئی لوگ ڈوب گئے۔''

اس کے بعد احمد نے حلب سے ترکی کی سرحد تک کے سفر کی روداد سنائی۔ اسے راستے میں کئی جلی ہوئی بسیں نظر آئیں۔ ان بسوں کے بدقسمت مسافر مارٹر توپوں اور بارودی سرنگوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ اس کی اپنی منی بس بھی مسافروں، ڈرائیور اور اسمگلر سے بھری ہوئی تھی۔ اس بس کو پہلے تو کئی جگہ شامی فوج نے روکا لیکن جیسے جیسے وہ سرحد سے قریب ہوتے گئے تو ان کا واسطہ مخالف ملیشیا گروپوں سے پڑتا گیا۔ وہ ہر چیک پوسٹ پر پیسوں کا مطالبہ کرتے اور اسمگلر اس رقم میں سے رشوت دے کر ان کا منہ بند کر دیتا۔ اس کے بعد انہیں بار بار منی بس بدلنا پڑی اور ہر بار ان کا واسطہ ایک نئے اسمگلر سے پڑتا۔ کئی مرتبہ انہیں کچھ فاصلہ پیدل بھی طے کرنا پڑا۔ ''ہم صبح ناشتا کرنے کے بعد سفر پر روانہ ہوئے تھے اور سورج غروب ہونے کے بعد ترکی کی سرحد پر پہنچے۔''

کھانے کے وقفے کے دوران بھی کلارا اور ہیری ایفل اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ ہیری نے بھنے ہوئے گوشت کا ٹکڑا کاٹتے ہوئے کہا۔ ''پہلے دمشق کا سفر پھر حلب واپسی..... یہ ایک نئی بات ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسا نہیں سنا۔''

''ہاں۔'' کلارا بولی۔ ''عام طور پر لوگ حلب سے سیدھے ترکی جاتے ہیں یا دمشق سے لبنان اور پھر وہاں سے یونان۔''

''اس کا یہ کہنا تو صحیح ہے کہ انہوں نے باغیوں سے بچنے کے لیے صحرا کا متبادل راستہ اختیار کیا لیکن ترکی کی سرحد کی طرف جاتے ہوئے جلتی ہوئی منی بس کو دیکھنے والی بات پرانی ہے۔ یہ کہانی میں کم از کم بارہ مرتبہ سن چکا ہوں۔''

''ممکن ہے۔'' کلارا نے کہا۔ ''جس منی بس کو انہوں نے دیکھا وہ کئی مہینوں سے وہاں کھڑی ہو۔''

''لیکن ہر بار جب بھی میں نے یہ کہانی سنی تو یہی بتایا گیا کہ اس منی بس سے دھواں اٹھ رہا تھا جیسے اسے ایک گھنٹا پہلے آگ لگی ہو۔ میں تمہیں بتا دوں کہ اس منی وین سے چھ مہینے تک دھواں نہیں اٹھ سکتا۔''

کلارا نے اپنی پلیٹ سے آلو کے چپس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں احمد کے فون کا ڈیٹا کب تک مل جائے گا؟''

''آج سہ پہر میں۔''

فون ڈیٹا کی بڑی اہمیت تھی۔ ہر پناہ گزین فون کر کے اپنے گھر والوں کو بتاتا کہ وہ زندہ سلامت ہے اور نہ تو سمندر میں ڈوبا اور نہ ہی صحرا میں جل کر مرا لیکن اسی ڈیٹا کی مدد سے ان کا جھوٹ بھی پکڑا جا سکتا تھا، جیسے احمد نے بتایا کہ وہ شام کا رہنے والا ہے۔ اس کا خاندان حلب میں مقیم تھا اور اب وہ دمشق میں اس کے ایک چچا کے پاس رہ رہے ہیں لیکن اگر ڈیٹا سے یہ ظاہر ہو کہ اس نے عراق، یمن وغیرہ فون کال یا پیغامات بھیجے ہیں تو اس کا جھوٹ پکڑا جائے گا۔

انہوں نے لنچ کے وقفے کے دوران ترکی سے جرمنی تک احمد کے سفر کی تفصیل پر گفتگو کی۔ اس نے اس سفر کا کتنا حصہ پیدل اور کتنا بس کے ذریعے طے کیا۔ وہ بلغاریہ، سربیا اور کروشیا سے ہوتا ہوا اٹلی پہنچا اور وہاں سے ٹرین کے ذریعے جرمنی آیا۔ اسے امید تھی کہ اس کا کزن اس کے استقبال کے لیے موجود ہوگا لیکن وہ کہیں جا چکا تھا۔

''یہ کہنا بہت آسان ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''ایک لاپتا کزن جس نے رہنے کے لیے جگہ اور مالی معاونت کی پیشکش کی ہو۔''

''ہم کسی ایسے کزن کی موجودگی ثابت نہیں کر سکتے جس نے اپنا کوئی نشان نہ چھوڑا ہو۔''

''احمد نے مجھے اس کزن کا جو نام بتایا ہے، میں اس کے بارے میں چھان بین کروں گا لیکن مجھے شبہ ہے کہ کچھ معلوم ہو سکے۔''

کلارا کھانا ختم کر چکی تھی۔ ہیری نے پوچھا۔ ''احمد نے جو کچھ بتایا ہے' اس بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے؟''

کلارا کافی دیر سوچتی رہی۔ اس کی کہانی کا کچھ حصہ فرضی لگ رہا تھا لیکن یہ ایک عام بات تھی۔ کئی پناہ گزین اس طرح کے جھوٹ بولا کرتے تھے جبکہ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح کی مبالغہ آمیزی کر کے وہ اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتے تا کہ انہیں پناہ ملنے کے امکانات بڑھ جائیں لیکن احمد کی کہانی کا زیادہ حصہ سچ پر مبنی تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر فون ڈیٹا چیک ہو جاتا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ ہم اس کی درخواست پر مزید کارروائی کر سکتے ہیں۔'' گویا ایک طرح سے اس نے بتا دیا کہ اسے احمد کی کہانی پر یقین ہے۔

شام کو ہیری ایٹل نے اسے فون پر ایک پیغام بھیجا۔ ''احمد کے بارے میں ایک خبر ہے، مجھے فون کرو۔'' وہ دوسرے دن کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً ہی اس کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر بھی ہیری خاموش رہا البتہ اس کی سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔ کلارا نے کہا۔ ''کیا بات ہے ہیری ـــــ تم بولتے کیوں نہیں؟''

''احمد ـــــ'' ہیری بولا۔ ''احمد مر گیا۔''

احمد کی موت کا کلارا کو بہت صدمہ ہوا۔ اس نے ایسے بہت سے لوگوں کی کہانیاں سنی تھیں جو راستے میں کسی بم یا بارودی سرنگ کا نشانہ بن گئے لیکن احمد کی موت اس کے شہر میں ہوئی جہاں وہ ایک طویل سفر کر کے پناہ کی تلاش میں پہنچا تھا۔ کلارا کو اسے یہ بتانے کا موقع بھی نہیں ملا کہ اس کی درخواست منظور ہونے کا کافی امکان ہے۔ کیا اسے یہ پریشانی تھی کہ وہ واپس بھیج دیا جائے گا؟

اسے ایک پارک میں چھرا گھونپ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ پولیس کے پاس کوئی سراغ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی پر شبہ کر رہی تھی۔ لہٰذا اس بارے میں کئی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ کیا یہ نیو نازی، نامی تنظیم کی کارستانی تھی جو غیر ملکیوں کو جرمنی سے نکالنا چاہ رہے تھے یا منشیات فروشی کا جھگڑا یا پھر کوئی انتقامی کارروائی کیونکہ بہت سے لوگ خانہ جنگی سے تنگ آ کر ملک سے فرار ہو رہے تھے۔ اس لیے یہ امکان موجود تھا کہ دشمن ان کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں۔ اخبارات میں بھی اس طرح کی خبریں شائع ہو رہی تھیں جن میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا۔ کلارا کو یہ باتیں دماغ سے نکالنا پڑیں کیونکہ اس کے باوجود اسے اپنا کام جاری رکھنا تھا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے اور دسمبر کا مہینا آ گیا۔

اب اس کے سامنے ایک اور احمد بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا نام احمد نہیں بلکہ حسن تھا لیکن اس نے بھی وہی کہانی بیان کی جو وہ احمد کی زبانی سن چکی تھی۔ وہی بیرل بم اور جیرا، وہی حلب کا محلہ، وہی عجیب سفر یعنی پہلے دمشق اور پھر ترکی کی سرحد پر جانے کے لیے حلب واپسی، وہی جلی ہوئی منی وین کا ذکر، بلغاریہ اور سربیا سے گزر کر اٹلی آنا۔ وہاں سے ٹرین کے ذریعے جرمنی آمد، یہاں تک کہ اس کہانی میں بھی وہ غیر حاضر کزن موجود تھا جس نے اس سے کام اور رہائش کا بندوبست کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس حیرت انگیز مماثلت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھی کہ اس کے سامنے حسن نہیں بلکہ احمد بیٹھا ہوا ہے۔

کیفے ٹیریا میں لنچ کے دوران کلارا اور ہیری ایٹل اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ ''اس کے پاس فون بھی نہیں ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ وہ فون افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کا ڈیٹا چیک نہیں کر سکتے کہ وہ شام کے کس علاقے سے آیا ہے یا درحقیقت اس کا تعلق کس ملک سے ہے۔''

''اس کے پاس پاسپورٹ یا کوئی اور شناختی دستاویز بھی نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب اسے اٹلی میں لوٹا گیا تو اس کی سب چیزیں کھو گئیں۔''

''کم از کم یہ حصہ احمد کی کہانی سے مختلف ہے۔''

کلارا نے گلاس میں مشروب ڈالتے ہوئے کہا۔

''پانی سے ڈرنے اور تیرا کی نہ جاننے والی بات بھی اس نے کسی فلم میں دیکھی ہوگی اور اس نے وہی لائنیں دہرا دیں۔''

لگتا تھا کہ ہم کسی فلم کاری میک دیکھ رہے ہیں۔ ایک جیسے سین، ایک جیسے شاٹ جس طرح ہالی وڈ والے بعض اوقات کسی اچھی فرانسیسی فلم کا چربہ بناتے ہیں۔

''وہ ایسا ڈپلی کیٹ ہے جسے سب ٹائٹل کی ضرورت نہیں۔'' ہیری نے کہا۔ ''وہ انگریزی بول رہا تھا۔''

''یہ بھی ایک فرق ہے۔ اس کی انگریزی احمد جیسی اچھی نہیں۔''

''تم نے اس پر بھی غور کیا تھا۔''

''ہمیں اس کی تصویر لیبارٹری میں بھیجنی چاہیے۔ شاید وہ اس کا چہرہ پہچان سکیں۔''

''معلوم کرو کہ کبھی اس شخص کو قاہرہ یا بیروت کے ائرپورٹ پر دیکھا گیا؟ ہوسکتا ہے کہ اس کی ویزا کی درخواست سفارت خانے سے مسترد ہوگئی ہو۔ یہ اس کی کہانی میں ایک جھول ہوگا۔''

کلارا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں حسن کو ایک مترجم کے حوالے کر دیتی ہوں، شاید وہ اس کے لہجے سے کچھ اندازہ لگا سکے۔''

''سب عربوں کا لہجہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔'' ہیری دفتر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

کلارا اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ''اگر مترجم کو کچھ شبہ ہوا تو لیکنیشن حسن کی تصویر اپنے سوفٹ ویئر پر چیک کرے گا۔ شاید وہ کچھ معلوم کر سکے۔ میں تم سے دس منٹ بعد ملتی ہوں۔ ابھی مجھے اپنی ماں کو ایک فون کرنا ہے۔''

ہیری کے جانے کے بعد کلارا نے ماں کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے نانا نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ گر پڑا۔ نرسوں نے اسے دوبارہ آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لٹا دیا لیکن وہ بہت بے چین ہے اور بار بار بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے اور پاگلوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ کلارا نے اس کی ذہنی صحت پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ چھٹی کے بعد اسے دیکھنے آئے گی لیکن پہلے حسن کا معاملہ اہم تھا۔

جب ہیری لیکنیشن سے حسن کے چہرے کی شناخت کے بارے میں بات کر رہا تھا تو کلارا نے حسن سے بات کرنے کے لیے ایک مترجم کو بلا لیا۔ اس نے حسن سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس کی انگریزی بھی اچھی نہیں ہے اسی لیے مترجم کو بلایا ہے جو روانی سے عربی اور جرمن بول سکتا ہے۔ وہ اس سے عربی میں بات کرے اور مترجم اس کا جرمنی میں ترجمہ کر کے کلارا کو بتائے گا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اور ہیری پہلے ہی حسن سے تمام معلومات حاصل کر چکے تھے۔ انٹرویو ختم ہونے کے بعد کلارا نے حسن سے کہا کہ وہ چند روز بعد ہاسٹل فون کر کے اسے تازہ ترین صورتِ حال بتائے گی۔ اس کے جانے کے بعد کلارا نے مترجم سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں ماہر نہیں ہوں۔'' مترجم نے کہا۔ ''میں مصریوں کا لہجہ پہچان سکتا ہوں۔ ان کا اپنا بات کرنے کا انداز ہے اور زیادہ تر عرب فلموں کی وجہ سے اسے پہچان لیتے ہیں کیونکہ عربی زبان کی ساری فلمیں مصر میں ہی بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں خلیجی ریاستوں کے لوگوں کو بھی پہچان لیتا ہوں۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت اچھا ہے لیکن دوسرے عربوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس شخص کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ اس کا تعلق مصر یا خلیجی ریاستوں سے نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شام کا رہنے والا ہو جیسا کہ وہ کہہ رہا ہے یا پھر لبنان، اردن اور فلسطین سے بھی ہوسکتا ہے۔''

''یا وہ ایک اچھا ایکٹر بھی ہوسکتا ہے اور ہمیں دھوکا دے رہا ہے؟''

''یہ بھی ممکن ہے۔''

اس کے بعد کلارا نے ہیری ایگل کو فون کیا۔ حسن کے چہرے کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ اگلا قدم آواز کا سوفٹ ویئر ہوسکتا ہے۔ گو کہ وہ لہجے کی نشاندہی نہیں کر سکتا لیکن دھوکا دہی کو بے نقاب کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ عربی حسن کی دوسری زبان ہو۔

شام کو وہ اپنے نانا کو دیکھنے گئی جسے وہ ادیا کہتی تھی۔ وہ اپنے بستر میں سو رہا تھا چنانچہ وہ اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہاں بھی اس کا دماغ اپنے کام میں الجھا رہا۔ وہ احمد اور حسن کا موازنہ کرنے لگی۔ وہ دونوں ایک جیسی

کہانی سنا رہے تھے لیکن حسن کے پاس صرف لفافی کے سوا کچھ نہیں تھا جبکہ احمد کے پاس کچھ دستاویزات بھی تھیں۔ ایک خستہ حال شامی پاسپورٹ اور کچھ خاندانی تصویریں جو زیادہ تر گھر پر لی گئی تھیں لیکن ان میں کوئی آؤٹ ڈور تصویر نہیں تھی جس سے یہ پتا چلتا.... کہ شام کے کس شہر یا مشہور مقام پر کھینچی گئی ہے۔

کچھ دیر بعد اوپا کی آنکھ کھل گئی۔ کلارا اس کا دل بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی مگر اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔ ''میں اب چل سکتا ہوں۔''

کلارا نے کہا۔ ''ہاں تم چل سکتے ہو لیکن زیادہ نہیں۔''

اس نے دل میں کہا۔ ''صرف وہیل چیئر سے بستر تک۔''

''مرنے سے پہلے میں بوہمیا جانا چاہتا ہوں، اپنے گاؤں۔''

کلارا کے پاس اس کی بے سروپا باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموش بیٹھی سر ہلاتی رہی۔

اگلے بدھ کو حسن آواز کا ٹیسٹ دینے نہیں آیا۔ کلارا نے ہاسٹل فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اور اسے فلو ہو گیا ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا یہ بھی کوئی چال ہے؟ شاید وہ اپنی دھوکا دہی کا اندازہ لگا کر اس کے مطابق منصوبہ بندی کرنا چاہتا ہے۔

چھٹی کے بعد وہ اپنی ماں سے ملنے کرس کنڈل مارکیٹ گئی۔ یہ شہر کے مرکز میں کرسمس کی خریداری کا مرکز تھی۔ وہاں بڑی رونق تھی اور لوگ خریداری کے ساتھ ساتھ مختلف تفریحات میں مشغول تھے۔ وہیں اس نے حسن کو دیکھا۔ وہ ایک اور شخص کے ساتھ تھا جو تقریباً اسی کا ہم عمر لگ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی کمپنی میں مگن تھے اور بچوں کی طرح چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے پھر اس نے انہیں کونے پر واقع ایک بوتھ میں جاتے ہوئے دیکھا۔

''ٹام۔'' اس نے کہا۔ ''میں بادام لینے اس کونے تک جا رہی ہوں۔ تم سے پانچ منٹ بعد اسی جگہ ملوں گی۔''

اس کی ماں نے سر ہلا دیا۔ وہ ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے حسن اور اس کے دوست کو ان بوتھ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا جو کھلونوں، ٹافیوں، موم بتیوں، کپڑوں اور گڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کے پیچھے چلتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ایک گھومنے والے جھولے پر پہنچ گئے... جہاں بہت سے بچے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

اگلے روز کلارا نے ہیری ایفل کو بتایا کہ اس نے حسن کو مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ ''مجھے شک ہے کہ اسے فلو تھا۔ ہمیں ابھی اسے فون کرنا چاہیے بلکہ کیوں نہ میں خود اسے ہاسٹل جا کر اپنے ساتھ لے آؤں۔'' ہیری نے کہا۔

اس سے پہلے کہ کلارا کوئی اعتراض کرتی، ہیری نے کار کی چابیاں اٹھائیں اور دروازے کی طرف چلا گیا۔ کلارا نے دیوار پر لگے ہوئے کلاک پر نظر ڈالی اور اندازہ لگایا کہ وہ کتنی دیر میں ہاسٹل جا کر واپس آ سکتا ہے پھر اس نے اپنے کمپیوٹر پر حسن کی فائل کھولی اور اس کی تصویر دیکھنے لگی۔ اس نے اس کے چہرے کا موازنہ گزشتہ روز بازار میں دیکھے جانے والے لڑکے سے کیا۔ وہی ڈارک براؤن بال، ویسی ہی آنکھیں، یہ دوسرے ہزاروں لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔

اس نے حسن کی فائل بند کر کے احمد کی فائل کھولی۔ ویسے ہی بال، ویسی ہی آنکھیں البتہ ڈاڑھی کچھ گھنی تھی پھر اس نے اپنی ای میل کھولی۔ اس میں احمد کی تصویر لگائی اور ارجنٹ پیغام بھیجا جس میں چہرے کی شناخت کے لیے کہا گیا تھا۔ بیس منٹ بعد جواب آ گیا۔ ''کیا یہ وہی شخص نہیں ہے جسے گزشتہ ماہ پارک میں قتل کر دیا گیا تھا؟''

کلارا جانتی تھی کہ وہ لوگ بہت مصروف ہیں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کی شناخت کریں جو اس دنیا میں نہیں رہا لیکن کلارا نے دوبارہ لکھا۔ ''نہیں، اس نام کے کئی لوگ یہاں آ رہے ہیں۔ کیا تم اس کے بارے میں جلد از جلد مجھے کچھ بتا سکتے ہو؟'' اس پیغام کا بھی فوراً جواب آ گیا۔

''ہم شام تک کچھ بتا سکیں گے۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور ہیری نے کہا۔ ''میں نے اسے انٹرویو روم میں بٹھا دیا ہے۔ میں کافی پینے جا رہا ہوں۔ پانچ منٹ بعد تم سے ملوں گا۔''

حسن اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ کلارا سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ''تم بہت جلدی فلو سے صحت یاب ہو گئے۔ یہ تو واقعی ایک معجزہ ہے۔'' ہیری ایفل نے کہا۔

''دراصل گزشتہ روز میری طبیعت کچھ خراب تھی لیکن ہاسٹل والوں نے تمہیں بتا دیا کہ مجھے فلو ہو گیا ہے۔''

ہیری اسے لینڈ لائن فون کے پاس لے گیا اور ریسیور اسے دیتے ہوئے بولا۔

''ایک نمبر ڈائل کرو۔ جب بیپ کی آواز آئے تو تمہیں انگریزی میں نہیں بلکہ اپنی زبان میں بات کرنی ہے..... سمجھ گئے؟''

''مجھے کیا کہنا ہے؟''

UUNOVELS.COM

''تم اپنے بارے میں بات کرو۔ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے۔ تمہاری فیملی میں کتنے لوگ ہیں۔ تم نے کس اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ ہو سکے تو اپنے گزشتہ روز کے بارے میں بھی بتاؤ۔ تمہیں صرف دو منٹ بولنا ہے۔''

ہیری نے نمبر ملایا اور حسن نے عربی میں بولنا شروع کر دیا۔ کلارا کا خیال تھا کہ وہ گزشتہ روز کے بارے میں بیان کر رہا ہے۔ دو منٹ بعد ہیری نے گھڑی دیکھی اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ حسن نے اسے ریسیور واپس کیا۔ ہیری نے وہ کریڈل پر رکھا اور بولا۔

''شکریہ..... اب تم یہاں انتظار کرو۔ ہم تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں۔''

دفتر آنے کے بعد ہیری نے وہ ریکارڈنگ چیک کی اور بولا۔ ''اس میں بچانوے فیصد وہ عربی ہے جو مشرقی بحیرۂ روم کے پانچ ملکوں میں بولی جاتی ہے۔ ان میں شام بھی شامل ہے۔''

''اب کیا کریں؟ یہ زبان اس کے دعوے سے مطابقت رکھتی ہے لیکن اس سے شام کی شہریت ثابت نہیں ہوتی۔ ہمارے پاس کوئی کاغذات یا شناختی دستاویزات نہیں، صرف ایک ملتی جلتی کہانی ہے۔''

کلارا نے کہا۔ ''اگر ہم احمد کی آواز کا ٹیسٹ کر سکیں؟''

''اب بہت دیر ہو چکی۔ مُردے بولا نہیں کرتے۔''

''ہو سکتا ہے کہ احمد بھی جھوٹ بول رہا ہو؟''

''یعنی اس نے حسن کی شناخت چرائی اور اس سے پہلے یہاں آ گیا؟''

''ہم اس پر بعد میں غور کریں گے۔ پہلے مجھے اس سے کچھ سوال کرنے ہیں۔''

جب وہ کمرے میں واپس آئے تو حسن کھڑکی میں کھڑا ہوا برف باری کا نظارہ کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''حسن! ہمارے لیے یہ بہت مشکل ہے۔ تمہارے پاس یہ ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کہ تم کون ہو؟''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے کاغذات اٹلی میں.....''

''ہاں، ہم نے سنا تھا لیکن ہم بہت سے لوگوں سے ملتے ہیں جن کے پاس کاغذات نہیں ہوتے تو ہمیں دوسرے طریقوں سے تصدیق کرنی پڑتی ہے۔ ہم نے وہی طریقے آزمائے۔ تمہارے چہرے کی شناخت، تمہاری آواز اور اب تمہارے الفاظ..... ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ تم سچ بول رہے ہو۔''

''میں نے تمہیں سچ ہی بتایا ہے۔''

کلارا بولی۔ ''حسن! تم مجھے گزشتہ شب کے بارے میں بتاؤ۔ تم کرسمس مارکیٹ گئے تھے یا ہاسٹل میں بیمار پڑے ہوئے تھے؟''

''تم نے مجھے وہاں دیکھا تھا؟''

''ہاں، میں ہر سال اپنی ماں کے ساتھ وہاں جاتی ہوں۔''

''میں نے تمہیں بتایا کہ صبح میری طبیعت خراب تھی لیکن شام میں بہتر محسوس کرنے لگا۔ ہاں، یہ صحیح ہے کہ میں وہاں گیا تھا۔ میں نے کرسمس میلے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس لیے خود دیکھنے وہاں چلا گیا لیکن میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ صبح میری طبیعت واقعی خراب تھی۔''

''اور تمہارے ساتھ وہ دوسرا آدمی کون تھا؟''

''میرا کزن۔''

''وہی جو غائب ہو گیا تھا؟'' ہیری نے پوچھا۔

''نہیں، یہ دوسرا کزن ہے۔ میں نے گھر فون کر کے اس کا نمبر لیا تھا۔ وہ یہاں ایک سال سے ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ شاید اس کے ذریعے ہم آگے بڑھ سکیں۔''

کلارا نے کہا۔ ''حسن! گزشتہ ماہ ہماری ایک شخص سے بات ہوئی تھی۔ اس کی کہانی بھی تم جیسی تھی۔ ویسے تو ہم آئے دن اس طرح کی ملتی جلتی کہانیاں سنتے رہتے ہیں لیکن اس کی کہانی حیرت انگیز طور پر تم سے بہت مل رہی تھی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

حسن کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ یوں لگا جیسے وہ پسپائی اختیار کر رہا ہو پھر اس نے سچ اگل دیا۔ ''میں نے اس کے ساتھ ترکی سے سلوینیا تک سفر کیا تھا جہاں ہمیں کچھ عرصہ جیل میں رہنا پڑا۔ ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے ایک دوسرے کو اپنی کہانی سنائی۔ اس نے بتایا کہ وہ فوج چھوڑ کر آیا ہے۔ وہ جنگ سے تنگ آ گیا تھا اور لڑائی میں مرنا نہیں چاہتا پھر میں نے بھی اپنی کہانی سنائی اور اس طرح وہ میرے بارے میں سب کچھ جان گیا۔ ہم ٹرک میں بھی ساتھ تھے۔ پھر اٹلی میں میری آنکھ کھلی تو وہ جا چکا تھا۔ میری رقم، میرے کاغذات اور تصویریں سب غائب تھیں۔ وہ سب تصویریں ایک چھوٹی فلیش ڈرائیو میں تھیں۔ میں نے کئی ہفتے سڑکوں پر گزارے۔ صفائی کا کام کیا جس کی مزدوری شام کو ملتی تھی۔ میں نے اتنے پیسے جمع کر لیے کہ یہاں آ کر اپنے کزن کو تلاش کر سکوں۔''

UUNOVELS.COM

ہیری ایفل نے کہا۔ ''یہی ہے تمہاری پوری کہانی؟''

حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسی وقت کلارا کے فون پر ایک پیغام موصول ہوا جو ٹیکنیشن کی جانب سے تھا۔ ''فوراً مجھے فون کرو۔''

کلارا نے کہا۔ ''احمد اچھا آدمی نہیں تھا؟''

حسن نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اطمینان اتر آیا۔ ''میں یہی سمجھتا ہوں۔''

دفتر آنے کے بعد کلارا نے اپنے فون پر ٹیکنیشن سے رابطہ کیا۔ ''تم نے جس احمد کی تصویر بھیجی تھی کیا وہ تمہارے پاس ہے؟''

''نہیں۔'' کلارا نے جواب دیا۔

''گڈ! ہمیں فوراً پولیس سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ شخص غیر ملکی جنگجو ہے اور اس کے پاس برطانیہ کی شہریت ہے۔ یہ وہ نہیں جو اپنے آپ کو بتا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن برطانیہ واپس نہیں جا سکتا۔ انہوں نے اس کا نام اپنی فہرست میں لکھ لیا ہے اس لیے وہ یہاں پناہ لینے آ گیا۔''

کلارا نے اس سے جھوٹ بولنے پر معذرت کی اور اس کا مقصد بھی بتا دیا۔ پہلے تو وہ ناراض ہوا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہیں بھیج دوں گا، تم وہ پولیس کو بتا دینا۔ شاید اس سے انہیں تحقیقات میں کچھ مدد مل سکے۔''

جب اس نے فون رکھا تو ہیری بولا۔ ''تم نے بہت ہوشیاری دکھائی۔''

''یہ محض ایک اندازہ تھا۔ میں نے اس سے ایک درخواست کی تھی جب تم حسن کو لینے گئے ہوئے تھے۔''

''تمہارا خیال تھا.....''

''کہ حسن نے احمد کو قتل کیا ہے؟ نہیں، لگتا ہے کہ وہ اس وقت بھی اٹلی میں تھا۔''

''شاید اس کے کزن نے؟''

''وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے اسے پہچان لیا تھا۔ تم حسن کو لے کر یہاں آؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس اس کے لیے کچھ ہے۔''

جب ہیری، حسن کو لینے انٹرویو روم گیا تو کلارا نے اپنا اسکرین کھولا جس پر اس نے احمد کی فلیش ڈرائیو سے تصویریں کاپی کی تھیں۔ اس نے ایک ایک کر کے وہ تصویریں دیکھنا شروع کیں۔ ایک تصویر میں احمد کیفے میں بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ دوسری تصویر میں وہ بائیک پر سوار تھا۔ تیسری تصویر ایک فیملی کی تھی۔ ان کے سامنے میز پر کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک اور تصویر میں گھر کے افراد ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو بہنیں، ماں، باپ، چھوٹا بھائی اور ایک جوان شخص۔ کلارا نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی کزن تھا جسے اس نے کرسمس مارکیٹ میں دیکھا تھا لیکن حسن کہاں ہے؟ کیا وہ تصویریں لے رہا تھا؟

ہیری، حسن کو لے کر آیا تو کلارا نے اس کے سامنے اسکرین کر دیا جس پر فیملی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ ''میرے انکل اور کزن۔'' حسن نے کہا۔

کلارا نے دوسری تصویر دکھائی۔ ''بابا، ماما۔'' حسن نے بے یقینی کے عالم میں اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

نیا سال شروع ہو گیا تھا۔ سردی عروج پر تھی اور مسلسل برف باری ہو رہی تھی۔ حسن اور اس کے کزن کو عارضی طور پر قیام کی اجازت مل گئی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنا عرصہ رہ سکتے ہیں۔ کلارا کو یاد تھا کہ بوسنیا کی جنگ ختم ہونے کے بعد ہزاروں افراد کو واپس ان کے تباہ حال گھروں میں بھیج دیا گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا حسن کو بھی واپس جانا ہوگا؟

ابھی تک پارک میں ہونے والے قتل کے سلسلے میں کوئی گرفتاری نہیں ہوئی تھی۔ جب سے احمد کی شناخت غیر ملکی جنگجو کے طور پر ہوئی تھی، اس کے بارے میں لوگوں کے جذبات بدل گئے تھے اور وہ اس سے نجات حاصل کر کے اطمینان محسوس کر رہے تھے۔

اب کلارا کے سامنے ایک اور درخواست گزار عزیز بیٹھا ہوا تھا۔ وہ افریقا سے سمندر کے راستے ایک بھری ہوئی کشتی میں بیٹھ کر یہاں پہنچا تھا۔

''وہ بم.....'' اس نے کہا۔ ''مارکیٹ میں پھٹا تھا۔'' اس نے اپنی آستین اوپر اٹھائی، وہاں ایک زخم تھا جو کافی عرصہ پہلے بھر چکا تھا۔ کلارا نے اس جگہ کا تصور کیا جو عزیز چھوڑ کر آیا تھا۔ کیا وہ جگہ اتنی بری تھی کہ اسے چھوڑے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اور وہ یہ جھوٹ بولنے کے لیے سمندر عبور کر کے یہاں پہنچا تھا۔ اس امید پر کہ کلارا یہ دردناک داستان سن کر اسے جرمنی میں پناہ دے دے گی لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کلارا یہ کہانیاں سننے کی عادی ہے اور بڑی آسانی سے سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتی ہے۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

محفلِ شعر و سخن

❁ محمد حسان گل سیال.....مدوہڑی

ہم تو وہ انا پرست ہیں جو ہار کے بھی کہتے ہیں
وہ منزل ہی بدنصیب تھی جو ہمیں پا نہ سکی

❁ صدف خان.....کوئٹہ

زندگی بھر کی آرزوؤں کا
ساتھ لمحوں میں چھوٹ جاتا ہے
کتنا نازک ہے آئینہ دل کا
بے خیالی میں ٹوٹ جاتا ہے

❁ محمد شہباز اکرم توئی.....پاک پتن شریف

حوصلہ ہار دیا اسے روانہ کرکے
رو پڑا آنکھ میں تنکے کا بہانہ کرکے

❁ دل افگار.....حیدرآباد

دلِ واعظ میں کوئی غم نہیں ہے
نظر رکھتا ہے، چشمِ نم نہیں ہے
میں اس کی گفتگو سے بھاگتا ہوں
کہ اس کی ریت میں زمزم نہیں ہے

❁ ریاض بٹ.....حسن ابدال

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں شاید مگر ایسے بھی ہیں

❁ محمد کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

روگ بن جاتا ہے پیار بھی بڑھتے بڑھتے
روز ملنے کی یہ خواہش میرے دوست مت کرنا

❁ مدحت.....کراچی

قصۂ غم سناتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کوئی دشمن پس دیوار کھڑا ہو جیسے

❁ جنید احمد ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

نیچے ہے جو سیلاب تو اوپر ہیں گھٹائیں
بدلی ہے وہ دنیا کہ فلک ہے نہ زمیں ہے
جس سمت بھی دیکھو تو نظر آتا ہے پانی
اور پیاس بجھانی ہو تو اک بوند نہیں ہے

❁ یسریٰ خان.....اسلام آباد

داغِ الفت ہی مجھ کو کافی تھا
تم یہ آنکھوں میں اشک کیوں بھر لائے

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

سوچا تھا تجھ سے بچ کے نکل جائیں گے کہیں
دیکھا جو ہر مقام تیری راہگزر میں ہے

❁ وزیر محمد خان.....بلل ہزارہ

دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے

❁ ارم کاشف .....جھنگ سٹی

اک عمر تو سراغ نہ اپنا ملا ہمیں
اب کیا کرے کسی کی یہاں جستجو کوئی
اک عمر سے ہیں لوگ اسی انتظار میں
کھل کر تو زندگی سے کرے گفتگو کوئی

UUNOVELS.COM

❁عاصمہ ناز .....سیالکوٹ

سانسوں کے سلسلے کو نہ دو زندگی کا نام
جینے کے باوجود بھی کچھ لوگ مر گئے

❁زیبہ.....کراچی

یاد آتے ہیں تو پھر ٹوٹ کر یاد آتے ہیں
کچھ گزرے ہوئے لمحے کچھ بچھڑے ہوئے لوگ

❁محمد آریز ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

تمہاری سرد مہری سے الجھنے سے تو بہتر تھا
ہم اپنی ذات کے قصے درودیوار پہ لکھتے

❁قاسم کھرانی.....خیرپور

اس عاشقی کی خیر ہو اس عاشقی میں تو
لینے پڑے ہیں خود سے ہمیں انتقام بھی
مدت کے بعد جو درِ میخانہ وا ہوا
مستی میں جھوم جھوم اٹھے ہم بھی، جام بھی

❁ایوب علی.....حیدرآباد

بنجر صحرا سوکھی آنکھوں تکتا ہے
بادل جاکر پربت پربت برسا ہے
وہ آنکھیں دیواریں تکتی رہتی ہیں
ان آنکھوں میں جیسے کوئی قصہ ہے

❁ریشا علی.....کراچی

غیروں کی نفرتوں کا گلہ ہم نے کب کیا
اپنوں کی شفقتوں کے ستائے ہوئے ہیں ہم

❁اقصیٰ احمد.....نواب شاہ

ذکر جس زندگی کا کرتے ہو
ہم نے کچھ مختلف گزاری ہے
وہ فقیروں کا عجز کیا جانے
وہ تو دستار کا پجاری ہے

❁عارف انصاری.....کراچی

اس شہر میں کیا خاک شناسا کوئی ڈھونڈیں
لوگوں کے بدن پر کوئی چہرہ ہی نہیں ہے
ایسا تو کبھی بھی کوئی موسم نہیں آیا
دامن میں کسی پیڑ کے سایہ ہی نہیں ہے

❁عبید علی.....ملتان

تُو ایک بار ہماری گلی سے گزرا تھا
ابھی تلک تری خوشبو گھروں سے آتی ہے

❁امبرین عاصم..مری

اس سے رشتے عجیب ہیں میرے
اک محبت کا، اک جدائی کا

❁اسما ناصر.....چنیوٹ

لبوں نے سونپ دیں آنکھوں کو سسکیاں ساری
عجیب شور تھا اس نے بھی سن لیا ہوگا

❁وردہ.....کراچی

لوگ کہتے ہیں فرشتہ ہیں جناب واعظ
ہم بھی کہتے تو یہی ہیں کہ وہ انسان نہیں

❁یوسف خان.....بہاولپور

دشت میں دھوپ ہی برسنی ہے
سائے تو سائبان میں ہوں گے
داستاں کی طرح بیاں ہم بھی
کل تمہاری زبان میں ہوں گے

❁بریرہ ملک.....گلشن اقبال، کراچی

اپنی ہی سوچ میرے لیے تھی بڑا عذاب
ہر صبح وشام درد کے پیکر میں ڈھل گئی
اب دوسروں سے کوئی کروں بھی گلہ تو کیا
جب میری ذات خود کئی نقشے بدل گئی

❁احمد خان مری بلوچ.....میرپور خاص

جہانِ خواب سے اکثر ہمیں تم نے پکارا ہے
چلو نکلیں سفر پہ اب اسے تعبیر کرنے تک
بہت انمول ہوتا ہے مگر صورت ہے اک باقی
تم اپنی زندگی دو گے، یہ دل جاگیر کرنے تک

❁محمد انور ندیم.....جویلی لکھا، اوکاڑہ

آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا
اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

❁محمد ضوریز ملک.....کراچی

یاروں کے تو کہانیاں سو ہاتھ آگئیں
کیسے کہیں کہ آپ نے رسوا نہیں کیا

❁آصف خان.....گجرانوالہ

ایسا نہ ہو کہ میری طرح تجھ کو بھی یہ بھوک
ہر صبح ہاتھ باندھ کے گھر سے نکال دے

UUNOVELS.COM

❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ

ہمیں تو لگتے ہیں کچھ فاصلے بہت زیادہ
تمہارے شہر میں اک گھر سے دوسرے گھر کے

❁ نوید ہمایوں.....سرگودھا

شاید کسی کے مہر پہ تیری بھی ہو نظر
اتنی نہ بے رخی سے مرے مہربان دیکھ

❁ پرویز خان.....کوئٹہ

لے کے اے درد تجھے آتو گئے ہم دل تک
اب بھلا اور کہاں تک تری توقیر کریں

❁ زاہد احمد.....گھوٹکی

سحر کے بعد تو شاید یہ خواب بھی نہ رہیں
سحر کے بعد تو بس کروٹیں بدلنا ہے

❁ عریشہ.....ملتان

یوں تو قدم قدم پر تھی گردشِ زمانہ
اک بے زباں محبت بھی اپنے درمیاں تھی

❁ اقبال احمد.....کورنگی، کراچی

ہے عیاں مجھ پر حقیقت اپنے چارہ ساز کی
جانتا ہوں اس لیے میں پوچھتا کچھ بھی نہیں

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

تیری رضا ہے ترکِ تعلق تو ہے قبول
شاید مجھ ایسی تجھ کو کہیں دوستی ملے

❁ اویس خان .....کراچی

ہر ایک شخص ہی اب مارِ آستیں نکلا
کہ دوستی کا رہا اب کوئی وقار نہیں

❁ ممنون احمد.....بی

اس قدر عادی ہوئے ہیں جسم وجاں صدمات سے
تلخیوں میں ہی گزر اوقات اب ہونے لگی

❁ سید نصیر.....خانپور

بھلا کس کام کا ایسا تعلق توڑ دو اس کو
جو نظروں کے لیے نفرت دلوں کا بار ہوجائے

❁ طوبیٰ جنید.....پنڈی

وصل کے لمحوں کی راحت نہ میسر آئی
رتجگے آنکھوں میں بونے کے سوا کچھ بھی نہیں

❁ حمیرا.....کراچی

دل میں سلگتا رہتا ہے ہر لمحہ یہ خیال
سادہ دلی کی کیسی سزا پا رہا ہوں میں

❁ امبر علی.....خانیوال

تفریق ناروا کا جو پرتو ہے آج بھی
اس ناروا اصول سے نالاں رہا ہوں میں

❁ لبنیٰ کامران.....پشاور

کس ہنرمندی سے اپنوں نے دیے ہیں دھوکے
تشنہ تعبیر کبھی خواب ہوئے جاتے ہیں

❁ سحرش.....قصور

ہر اک شے سے بناوٹ ہے نمایاں
حقیقت پھر رہی ہے منہ چھپائے

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

دو قدم کا ساتھ بھی جن کو گوارا ہی نہیں
ایسی بے حس قربتوں کا سامنا کرتا رہا

❁ مجاہد علی.....سکھر

نفرتوں کے حبس میں گھٹنے لگا ہے اب تو دم
چاہتوں کی اب تلک موجِ صبا گزری نہیں

❁ غزالہ حیدر.....بہاولنگر

گھورتا رہتا ہوں پہروں اب خلاؤں میں یونہی
بے سکوں سی خامشی دلگیر ہوکر رہ گئی

❁ اکبر علی اکبر.....بونیر

رفتہ رفتہ بجھ گیا آخر چراغِ آرزو
پہلے دل خاموش تھا اب زندگی خاموش ہے

❁ شیر محمد شیری.....دریا خاں، ضلع بھکر

سجدوں کے عوض فردوس ملے منظور نہیں
بے لوث عبادت کرتا ہوں، بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں

UUNOVELS.COM

محفلِ شعر و سخن

کوپن
برائے
شمارہ
مئی
2020ء

نام : _____

پتا : _____

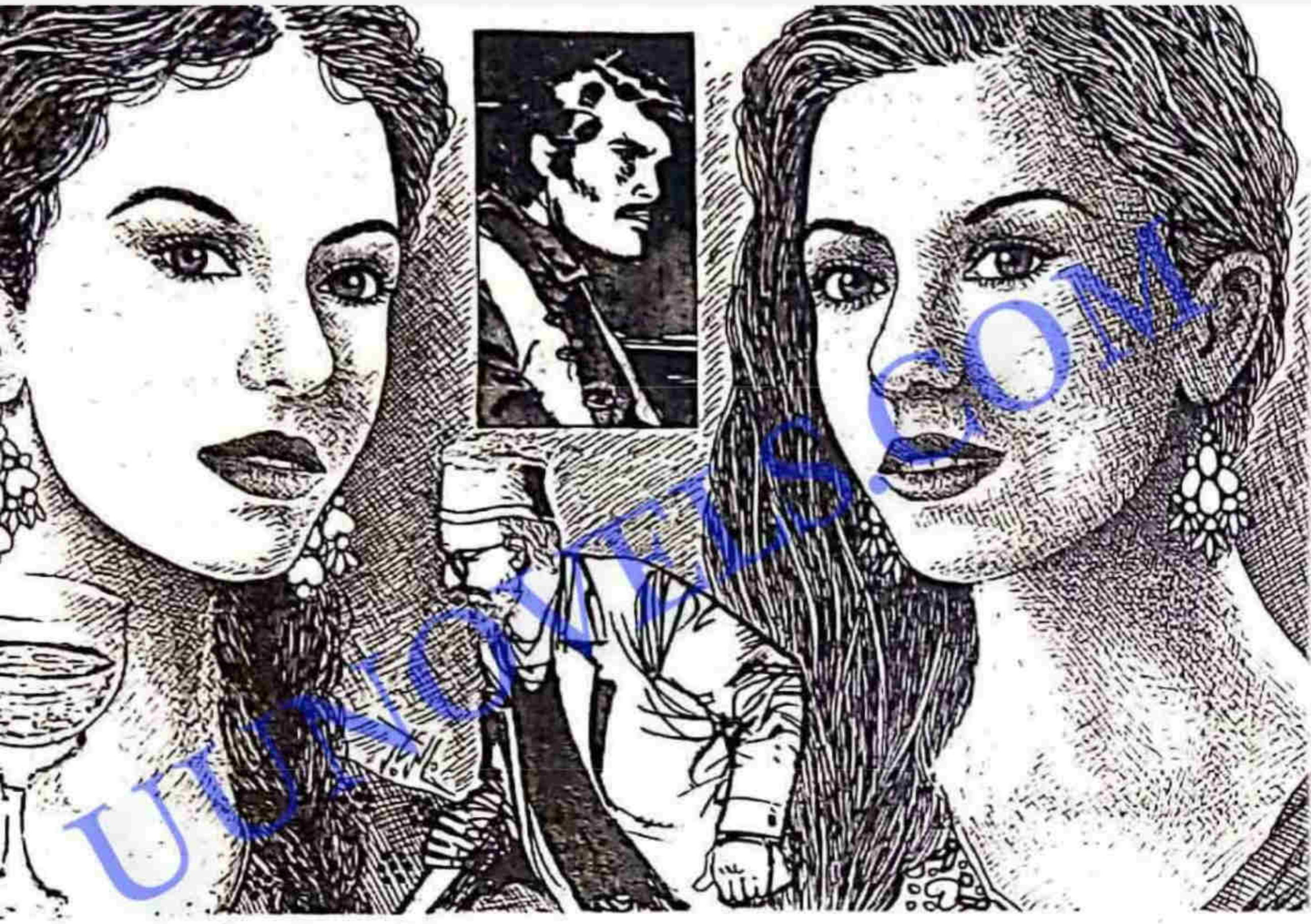

زود پشیماں

ایم اے راحت

زن، زر اور زمین ہمیشہ خونی رشتوں کے درمیان فساد ڈالتے آئے ہیں... مگر کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ اپنے ماضی کی کچھ غلطیوں کی اذیت میں مبتلا بس ایک جائے پناہ میں منہ چھپائے بیٹھا تھا... اور پھر اچانک اس جائے پناہ میں بھی طوفان در آیا کیونکہ... بُرے کا انجام کبھی اچھا نہیں نکلا۔ قدرت نے ببول سے ببول ہی نکالا... اس کی خواہش کے مطابق گلاب نہیں۔

اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے والے ایک پتھر دل انسان کی پشیمانی

شہزاد صاحب کی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ حالات نے اس طرح رخ بدلا تھا کہ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ آخری پونجی تک لگا بیٹھے تھے۔ کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں تھا۔

دوستوں نے طنزیہ فقرے اچھالنا شروع کر دیے تھے۔ ان لوگوں سے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔ دل کا درد کسی سے کہہ نہیں سکتے تھے۔ غلطی ان کی اپنی تھی۔ جما، جمایا کاروبار تھا لیکن لالچی فطرت نے سب تباہ کر دیا۔ کاروبار

میں ایمانداری کا اپنا ایک مقام ہے۔ بے ایمانی تباہی کے راستوں کا آغاز ہے۔

چھوٹا سا منافع بالآخر ایک دن بڑا نقصان بن کر سامنے آتا ہے اور یہی ہوا تھا۔ ایک ساتھ ساری مصیبتیں نمودار ہوگئی تھیں۔ انکم ٹیکس کی چوری کرتے رہے بالآخر پکڑے گئے اور بہت بڑی رقم ادا کرنا پڑی۔ اتنی بڑی رقم کاروبار سے نکلی تو ساکھ کمزور پڑ گئی۔

اخبارات میں تفصیل آگئی تھی۔ اس لیے ان سے کاروباریوں نے تعاون بند کردیا۔ بہرحال بچے کھچے سرمائے سے کئی اور کام شروع کیے لیکن ایک کے بعد ایک نقصان اٹھاتے رہے اور بالآخر کنگال ہوکر رہ گئے۔ اب صرف یہ خوبصورت کوٹھی تھی اور ایک دفتر کی عمارت۔ جس کا سارا عملہ کئی ماہ کی تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے ملازمت چھوڑ گیا تھا اور اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا اور اب وہ قرض خواہوں سے منہ چھپائے چھپائے پھرتے تھے۔

اس وقت بھی رات کا تقریباً ایک بج رہا تھا اور وہ اوپری منزل کی کھڑکی میں بیٹھے سامنے نظر آنے والی سڑک کو گھور رہے تھے۔ دفعتاً سڑک پر دو روشنیاں تیرتی ہوئی نظر آئیں اور انہوں نے ایک طویل سانس لی لیکن سیاہ رنگ کی قیمتی کار ان کی کوٹھی کے قریب ہی رکی تھی۔

پھر اس سے شہروز نیچے اترا اور شہزاد صاحب نے ہونٹ بھینچ لیے۔ شہروز لڑکھڑاتے قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھا اور اندر داخل ہوگیا۔ وہ پھر شراب پی کر آیا تھا۔ تقریباً دوسرے تیسرے دن یہی ہوتا تھا لیکن ناز و نعم میں پرورش پانے والے بچے بگڑ ہی جاتے ہیں۔ شہزاد صاحب کی بیگم نے انہیں ان کی جوانی یاد دلائی۔ جب وہ بلا ناغہ پیتے تھے۔

''لیکن یہ تباہی کا راستہ ہے۔ تم اس کی حمایت کر رہی ہو؟''

''تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے شہزاد صاحب! بہرحال یہ بری عادت ہے لیکن اس کی خودسری کو ہوا نہ دی جائے۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔''

''آئندہ وہ شراب نہ پیے اور اس کی جوابدہی تمہیں کرنا ہوگی۔'' شہزاد صاحب نے کہا تھا۔

''کیا آپ کی امی بھی ایسا ہی کرتی تھیں۔''

''افوہ۔ تم اس کی بے جا حمایت کر رہی ہو۔ ہمارے حالات اب وہ نہیں رہے، جو تھے۔ ہمیں اب نئے سرے سے خود کو سنبھالنا ہوگا۔''

''آپ کا خیال ہے شہروز کہیں نوکری کرے۔''

''کرنا ہوگی ..... اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

''والدین کی سزا اولاد کیوں بھگتے۔ ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ بہرحال اسے سمجھاؤں گی۔'' لیکن مسز شہزاد کے خیالات یہ تھے' وہ بیٹے کو کیا سمجھاتیں۔ البتہ انہوں نے شہروز کو احتیاط کی تاکید کردی تھی لیکن اس کے باوجود شہروز ہر دوسرے تیسرے دن نشے کی حالت میں شہزاد صاحب کے سامنے آجاتا تھا' وہ آج تک خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس وقت سخت ذہنی الجھنوں کا شکار تھے۔ شہروز کو دیکھ کر چراغ پا ہوگئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کر نیچے جانے والے راستے پر چل پڑے۔

بیگم شہزاد کو شاید شہروز کے آنے کے وقت کی اطلاع تھی۔ اس لیے وہ باہر آتی نظر آئیں لیکن شہزاد صاحب کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

''اوہ۔ تو یہ سب کچھ آپ کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے' اچھا ہے... سر پکڑ کر رونے کے وقت ہم... تنہا نہ ہوں گے۔''

''خدا کے لیے اس وقت پرسکون رہیں۔ بعد میں بات کرلیں گے' رات کا وقت ہے کوئی ہنگامہ مناسب نہ ہوگا۔''

''کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا بیگم صاحبہ! بلکہ اس وقت تو میں مسرور ہوں۔ کم از کم یہ سکون تو ہو رہا ہے کہ آنے والے خوفناک وقت کا ذمے دار میں تنہا نہیں ہوں گا۔ آپ لوگوں کا نام بھی لے سکوں گا۔''

اتنی دیر میں شہروز اندر داخل ہوگیا تھا۔ اس کا سفید چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں۔

''ارے آپ لوگ جاگ رہے ہیں ابھی تک۔ اتنی دیر تک نہ جاگا کریں ڈیڈی صحت خراب ہوجائے گی۔'' شہروز نے بڑے خلوص سے کہا۔

''تم بھی تو جاگ رہے ہو شہروز بیٹے اور دیکھو! تمہاری ممی بھی جاگ رہی ہیں لیکن تمہیں میری صحت کا سب سے زیادہ خیال ہے۔ ویسے کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟''

''ارے وہ ڈیڈی.. وہ بس ایک دوست کی ممی بہت بیمار تھیں بے چارہ سخت پریشان تھا۔ بس وہ ہی۔'' شہروز خوامخواہ ہنس پڑا۔

''یہ بڑا اچھا کام ہے شہروز۔ روزانہ دل بہلایا کرو اس کا۔ شاید وہی تمہیں چھوڑنے بھی آیا تھا۔''

''اوہ۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔ مجبوری تھی۔ آپ نے تو کار بھی بیچ دی ڈیڈی یوں لگتا ہے جیسے ہم غریب ہوگئے ہوں۔ کیا ہم غریب ہوگئے ڈیڈی؟''

''نہیں بیٹے۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو ہم اس کوٹھی کے

مالک ہیں۔ کوٹھی میں رہنے والے کہاں غریب ہوتے ہیں۔ابھی کچھ وقت اور لگے گا۔ جاؤ آرام کرو۔تمہاری ممی سخت پریشان ہو رہی ہیں تمہارے لیے۔'' شہزاد صاحب کے انداز میں زہر بھرا ہوا تھا۔

''اوہ۔ ممی آپ نے دیکھا۔ ڈیڈی کتنے ہمدرد انسان ہیں۔ڈیڈی بہت گریٹ ہیں۔ تھینک یو ڈیڈی۔ تھینکس۔'' بیگم شہزاد سے سہارا دے کر اندر کی طرف لے چلیں۔

شہروز سخت نالائق تھا۔ شہزاد صاحب نے اس کے لیے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ انہوں نے اپنے کاروبار کو اتنی وسعت اس لیے دی تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا منظر عام پر آئے اور اپنی ذہانت کے جوہر دکھائے لیکن وہ اپنی جوانی کو بھول گئے تھے۔ وہ خود بھی اپنے والدین کے لیے طویل عرصے تک دردِ سر بنے رہے تھے۔ البتہ تھوڑا سا فرق ضرور تھا۔ وہ خود دو بھائی تھے چنانچہ والد صاحب کا کاروبار شہزاد صاحب کے دوسرے بھائی نے سنبھال لیا اور اس طرح شہزاد صاحب اس خاندان کی تباہی کا باعث نہیں بن سکے۔

پھر والد صاحب کی موت کے بعد وہ پاکستان چلے آئے اپنے بھائی فرہاد صاحب سے تھوڑی سی ناچاقی ہو گئی تھی۔ اس لیے دوبارہ پلٹ کر بھائی کی طرف نہیں دیکھا۔ خط کتابت بھی بند تھی۔ یوں طویل عرصہ گزر گیا لیکن شہزاد صاحب صرف ایک بیٹے کے باپ تھے اور وہ بیٹا بھی ان ہی کے نقش قدم پر تھا البتہ نوشین کی طرف سے وہ مطمئن تھے۔ نوشین شہروز سے صرف ایک سال چھوٹی تھی اور تعلیم میں کہیں آگے۔ وہ ایم بی بی ایس کر چکی تھی اور اب ایک اسپتال میں ابتدائی خدمات سرانجام دے رہی تھی لیکن شہروز نے نہ جانے کس طرح بی اے کیا تھا اور اس کے بعد صرف آوارہ گردی کر رہا تھا اور اب صورت حال ہی بدل چکی تھی۔ شہزاد صاحب تباہی سے دوچار ہو گئے تھے۔ اس تباہی کی تھوڑی سی ذمے داری انہوں نے شہروز اور اپنی بیگم پر بھی ڈالی تھی۔ جنہوں نے کبھی ان سے تعاون نہیں کیا تھا اور اب شہروز کو تباہی کے دہانے پر پہنچا رہی تھیں۔ صورت حال بدلنے کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ ساری ساری رات وہ بیٹھے سوچتے رہتے تھے اور اس وقت بھی وہ اسی پریشانی میں جاگ رہے تھے کہ شہروز نے طبیعت اور مکدر کر دی تھی۔

دوسری صبح ناشتے پر شہروز سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی قدر شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ شہزاد صاحب کے دل میں بہت کچھ تھا لیکن شہروز کے انداز.... نے انہیں کسی حد تک نرم کر دیا اور وہ مصلحتاً رات کی بات ٹال گئے لیکن حسب معمول ناشتا ٹھیک طور سے نہ کر سکے۔ نوشین خاص طور سے اپنے باپ کی پریشانی کو زیادہ محسوس کر رہی تھی۔ شہزاد صاحب کے ہاتھ روک لینے پر وہ اداس نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی اور اس کی رفتار بھی کسی قدر سست ہو گئی۔

''کھائیے ڈیڈی! آپ نے تو.....'' وہ اداس لہجے میں بولی تو شہزاد صاحب چونک پڑے۔ انہوں نے محبت آمیز نگاہوں سے نوشین کو دیکھا۔

''بس بیٹے کھا لیا۔''

''ڈیڈی..... یہ آپ اپنے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں۔ آپ کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ آپ رات بھر نہیں سوئے۔''

''ہاں بیٹے نیند نہیں آئی۔''

''کیوں ڈیڈی؟''

''بیٹے ہم نے آپ کو حالات سے کبھی لاعلم نہیں رکھا۔''

''میں جانتی ہوں ڈیڈی۔''

''ہم نے ہمیشہ آپ پر اعتماد رکھا ہے۔''

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے ڈیڈی۔ مجھے معلوم ہے۔''

''میں بھی جانتا ہوں کہ آپ بہت احساس کرنے والی ہیں اسی لیے بتا رہا ہوں۔ کاروباری معاملات بالکل ختم ہو چکے ہیں گو قرض اتنا زیادہ نہیں ہے ہمارے اوپر۔ بس یہی پریشانیاں ہوتی ہیں بدقسمتی سے ہم تنہا ہیں۔ شہروز صاحب نے ہمارا کبھی ساتھ نہیں دیا۔ چنانچہ مستقبل میں بھی بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہی حالات پریشان کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ڈیڈی لیکن ابھی آپ نے کہا ہے کہ مردوں کو یہی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ مرد ہی ان سے نمٹتے بھی ہیں۔ آپ ہمت کیوں ہارتے ہیں بھیا سنبھل جائیں گے اور پھر میں جو ہوں۔ میں بہت جلد اپنا کلینک قائم کروں گی۔ میں چاہتی ہوں اپنے وطن کے لوگوں کو زیادہ بہتر علاج کے مواقع فراہم کر سکوں لیکن میرے وطن میں سب غریب تو نہیں ہیں۔ میں ایک شعبہ دولت کے حصول کا بھی رکھوں گی اور مجھے یقین ہے کہ خوب کماؤں گی۔''

''یقیناً بیٹی! لیکن والدین کے لیے بیٹی کی کمائی کا تصور دھبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ تم ضرور کمانا لیکن اپنے شوہر، اپنے گھر کے لیے۔ مجھے تو بس یہ افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کوئی خوب صورت کلینک بھی نہیں بنوا سکوں گا۔''

''خوبصورت کلینک ایک سرمایہ دارانہ تصور ہے۔ میں کسی چھوٹی سی دکان میں بھی کام شروع کر سکتی ہوں۔''

''لیکن میرے خواب کچھ اور تھے۔''

UUNOVELS.COM

''آپ کے خواب بھی ایک نہ ایک دن ضرور پورے ہو جائیں گے ڈیڈی آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ فی الحال اگر آپ میری باتوں کو کوئی اہمیت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔''

''ہاں کہو۔'' شہزاد صاحب بولے۔

''ڈیڈی! دفتر کی عمارت کی ہمیں کیا قیمت مل جائے گی؟''

''کیا مطلب؟''

''ہم اسے فروخت کریں تو ہمیں کتنے پیسے مل جائیں گے؟''

''کم از کم اسی، نوے لاکھ۔''

''قرض کتنا ہوگا ہم پر۔''

''لگ بھگ اتنا ہی۔''

''تو پھر پریشانی کس بات کی ہے۔ آپ وہ عمارت بیچ کر قرض ادا کر دیں اور ضرورت پڑی تو ہم یہ کوٹھی بھی فروخت کر کے کوئی چھوٹا سا مکان لے لیں گے اور اس کی رقم سے میں ایک چھوٹا سا کلینک بنا لوں گی۔'' نوشین نے کہا اور شہزاد صاحب تعجب سے اسے دیکھنے لگے لیکن شہروز کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے نوشین کو دیکھا اور پھر بولا۔

''ممی: کیا اس کے بعد بھی آپ کہیں گی کہ نوشین کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ ہے اور وہ میرے لیے بہتر انداز میں سوچ سکتی ہے۔'' سب چونک کر شہروز کو دیکھنے رہے۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھائی رہی پھر شہزاد صاحب ہونٹ بھینچ کر بولے۔

''کیا کہنا چاہتے ہو تم شہروز؟''

''یہی ڈیڈی کہ کیا نوشین کے الفاظ میرے لیے ایک سازش نہیں ہیں؟''

''نہیں..... میں..... میں آپ کے خلاف سازش کروں گی؟'' نوشین غم زدہ لہجے میں بولی۔

''یوں تو میرے بارے میں تم نے کبھی بہتر انداز میں نہیں سوچا نوشین لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم میری دشمن کیوں ہو۔ جو تجویز تم نے پیش کی ہے۔ کیا وہ میری تباہی کی مکمل تجویز نہیں ہے، تم جانتی ہو کہ تمہیں ایک دن اس گھر سے دوسرے گھر چلے جانا ہے اور دوسرا گھر اس گھر سے بلاشبہ بہتر ہوگا۔ اس کے بعد زندگی مجھے گزارنی ہے جس کی تجویز تم نے پیش کی ہے۔ تمہارا اپنا کلینک ضرور بن جائے گا۔ جو ظاہر ہے تمہاری ملکیت ہوگا۔ کیا خوب صورت پروگرام بنایا ہے تم نے نوشین۔'' شہروز تلخ لہجے میں بولا اور نوشین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم..... تم اس انداز میں سوچ بھی کیسے سکتے ہو بھیا۔'' وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''وہ اس کے علاوہ اور کسی انداز میں سوچ کیسے سکتا ہے نوشین ایک ناکارہ انسان ہمیشہ دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے کی سوچتا ہے۔'' شہزاد صاحب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کا طرز گفتگو غلط ہے ڈیڈی! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میری تربیت آپ کے ہاتھوں میں ہوئی ہے۔ میری اچھی یا بری شخصیت آپ کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے لیکن ان بُرے حالات میں سب نے آپ کے ساتھ تعاون کیا ہے ہمارا طرز زندگی بلند تھا۔ کاروبار میں نقصان ہماری وجہ سے نہیں آپ کی غلط پلاننگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میرا اس میں کیا قصور ہے لیکن اس کے بعد جو نتائج برآمد ہوئے وہ ہم سب کی ذات پر اثر انداز ہوئے۔

''آج میرے پاس کار بھی نہیں ہے اور میں دوسرے لوگوں کی گاڑیوں میں لفٹ مانگتا پھرتا ہوں۔ ہمیں یہ اسٹیٹس آپ نے دیا ہے ہم سب اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت کی تشکیل آپ کے ڈیڈی نے کی تھی۔ جو حق آپ اپنے ڈیڈی پر رکھتے تھے کیا میں نہیں رکھتا؟''

''ضرور رکھتے ہو لیکن تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں پاکستان بے سروسامانی کی حالت میں آیا تھا۔ اپنی امی سے پوچھو کہ ان کے اور تمہارے علاوہ..... میں یہاں کیا لے کر آیا تھا۔''

''میں نہیں جانتا ڈیڈی۔ نہ ہی مجھے اس سلسلے میں کچھ بتایا گیا ہے۔''

''میں سب کچھ چھوڑ کر آیا تھا۔ کوئی چیز لے کر نہیں آیا تھا یہاں۔ نہ اس کے بعد میں نے کسی شے کی طلب کی۔ میں خالی ہاتھ آیا تھا اور اس کے بعد اپنی محنت سے میں نے سب کچھ کیا۔''

''یہ میرے لیے نئی اور تعجب خیز بات ہے۔ لیکن جو کچھ تھا وہ کہاں گیا؟'' شہروز نے پوچھا۔

''میں بتاتی ہوں شہروز۔ تمہارے ابو کی تمہارے تایا سے ناچاقی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ہم نے سب کچھ چھوڑ دیا اور یہاں چلے آئے۔ اس کے بعد سے ہم کبھی ہندوستان واپس نہیں گئے اور نہ ہی ہم لوگوں نے ان سے کوئی واسطہ رکھا۔''

''اور وہ لوگ اب بھی وہاں ہیں۔'' شہروز نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ وہیں ہوں گے۔''

''اوہ..... میرے پیارے تایا۔ کیا ان لوگوں کی

خیریت بھی معلوم نہیں ہوئی کبھی؟'' شہروز نے مکاری سے کہا۔

''نہیں۔ بس یونہی کبھی کسی شناسا نے خیریت بتا دی۔ نہ انہوں نے کوئی خط لکھا اور نہ کبھی ہم نے۔''

''آہ..... میرے پیارے ڈیڈی آپ اتنے معصوم ہیں مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں آپ سے از حد شرمندہ ہوں۔'' شہروز کی آنکھیں نجانے کیوں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ شہزاد اور دوسرے لوگ تعجب سے شہروز کی اس بدلی ہوئی کیفیت کو دیکھ رہے تھے۔ شہزاد صاحب نے منہ سے کچھ نہ کہا اور اسے دیکھتے رہے۔

''آپ کا خون سفید ہو گیا ہے ڈیڈی میرا نہیں۔''

''آخر کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' بمشکل تمام شہزاد صاحب نے کہا۔

''ڈیڈی آپ کتنے سنگدل ہیں۔ آپ نے اتنے طویل عرصے تک ہمیں اپنے خون سے دور رکھا لیکن میں ناکارہ اور نکما انسان خون کے اس رشتے کو پھر سے جوڑ دوں گا۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا فرض ہے ڈیڈی، میں جوان ہو گیا ہوں اور اب آپ لوگوں کے معاملات میں دخل اندازی کر سکتا ہوں۔ میں بھائی کو بھائی سے ملاؤں گا۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' شہزاد صاحب جھنجلا کر بولے۔

''کیا تایا ابو اتنے سنگدل ہیں کہ ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیں۔ آخر تایا ابو کے پاس جو دولت ہے کیا اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ بلاشبہ انہوں نے وہ حصہ محفوظ رکھا ہوگا۔ آپ ایک اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ آپ نے کبھی اس دولت کے بارے میں نہیں سوچا لیکن اب شہروز کو اس کی ضرورت ہے۔''

''اوہ..... نہیں، ہرگز نہیں۔'' شہزاد صاحب بولے لیکن بیگم شہزاد تعجب سے شہروز کو دیکھ رہی تھیں۔

''آخر کیوں نہیں ابو۔ وہ میری ضرورت ہے۔''

''مگر میں اسے چھوڑ چکا ہوں۔''

''جو نادانی آپ کر چکے ہیں، ضروری تو نہیں وہ آپ کی اولاد بھی کرے۔ نہیں ڈیڈی نہیں، یہ نادانی ہم نہیں کریں گے اور پھر دیکھیے نا... ہماری ضروریات بھی تو ہیں جو ہمیں اس کے لیے مجبور کر رہی ہیں۔

''نوشین کو ایک نیا کلینک تعمیر کرنا ہے۔ ممکن ہے عقل آ جائے اور میں بھی کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کر دوں اور ڈیڈی نہ تو ہمیں آفس بیچنے کی ضرورت پڑے گی اور نہ یہ بنگلا بلکہ ہم اپنے پیارے تایا جان سے اپنا حصہ وصول کر لیں گے اور مجھے یقین ہے وہ دے دیں گے اور اگر نہیں دیں گے تو قانونی چارہ جوئی کی بھی گنجائش ہے اور اس کے بعد ڈیڈی سارے معاملات درست ہو جائیں گے، یوں ڈیڈی..... یوں۔''

شہروز نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا اور شہزاد صاحب ایک لمحے کے لیے کچھ پریشان ہو گئے۔ دیر تک وہ گردن جھکائے کچھ سوچتے رہے اور پھر بولے۔

''مگر شہروز میں..... میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں اب وہاں نہیں جانا چاہتا جس جگہ کو میں چھوڑ چکا ہوں وہاں دوبارہ قدم رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' شہزاد صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

''اوہو ڈیڈی..... جذباتی ہونے سے اس دنیا میں کبھی کچھ نہیں ملتا۔ اب دیکھیے نا ہمارے تایا ابو کبھی جذباتی ہوئے۔ اگر وہ جذباتی ہوتے ڈیڈی تو یقیناً انہیں کبھی نہ کبھی آپ کی یاد ضرور آتی اور جب آپ کی یاد آتی تو وہ ہم سے ملنے کبھی پہنچ جاتے اور یہاں آنے کے بعد ہمیں ہمارا حصہ دینے کی کوشش بھی کرتے۔ جب انہوں نے جذباتی ہونا نہیں آتا تو آپ کے اندر یہ اتنی ساری جذباتیت کہاں سے آ گئی۔ ڈیڈی ہر شخص اس دنیا میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کا خواہش مند رہتا ہے۔ تعلقات، خون، رشتے داریاں، یہ ساری چیزیں فضول سی باتیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ خون کے رشتے کبھی کوئی حیثیت رکھتے ہوں گے لیکن اب ان کا کوئی وجود نہیں ہے چنانچہ اس خود پرست دنیا میں بلکہ زر پرست دنیا میں اگر اسی کے مانند زندگی نہ گزاری جائے تو پھر آپ یقین کریں کہ زندہ رہنے کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔''

''شہروز..... شہروز..... میں۔''

''کچھ نہیں ڈیڈی، کچھ نہیں آپ سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دیں۔ زندگی میں کچھ تو کرنے کا موقع دیں۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ نکما ہے اور ناکارہ ہے۔ کچھ نہیں کیا اس نے زندگی میں۔ ڈیڈی صرف ایک کام کروں گا اور وہ یہ کہ اپنے حصے کی دولت تایا ابو کے حلق میں انگلی ڈال کر نکال لوں گا، کیا سمجھے آپ ڈیڈی۔''

شہروز کی باتیں بڑی عجیب تھیں۔ ان باتوں سے سب سے زیادہ متاثر بیگم شہزاد معلوم ہوتی تھیں۔ تب انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہی تو کہتا ہے شہروز، خدا کی قسم آج تک کبھی یہ بات ہمارے ذہنوں میں نہیں آئی، جو چھوڑ چکے

UUNOVELS.COM

تھے اس کا تصور تو ہم نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن کیا ہمارے بچے بھی اس سے محروم رہیں۔ میں کہتی ہوں، فرہاد صاحب کو خود ہی کبھی نہ کبھی یہ بات سوچنی چاہیے تھی۔ انہوں نے بھی سوچا ہوگا اچھا ہے یہ بلا ٹل گئی۔ چنانچہ جب وہ اس دولت سے مکمل اور بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ اسے اپنے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں۔

"آخر ہمارا جائز حصہ ہے۔ انہیں ہمارا حصہ ہمیں دینا ہی ہوگا۔ ٹھیک ہے شہروز بیٹے میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

شہزاد صاحب کچھ نہ بولے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بیگم کی مخالفت بھی نہیں کی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود بھی تھوڑے سے نرم پڑ گئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شہروز ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ اگر فرہاد صاحب ایماندار ہوتے تو تعلقات رکھتے یا نہ رکھتے لیکن ان کے حصے کی دولت ان کے حوالے کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ یہ ان کا اخلاقی فرض تھا۔ جب انہوں نے اپنا یہ فرض پورا نہیں کیا تو کیا ضروری ہے کہ اس سلسلے میں کوئی تکلف برتا جائے۔ چنانچہ انہوں نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا نوشین البتہ پریشان نگاہوں سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

سب لوگ ناشتے کی میز سے اٹھ گئے۔ "نوشین تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔" شہزاد صاحب نے کہا اور نوشین اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ بیگم شہزاد اور شہروز بھی دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے، بیٹی اس سلسلے میں؟"

"میں کیا عرض کروں ڈیڈی آپ نے دیکھا۔ شہروز بھیا نے کتنی آسانی سے میرے اوپر الزام لگا دیا۔"

"اوہ..... نوشین، اس کی جو محبت ہے۔ اس کے تحت اس سے کسی بہتر بات کی توقع ہی فضول ہے۔ اس کا ذہن اسی انداز میں سوچنے کا حامل ہے، مگر میں پریشان ہوں۔"

"کیوں ڈیڈی؟"

"تمہارا کیا خیال ہے نوشین کیا ہمیں یہ اقدام کرنا چاہیے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں ڈیڈی۔ اگر تایا ابو سے ملنے کو آپ کا دل چاہتا ہے تو ضرور چلیے، دل تو میرا بھی بہت چاہتا ہے انہیں دیکھنے کو، مگر میں نے صرف آپ کی وجہ سے کچھ نہیں کہا۔"

"نوشین دیکھنا دوسری بات ہے مگر اپنا حصہ مانگنے والی بات، میں نے ہمیشہ فرہاد بھائی کی بے پناہ عزت کی ہے ناچاقی کی بنیادی وجہ بھی کچھ ایسی تھی لیکن میں نے کبھی ان کے سامنے کھڑے ہو کر گفتگو نہیں کی۔ اب میں ان سے اس دولت کی بات کیسے کر سکوں گا؟"

"میرا خیال ہے یہ کام شہروز بھیا آرام سے کر لیں گے، ڈیڈی۔"

"ہاں..... لیکن وہ بدتمیز لڑکا..... کیا سوچیں گے وہ لوگ کہ شہزاد، شہروز کو اب جوان کر کے لایا ہے تاکہ اپنا بدلہ لے سکے۔"

"اب سوچ لیں ڈیڈی، آپ کا دل کیا گوارا کرتا ہے۔"

"دیکھو نوشین بیٹے، تم سے میں دل کی بات کبھی نہیں چھپاتا۔ بھیا کو دیکھنے کو تو دل بہت چاہتا ہے لیکن جس انداز میں ہم ان کے سامنے جائیں گے، کیا اس میں محبت کا کوئی عنصر ہے۔ اس میں تو صرف ایک ہوس، ایک لالچ ہے۔"

"میں کیا عرض کر سکتی ہوں ڈیڈی۔"

"ہوں..... ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ مجھے اس سلسلے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔" شہزاد صاحب نے کہا اور پھر نوشین اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بلاشبہ ان کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی اور وہ اپنے حالات سے سخت پریشان تھے لیکن اس دوران ایک بار بھی انہیں اس دولت کا خیال نہیں آیا تھا جو ان کا حصہ تھی اور ان کے بھائی کے قبضے میں تھی۔

جوں جوں شہزاد صاحب اس سلسلے میں سوچ رہے تھے ان کی حالت عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ ہندوستان سے آئے ہوئے انہیں طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران انہوں نے بڑی کوششیں کر کے سب کچھ بھلا دیا تھا لیکن آج پرانی..... یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ آج انہیں بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ داستان بھی جو کوئی نہیں جانتا تھا اور جو ان کے ذہن کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھی۔

نہ جانے کب تک وہ خیالات میں ڈوبے رہے اور پھر جب وہ چونکے تو شہروز سے متفق ہو چکے تھے۔ یوں بھی یہ ہی بہتر تھا۔ ان حالات سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ شہروز ٹھیک کہتا ہے۔ فرہاد صاحب نے بھی تو خود غرضی کا ثبوت دیا تھا۔ ناراض تھے تو ٹھیک تھا لیکن بھائی کا جائز حق تو اسے پہنچاتے۔ واقعی اس میں نوشین کا کلینک بھی بن جائے گا اور ممکن ہے کاروبار میں دوبارہ جان پڑ جائے۔

پھر جب وہ بیگم کے کمرے میں پہنچے تو شہروز اور بیگم شہزاد کا ناپھوسی کر رہے تھے۔

"یہ دور ہی تخریب کاروں کا ہے، ہم جیسے نیک لوگ واقعی اس دنیا کے ناکام ترین لوگ ہیں۔" ماں، بیٹے نے محسوس کیا کہ شہزاد صاحب کا موڈ خوشگوار ہے تو دونوں خوش ہو گئے۔

"بس ڈیڈی اسی سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔"

JUNOVELS.COM

''گویا تم میرے بھائی کے خلاف سازش کررہے ہو؟''

''ارے نہیں توبہ، توبہ ڈیڈی۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ تایا کا ہمیں دیکھ کر کیا ردعمل ہوگا۔''

''خدا جانے۔'' شہزاد صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ ''بہرحال ڈیڈی میں ایک ہفتے کے اندر سارے انتظامات کرلوں گا۔''

☆☆☆

ایک طویل عرصے کے بعد شہزاد صاحب نے جانی پہچانی سرزمین پر قدم رکھا تھا... اب یہ زمین اجنبی تھی سب کچھ بدل گیا تھا لیکن اس سرزمین کے چپے چپے سے لاتعداد یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں انہوں نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس سرزمین پر ان کی جوانی کی رنگین داستانیں بکھری ہوئی تھیں اور اس عمر میں جوانی کے ہنگامے ان کے لیے شرمندگی کا باعث تھے۔ وہ زمیندار تھے اور زمینداروں کی بگڑی ہوئی اولاد کی ساری باتیں ان میں موجود تھیں۔ گو حالات نے بڑھاپا سدھار دیا تھا لیکن جوانی کی کہانیوں سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان تو نہیں تھا۔

جوں جوں وہ اپنے علاقے کی طرف بڑھتے جارہے تھے، خیالات تازہ ہوتے جارہے تھے۔ نئی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ سڑکیں، گلیاں، بازار بدل گئے تھے لیکن یادیں نہیں بدلی تھیں۔

خوبصورت حویلی اسی طور تھی۔ گو اس کے سامنے کے رخ کی شکل بدل گئی لیکن اس بدلی ہوئی شکل میں بھی وہ حویلی انہیں اپنی اپنی لگی ٹیکسی حویلی کے دروازے پر رک گئی۔ گیٹ پر کھڑا چوکیدار ٹیکسی کے قریب آگیا تھا۔ ''جی صاب؟'' اس نے پوچھا۔

''فرہاد صاحب یہاں رہتے ہیں؟'' شہزاد صاحب نے پوچھا۔

''جی صاب۔''

''موجود ہیں اندر؟''

''جی صاب۔''

''کیا جی صاب..... لگا رکھی ہے، دروازہ کھولو۔'' شہروز نے ڈانٹ کر کہا۔

''جی صاب۔'' چوکیدار جلدی سے واپس پلٹ گیا اور پھر اس نے گیٹ کھول دیا۔ ٹیکسی اندر چلی گئی تھی۔ صدر دروازے پر ایک قبول صورت نوجوان کھڑا ان لوگوں کو گھور رہا تھا۔ ٹیکسی رکنے پر وہ ان کے قریب آگیا۔ شہزاد صاحب نے تعجب سے اسے دیکھا۔ نوجوان کے چہرے پر فرہاد صاحب کی شباہت موجود تھی۔

''تم..... جمشید فرہاد ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں..... آپ؟'' نوجوان نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''یعنی ہم آپ کے مہمان ہیں، کیا آپ ہمیں شرف میزبانی نہیں بخشیں گے؟'' شہزاد صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنا مکمل تعارف کرایا اور ٹیکسی سے نیچے اتر آئے۔ نوشین اور بیگم شہزاد بھی نیچے اتر آئی تھیں۔

''اوہ..... معاف کیجیے گا۔ تشریف لائیے۔'' نوجوان انہیں لیے ہوئے ایک پُرتعیش ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ ''تشریف رکھیے آپ لوگ میں اندر اطلاع کرتا ہوں۔'' اور پھر وہ بدحواس سا اندر کی طرف چلا گیا۔ شہروز گہری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو یہ عیش ہورہے ہیں۔ خوب..... بڑے مناسب وقت پر ہم یہاں آئے ہیں۔''

چند ساعت کے بعد فرہاد صاحب ایک خوب صورت چھڑی ٹیکتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ سفید ڈاڑھی، نورانی چہرہ، کافی ضعیف ہوگئے تھے لیکن بصارت اور ذہانت پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے متعصب نگاہوں سے آنے والوں کو دیکھا اور پھر ان کی نگاہیں شہزاد پر ٹک گئیں اور دوسرے لمحے ان کے چہرے میں نمایاں تغیر نمودار ہوا۔ چھڑی ان کے ہاتھوں سے گرگئی اور وہ بے اختیار کئی قدم آگے بڑھ آئے پھر رک گئے۔

''یہ تم..... تم ہو شہزاد۔'' انہوں نے جذباتی لہجے میں پوچھا اور شہزاد صاحب بھائی جان کہہ کر ان سے لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے منظر جذباتی ہوگیا تھا۔ فرہاد صاحب کے پیچھے آنے والے حیران کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی بیگم دو لڑکیاں اور وہی نوجوان تھا جس کی سب سے پہلی ملاقات ان لوگوں سے ہوئی تھی۔

''توبہ فرزانہ میں تو تمہیں پہچانی بھی نہیں۔'' بیگم فرہاد آگے بڑھتے ہوئے بولیں، وہ فرزانہ بیگم سے لپٹ گئی تھیں۔ عجیب وغریب ماحول ہوگیا تھا۔ فرہاد صاحب بے اختیار رو رہے تھے اور شہزاد صاحب کی آنکھیں بھی نم ناک تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے سارا معاملہ چوپٹ ہوگیا تھا۔ نوشین اور شہروز بھی پیچھے ہی کھڑے تھے۔ تب دونوں لڑکیاں آگے بڑھ آئیں۔

''اگر ہم لوگوں کے درمیان کوئی ایسا ہی گہرا رشتہ ہے تو یقیناً آپ بھی ہماری رشتے دار ہی ہوں گی۔'' ایک لڑکی جو کسی قدر شوخ چہرے کی تھی، آگے بڑھ کر نوشین سے بولی

UUNOVELS.COM

اور نوشین اس کے قریب پہنچ گئی۔

''اب رہ گیا میں۔'' شہروز نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس نوجوان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آؤ بھائی، ہم دونوں بھی گلے ملنے کی کوشش کریں۔'' نوجوان ہنس پڑا تھا۔ تب وہ بھی شہروز کے نزدیک پہنچ گیا۔

فرہاد صاحب خاصے نڈھال ہو گئے تھے۔ وہ مسلسل روتے جا رہے تھے اور اب تمام لوگ ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ انہیں سہارا دیا گیا اور سہارا دے کر ایک صوفے پر بٹھایا گیا۔

''شہزاد..... شہزاد تو آخر آ ہی گیا۔'' وہ کہہ رہے تھے اور بار بار شہزاد صاحب کو لپٹا لیتے تھے۔ شہزاد صاحب کی حالت بھی کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی حالانکہ وہ اتنے نرم دل کے مالک نہیں تھے۔ زمانے کی سختیوں نے انہیں خاصا سخت دل بنا دیا تھا لیکن بھائی کی محبت کو وہ کبھی محو نہیں کر سکے تھے۔

''چچا شہزاد۔'' نوجوان نے کہا اور پھر وہ بھی شہزاد صاحب کے نزدیک آ کر ان سے لپٹ گیا۔ شہزاد صاحب ایک ایک کو پیار کر رہے تھے۔ کافی دیر تک ڈرائنگ روم میں یہ تماشا ہوتا رہا۔ پھر سب سکون سے بیٹھ گئے۔ سامان اندر رکھوا دیا گیا تھا۔

''مجھے یقین تھا شہزاد کہ تم ایک دن ضرور آؤ گے۔ مجھے پورا پورا یقین تھا۔'' فرہاد صاحب نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھائی جان، میری نالائقی ہے کہ اس سے پہلے حاضر نہیں ہوا۔''

''شہزاد اب ان باتوں کو چھوڑ دو۔ نجانے میں بھی کیوں اتنا شدت پسند ہو گیا تھا۔ تم نے بڑائی کی ہے شہزاد! تم نے میرے پاس آ کر اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا ہے۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔''

''بھائی جان جو کچھ ہو چکا واقعی اس کو بھول جانا بہتر ہے۔ بس آپ کچھ بھی کہیں میں آپ کا چھوٹا بھائی تھا۔ مجھے خود ہی آپ کے پاس پہنچنا چاہیے تھا۔'' شہزاد صاحب نے فرہاد صاحب کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''ہاں، شہزاد خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے دوبارہ مل گئے۔''

سب خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔

بیگم فرہاد اور فرزانہ دونوں ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ فرہاد صاحب شہزاد صاحب سے ان کے حالات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ شہزاد صاحب نے رسمی طور پر اپنے کاروبار کے بارے میں غیر اطمینانی کا اظہار کیا۔ فرہاد صاحب نے انہیں بہت سی تسلیاں دیں اور اپنی بیگم سے کہا۔

''بیگم آپ تو بیٹھ گئیں۔ ان لوگوں کے لیے کھانے پینے اور آرام کا بندوبست کریں۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔''

''ہاں..... ہاں بس ابھی چند منٹ میں آئی۔'' انہوں نے کہا اور بیگم شہزاد بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئیں۔

''میں بھی چلتی ہوں بھائی جان میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گی۔ بس ان دونوں کو باتیں کرنے دیجیے۔'' اور پھر ڈرائنگ روم میں شہزاد صاحب اور فرہاد صاحب رہ گئے۔ شہزاد صاحب گزری ہوئی باتیں کر رہے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے دوران میں خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں آپس میں خوب گھل مل گئے تھے اور ان کے قہقہے گونج رہے تھے۔ شہزاد صاحب نے ایک دو بار تشویش کی نگاہوں سے شہروز کو دیکھا تھا۔ شہروز اچھی طبیعت کا نوجوان نہیں تھا اور وہ اس کی حرکتوں سے بخوبی واقف تھے لیکن اب وہ ان کے بس سے بھی باہر تھا۔ یہاں پر یہ دو بچیاں کہیں شہروز کی کسی حرکت کا شکار نہ ہو جائیں۔

یہ سوال کئی بار ان کے ذہن میں آیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ شہروز پر خاص نگاہ رکھیں گے۔

کھانے کی میز سے اٹھنے کے بعد دوسری باتیں چھڑ گئیں۔ پھر شہزاد صاحب آرام کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ بیگم شہزاد کو بیگم فرہاد اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ وہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ شہزاد صاحب جس کمرے میں آئے، اس میں داخل ہو کر ان پر ایکدم عجیب سی کیفیات کا حملہ ہوا۔ یہ کمرا ان ہی کی ملکیت تھا۔ انہوں نے اس کمرے میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ حویلی میں بے شمار تبدیلیاں ہوئی تھیں لیکن شہزاد صاحب کا کمرا اسی طرح تھا۔ پچیس سال کے بعد بھی اس کمرے کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شہزاد صاحب کی قد آدم..... تصویر آج بھی اسی جگہ موجود تھی جہاں ہمیشہ رہتی تھی اور تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کے رنگوں پر وقت کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ ان کا بستر بھی اسی کھڑکی کے نزدیک تھا... جہاں ہوتا تھا۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ شہزاد صاحب ایک ایک شے کو دیکھ کر پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ ان پر رقت طاری تھی۔ ماضی انسان کے لیے عجیب حیثیت رکھتا ہے۔

شہزاد صاحب ایک الماری کے قریب پہنچ گئے۔ اس الماری میں ان کی کتابیں وغیرہ رہا کرتی تھیں۔ انہوں نے

الماری کھولی اور دنگ رہ گئے۔ ساری کتابیں جوں کی توں موجود تھیں۔ اس کمرے میں کوئی تبدیلی نہ ہونے کا مقصد تھا کہ فرہاد صاحب ان کی یادوں کو سینے سے نہیں نکال سکے تھے۔ وہ آج بھی انہیں اتنا ہی چاہتے تھے لیکن بس ان میں بھی ایک انا تھی۔ جس نے انہیں شہزاد سے رجوع نہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔

شہزاد صاحب ایک بار پھر الجھن کا شکار ہو گئے۔ ان حالات نے انہیں بے حد متاثر کیا تھا۔ اب وہ جائداد کی تقسیم کی بات کس طرح کریں گے۔ کیا فرہاد بھائی یہ نہیں سوچیں گے کہ ان کی محبت نہیں بلکہ جائداد کی محبت شہزاد کو یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ کتابوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے وہ یہی سوچ رہے تھے۔

پھر انہوں نے کتابوں کی الماری کے سب سے نچلے خانے میں نگاہ ڈالی اور دفعتاً ان کے دل کو ایک شدید گھونسا سا لگا۔ نچلے خانے میں مٹی کا ایک کھلونا رکھا ہوا تھا۔ چونے سے پتا ہوا۔ ایک خوب صورت برتن کھلونا۔ دیوالی کے موقع پر اس برتن میں ناریل، مصری اور دوسری چیزیں رکھ کر ایک دوسرے کو تحفتاً دی جاتی ہیں اور یہ تحفہ..... یہ معصوم تحفہ بھی کسی نے انہیں دیا تھا۔

"کون ہو تم؟"

"رانو سرکار۔"

"رانو سرکار... یہ کیا نام ہوا؟"

"رانو سرکار نہیں صرف رانو..... ہم رانو ہیں سرکار....." وہ ہنس پڑی۔

"تم صرف رانو ہو؟"

"تو اور کیا؟"

"میں نہیں مانتا۔ اتنی بڑی تو ہو اور اتنا سا نام ہے۔"

"نام تو ہمارا رانی ہے... سرکار بس سب پیار سے رانو کہتے ہیں۔"

"اوہ..... اس کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگ تمہیں پیار کرتے ہیں۔ کون، کون ہیں، وہ ذرا مجھے بتاؤ۔"

"کون سرکار؟"

"وہی جو تمہیں پیار کرتے ہیں۔"

"لو۔ کون ہوتا۔ ہمارے ماما ہیں، امی ہے، بس اور کون ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"اور تو کوئی نہیں ہے نا...؟" شہزاد صاحب نے پوچھا۔

"نہیں..... نہیں اور کوئی نہیں۔" وہ ڈسٹر سے میز صاف کرتے ہوئے بولی۔ شہزاد صاحب گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ سانولا رنگ حسین ترین بدن، بڑی بڑی شرم سے جھکی ہوئی آنکھیں۔ اگر اس میلے کچیلے لباس کے بجائے، اسے کوئی حسین لباس پہنا دیا جائے تو بڑی بڑی حسینائیں شرما جائیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے نقوش میں ایک عجیب سی تمکنت تھی۔ وہ جس لباس میں تھی اس ماحول کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"مگر..... رانی..... بلکہ رانو میں نے تمہیں آج پہلی بار دیکھا ہے۔"

"تو ہم کیا کریں۔ ہم نے تو آپ کو بہت سی بار دیکھا ہے۔"

"اچھا کہاں؟"

"یہیں گھر میں اور کہاں؟"

"تم کہاں رہتی ہو؟"

"ماما کے پاس۔"

"اور یہ تمہارے ماما کہاں رہتے ہیں؟"

"اپنے گھر میں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"کہاں ہے تمہارے ماما کا گھر؟"

"باغ کے دوسری طرف۔" اس نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ برابر اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ شہزاد صاحب سمجھ گئے کہ وہ نوکروں کے کوارٹر میں رہتی ہے۔

"کیا نام ہے تمہارے ماما کا؟"

"دین محمد۔"

"اوہ..... مالی دین محمد۔"

"ہاں۔"

"میرے کمرے کی صفائی کرنے کے لیے کس نے کہا ہے تمہیں؟"

"وہ مائی..... اکبری۔ اپنے گھر گئی ہے نا۔ تو ہم سے کہا کہ ہم یہاں صفائی کیا کریں۔" اس نے جواب دیا۔

"خوب... بہرحال رانی ہم بھی تمہیں رانو ہی کہیں نا؟"

"آپ مالک ہو سرکار جو دل چاہے کہو۔"

"تمہیں سب پیار سے رانو کہتے ہیں نا...؟"

"ہاں....."

"تو پھر ہم بھی تمہیں پیار کرنے لگے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر آپ بھی رانو کہہ لیا کریں۔" اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ وہ اپنا کام ختم کر کے اندر چلی گئی تھی لیکن شہزاد صاحب اس کے سراپا کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ نوکروں کے کوارٹروں میں بھی ایسے پھول کھلے ہوں گے۔ وہ حیران تھے کہ ابھی تک ان کی نگاہ اس کی طرف کیوں نہیں پڑی تھی۔

UUNOVELS.COM

دور شباب تھا۔ وہ ایک بے نتھے بیل کی طرح تھے۔ دوستوں کی محفلیں ہوتیں اور وہ۔ ان محفلوں میں کیا نہیں ہوتا تھا۔ دولت شہزاد صاحب کی، کارکردگی دوستوں کی۔ چھٹی ہوتی طوائفیں اور گانے والیاں بلائی جاتیں۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں اور پھر شراب کے سرور میں غرق ہو کر ماحول بدل جاتا لیکن یہ محفلیں محدود تھیں۔ ان میں زیادہ تر کاروباری عورتیں اور لڑکیاں شریک ہوتی تھیں اور ایک بار شہزاد صاحب کے چند دوستوں نے کچھ ایسی مجبور اور بے سہارا لڑکیوں کا بندوبست بھی کیا تھا جو اپنے حالات کی وجہ سے عصمت فروشی پر آمادہ ہو گئی تھیں لیکن اس کے علاوہ شہزاد صاحب نے کسی اور طرف نگاہیں نہیں کی تھیں۔

لیکن اب وہ دوسرے انداز میں سوچ رہے تھے۔ یہ پھول تو ان کی رگِ جاں سے بھی قریب تھا۔ ناقابل حصول بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے ملازموں کے ہاں اور بھی ویسے پھول ہوں۔ شہزاد صاحب اس دریافت پر بہت خوش تھے۔

گو انہوں نے ابھی تک بذاتِ خود کسی ایسی کوشش کا آغاز نہیں کیا تھا لیکن عورتوں کی دنیا میں اجنبی نہیں تھے چنانچہ وہ دوسرے دن کا شدت سے انتظار کر رہے تھے اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ساتھ رانی ان کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ شہزاد صاحب دیر سے اٹھنے کے عادی تھے لیکن آج وہ رانی کے لیے جاگ رہے تھے اور بہت غور و خوض کے بعد آج کا لائحہ عمل تیار کر چکے تھے۔

چنانچہ جونہی رانی کمرے میں داخل ہوئی، انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ہولے ہولے کراہنے لگے۔ کراہنے کی آوازیں رانی نے بھی سن لیں اور وہ ٹھٹک گئی۔

پھر وہ دھیمے قدموں سے ان کے پاس پہنچ گئی۔ جب وہ ان کے عین سامنے آ گئی تو شہزاد صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ کرنوں جیسی ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور شہزاد صاحب کو وہ مسکراہٹ بڑی جاں بخش محسوس ہوئی۔

''رانو.....'' انہوں نے بڑے پیار سے اسے آواز دی۔

''سرکار! کیا بات ہے، آپ کراہ رہے تھے۔''

''سر میں بڑا درد ہے رانو.....''

''اوہ..... میں دبا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہیں تکلیف ہو گی۔''

''لو..... سر دبانے میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ ماما کا تو روز سر دباتی ہوں۔'' وہ اطمینان سے شہزاد کے سرہانے بیٹھ گئی۔ نرم ہاتھوں کا یہ لمس شہزاد کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ ان ہاتھوں کی جادوگری کے قائل ہو گئے۔ اس سے قبل یہ سکون ان کے بدن نے کبھی نہیں لیا تھا۔ رانی کے گداز بدن کی خوشبو ان کے حواس پر نشہ بن گئی تھی اور وہ جنبش تک نہ کر سکے۔ سارے شیطانی جذبات سرد پڑ گئے تھے۔

پھر سورج چڑھ گیا اور وہ اٹھ گئی۔ کمرے کی صفائی کرنے کے بعد وہ اسی خاموشی سے باہر نکل گئی لیکن اس کے جانے کے بعد شہزاد صاحب کو ایک بے چینی کا احساس ہوا۔ وہ تو کچھ نہیں کر سکے تھے۔ کچھ نہیں بول سکے تھے اور ان کے نزدیک یہ حماقت تھی۔ انہیں اتنی شرافت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دیر تک وہ سوچتے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھ گئے۔ ''بہر حال دوسرا دن بھی آئے گا۔''

البتہ انہوں نے اپنے دوستوں سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور اس احساس کو دل میں چھپائے رہے تھے۔

ان دنوں ان کی شادی کے چرچے ہو رہے تھے اور کسی جگہ رشتہ وغیرہ بھی کر دیا گیا تھا لیکن شہزاد صاحب کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو دوسری ہی رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔

رانو اب انہیں روزانہ ملتی تھی اور کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ پھر دیوالی آ گئی۔ گو یا مسلمانوں کا تہوار نہیں تھا لیکن ہندو معاشرے میں رہ کر بعض گھرانے اس سے متاثر ہو گئے تھے۔ کچھ نہ سہی کسی تہوار کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ گھر کے سارے لوگ چراغاں دیکھنے چلے گئے تھے۔ شہزاد صاحب بھی موجود نہیں تھے۔ پھر وہ گھر واپس آ گئے۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے رانی کو دیکھا وہ کچھ لیے بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔ شہزاد صاحب خوش ہو گئے۔

''ارے رانو تم.....''

''ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔''

''کیوں؟''

''آج دیوالی ہے نا...؟''

''ہاں، تو پھر؟''

''ہم آپ کے لیے یہ برتن لائے ہیں۔'' اس نے مٹی کا یہ خوب صورت برتن ان کے سامنے کر دیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''بس ہے، ایک کام کی چیز اور ہم آپ کے لیے لائے ہیں۔'' اس نے کہا اور شہزاد صاحب جھک کر اس معصوم سی لڑکی کے خوب صورت کھلونے کو دیکھنے لگے جس میں نجانے کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے ہنس کر یہ تحفہ قبول کر لیا۔

''تم چراغاں دیکھنے نہیں گئیں؟''

UUNOVELS.COM

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''ہم نے گھر میں ہی چراغ جلا لیے تھے۔'' اس کے جواب میں شاعری نہیں تھی لیکن شہزاد صاحب جھوم اٹھے۔ ان کے سینے میں عجیب سی تمنائیں ابھر آئی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ تب وہ آگے بڑھے اور بولے۔

''تو آؤ..... رانو..... ہم کچھ اور چراغ روشن کریں۔'' وہ اس کے نزدیک پہنچ گئے۔

''کہاں..... اس کمرے میں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''تو ٹھہریں۔ میرے پاس تیل بھی ہے اور دیے بھی۔ میں ابھی لے آتی ہوں۔'' وہ پلٹی لیکن شہزاد صاحب نے اس کے دونوں شانے پکڑ لیے۔

''نہیں رانو..... مٹی کے چراغ تمہاری آنکھوں میں روشن چراغوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے ان کی روشنی دیکھنے دو۔'' انہوں نے ..... رانو کی ٹھوڑی کو اونچا کر کے اس کے ہونٹ چوم لیے۔ وہ سخت حیران نظر آ رہی تھی۔

''سرکار..... سرکار.....'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''سرکار نہیں رانو..... شہزاد کہو۔''

''نن..... نہیں سرکار! آپ..... آپ تو مالک ہیں۔''

''آج تم ہی ہماری حیات کی مالک ہو آؤ رانو دیوالی منائیں۔ دیوالی خوشیوں کا تہوار ہے۔ دیوالی دلوں کا کھیل ہے، بولو..... رانو..... بولو، دیوالی مناؤ گی میرے ساتھ۔'' انہوں نے پوچھا اور اس نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

خاصی رات گئے جب..... وہ شہزاد صاحب کے کمرے سے باہر نکلی تو اس کے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ جس طرح شہزاد صاحب شراب پی کر لڑکھڑانے لگتے تھے۔

''رانی.....'' شہزاد صاحب نے اسے پکارا۔

''جی سرکار.....!''

''دلوں میں محبت کے دیے روشن ہوں تو ہر رات دیوالی ہوتی ہے۔ کل رات بھی چراغاں کریں گے۔ بولو دیوالی منانے آؤ گی؟'' اور اس نے گردن ہلا دی۔ اسے بھی یہ خوشیاں..... بھلی لگی تھیں۔

یوں راتیں دیوالی کی راتیں قرار پائیں۔ رانی معصوم تھی۔ اس کھیل کے دوسرے رخ سے نا آشنا۔ وہ اس قدر معصوم تھی کہ کبھی اس نے شہزاد صاحب پر اپنا حق نہ جتایا۔ کبھی یہ نہ سوچا کہ ان راتوں کا کوئی بدلہ بھی ہوتا ہے۔ کبھی کچھ نہ مانگا، کبھی کچھ نہ پایا۔ شہزاد صاحب کی دلجوئی اور

پھلجھڑیاں

شرم

بیوی۔ (اپنے شوہر سے) ''آپ اپنے دوست کی بیوی کے جنازے میں کیوں نہیں جا رہے؟''

شوہر۔ ''مجھے شرم آ رہی ہے۔''

بیوی۔ ''ارے بھئی اس میں شرم کی کیا بات ہے؟''

شوہر۔ ''ارے بیگم! بات یہ ہے کہ وہ آج مجھے اپنی چوتھی بیوی کے جنازے میں شرکت کے لیے بلا رہا ہے اور میں نے آج تک ایک بار بھی نہیں بلایا۔''

وڈا منڈا

آج میں نے ایک بوڑھی عورت سے پوچھا۔

''اماں جی! 71ء کی جنگ میں کیا ہوا تھا؟''

اماں شرماتے ہوئے بولی۔ ''میرا وڈا منڈا۔''

جنتی

بیوی گوری چٹی تھی۔ شوہر کالا تھا۔ ایک دن بیوی کہنے لگی۔ ''سنو، ہم دونوں جنتی ہیں۔''

شوہر نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

بیوی بولی۔ ''وہ ایسے کہ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر توبہ کرتی ہوں اور تم مجھے دیکھ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہو۔''

داد

اگر اپنا بچہ روئے تو دل میں درد ہوتا ہے اور اگر کسی دوسرے کا بچہ روئے تو سر میں درد ہوتا ہے اور بالکل اسی طرح اگر اپنی بیوی روئے تو سر میں درد ہوتا ہے اور اگر کسی دوسرے کی بیوی روئے تو دل میں درد ہوتا ہے۔

چیونگم

شادی بالکل چیونگم کی طرح ہوتی ہے۔ پہلے میٹھی پھر پھیکی اور آخر میں تو بس چپک ہی جاتی ہے۔

مرسلہ۔ ناہید یوسف، اسلام آباد

UUNOVELS.COM

خدمت کو اس نے اپنا شعار بنالیا۔ شہزاد صاحب کبھی اسے کچھ دینے کی کوشش کرتے تو وہ..... منع کر دیتی۔ ''نہ، نہ..... ماما، ناراض ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ ہمیشہ بات ٹال دیتی۔

شہزاد صاحب کی شادی کا چرچا زوروں سے ہونے لگا۔ اس کے بعد تاریخ طے پا گئی اور پھر ایک دن دھوم دھام سے ان کی شادی فرزانہ بیگم سے ہوگئی۔ رانی اس شادی میں اتنی ہی خوش تھی جتنے دوسرے۔ گھر کے سارے کام بھاگ بھاگ کر کر رہی تھی۔ گویا یہ احساس ہی نہ تھا کہ اس کا کچھ لٹ گیا ہے۔ کچھ چلا گیا ہے اور خود اس کی اپنی کوئی قیمت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ معصوم مسکراہٹوں کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہی اور یوں شادی کے دن گزر گئے۔

لیکن اب دیوالی کی راتیں ماند پڑ گئی تھیں۔ وہ دیے بجھ گئے تھے جو اس میں جلائے جاتے تھے۔ رانی کئی بار راتوں کو اس کمرے میں آئی لیکن اب یہاں فرزانہ بیگم کا راج تھا۔''

شہزاد صاحب اس سے کترانے لگے اور پھر رانی کے چہرے پر اداسیاں رقص کرنے لگیں۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولتی تھی لیکن اب اس کا چہرہ اداس اداس رہتا تھا۔ صبح کو وہ ان دونوں کے لیے چائے لاتی۔ ان کے کمرے کی صفائی کرتی لیکن اب اس کا چہرہ ویران ہوگیا تھا۔ آنکھوں کے کنول مرجھا گئے تھے۔ شہزاد صاحب کو کئی بار رانی کا خیال آیا لیکن فرزانہ بیگم بھی خاصی حسین تھیں اور اس نئے حسن میں وہ گم ہو کر رانی کو فراموش کر بیٹھے تھے... مگر ایک دن کچھ دبی دبی سی آوازیں ابھریں اور شہزاد صاحب کے کان بھی کھڑے ہوگئے۔

''ارے..... آپ نے کچھ سنا۔'' فرزانہ بیگم نے آہستہ سے ان سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''جی وہ لڑکی ہے نا جو صبح کو صفائی کرنے آتی ہے، کیا نام ہے اس کا؟''

''رانو.....؟'' شہزاد صاحب نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا ہوا، اس کو.....'' شہزاد صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

''حاملہ ہے کمبخت۔''

''کیا مطلب؟'' شہزاد صاحب کا پورا بدن جھنجھنا گیا۔

''ہاں، حاملہ ہے یہ نوکر قسم کے لوگ نجانے کیا کیا حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ نہ جانے کمبخت کہاں سے لے آئی ہے۔''

''کیسے پتا چلا تمہیں؟'' شہزاد صاحب نے چکراتے سر پر قابو پا کر پوچھا۔

''پتا چلنے کی کیا بات ہے۔ پیٹ بھی آہستہ آہستہ باہر نکل رہا ہے۔ صبح کو کام کرتے کرتے بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ تب دیکھا گیا اور اندازہ کر لیا گیا۔ اس کے ماما کا تو برا حال ہے۔''

''اوہ..... مگر یہ ہنگامہ کہاں ہو رہا ہے؟''

''ہنگامہ تو کچھ نہیں ہو رہا۔ بس بھابی نے اس کے ماما کو بلا کر کہا تھا کہ فوری طور پر اسے لے کر یہاں سے چلا جائے۔ اس کا ماما سخت پریشان تھا۔''

''ہوں.....'' شہزاد صاحب نے کہا اور خاموش ہوگئے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سلسلے میں کیا کریں۔ رانی کی رسوائی انہی کی ذات کی وجہ سے تھی لیکن اب تو وہ زبان بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ ان کی مصیبت بھی آجاتی اور پھر ان کی مشکل کا ایک اور حل نکل آیا۔

فرہاد صاحب سے کسی مسئلے پر ان کی جھڑپ ہوگئی اور یہ جھڑپ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ شہزاد صاحب نے فرزانہ بیگم کے مشورے سے یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اس طرح یہ دونوں گھر سے نکل گئے۔ فرزانہ بیگم چند روز اپنے میکے میں رہیں۔ پھر شہزاد صاحب نے پاکستان آنے کا پروگرام بنالیا۔ ان کا دل بھائی کی طرف سے اس قدر کھٹا ہوگیا تھا کہ وہ کسی صورت وہاں رکنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ ایک دن وہ خاموشی سے پاکستان چلے آئے۔

پاکستان آکر انہوں نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ کاروبار کے لیے کوششیں کرتے رہے اور کاروبار جمانے میں کامیاب ہوگئے اور پھر انہوں نے عروج دیکھا۔ اسی عروج کے زمانے میں شہروز پیدا ہوا اور شہروز کے ایک سال بعد نوشین وجود میں آئی اور شہزاد صاحب کی ابتدائی زندگی ہنسی خوشی گزرتی رہی، رانی کا خیال ان کے دل سے بالکل نکل گیا تھا۔

یہاں تک کہ کچھ عرصے کے بعد وہ اس کے نام کو بھی بھول گئے تھے۔ جوانی کی رنگ رلیوں کا دور گزر چکا تھا اور اب ذمے داریوں کا دور تھا۔ ابتدا میں کچھ عرصے تک انہوں نے اپنے شوق پورے کیے لیکن آہستہ آہستہ ذہن میں یہ احساس جاگزیں ہوتا گیا کہ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ ان پر ان رنگ رلیوں کا برا اثر پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا اور گھر بار کے ہو کر رہ گئے۔

لیکن دولت کمانے کی ہوس نے انہیں بہت سی باتوں میں اخلاقی حد بندیوں سے دور کر دیا تھا۔ وہ اپنے معاملات میں فیئر نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ یہ ہی بات ان کے زوال کا

UUNOVELS.COM

سبب بن گئی اور پھر ایک عرصے کے بعد انہوں نے واپسی کے بارے میں سوچا تھا۔

یہاں آکر انہیں فرہاد صاحب کی فطرت کا اندازہ ہوا۔ فرہاد صاحب بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ جھڑپ جو عجیب شکل اختیار کر گئی تھی، اب انہیں یاد بھی نہیں تھی اور وہ بھائی کی محبت میں تڑپ رہے تھے جس کا ثبوت یہ کمرا تھا۔ جسے جوں کا توں رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے نشانات بھی باقی رکھے گئے تھے۔

کافی دیر تک وہ کھڑے رہے اور پھر ایک گہری سانس لے کر وہ وہاں سے ... ہٹ آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد نوشین، فرہاد صاحب کی دونوں بیٹیوں کو لے کر آگئی۔

''ہیلو ڈیڈی! کیا کر رہے ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں بیٹے! آؤ بیٹھو۔ کہاں سے آرہی ہو آپ لوگ؟''

''ہم آپ سے اجازت لینے آئے ہیں چچا جان۔'' شمسہ نے کہا جو فرہاد صاحب کی بڑی بیٹی تھی۔

''کس سلسلے میں؟''

''بس آپ نوشین کو ہمارے حوالے کر دیں۔ ہم انہیں اپنے طور پر سیر و تفریح کرائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میری طرف سے اجازت ہے۔ تم لوگ غیر تو نہیں ہو کہ اجازت کی ضرورت پیش آئے۔''

''اوہ..... شکریہ چچا جان! آپ تو ہمارے ڈیڈی سے بھی اچھے ہیں۔'' لڑکیاں خوش ہو گئیں۔ شہزاد صاحب ان سے ان کے تعلیمی مشاغل کے بارے میں پوچھتے رہے اور دیر تک باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

رات کے کھانے کے بعد فرہاد صاحب، شہزاد صاحب کو لے کر اپنے کمرے میں پہنچ گئے اور بے شمار باتیں ہوتی رہیں۔ فرہاد صاحب نے ان سے ان کے کاروبار کے بارے میں پوچھا اور شہزاد صاحب تفصیلات بتاتے رہے۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں انہوں نے کاروبار کی تباہی کی داستان بھی سنا دی۔

''لیکن اس میں تو قصور تمہارا ہی نظر آتا ہے۔''

''ہاں..... بھائی جان، بس سنبھال نہیں سکا۔''

''نہیں شہزاد میاں، کسی بھی کاروبار میں ایمانداری پہلی شرط ہوتی ہے یوں تو لاکھوں لوگ ناجائز کاروبار کرتے ہیں۔ جن میں اسمگلنگ، چور بازاری، بلیک مارکیٹنگ وغیرہ شامل ہے اگر غلط کام کرنے ہیں تو سیدھے سیدھے غلط کام کرو۔ انہیں شرافت کی شکر میں کیوں لپیٹتے ہو؟''

''آپ درست کہتے ہیں۔''

''خیر میاں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اب نئے سرے سے کام کا آغاز کرو۔ کم کماؤ لیکن ایمانداری سے کماتے رہو تاکہ بالکل ہی ناکارہ ہو کر نہ رہ جاؤ۔''

''نوشین، ایم بی بی ایس کر چکی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایک کلینک کھول لے۔''

''ماشاءاللہ اچھا خیال ہے۔ شہروز کو تم اپنے ساتھ کام میں ہی لگاؤ۔ دیکھو شہزاد میاں! اولاد کو کسی راستے پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خود ان بہتر راستوں کو اپنائیں۔ والدین اولاد کے لیے مثال ہوتے ہیں۔ وہ ان سے زیادہ کسی کا اثر..... قبول نہیں کرتی۔ تم خود شہروز کو کام کر کے دکھاؤ تاکہ وہ تمہارے طریقے اپنائے۔''

''حالات نے اگر اس بار مجھے معاف کر دیا بھائی جان تو آئندہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کر دوں گا۔'' شہزاد صاحب نے کہا تو فرہاد صاحب خاموش ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے۔

فرزانہ بیگم کو بیگم فرہاد نے ایسا رچھایا تھا کہ شوہر کو ہی بھول گئیں اور یوں بھی اب دونوں کی عمر ایسی نہیں تھی کہ کمرے میں ایک ساتھ سونا ضروری ہوتا۔ چنانچہ شہزاد صاحب کو تنہا ہی یہاں رہنا پڑا لیکن رات کی تنہائیاں ان کے لیے بڑی تکلیف دہ تھیں۔ خیالات کا ہجوم تھا جس میں اس کمرے کی گزری ہوئی داستانیں سر اٹھائے سرگرداں تھیں۔ رانی کا خیال ان کے ذہن میں اس طرح سوار تھا کہ نیند آنے کے بعد بھی وہ... خوابوں میں ڈوبے رہے اور رات اس طرح بیت گئی جیسے آئی ہی نہ ہو۔

صبح کو بھی وہ خواب ہی دیکھ رہے تھے کہ ایک آہٹ پر آنکھ کھل گئی۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ جاگ اٹھے ہیں لیکن یہ خواب تو نہیں۔ رانی اپنے مخصوص انداز میں صفائی کر رہی تھی۔ وہی نقش جو نقش اول تھا۔ جھکی جھکی نگاہیں، بکھرے بال اپنے آپ میں گم..... لیکن..... لیکن شہزاد صاحب خوف سے اچھل پڑے۔

یہ خواب تو نہیں ہے، وہ جاگ رہے تھے اور..... اور رانی، وہ اسی طرح بھرپور جوان تھی۔ وہی قد و قامت ویسے ہی سیاہ بال، وہی سانولی رنگت، وہی تیکھے نقوش ذرہ برابر بھی تو تبدیلی نہیں آئی تھی اس میں، حالانکہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ تو..... ان کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی لیکن رانی ان کی ہر کیفیت سے بے نیاز تھی۔ اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ باہر نکل گئی۔ شہزاد صاحب کے پورے بدن نے پسینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ یہ..... یہ رانی..... انہوں نے چکراتے ہوئے سر کو

دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ دیر تک وہ اسی طرح لیٹے رہے۔

پھر فرزانہ بیگم اندر آ گئیں اور انہوں نے اپنی دانست میں شہزاد صاحب کو جگایا۔ شہزاد صاحب اٹھ گئے تھے۔ فرزانہ بیگم پر وہ سب کچھ ظاہر نہیں کر سکتے تھے لیکن سارا دن پریشان رہے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ بچے مختلف تفریحات میں مصروف رہے تھے۔ شام کو فرہاد صاحب نے اپنے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا اور انہیں اپنے بھائی سے ملانا چاہتے تھے۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ان لوگوں کے جانے کے بعد سونے کا فیصلہ کیا گیا لیکن نہ جانے کیوں شہزاد صاحب کو اس کمرے سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ ’اگر آج کی رات بھی یہ خیالات مجھے پریشان کرتے رہے تو پھر کل کمرا بدل لیا جائے گا‘ انہوں نے سوچا۔

لیکن خیالات کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں اور پھر صبح کا منظر تو اور زیادہ خوفناک تھا۔ اگر رانی میں بھی عمر کی تبدیلیاں ہوئی ہوتیں تو..... تو شاید وہ اتنے خوفزدہ نہ ہوتے لیکن وہ دن بھر پریشان رہے تھے۔ اس لیے رات کو نیند جلدی آ گئی۔ دوسری صبح اتنی ہی قیامت خیز تھی۔ آنکھ کھلی تو رانی نظر آئی لیکن وہ اپنا کام ختم کر کے باہر نکل رہی تھی۔ شہزاد صاحب وحشت زدہ ہو کر اٹھ گئے۔

”سنو..... سنو رانی.....“ نہ جانے کس طرح ان کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی لیکن یہ آواز اتنی مدھم تھی کہ کسی نے نہ سنی ہوگی۔ وہ چلی گئی اور شہزاد صاحب کے ذہن میں پھر بھنور پڑ گئے تھے۔ آج ان کی حالت کل سے بھی زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ دیر تک وہ بیٹھے رہے اور پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ رانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر شہزاد صاحب ٹہلتے ہوئے لان میں نکل آئے۔ مالی لان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ گئے تو مالی نے انہیں سلام کیا جو ایک فربہ بدن آدمی تھا۔

”کب سے کام کر رہے ہو؟“ شہزاد صاحب نے پوچھا۔

”چھ مہینے ہو گئے سرکار۔“

”تم سے پہلے کون یہ کام کرتا تھا؟“

”دین محمد سرکار۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”اسے سل کی بیماری ہو گئی ہے سرکار۔ آج کل سینی ٹوریم میں داخل ہے۔“ مالی نے جواب دیا۔

”اوہ..... تم لوگ اسے دیکھنے نہیں جاتے؟“

”میں تو دو دفعہ جا چکا ہوں سرکار۔ روز روز فرصت کسے ہے؟“

”تم وہاں کا راستہ جانتے ہو؟“

”جی سرکار۔“

”ٹھیک ہے میرے ساتھ چلنا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، کب چل سکتے ہو؟“

”جب حکم کریں سرکار۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ضمیر علی، سرکار۔“

”ٹھیک ہے..... ضمیر علی! میں تمہیں بلوا لوں گا۔ تم میرے ساتھ چلنا۔“ شہزاد صاحب نے کہا اور ضمیر علی نے گردن ہلا دی۔ شہزاد صاحب اس سے زیادہ معلوم نہیں کر سکے۔ ان کے ذہن میں عجیب سے سناٹے تھے۔ نہ جانے کیسے کیسے خیالات ہر وقت ان کے ذہن میں چکراتے رہتے تھے۔ ان کے معمولات حسب سابق تھے۔ شہروز فرہاد صاحب ہی کے بیٹے کے ساتھ مصروف رہتا تھا۔ نوشین لڑکیوں میں الجھی ہوئی تھی اور فرزانہ بیگم، بیگم فرہاد کے ساتھ سیر سپاٹے کر رہی تھیں۔ وہ تنہا رہ جاتے تھے۔ فرہاد صاحب بھی اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ اس وقت بھی وہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شہزاد کو دیکھ کر بولے۔

”پسند کرو تو میرے ساتھ چلو۔ اکیلے بور ہو رہے ہو گے۔“

”ہاں..... بھائی جان۔ یہاں تو سب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔“

”گھومو..... پھرو۔ یہاں تو تمہارے کافی دوست تھے۔ گاڑی کی ضرورت ہو تو میں چھوڑ جاؤں۔“

”جی ضرورت تو ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر تکلف کیوں ہو رہا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ ڈرائیور مجھے چھوڑ کر ابھی واپس آ جائے گا۔ اس کے بعد تم بے فکر ہو کر جہاں دل چاہے چلے جانا۔“ فرہاد صاحب نے کہا تو شہزاد صاحب نے گردن ہلا دی۔

فرہاد صاحب چلے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ڈرائیور آ گیا۔ تب شہزاد صاحب نے ضمیر علی کو بلایا اور اس کے ساتھ سینی ٹوریم چل پڑے۔ حسب معمول ان کا ذہن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سینی ٹوریم میں داخل ہو کر انہوں نے دین محمد کے بارے میں معلوم کیا اور تھوڑی دیر کے بعد انہیں جنرل وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ دین محمد ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا تھا۔ وہ زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہا

UUNOVELS.COM

تھا۔ حالت ضرورت سے زیادہ بگڑ چکی تھی۔ آواز بھی انتہائی نحیف اور باریک سی نکلتی تھی۔ حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی سی بے رونق آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ شہزاد صاحب اس کے قریب بیٹھ گئے تھے۔

''مجھے پہچانتے ہو، دین محمد۔'' انہوں نے کہا تو دین محمد خالی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ''میرا نام شہزاد ہے فرہاد صاحب کا چھوٹا بھائی۔'' دین محمد سوچتا رہا، دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ہلکا سا تغیر نمودار ہوا۔ یوں لگا جیسے ان آنکھوں میں جان پڑ گئی ہو۔

''پہچانے، دین محمد۔''

''ہاں..... ہاں..... میں۔'' دین محمد نے جیسے بمشکل تمام یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

''کیا حال ہے تمہارا؟''

''ٹھیک..... ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے مشکل سے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟'' شہزاد صاحب نے کہا تو دین محمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر پھیل گئی۔

''کوئی چیز چاہیے؟'' شہزاد صاحب نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''بولو..... بولو..... کیا چیز چاہیے؟''

''زندگی..... زندگی۔'' دین محمد نے کہا تو شہزاد صاحب سناٹے میں آ گئے۔ کیسی بات کہی تھی دین محمد نے۔ کتنی انوکھی بات تھی، ایک لمحے کے لیے شہزاد صاحب دنگ رہ گئے پھر بولے۔

''زندگی تو صرف خدا ہی دے سکتا ہے دین محمد۔ ہم تو تمہارے لیے دعا کر سکتے ہیں۔ میں ڈاکٹروں سے تمہارے لیے بات کروں گا۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ دین محمد فکر مت کرو اور ہاں ایک بات تو بتاؤ۔ تمہارے اہلِ خاندان کہاں ہیں؟''

''تھا ہی کون۔ اس کے سوا۔'' دین محمد نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

''وہ..... وہ..... رانو..... میرا مطلب ہے۔ رانی کہاں ہے؟'' شہزاد صاحب نے دھڑکتے دل سے مطلب کی بات پوچھ لی اور دین محمد کے چہرے پر پھر جنون کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے دکھ کی نگاہوں سے شہزاد صاحب کو دیکھا اور شہزاد صاحب کو یوں لگا..... جیسے دین محمد کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہو۔ جیسے وہ شہزاد صاحب کے جرم سے واقف ہوں۔

''وہ بدنصیب..... وہ بدنصیب تبھی مر گئی تھی۔ ایک سال بھی زندہ نہ رہی..... وہ تم..... تم.....'' اس کے ساتھ ہی دین محمد پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ آواز کے ساتھ خون اچھل رہا تھا۔ وہ بے حال ہو گیا اور نرسوں نے شہزاد صاحب سے معذرت کر لی۔

''معاف کیجیے گا جناب۔ اس وقت مریض کے پاس رہنا خطرناک ہے۔ آپ باہر جائیں۔'' اور شہزاد صاحب اٹھ گئے لیکن ان کے حواس مکمل طور پر گم ہو گئے تھے۔ دین محمد نے صرف اتنا کہا تھا کہ رانی مر چکی ہے تو پھر..... تو پھر وہ کون تھی..... وہ..... وہ کیا رانی کی روح تھی۔ ہاں..... روح ہی ہو سکتی ہے۔ خاموش خاموش سی، شاکی سی۔

شہزاد صاحب کو چکر آ گئے۔ سینی ٹوریم سے وہ سیدھے حویلی آئے تھے لیکن وہ سخت پریشان تھے۔ ضمیر علی ان کے ساتھ ہی تھا۔ کسی خیال کے تحت وہ بولے۔ ''بہت بری حالت ہے بیچارے کی۔''

''ہاں صاحب طویل عرصے سے بیمار ہے۔''

''اس کے خاندان میں کوئی نہیں ہے؟''

''پتا نہیں صاحب سنا ہے، چھ سال تو اس نے نوکری ہی نہیں کی پھر دوبارہ صاحب نے بلا لیا۔''

''ہوں۔'' شہزاد صاحب خاموش ہو گئے۔ نوکروں سے مزید کرید مناسب نہیں ہوتی۔ منہ کو آتے ہیں لیکن وہ سخت بے سکون ہو گئے تھے۔ فرزانہ بیگم واپس آ گئیں۔ بچے غائب تھے پھر فرہاد بھی آ گئے اور گھر میں خاصے ہنگامے جاگ گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے شہزاد صاحب بہل گئے تھے۔ راتیں ان کے لیے سخت پریشان کن ہوتی تھیں۔ اس رات وہ تنہا نہ سو سکے اور انہوں نے فرزانہ بیگم سے کہا۔

''میرا خیال ہے، ہم تو آپ کے دل سے نکل گئے ہیں۔''

''کیوں؟'' وہ مسکرائیں۔

''بس دوسروں کی طرح دن میں آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔''

''اوہ..... میں کیا بتاؤں بھابی جان کتنی نثار ہو رہی ہیں۔ رات رات بھر باتیں کرتی نہیں تھکتیں۔ بڑی مشکل سے سونے دیتی ہیں۔''

''ہم تو سو ہی نہیں پاتے۔''

''خیر تو ہے، یہاں آ کر جوانی یاد آ گئی ہے کیا۔ اب ان باتوں کو چھوڑو بچوں کے مستقبل کی فکر کرو۔''

''خدا ان کا مستقبل بہتر کرے۔ یہاں کا ماحول کتنا

اچھا ہے' مجھے تو افسوس ہو رہا ہے میں یہاں سے دور کیوں رہا۔ پہلے ہی مل لیا ہوتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اور کیا سوچا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"لو..... مطلب کی بات تو بھول ہی گئے۔ کس لیے آئے تھے یہاں؟"

"سچی بات تو یہ ہے فرزانہ بیگم کہ اب ہمت نہیں پڑ رہی' ان کے اخلاق کے سامنے چھوٹی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔"

"میں بھابی جان سے بات کروں؟"

"خدا کے لیے نہیں..... ذکر تک مت کرنا۔ میں خود کوئی مناسب صورت نکال کر بات کروں گا۔ اس تذکرے کو چھوڑو' یہاں رات کو آجانا۔"

"ٹھیک ہے۔" فرزانہ بیگم نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا اور پھر اس رات وہ شہزاد صاحب کے ساتھ ہی سوئیں۔ اس صبح وہ نہیں آئی تھی بلکہ ان کا کمرا کسی دوسرے نوکر نے صاف کیا تھا۔ شہزاد صاحب کی حالت اور خراب ہوگئی تھی۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ صرف رانی کی روح تھی اور یہ تصور ان کے لیے بڑا انوکھا تھا۔

تین دن سے بیگم شہزاد، شہزاد صاحب کے ساتھ ہی سو رہی تھیں اور ان دنوں صبح کو وہ دوسرا نوکر صفائی کے لیے آتا رہا لیکن چوتھے دن رات کو بیگم فرہاد کسی کے ہاں موجود تھیں۔ اس لیے فرزانہ بیگم بھی ان کے ساتھ چلی گئیں اور اس رات شہزاد صاحب پھر خوف کا شکار رہے۔ صبح کو آنکھ کھلی تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہ موجود تھی اور اسی خاموشی سے کام میں مصروف تھی۔

شہزاد صاحب کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"تم..... تم۔" وہ شدید اضطراب کے عالم میں بولے تو وہ چونک کر شہزاد صاحب کو دیکھنے لگی۔

"معاف کیجیے گا صاحب۔ کسی آہٹ سے آپ کی آنکھ کھل گئی۔ میں شرمندہ ہوں۔" اس نے کہا، لہجہ بے حد شستہ تھا اور آواز..... وہ اس آواز کو کہاں بھول سکتے تھے۔

وہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہزاد صاحب دیوانگی کے عالم میں اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کریں، کہاں بھاگ جائیں۔ اس کا یہ خاموش احتجاج انہیں پریشان کیے دے رہا تھا۔ اس دن وہ سخت پریشان رہے۔ اب ان کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر ایک فیصلہ کیا' وہ یہ کہ حویلی چھوڑ دی جائے۔ ویسے بھی طویل پروگرام نہیں تھا۔ حالانکہ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ جب انہوں نے اس کا اظہار فرہاد صاحب سے کیا تو وہ حیران رہ گئے۔

"کیا۔ یعنی کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"بس بھائی صاحب کاروبار کا خیال الجھا رہا ہے۔"

"مگر میاں ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن۔"

"خیر ابھی چند روز تو رکو' ابھی تو آنکھوں کی پیاس بھی نہیں بجھی۔"

"اب تو حاضر ہوتا رہوں گا بھائی جان!" بہرحال جو حکم۔" شہزاد صاحب خاموش ہوگئے۔ اس دن بھی اضطراب انہیں بے سکون کرتا رہا۔ دوپہر کے بعد وہ سینی ٹوریم گئے۔ دین محمد کی حالت بدستور خراب تھی۔ شہزاد صاحب نے خصوصی وارڈ میں اس کے لیے انتظام کردیا اور ڈاکٹروں کو خاصی رقم پیش کر کے بہتر علاج کی درخواست کی اور چلے آئے لیکن رانی کی روح نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا..... اس رات بھی فرزانہ بیگم ان کے ہمراہ سوئی تھیں لیکن صبح کو جب آنکھ کھلی تو وہ موجود تھی۔ آج اس نے فرزانہ بیگم کی موجودگی کا بھی احساس نہیں کیا تھا۔

فرزانہ بیگم بھی جاگ گئیں اور انہوں نے اسے دیکھا۔ ان کے ذہن میں رانی نہیں ابھری تھی۔ وہ اس کی صورت ہی بھول گئی تھیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ یہ نوجوان لڑکی چوبیس پچیس سال کے بعد بھی ویسی ہی ہوگی۔ ان کے ذہن میں اس کی کوئی تصویر نہیں تھی لیکن شوہر کی کیفیت پر وہ چونک پڑیں۔

"خیریت تو ہے' یہ آپ اسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

رانی باہر نکل گئی، اس کا کام ختم ہوگیا تھا۔

"اوہ۔" شہزاد صاحب چونک پڑے تھے۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں۔ ہاں۔ وہ..... وہ تم نے اسے دیکھا..... فرزانہ۔"

"کون.....؟"

"وہ لڑکی جو صفائی کر رہی تھی۔"

"ہاں....."

"تمہارے ذہن میں کوئی خیال ابھرا؟"

"کیا؟"

"کیا وہ رانی نہیں تھی؟"

UUNOVELS.COM

''کون رانی؟''

''چوبیس سال قبل، وہ ہماری ملازمہ تھی۔''

''مگر یہ نوجوان لڑکی ہے، ہاں مجھے اس کی صورت یاد آرہی ہے مگر چوبیس سال میں تو سب کچھ بدل جاتا ہے، اس کی ہم شکل ضرور ہے مگر وہ نہیں ہوسکتی مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہوگئے؟''

''ایں۔ نہیں۔ بس سوچ رہا تھا پرانی باتیں یاد آرہی تھیں۔ چھوڑو جانے دو۔'' فرزانہ بیگم نے بھی زیادہ کرید نہیں کی اور بات گئی گزری ہوگئی لیکن شہزاد صاحب کے لیے نہیں۔ وہ بدستور پریشان تھے۔ وہ ہر روز صبح موجود ہوتی اور اسی خاموشی سے واپس چلی جاتی۔ اس رات بھی فرزانہ بیگم شہزاد صاحب کے ساتھ موجود نہیں تھیں۔ شہزاد صاحب جاگ رہے تھے۔ رات کے تقریباً دو بجے تھے۔ وہ بے چین ہوکر اپنے کمرے سے نکل آئے اور پھر یونہی گھومتے ہوئے باہر نکل آئے لیکن اچانک انہوں نے ایک سایہ دیکھا۔ بس ان کا دل دھڑک اٹھا۔ کوئی کوٹھی سے نکل کر نوکروں کے کوارٹرز... کی طرف جارہا تھا۔ شہزاد صاحب چیتے جیسی پھرتی سے اس طرف چل پڑے۔

سایہ ایک بار روشنی میں آیا تو۔ وہ اچھل پڑے۔ یہ شہروز تھا جو چوروں کی طرح جارہا تھا۔ اس کے قدموں میں لغزش تھی۔ شہزاد صاحب حیران رہ گئے تھے۔ شہروز نے یہاں بھی اپنی حرکتیں نہیں چھوڑی تھیں۔ شہزاد صاحب مزید پریشان ہوگئے۔ وہ اس وقت کہاں جارہا ہے؟ شہزاد صاحب اس سے زیادہ دور نہیں تھے۔ شہروز نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز ابھری۔

''کون ہے!'' لیکن شہروز نے جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور دروازہ کھٹکھٹاتا رہا اور چند ساعت بعد اندر سے پیلی روشنی کی ایک کرن باہر آئی۔

روشنی کے پس منظر میں شہزاد صاحب نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی اور وہ دل پکڑ کر رہ گئے تھے۔ یہ رانی تھی، دوسرے لمحے اس کی ہلکی سی چیخ ابھری۔ شہروز اندر داخل ہوگیا تھا۔

شہزاد صاحب بھی دیوانہ وار آگے بڑھے اور دروازے کے قریب پہنچ گئے۔

''تم..... تم اس طرح یہاں کیوں آئے ہو؟'' رانی کی آواز ابھری۔

''میں آج برداشت نہ کرسکا جان من! جب سے یہاں آیا ہوں، تم نے پاگل کر رکھا ہے۔ آج میں..... آج

جواہر پارے

☆ منافقت منہ کی بدبو کی طرح ہوتی ہے، اپنی کا پتا ہی نہیں چلتا صرف دوسروں کی بری لگتی ہے۔

☆ ہاتھ کی لکیریں بھی عجیب ہیں، کمبخت مٹھی میں ہیں لیکن قابو میں نہیں ہیں۔

☆ جتنی بھیڑ بڑھ رہی ہے، لوگ اتنے ہی اکیلے ہوتے جارہے ہیں۔

☆ یا اللہ مغرور کرنے والا مال نہ دے اور مایوس کرنے والی غریبی نہ دے۔

☆ رب وہاں سے دروازے کھولتا ہے جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔

☆ طنز عینک کے مانند ہے جس کے ذریعے اپنے چہرے کے سوا ہر چیز نظر آتی ہے۔

☆ انسان کا بہترین مطالعہ انسان کا مطالعہ ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

لاہور کا حدود اربعہ

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں لاہور کا جغرافیہ حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبہ کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کردیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف لاہور ہی لاہور واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہورہا ہے..... ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ (پطرس)

پٹرول

ایک عورت ماہر حیوانات کے پاس گئی اور بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! میرے کتے نے پٹرول پی لیا ہے اور وہ مسلسل صحن کے چکر کاٹ رہا ہے۔''

ڈاکٹر کہنے لگا۔ ''بی بی! فکر مت کریں، جب پٹرول ختم ہوگا خود بخود رک جائے گا۔''

مرسلہ۔ غلام حسین اختر، سرگودھا

UUNOVELS.COM

میں بہت کچھ سوچ سمجھ کر آیا ہوں۔ آج میں ناکام واپس نہیں جاؤں گا۔"

"ہاں..... میں نے سنا ہے، تم بڑے لوگوں کے یہی کھیل ہوتے ہیں۔ اپنے سے غریب لوگوں کو تم انسان سمجھنے کے قائل نہیں ہوتے لیکن آج یہ کھیل بدل رہا ہے۔ سمجھے؟ تمہیں اپنے ناپاک ارادوں میں کامیابی نہ ہوگی۔"

"کیا کرو گی تم؟"

"مرجاؤں گی، یہ تو ہم لوگوں کا نصیب ہے اور جب یہی نصیب ہے تو پھر اس سے بھاگا کہاں جاسکتا ہے۔ تم یہاں سے جاتے ہو یا میں تمہیں اس جرأت کی سزا دوں، بولو....."

"ٹھیک ہے، تم مجھے سزا دو۔" شہروز نے کہا تو رانی نے قریب رکھی ہوئی لالٹین اٹھالی اور اسے تولنے لگی۔ شہروز ہوشیار ہوگیا۔ وہ چالاکی سے آگے بڑھا اور رانی نے لالٹین اس کے منہ پر دے ماری، چمنی ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی شہروز کی چیخ ابھری۔ مٹی کا تیل اس کے کپڑوں پر گرا اور آگ بھڑک اٹھی۔

"کمینے، کتے۔ تم لوگوں کا انجام۔ بالآخر یہی ہونا تھا۔" وہ بولی۔ شہروز بری طرح اپنے کپڑوں کی آگ بجھا رہا تھا۔ آگ زیادہ بھڑک نہ سکی لیکن وہ کافی جھلس گیا تھا۔ دوسرے لمحے اس نے باہر چھلانگ لگادی۔ شہزاد صاحب راستے سے ہٹ گئے تھے اور شہروز سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ اس نے شہزاد صاحب کو دیکھا نہیں تھا۔ چند ساعت کے بعد رانی باہر نکل آئی۔

"کمینہ، کتا..... مجھے لوٹ کا مال سمجھا تھا۔" اس کی غراہٹ ابھری اور اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہ شہزاد صاحب پر پڑی۔ باہر روشنی تھی، اس نے شہزاد صاحب کو پہچان لیا اور پھر اس کی سخت آواز ابھری۔

"قصور میرا نہیں تھا۔ میں نے صرف اپنی عزت بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔"

"رانی!" شہزاد صاحب کے منہ سے آواز نکلی۔

"میرا نام نوری ہے جناب اور میں تیار ہوں۔ آپ لوگ جو سلوک چاہیں میرے ساتھ کریں لیکن ہماری عزت بھی تو ہے آخر؟"

"رانی....." شہزاد صاحب آگے بڑھے۔

"براہ کرم آپ چلے جایئے یہاں سے ورنہ میں خودکشی کرلوں گی اور میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔"

"لیکن تم، لیکن تم۔" شہزاد صاحب کچھ اور آگے بڑھے تو اس نے جلدی سے اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا۔

شہزاد صاحب ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ پھر وہ واپس پلٹ آئے لیکن ساری رات بیٹھے بیٹھے گزری تھی۔ انہوں نے شہروز کی خبر بھی نہیں لی تھی۔ نجانے اس کا کیا حشر ہوا۔

لیکن شہروز بے حد چالاک تھا۔ صبح کو وہ سامنے آیا..... اس کا چہرہ ہاتھ وغیرہ جل گئے تھے۔ اس نے اپنا بستر بھی جلالیا اور توجیہہ پیش کی کہ رات کو سگریٹ سے آگ لگ گئی تھی۔ تمام لوگ پریشان ہوگئے تھے۔ فرہاد صاحب نے ڈاکٹر جمع کرلیے اور سب شہروز کے اردگرد جمع ہوگئے لیکن اصلیت سے کوئی واقف نہیں تھا۔

دوسری طرف شہزاد صاحب کی حالت خراب تھی۔ دوپہر کو وہ سخت پریشان ہوکر دین محمد کی طرف چل پڑے۔ دین محمد ایک پرائیویٹ وارڈ میں داخل تھا اور آج اس کی حالت کافی بہتر نظر آرہی تھی لیکن اس کے نزدیک رانی کو دیکھ کر شہزاد صاحب دنگ رہ گئے۔ رانی ایک خوبصورت لباس میں تھی۔ اس کے پاس ہی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دین محمد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

"آیئے سرکار! یوں لگتا ہے، قدرت نے مجھے ایک موقع عطا کیا ہے۔ سچ ہے، قدرت کے کھیل قدرت ہی جانے۔ اسے پہچانتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیسی طبیعت ہے، دین محمد۔"

"آپ کی مہربانی سے ٹھیک ہوں لیکن میں اس بدنصیب کے بارے میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

"یہ..... یہ..... رانی..... ہے۔" شہزاد صاحب نے چوروں کی طرح نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"رانی نہیں ہے، لیکن اسے بھی رانی بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اچھا ہوا سرکار آپ آگئے ورنہ..... ورنہ....."

"یہ..... یہ رانی نہیں ہے۔" شہزاد صاحب نے تعجب سے کہا۔

"نہیں۔ یہ اس کی بیٹی نوری ہے سرکار بلکہ یہ آپ کی بیٹی نوری ہے سمجھے آپ۔" دین محمد کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ نوری بری طرح چونک پڑی تھی اور شہزاد صاحب کا سر گھوم گیا تھا۔ بمشکل وہ گرتے گرتے بچے۔

"کون ہے یہ..... کون ہے؟" وہ بمشکل تمام بولے۔

"ہاں..... سرکار! وہ حاملہ ہوگئی تھی اور جب اس کا پیٹ بڑھا اور سب کو معلوم ہونا شروع ہوا تو ہمیں حویلی سے نکال دیا گیا۔ اسے بدکار قرار دیا گیا تھا۔ پھر وہ ایک بیٹی کو جنم دے کر مرگئی اور مرتے وقت اس نے مجھے بتایا کہ آپ

اس کے باپ ہیں' سرکار! نوری کے باپ آپ ہیں مگر میں آپ کو کہاں تلاش کرتا، رانی مرگئی اور میں اس کی پرورش کرتا رہا۔ چھ سال کے بعد بڑے سرکار نے مجھے پھر بلوالیا۔ میں نوکری کر کے نوری کو پروان چڑھاتا رہا اور پھر اسے اسکول میں داخل کرادیا۔ یہ پلتی رہی، پڑھتی رہی، مجھے سخت پریشانیاں تھیں لیکن میں نے ہمت نہ ہاری پھر میری صحت جواب دے گئی اور مجھے سل کی بیماری ہوگئی۔ اب مجبوری تھی۔ میں نے اسے بڑے سرکار کے ہاں ملازم کرادیا۔ بڑے سرکار نے کرم کیا اور اسے معمولی سے کام سونپ دیے اور پڑھنے کی اجازت دی..... لیکن سرکار..... سرکار، اب وہ کہانی ایک بار پھر دہرائی جارہی ہے۔ اب میں کیا کروں سرکار۔ اب اس کی حفاظت کون کرے گا؟ کیا اسے بھی ایک بیٹی کو جنم دے کر مرجانا ہوگا؟"

شہزاد صاحب کے پورے بدن کا خون خشک ہوگیا تھا۔ ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔ تب وہ اٹھے اور پاگلوں کی طرح نوری کو سینے سے لگالیا۔

"نوری..... میری بچی..... میری بچی، میری لخت جگر، میں تیرا محافظ ہوں' میں تیرا باپ ہوں۔ نوری کس کی مجال ہے کہ کوئی میری زندگی میں تجھے پریشان کرسکے۔"

"خدا کا احسان ہے، خدا کا شکر ہے۔" دین محمد کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے تھے۔

"میں اسے لیے جارہا ہوں دین محمد، اب تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔"

"جب اس کے باپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا ہے تو میری فکر کیا معنی رکھتی ہے۔" دین محمد نے روتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

نوری کو دیکھ کر شہروز کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ وہ شہزاد صاحب کے ساتھ آئی تھی اور شہزاد صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سے سنگینی طاری تھی۔ "ارے نوری، آج دن بھر کہاں غائب رہیں۔ سارے کام پڑے رہ گئے۔" بیگم فرہاد نے کہا۔ تمام لوگ لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کہاں سے آرہے ہو شہزاد میاں اور یہ نوری کہاں چلی گئی تھی؟" فرہاد صاحب بولے، شہزاد صاحب خاموشی سے بیٹھ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک تھی۔

"بڑی عجیب کہانی سنانے آیا ہوں بھائی صاحب، نوری میری بیٹی ہے۔ ہاں یہ میری اور رانی کی بیٹی ہے۔ میری جوانی کی ایک غلطی، جس نے ایک معصوم لڑکی رانی کو داغدار کردیا تھا اور جب اسے میری مدد کی ضرورت تھی تو میری شادی ہوگئی اور پھر میں یہاں سے چلا گیا۔ پھر بھائی جان! رانی مرگئی۔ اس نے میری بچی کو جنم دیا تھا لیکن آج میری بچی مجھے مل گئی..... اور بیگم..... نوشین اور شہروز، سنو..... غور سے سنو۔ میں قلاش ہوچکا ہوں۔ میرے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اس طرح سے اب میں تمہارے لیے ایک بے مصرف انسان ہوں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے بھول جاؤ۔ میں نوری کے ساتھ ایک نئے مستقبل کی تلاش میں مصروف ہونا چاہتا ہوں۔ ہر وہ شخص مجھے چھوڑ دے جو میری نوری کی عزت نہ کرسکے' وہ مجھے بھول جائے۔"

"ڈیڈی، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ نے مجھے بہن دی ہے۔ یہ میری بہن ہے۔" سب سے پہلے نوشین نے اٹھ کر نوری کو گلے لگایا تھا۔

"تم قابل فخر ہو شہزاد کہ تم نے ایک باپ کی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے، بھول فرشتوں سے نہیں ہوتی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ میں تمہارے اس جرأت مندانہ اعتراف کو سراہتا ہوں۔ نوری کسی کی محتاج نہیں رہے گی۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنے خون کی مدد کی۔ میں نوری کو پچاس لاکھ روپے دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ رقم میری اپنی ہوگی۔ اس کے علاوہ شہزاد میں نے جائداد میں سے تمہارا حصہ نکال کر اس کا تخمینہ ایک کروڑ روپے لگایا ہے اور اس کے تمام کاغذات تیار کردیے ہیں۔ تم چاہو تو یہ جائداد اپنے تصرف میں لے لو، یا پھر اس کی رقم مجھ سے لے لو۔"

شہروز اور فرزانہ بیگم منہ کھول کر رہ گئے تھے۔ پھر، فرزانہ بیگم اٹھیں اور نوری کو گلے لگاتے ہوئے بولیں۔

"میری بچی تو بڑی ہی بھاگوان ہے۔ اس کے آتے ہی ہمارے سارے دلدر دور ہوگئے اور تم کیسی باتیں کر رہے ہو.. شہزاد ہم اپنے خون سے منحرف ہوں گے۔" اور نوری کو بھی محسوس ہوا جیسے اس کے چاروں طرف پھول بکھر گئے ہوں۔

اسے اتنے سارے اپنے مل گئے تھے۔ سب خوش تھے۔ بس شہروز کی حالت خراب نظر آرہی تھی۔ اس رات نوری نے چپکے سے اس سے کہا۔

"میں نے آپ کو معاف کردیا، بھیا اور اب میں آپ کو ٹھیک..... کردوں گی۔" شہروز کی گردن شرم سے جھک گئی تھی۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

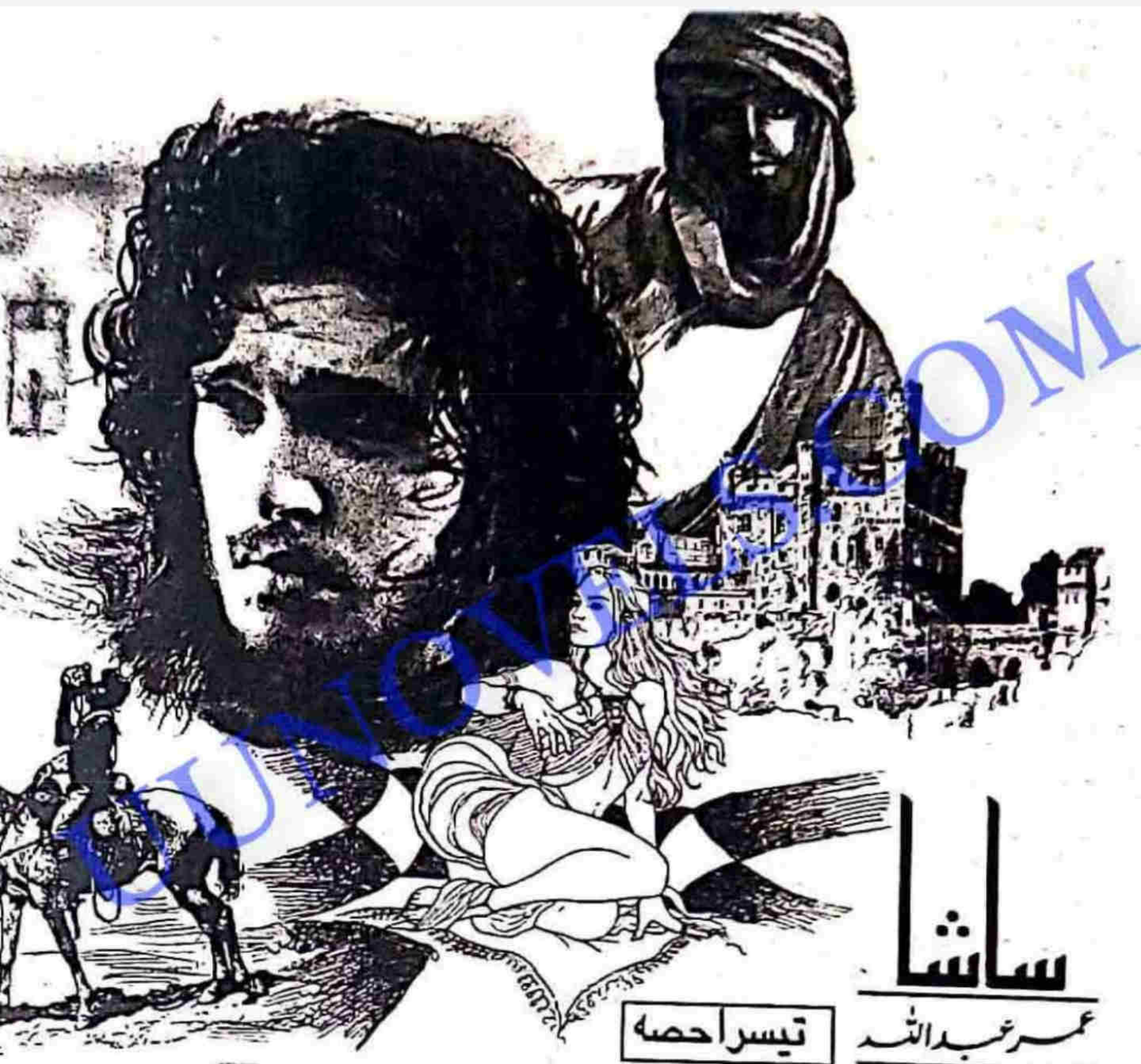

ساشا

عمر عبداللہ

تیسرا حصہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور آنکھوں میں سنہرے خواب تھے، جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

UUNOVELS.COM

ثریا نے فجر کے فرائض کی ادائیگی کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو کئی آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ یہ آنسو اس آبلہ پا قوم کے شاید ہر فرد کا نصیب بن چکے تھے۔ وطن سے دور اس خانماں برباد قافلے کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جس کا دل قوم کی اجتماعی بربادی کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی بربادی کے زخموں سے داغ دار نہ ہو۔ وہ سب مصیبت زدہ تھے اور اللہ کی زمین پر اپنے لیے کوئی جائے امان تلاش کرتے ہوئے ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔ مصیبت اور غم و آلام کے اس مشکل دور سے گزرتے ان افراد کے لیے فقط اللہ کا ہی آسرا رہ گیا تھا اور ان کی زبانیں ہر وقت رب العزت سے رحم کی درخواست کرتی رہتی تھیں۔ ثریا نے بھی بڑی رقت سے خود سے پہلے آخرت کی منازل طے کر لینے والے اپنے پیاروں کی مغفرت کی دعا کی اور ایک بار پھر اللہ کے حضور رحم کی درخواست دہراتے ہوئے بولی۔

"اے مالک ذوالجلال! اے قادرِ مطلق! ہم جو تیرے محبوب نبیؐ کی امت ہیں، آج اپنی بداعمالیوں کے نتیجے میں ذلیل و خوار ہو کر خس و خاشاک کی طرح بھٹکتے پھر رہے ہیں اور اس روئے زمین پر اپنے لیے کوئی جائے پناہ نہیں پاتے۔ ہم میں سے کچھ نے اپنے اسلاف کی سنت پر عمل کر کے اپنی قوم کو اس بربادی سے بچانے کی کوشش بھی کی لیکن صاحبانِ اقتدار کی عاقبت نااندیشی نے ان مٹھی بھر جانبازوں کی ہر کوشش اور قربانی کو برباد کر دیا۔ اے انسانوں کی جان و عزت کے مالک! ہم بہت خطا کار اور گناہ گار ہیں لیکن ہمیں تیرے محبوب کی امت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ پیغمبرِ آخر الزماں جو اپنی امت کی بخشش اور جہنم سے نجات کے لیے راتوں کو جاگ جاگ کر تیرے حضور سجدے کیا کرتے تھے، آج یقیناً امتِ مسلمہ کی اس حالتِ زار پر غمگین اور رنجور ہوں گے۔

"اے الرحم الراحمین! اپنے محبوب کے امتیوں کی حالتِ زار پر رحم فرما اور اپنی اس وسیع زمین پر ہمیں کوئی ایسا چھوٹا سا گوشۂ عافیت عنایت فرما دے کہ جہاں ہم اپنی زندگی کی بچی کھچی سانسیں عزت اور سکون سے گزار سکیں۔ اے ہماری جانوں کے مالک! اگر تو ہمیں اس قابل نہیں جانتا کہ اپنی اس زمین پر ہمیں پناہ دے سکے تو ہم پر صرف اتنا کرم کر دے کہ ہمارے لیے آسمانوں سے عزت کی موت اتار دے اور اس سے قبل کہ تاتاریوں کے ہاتھ ہمارے سر کی چادروں تک پہنچیں، ہمیں قبر کے اندھیروں میں پناہ دے دے۔" دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے رب کے حضور درخواست گزارتی ثریا کو ہوش نہیں تھا کہ اس کی سسکیاں اتنی بلند ہو چکی ہیں کہ اسی خیمے کے ایک گوشے میں سوئی ہوئی ہستی کی نیند میں مخل ہو رہی ہیں۔ ثریا ہی کے ایک سادہ سے لباس میں ملبوس وہ لڑکی نیند سے جاگی تو پہلے تو اس کا ذہن فوری طور پر ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے سے قاصر رہا لیکن پھر وہ ثریا کی مسلسل سسکیوں کے باعث اس کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ اس وقت درختوں کے جھنڈ میں ملنے والے داؤد بن معیز کی بہن کے خیمے میں تھی اور رات بھر کی پُرسکون نیند کے بعد صبح دم جاگی تھی تو ثریا کی المناک سسکیوں نے اس کا اپنا دل رقیق کر دیا تھا۔ اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھنے کے بعد وہ کچھ دیر تذبذب میں بیٹھی رہی کہ آیا ثریا کی دعا کے درمیان دخل دے یا نہیں لیکن پھر جب ثریا کی گریہ وزاری اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے برابر میں جا بیٹھی اور اپنا ہاتھ نرمی سے اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کے لمس نے ثریا کو بے خودی کی کیفیت سے نکالا اور وہ رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بس کر دو میری بہن! تمہارے یہ آنسو میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔" اس نے رقت بھری آواز میں ثریا کو نصیحت کی۔

"تم میری گریہ وزاری پر خود کو رنجور نہ کرو پیاری لڑکی! یہ رونا تو اب میری قوم کی ہر بیٹی کا مقدر ہو چکا ہے۔" ثریا نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے آنچل کے پلو سے آنسوؤں بھرا چہرہ صاف کیا اور مسکرانے کی کوشش کی لیکن غموں سے چُور دل کی مسکراہٹ ہونٹوں کے گوشوں میں ہی سمٹ کر رہ گئی۔

"اگر تمہاری قوم کی ہر بیٹی اسی طرح گریہ وزاری کرتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ کائنات کا مالک بہت زیادہ عرصے تک تمہیں اس حال میں تنہا نہیں چھوڑے گا اور بہت جلد آسمانوں سے تمہارے لیے مدد آئے گی۔" اس نے ثریا کا ہاتھ تھام کر اس کی دلجوئی کی کوشش کی۔

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے بہن..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس قوم کے صاحبانِ اقتدار اور علماء اپنے فرائض سے غافل ہو کر تن آسانی اور عیاشی کو اپنا مسلک بنا لیں، اس قوم کی بیٹیوں اور بے کسوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔" ثریا اپنے پیچھے اتنی بربادیاں دیکھ کر آئی تھی کہ کسی کے محض چند الفاظ اس کو یہ یقین نہیں دلا سکتے تھے کہ ان پر سے یہ شبِ غم ٹل بھی سکتی ہے۔

UUNOVELS.COM

"خالقِ کائنات کے رحم سے مایوس ہوجانا بھی تو مناسب عمل نہیں ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں دلیل دی تو ثریا کانپ گئی اور شرمندگی سے بولی۔

"اللہ مجھے اس گستاخی سے محفوظ رکھے۔ یہ اس کا رحم ہی ہے کہ ہم ابھی تک اس زمین پر چل پھر رہے ہیں اور کسی نہ کسی طور ہمیں زندگی کے اسباب بھی مہیا ہو رہے ہیں۔"

"ثریا بہن! اخی کہتے ہیں کہ آپ اور آپ کی مہمان خاتون جلد از جلد سفر کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہمارے قافلے کا سورج بلند ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے کوچ کر جانا ضروری ہے تاکہ ہم رات پڑنے سے قبل زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر سکیں۔" ثریا کے الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ خیمے کے دروازے کے باہر سے کسی نے پکار کر پیغام پہنچایا۔

"اخی سے کہو لطیف کہ ہمیں بس تھوڑی ہی سی مہلت درکار ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد ہم اہلِ قافلہ کے ساتھ کوچ کے لیے تیار ہوں گے۔" ثریا نے پکارنے والے کی آواز پہچان کر اسے جواب دیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"چلو سارہ! جلد از جلد ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتا کر لو۔ آج ہمیں بڑا طویل اور دشوار گزار سفر درپیش ہے اور اس بات کا امکان کم ہے کہ راستے میں کہیں ہمیں آرام کرنے یا کھانے پینے کے لیے ٹھہرنے کا موقع مل سکے گا۔" داؤد بن معیز کا پیغام پاتے ہی ثریا مستعد نظر آنے لگی۔ اس نے ضروری امور کی انجام دہی میں سارہ کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ اسے آرام کے لیے مہیا کیا گیا بستر بھی تہہ کر کے باندھا اور اس سامان کے ساتھ رکھ دیا جو وہ رات ہی سفر کے لیے باندھ کر تیار کر چکی تھی۔ ان امور کی انجام دہی کے بعد انہوں نے ناشتا بھی تیزی سے ختم کر لیا۔ کل کا بچا ہوا بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت اور خشک نان حلق سے اتارنے کے بعد وہ سفر کے لیے پوری طرح تیار تھیں۔ ثریا نے اپنا چہرہ نقاب سے چھپا لیا تھا جبکہ سارہ نے اپنی کل والی سفید چادر کو اس طرح گھما لیا تھا کہ اس کی صرف آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

خیمہ اکھاڑ کر سامان ایک اونٹ پر بار کیا جانے لگا تو ثریا عملاً یہ کام انجام دینے والوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ دیکھنے میں وہ نرم و نازک سی لڑکی تھی لیکن اس کی کمر کے ساتھ لٹکی چھوٹی تلوار اور اس کے سرگرم طرزِ عمل سے ظاہر تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ مردوں کی طرح حالات سے مقابلہ کرنے کی بھی اہلیت رکھتی ہے۔ ثریا کی طرح دو چار اور خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ کوچ کی تیاریوں میں سرگرم دکھائی دیں۔ سارہ کے پاس اپنا ذاتی اسباب نہ ہونے کے برابر تھا اور ثریا نے اسے کسی کام کے لیے زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے اس وقت وہ فارغ کھڑی اہلِ قافلہ کو کوچ کی تیاری کرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ مشاہدے سے یہ بات اس کے علم میں آئی کہ قافلے میں جوان مردوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اہلِ قافلہ کا بڑا حصہ خواتین، بچوں اور بوڑھوں پر مشتمل ہے۔ شاید اس صورتِ حال کے سبب ہی جوان عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ بڑھ چڑھ کر کام کر رہی تھیں۔

"سارہ بہن! یہ آپ کا گھوڑا میں نے تیار کر دیا ہے۔ اس کے توبڑے میں جو کی کافی مقدار بھی موجود ہے۔ انشاء اللہ آپ کو دورانِ سفر کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" وہ ایک جگہ کھڑی اہلِ قافلہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ لطیف نامی نوجوان اس کے گھوڑے کی باگ تھامے اس کے پاس لے آیا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے کل داؤد کے گھوڑے پر لدی ہوئی بھیڑ دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا اور پھر داؤد کے گھوڑے کو نہلانے کی ذمے داری بھی بخوشی سنبھال لی تھی۔ لطیف نامی اس نوجوان کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی مسیں بھی ابھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں اور چہرے پر ابھی تک جاتے بچپن کی معصومیت برقرار تھی۔

"تمہارا بہت شکریہ لطیف! لگتا ہے تم نے میرے گھوڑے کی بہت خدمت کی ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ ایک ہی رات میں تم سے خاصا مانوس ہو گیا ہے۔" اس نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لطیف کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گیا اور شرماتے ہوئے بولا۔

"مجھے گھوڑے بہت پسند ہیں اس لیے میں ان کی خدمت شوق سے کرتا ہوں۔ آپ کے اس شاندار گھوڑے کی خدمت کرنے میں تو مجھے خاص طور پر بہت مزہ آیا۔ یقیناً اس پر سفر کرنا بھی ایک خوشگوار تجربہ ہوتا ہوگا۔"

"تم چاہو تو میرے گھوڑے پر سفر کر سکتے ہو۔" لطیف کی گھوڑے میں دلچسپی دیکھ کر اس نے کھلے دل سے اسے پیشکش کی۔

"پیشکش کا شکریہ سارہ بہن! میرے تعریف کرنے کا یہ مقصد نہیں تھا۔" لطیف اس کی پیشکش پر جھینپ گیا اور اس حالت میں اس کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔

"لطیف! ادھر آؤ۔ ذرا یہ رسی باندھنے میں میری مدد کرو۔" ایک اونٹ کے قریب کھڑے داؤد نے اسے آواز لگائی تو سارہ کو اس سے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور وہ

فوراً ہی داؤد کی جانب چلا گیا۔ کچھ دیر بعد قافلہ روانگی کے لیے مکمل طور پر تیار تھا۔ قافلے کو کوچ کا حکم ملا تو اپنے گھوڑے پر سوار سارہ نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ طویل مسافت سے تھک جانے والا گھوڑا رات بھر کے آرام، اچھی خوراک اور لطیف کی خدمت گزاری کے نتیجے میں بالکل تازہ دم ہو چکا تھا اور صبا رفتار بنا ہوا تھا۔ جلد ہی سارہ نے آگے جاتے داؤد کو جا لیا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اپنے قافلے میں پناہ دینا منظور کر لیا۔'' وہ اس کے برابر گھوڑا دوڑاتی ہوئی اس سے ممنون لہجے میں بولی۔

''اب میں دعا گو ہوں کہ میرا یہ فیصلہ غلط ثابت نہ ہو۔''

''مطلب آپ کے دل سے ابھی تک میرے تاتاری جاسوسہ ہونے کا شک نہیں نکلا ہے۔'' داؤد کے بے ساختہ جواب پر اس نے ناراضی سے کہا۔

''اصل میں، میں ابھی تک یقین نہیں کر سکا ہوں کہ سیلِ رواں کی طرح زمین پر پھیلتے تاتاری ابھی تک صرف چپٹی ناکوں اور چندی آنکھوں والی عورتوں پر اکتفا کیے ہوئے ہوں گے اور تیکھے نقوش اور ریشم جیسے پیکر رکھنے والی حسینائیں اب تک ان کی دسترس سے دور ہوں گی۔'' وہ سامنے کے رخ دیکھتا اس سے ایک قدم آگے نکل گیا تھا اس لیے وہ اس کی بے حد سنجیدہ آواز تو سن سکتی تھی لیکن ہونٹوں پر کھیلتی شریر مسکراہٹ اس کی نظروں سے اوجھل تھی۔

''اگر ایسی بے یقینی ہے تو آپ راستے میں پڑنے والی کسی بھی پہلی بستی میں مجھے اتار کر خود کو الجھن سے آزاد کر سکتے ہیں۔'' اس نے خفا اور رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''افسوس کہ ہم بستیوں سے بچ کر نکلیں گے اور اپنے سفر کے اہم مرحلے میں داخل ہونے سے قبل اپنے کچھ ساتھی راستے کی آخری بستی کے قریب اتر جائیں گے تاکہ وہ ہمارے لیے خوراک کا کچھ ذخیرہ لے کر آ سکیں۔''

''تو آپ مجھے اس آخری بستی میں ہی چھوڑ دیجیے گا۔ ہو سکتا ہے اب تک میری حفاظت کرنے والی ذات نے وہیں میرے لیے کوئی بھلائی رکھی ہو۔'' اس کے لہجے کی خفگی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔

''اس آخری بستی کے لوگ کچھ ایسے مزاج کے ہیں کہ میں کسی چپٹی ناک اور چندی آنکھوں والی منگول عورت کو بھی ان کے درمیان چھوڑ کر جاتے ہوئے خطرہ محسوس کروں گا۔ آپ جیسی حسین خاتون کو تو وہاں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس بار داؤد اپنے لہجے کی سنجیدگی برقرار نہیں رکھ سکا اور اس میں در آنے والی شوخی کو محسوس کر کے سارہ کچھ اور بھی خفا ہو گئی اور تیکھے لہجے میں بولی۔

''خود آگہی کو خود ستائی سمجھ کر کسی خاتون کو طنز کا نشانہ بنانا اخلاقیات کے منافی ہے۔'' وہ سمجھ گئی تھی کہ پہلی بار خود کو تاتاری جاسوسہ قرار دیے جانے پر اس نے جو وضاحت دی تھی، داؤد اسے اس حوالے سے چھیڑ رہا ہے۔

''میں اپنی اس گستاخی پر معافی چاہتا ہوں۔'' داؤد دھیرے سے ہنسا اور پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے افسوس ہے کہ ایک تھکا دینے والی طویل مسافت کے بعد آپ کو بہت زیادہ آرام نہیں مل سکا اور ایک نئے سفر پر نکلنا پڑا۔''

''خاص انداز کی پرورش نے مجھے لڑکی ہونے کے باوجود خاصا سخت جان بنا دیا ہے اس لیے آپ کو میری بابت زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں آپ کو یقین دہانی کرواتی ہوں کہ سفر کے کسی بھی مرحلے پر میری ذات آپ کے لیے مسئلہ نہیں بنے گی۔'' اس نے داؤد کو یقین دہانی کروائی اور گھوڑے کی رفتار ذرا سست کر کے عقب میں آتی ثریا سے جا ملی۔

☆☆☆

سیاہ لبادے والی کے بے ہوش ہونے پر معزز خواتین والے حصے میں ذرا سی افراتفری مچ گئی تھی۔ اسے سنبھالنے والیوں کے علاوہ آگے پیچھے کی دیگر خواتین بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں اور ان کی آپس میں جاری چہ میگوئیاں بھنبھناہٹ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ کچھ دیر قبل دیکھے جانے والے ہولناک تماشے سے اس نئے تماشے کی طرف توجہ مبذول کر لینے میں انہیں چند ثانیوں سے زیادہ کا وقت نہیں لگا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ توجہ کا مرکز بدل لینے کے بعد تماش گاہ میں کیسی مہیب تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔

لوئیس کی ہڈیوں کو توڑ کر فارغ ہو چکے ہاتھیوں کا جوش و خروش اور غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ جھومتے، غضب سے چنگھاڑتے اور جوش و تکلیف سے باؤلے ہوتے اپنی جگہ سے حرکت میں آئے اور پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے بے حد قوت سے بیک وقت جنگلے کے دروازے سے جا ٹکرائے۔ ان کی دیوانگی کو پہنچے جوش کی بے پناہ قوت تھی یا دروازہ بند کرنے والوں سے کوئی غفلت ہوئی تھی کہ لوہے کا مضبوط جالی دار دروازہ پہلی ہی ٹکر میں چوپٹ کھل گیا۔ دونوں ہاتھی دندناتے ہوئے باہر نکلے اور تماش گاہ لوگوں کی ہراساں چیخوں سے گونج اٹھی۔

UUNOVELS.COM

ساشا نے بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے یہ منظر دیکھا اور بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ واحد راستے والی اس تماشا گاہ میں یہ بپھرے ہوئے ہاتھی کتنی بڑی تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ ہاتھیوں کے رکھوالوں نے بھی یقینی طور پر اس خطرے کو سمجھ لیا تھا اور لمحہ بھر ششدر رہنے کے بعد وہ حرکت میں آ گئے تھے۔ امیر کے سپاہی بھی ان کی مدد کے لیے چوکس ہو گئے تھے۔ ان میں سے چند تلواریں اور بھالے سونت کر ہاتھیوں کی طرف بھاگے۔ عام حالات میں شاید ان کے لیے ان قیمتی جانوروں پر ہتھیاروں کا استعمال آسان نہ ہوتا لیکن وہ دیکھ چکے تھے کہ ہاتھیوں کا رخ معزز خواتین والے حصے کی طرف ہے اس لیے انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ رکھوالے بھی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ ایک رکھوالے کے ہاتھ میں پتا نہیں کس مقصد کے لیے ایک موٹی رسّی موجود تھی۔ اس نے اس رسی کا پھندا بنایا اور گھما کر ایک بھاگتے ہوئے ہاتھی کی طرف پھینکا۔ اس کی مہارت کمال کی تھی۔ پھندا اڑتا ہوا گیا اور ہاتھی کے سر سے گزر کر اس کے بڑے بڑے کانوں کے پیچھے موٹی گردن میں پھنس گیا لیکن اگلا لمحہ خود رکھوالے کے لیے تباہ کن تھا۔ اس کے ساتھی بروقت اس کا ساتھ نہیں دے سکے تھے اور خود اس کے لیے تنہا اس طاقتور جانور کو قابو کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے گرا اور اپنے ہاتھوں میں لپٹی رسی کو کھولنے کی مہلت پائے بغیر ہاتھی کے پیچھے گھسٹتا چلا گیا۔ اس کی درد بھری چیخیں ہجوم کی خوف زدہ چیخوں میں مدغم ہو گئیں۔

وہ ہاتھی جسے سپاہیوں نے گھیر لیا تھا، ہتھیاروں کے استعمال کے باوجود ان کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک سپاہی کو سونڈ میں جکڑ کر دور پھینکا، دوسرے کو سر سے ٹکر ماری اور تیسرے کو اپنے بھاری پیر تلے روند ڈالا لیکن سپاہیوں نے ہمت نہ ہاری۔ کسی کی تلوار نے ہاتھی کی سونڈ کاٹی، کسی کا تیر اس کی آنکھ میں اترا اور کچھ کے بھالے اس کی موٹی کھال سے گزر کر ایسے گھاؤ لگانے میں کامیاب ہو گئے کہ اس کی بے پناہ قوت جواب دے گئی اور وہ دردناک آواز میں چنگھاڑتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ جن لمحات میں اس ہاتھی کو زیر کیا جا رہا تھا، اپنے رکھوالے کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہاتھی خواتین والے حصے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ چکا تھا، بے ہوش لڑکی کو سہارا دینے والی خواتین سمیت ساری خواتین بلند آہنگ چیخیں مارتی اِدھر اُدھر تتر بتر ہونے لگیں۔ بے ہوش لڑکی اپنی جگہ بے یار و مددگار پڑی رہ گئی۔

اس صورتِ حال نے ساشا کے پُرجوش خون میں ابال سا پیدا کیا۔ خطروں سے کھلونوں کی طرح کھیلنے کی عادی فطرت پوری شدت کے ساتھ ابھری اور اعضا نے خودکار انداز میں حرکت کی۔ اگلے ہی لمحے اس کا ایک ہاتھ اپنے پہلو میں موجود سلیمان کی نیام سے تلوار کھینچ چکا تھا اور جسم نے یوں حرکت کی تھی کہ آگے موجود لوگوں کو لگا کوئی بڑا سا پرندہ ان کے سر پر سے اڑتا ہوا گزرا ہے۔ چھلانگ لگانے کے بعد وہ ٹھہرا نہیں بلکہ کسی گیند کی طرح دوبارہ اچھلا اور ایک بدحواس سپاہی کے ہاتھ سے اس کا نیزہ جھپٹتا ہوا آگے نکلتا چلا گیا۔ افراتفری اور ہراس کے باوجود اس کے برق کی طرح کوندتے وجود نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اپنے مصاحبین کے ساتھ مضطرب بیٹھے امیر ارغل نے بھی اسے دیکھا۔ وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھتے ہاتھی کے پیچھے لپکا اور حالتِ حرکت میں ہی اپنے تلوار والے ہاتھ کو جنبش دی۔ وہ موٹا رسّا جو رکھوالے کو بپھرے ہوئے ہاتھی کے ساتھ گھسیٹتا ہوا لے جا رہا تھا درمیان سے کٹ گیا اور رکھوالے کی جان چھوٹی۔ اصل میں اس بے چارے نے رسے کا ایک سرا اپنی کلائی کے ساتھ گرہ دے کر باندھ لیا تھا اس لیے چاہتے ہوئے بھی خود کو چھڑا نہیں پا رہا تھا۔

رکھوالے کو نجات دلا کر ساشا نے برق رفتاری سے مزید سیڑھیاں طے کیں اور وہاں دہشت پھیلا دینے والے ہاتھی سے کئی قدم آگے نکلتا چلا گیا۔ آگے نکلنے کے بعد وہ کسی چیتے کی سی پھرتی سے پلٹا اور حلق سے ایک وحشت ناک آواز نکالتے ہوئے بپھرے ہوئے ہاتھی پر حملہ آور ہوا۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے برق سی کوندی اور اگلے ہی لمحے منظر یہ تھا کہ ساشا کی تلوار ہاتھی کی آنکھ اور نیزہ گردن میں اترا ہوا تھا۔ زخمی ہاتھی تکلیف کی شدت سے چنگھاڑ رہا تھا لیکن اس کی قوتِ حرکت ختم ہو چکی تھی۔ اس موقع پر ادھر ادھر بکھرے سپاہیوں نے بھی حرکت کی اور ساشا کے کام کو مکمل کر ڈالا۔ ان ہی پُرجوش سپاہیوں میں سے دو نے ساشا کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور نعرے لگانے لگے۔ نعرے لگاتے ہوئے وہ خواتین والے حصے سے نیچے اتر آئے اور اس حصے کی طرف بڑھے جہاں امیر ارغل اپنے مصاحب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ عام افراد کے ہجوم میں سے بھی کئی لوگ اس طرف امڈ آئے اور اس نوجوان کے لیے تعریفی نعرے لگانے لگے جس نے معزز خواتین کی زندگیاں بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہجوم کا جوش و خروش دیکھتے ہوئے امیر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ بلند کر کے لوگوں کے نعروں کا جواب دینے لگا۔ ذرا دیر بعد اس نے اشارہ کیا

UUNOVELS.COM

تو ہجوم نے خاموشی اختیار کر لی اور ساشا کو کندھوں پر سے اتار دیا۔ نیچے اترنے کے بعد ساشا امیر کی دعوت پر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ امیر نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا اور اپنے گلے میں پڑی قیمتی موتیوں کی مالا اتار کر اسے تھما دی۔

''میں امیر محترم کا شکر گزار ہوں لیکن میں نے انعام کے لالچ میں نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھتے ہوئے یہ خدمت انجام دی ہے۔'' اس نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

''ہم فرض شناس لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور تم خود کو اس انعام کا حق دار ثابت کر چکے ہو۔'' امیر نے مسکرا کر اسے جواب دیا اور پھر اردگرد دیکھتے ہوئے بولنے لگا۔

''اس نوجوان نے مختصر عرصے میں دوسری بار ہمارے لیے اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس کی بہادری اور جرأت مندی ہمارا دل جیت چکی ہے اور ہم آپ سب کے سامنے اسے یہ پیشکش کرتے ہیں کہ اگر یہ ہماری سپاہ میں شامل ہونا چاہے تو ایک معقول عہدہ اور خطیر مشاہرہ اس کا منتظر ہوگا۔''

''میں امیر کی اس پیشکش کو رد کرنا کفرانِ نعمت سمجھوں گا۔'' اس کے لیے تو یہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے والی بات تھی اس لیے فوراً ہی اپنی رضامندی دے دی۔ اس کے اس جواب پر ہجوم ایک بار پھر خوشی سے نعرے لگانے لگا۔ ساشا نے امیر کے قریب اس بلند مقام پر کھڑے کھڑے اردگرد کا جائزہ لیا۔ انتظامی فرائض انجام دینے والے افراد مُردہ ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ حبشی نگراں اور لوئیس کی لاشیں اٹھانے کے انتظامات کر رہے تھے۔ معزز خواتین کو تماشا گاہ سے لے جانے کے لیے خوبصورت بگھیاں پہنچ چکی تھیں اور ایک بڑا ہجوم اس کے سامنے کھڑا اس کے لیے پُرجوش نعرے لگا رہا تھا..... اپنے لوگوں کی بے وفائی اور غداری کے نتیجے میں ملنے والی دربدری اور خواری چند دن سے زیادہ اس کے ساتھ چمٹی نہیں رہ سکی تھی اور آج ایک بار پھر وہ ایک باعزت مقام پر تھا۔ اپنے مقدر کے بلند ستارے کو دیکھتے ہوئے اس نے ان دشمنوں کو یاد کیا جن کے نام اس کے دل پر نقش تھے۔ ان دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے تک ان ناموں کو وہیں رہنا تھا۔

☆☆☆

''تم سمجھ رہے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' اس شخص نے شدید اضطراب کی کیفیت میں پوچھنے کے ساتھ ساتھ اپنے مقابل کا بازو ہلایا تو اسے لگا کہ اس کی انگلیاں مقابل کے لباس کے میل سے بھر گئی ہوں لیکن وہ جس مقصد کے تحت اس شخص سے مخاطب ہوا تھا اس کی افادیت کے مقابلے میں اس معمولی سی بات کو اہمیت نہیں دی جا سکتی تھی۔

''دیکھو! یہ مجھ سے زیادہ تمہارے فائدے کی بات ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ کسی انسان کو اس طرح پوری دنیا سے کاٹ کر ایک تہ خانے تک محدود کر دینا بالکل غیر انسانی سلوک ہے لیکن یہ طاقتور لوگ ہم غریبوں کو انسان ہی کہاں سمجھتے ہیں۔ امیر اور امیر کے آباؤ اجداد بھی نسلوں سے میرے اور تمہارے جیسے انسانوں کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اس زیادتی کا جواب دینا ہمارا حق ہے۔'' وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اپنے زورِ خطابت سے مقابل کو قائل کر سکے لیکن مقابل اپنی گدلی آنکھیں اس پر جمائے بالکل خاموش کھڑا تھا اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ ''تم کوئی جواب کیوں نہیں دیتے؟ کیا تنہا تہ خانے میں رہتے رہتے تمہارا دماغ اتنا کند ہو چکا ہے کہ تمہیں اپنے فائدے کی بات بھی سمجھ نہیں آتی۔'' مسلسل خاموشی نے اس کا اضطراب بڑھانے کے ساتھ ساتھ لہجے کو چڑچڑا بھی بنا دیا تھا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور آواز کو نرم کرتے ہوئے ایک بار پھر سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ اتنے برسوں سے تہ خانے کی تنہائی میں قید ہو کر تمہارے ذہن سے بیرونی دنیا کی یادداشتیں بھی مٹنے لگی ہوں گی لیکن ذرا سوچو..... ابھی زندگی باقی ہے اور تمہیں اپنی باقی ماندہ زندگی عیش و عشرت میں گزارنے کا ایک سنہری موقع مل رہا ہے تو تمہیں اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میرے ابوبکیٰ سے سارے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ وہ اس خدمت کے عوض ہمیں خطیر انعام دینے کے ساتھ ساتھ تحفظ بھی دینے کے لیے تیار ہے۔ ہم یہاں سے نکل کر اس کی پناہ میں ہوں گے اور اپنی باقی زندگی خوب مزے میں گزاریں گے۔'' وہ اسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ اپنے سخی سے وجود کے ساتھ وہ یہی کر سکتا تھا کہ اسے معلوم تھا، اس کے سامنے کھڑا لمبے بالوں والا میلا کچیلا شخص بلا کا پھرتیلا اور طاقتور ہے اور وہ طاقت کے بل پر اسے زیر نہیں کر سکتا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اپنا کام نکل جانے کے بعد امیر تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا لیکن یہ جانتا ہوں کہ اگر تم زندگی بھر کی اس قید سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو آج کا دن اس کام کے لیے بہترین ہے۔ آج امیر سمیت قصر کے زیادہ تر مکین تماش گاہ گئے ہوئے ہیں۔ ملازمین اور

پہریداروں کی بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ ہی موجود ہے۔ آج میرے پاس موقع ہے کہ میں بھیس بدل کر تمہیں قصر سے باہر نکال دوں اور تمہارے ساتھ خود بھی یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ امیر کے قصر واپس آنے اور مقررہ وقت پر تمہارے پاس چکر لگانے تک ہم یہاں سے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔'' وہ مسلسل اسے ترغیب دے رہا تھا۔

''تمہارا ابوبکیٰ سے رابطہ کیسے ہوا؟ وہ تو یہاں سے دور امیر سفیان کی پناہ میں ہے نا؟'' آخر اس میلی کچیلی پتھر کی مورت کے ہونٹوں نے جنبش کی اور ایک ایسا سوال کیا جسے سن کر اس کے مخاطب کو احساس ہوا کہ یہ تہ خانے تک محدود شخص اتنا بھی لاعلم نہیں ہے جتنا وہ گمان کر رہا تھا۔

''تم درست کہہ رہے ہو لیکن تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟'' وہ اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''تمہارے سوا صرف ایک ہی فرد مجھ تک آتا ہے۔'' اس کے جواب نے مخاطب کو لاجواب کر دیا لیکن حیران بہر حال وہ اب بھی تھا کہ امیر نے اس بے حیثیت شخص کو اتنی معلومات فراہم کرنا کیوں ضروری سمجھا۔

''ان سب باتوں کو چھوڑو خسرو! تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم میرے منصوبے سے متفق ہو یا نہیں؟'' اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''نہیں اختر! جب تک تم مجھے میرے سوال کا جواب نہیں دو گے میں بھی تمہیں کوئی جواب نہیں دوں گا۔'' اس نے صاف انکار کیا۔

''میں نے خود ابوبکیٰ سے رابطہ کیا تھا۔ امیر نے تمہارے سلسلے میں مجھے ہمیشہ دھوکے میں رکھا اور میں ہمیشہ یہی گمان کرتا رہا کہ خود کو بدنامی اور شرمندگی سے بچانے کے لیے امیر نے ساری دنیا سے چھپا کر تمہیں یہاں رکھا ہوا ہے اور خود اپنے دل کی محبت سے مجبور ہو کر کبھی کبھار تم سے ملنے یہاں آتا ہے لیکن پھر قصر میں جو کچھ ہوا اور میرے کانوں تک جو باتیں پہنچیں، ان سے میری ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور میں نے فیصلہ کیا کہ ضروری نہیں ہے کہ میں ایک معمولی مشاہرے پر ساری عمر امیر کی خدمت کرتا رہوں۔ میرا بھی زندگی کی خوشیوں اور عیش و آرام پر حق ہے اور اس حق کو وصول کرنے کے لیے ہی میں نے ابوبکیٰ سے معاملات طے کر لیے۔ ساری زندگی امیر کے رازوں کی حفاظت کر کے مجھے جو نہ مل سکا، وہ ایک راز کا پردہ فاش کرنے سے مل جائے گا۔'' آخر کار اس نے سب بتا ڈالا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے اتنے مختصر سے وجود میں

رونا

مشتاق احمد یوسفی لکھتے ہیں جب ان کی شادی ہوئی اور رخصتی کا وقت آیا تو دلہن کی ماں نے اور بہنوں نے رونا شروع کیا مگر ان کی بیگم خاموش تھیں۔ انہوں نے اپنی بیگم سے کہا..... آپ رو لیں کیونکہ دلہن رخصتی کے وقت گھر والوں سے جدا ہوتی ہے تو روتی ہے مگر وہ نہ روئیں پھر گھر کا دروازہ آیا۔ ہم نے کہا آپ تو دروازے پر آ گئی ہیں، اب تو رو لیں مگر پھر بھی نہ روئیں پھر گاڑی کے قریب آ کر ہم نے پھر کہا مگر وہ نہ روئیں اور گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

اور پھر جب ہم اپنا سہرا اٹھا کر گاڑی میں بیٹھے اور انہوں نے ہمیں دیکھا تو پھر وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بلل ہزارہ

بے چارہ اخبار

ٹرین میں کتاب کا مطالعہ تو پھر بھی قابل برداشت ہے۔ مشکل تو اخبار کے مطالعے میں ہوتی ہے۔ آپ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں برابر والا مسافر کہتا ہے۔ ذرا اوپر والا صفحہ تو عنایت کیجیے۔ دیکھیں، آج کی خاص خاص خبریں کیا ہیں۔ آپ اپنی خاندانی شرافت کی وجہ سے مطلوبہ صفحہ دے دیتے ہیں اور باقی اخبار پر نظریں دوڑانے لگتے ہیں کہ اتنے میں آواز آتی ہے۔ جناب! ذرا صفحہ نمبر 4 تو دیجیے۔ ایک دلچسپ خبر کا باقی حصہ صفحہ نمبر 4 پر ہے۔ آپ بادل ناخواستہ صفحہ نمبر 4 دے دیتے ہیں۔ اب اخبار قسطوں میں آپ کے ہاتھوں سے نکلنے لگتا ہے اور کچھ ہی دیر بعد آپ خلاؤں میں اس طرح گھورنے لگتے ہیں جیسے وہاں خبریں تلاش کر رہے ہوں لیکن اس وقت آپ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ کر نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں جب ڈبے کا کوئی مسافر اخبار کے ایک صفحے کو بطور دستر خوان بچھا کر اس پر طعام کا سامان سجا دیتا ہے اور آپ کو جھوٹے منہ پوچھتا بھی نہیں۔

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

UUNOVELS.COM

اتنی عیاری چھپی ہوئی ہے۔'' خسرو نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اب تو پتا چل گیا ہے نا! اب تم اپنا فیصلہ سناؤ۔''

''میں نے اس قید خانے سے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے جہاں مجھے کسی جانور کی طرح قید رکھ کر اپنی قیمتی متاع کی حفاظت کروائی جارہی ہے۔''

''یعنی تم میرا ساتھ دینے کو تیار ہو؟'' اختر اس کے جواب پر خوش ہوگیا۔

''تم میرے ساتھ آؤ۔'' اسے جواب دینے کے بجائے خسرو نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور مڑ کر لچکتا ہوا اس سرنگ میں آگے کی طرف سفر کرنے لگا جس کے وسط میں اس کی اختر سے دن میں ایک بار روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ اس ملاقات میں اختر اسے کھانے پینے کا سامان تھما کر واپس لوٹ جاتا تھا کہ اس سے آگے جانے کی اسے اجازت تھی، نہ حوصلہ۔ وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتا تھا کہ جیسے ہی امیر کے حکم کی خلاف ورزی کرے گا، کسی نہ کسی طرح امیر کو خبر ہوجائے گی اور اسے اس حکم عدولی کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی لیکن آج وہ ہر قسم کے خوف کو بالائے طاق رکھ چکا تھا اور خسرو کے پیچھے پیچھے اس سرنگ میں آگے بڑھتا جارہا تھا جس میں چلنے کے لیے خسرو کو اپنے دراز قد کی وجہ سے سر جھکا کر چلنا پڑتا تھا اور وہ اپنے مختصر وجود کے ساتھ بہ آسانی گزرتا جارہا تھا۔

سرنگ کے سہ شاخہ حصے تک پہنچ کر اس نے اختر کو اپنے پیچھے تہ خانے میں اترنے کا اشارہ کیا۔ اختر سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرے کی صاف ستھری معطر فضا اور سجاوٹ کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ خسرو جیسے شخص کی قیام گاہ ہوگی۔

''اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو؟'' خسرو نے اس کی آنکھوں کی حیرت پڑھ لی۔

''کچھ نہیں..... بس ایسے ہی۔'' وہ اپنی حیرت کی وجہ بیان کرنے کی ہمت نہیں کرسکا۔

''مجھے معلوم ہے۔ تم یہ سوچ کر حیران ہورہے ہو کہ مجھ جیسے غلیظ آدمی کے لیے اتنی شاندار رہائش کیونکر ہے؟'' خسرو کے ہونٹوں پر رینگتی مسکراہٹ نے اختر کو جھینپنے پر مجبور کردیا۔

''میرے خیال میں تمہیں اپنی اس غلط فہمی کو دور کرلینا چاہیے۔ یہ سارا اہتمام میرے لیے نہیں بلکہ اس نقشے کے لیے ہے جسے امیر ارغل اور اس کے اجداد ایک مقدس امانت کی طرح سنبھالتے آئے ہیں۔ میں تو بس ایک نگراں یا مجاور کی طرح ہوں جس کے حال سے بے حال رہنے پر امیر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی تلخی تھی۔

''یہ واقعی امیر کی بہت بڑی زیادتی ہے۔ انہیں کم از کم چند صاف ستھرے ملبوسات اور ان اشیائے ضرورت کی فراہمی کو تو ممکن بنانا چاہیے تھا جن کے استعمال سے تم انسان دکھائی دیتے۔'' خسرو کے لہجے کی تلخی کو محسوس کرکے اس نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اسے امیر سے مزید بدگمان کرنے کی کوشش کی۔

''میں انسان دکھائی دیتا تو میرے اندر انسانی نفس بھی جاگ جاتا یا پھر وہ کشش پیدا ہوجاتی جو تم جیسے سوکھے بندے کو میری طرف متوجہ کرکے کوئی ایسا گل کھلا دیتی جو امیر کو گوارا نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے مجھے اس حال میں رکھنا ہی بہتر سمجھا کہ تم مجبوراً اپنی نوکری نبھانے آؤ بھی تو دو گز دور سے ہی کھانے کا خوان تھما کر ناگواری سے ناک سکوڑتے ہوئے واپس بھاگ جاؤ۔'' اس کی گفتگو میں تلخی تھی لیکن یہ کمال تھا کہ برسوں کی تنہائی کاٹ کر بھی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ نہیں ہوا تھا اور حالات کا بالکل ٹھیک ٹھیک تجزیہ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

''امیر نے تم پر بہت ظلم کیا۔ بہرحال اب تمہارے بُرے دن ختم ہوچکے ہیں۔ اب تم یہاں سے دور کسی اچھی جگہ پر ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہو۔'' اختر نے اسے مزید لالچ دیا۔

''یہاں سے باہر نکلنے سے پہلے میں اپنا حلیہ درست کرنا چاہتا ہوں۔ اس حلیے میں باہر نکلا تو سب کی نظروں میں آجاؤں گا۔'' اس کے جملے سے ظاہر تھا کہ اس نے اختر کی پیشکش قبول کرلی ہے۔ سن کر اختر کا چہرہ کھل اٹھا اور چہک کر بولا۔

''تم فکر ہی نہیں کرو۔ ابھی پانچ منٹ میں، میں سب کچھ لے کر تمہارے پاس واپس آتا ہوں۔'' وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا لیکن سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے تجسس سے پوچھنے لگا۔

''وہ نایاب نقشہ کس جگہ رکھا ہے؟''

''مجھے نقشے سمیت تمہارے ساتھ ہی روانہ ہونا ہے۔ ابھی وقت ضائع نہ کرو اور جلدی جلدی سارے انتظامات کرو تاکہ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل سکیں۔'' اس کا جواب ایسا تھا کہ اختر اصرار نہیں کرسکا۔ تھوڑی دیر میں وہ تمام ضروری سامان کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے خسرو کے سر کے بال کاٹے اور جب وہ لباس لے کر ملحقہ حمام میں نہانے کے لیے گیا تو احتیاط سے کمرے کی تلاشی

لینے لگا۔ وہاں اتنا زیادہ سامان نہیں تھا کہ تلاشی لینا مشکل ثابت ہو لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ نقشہ کس جگہ چھپایا گیا ہوگا۔ تلاشی کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے اس نے مچھلیوں والے برتن سے مرتبان کو غور سے دیکھا تو اسے لگا کہ مرتبان جس مستطیل شکل میں تراشے ہوئے خوبصورت پتھر پر رکھا ہوا ہے اس پتھر کے نیچے نقشہ چھپانا ممکن ہے۔ اس نے حمام کے بند دروازے پر ایک چور نظر ڈال کر بھاری مرتبان کو احتیاط سے اٹھایا اور اسے مناسب جگہ رکھنے کے خیال سے جلتے ہوئے سونے کے آتش دان کے قریب گیا۔ یہی لمحہ تھا جب اس کے گلے میں رسی کا پھندا پڑا اور اتنی زور سے کھینچا گیا کہ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور بے ساختہ ہی اس کے ہاتھ سے مرتبان چھوٹ گیا۔ مرتبان سیدھا آتش دان میں جا کر گرا، اس کا شیشہ ٹوٹا اور پانی باہر نکل کر اس مختصر آتش دان کی آگ بجھا گیا۔ پانی کے ساتھ ہی باہر نکل کر گرنے والی مچھلیاں بری طرح تڑپنے اور پھڑکنے لگیں۔ تڑپ اور پھڑک اختر بھی رہا تھا لیکن پھندا اس کے گلے کے گرد اتنی تیزی سے تنگ ہوا کہ اسے بھرپور مزاحمت کا موقع ہی نہیں مل سکا اور وہ حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکالتا پھٹی پھٹی نظروں سے گیلے بالوں والے خسرو کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ خسرو نے اس وقت تک اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی جب تک اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں ساکت نہیں ہو گئیں اور زندگی بخش سانسوں کے لیے تڑپتے، پھڑکتے اعضا نے ہار نہ مان لی۔

''جس دنیا میں خون کے رشتوں کا بھروسا نہیں وہاں میں تجھ جیسے بکاؤ پر کیسے بھروسا کر سکتا تھا۔'' خسرو نے نفرت سے بولتے ہوئے اس کے اوپر تھوکا اور زور لگا کر آتش دان کے اوپر دیوار کے دو پتھروں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ان پتھروں کے ساتھ ساتھ ایک سنگی سل اس طرح کھنچی ہوئی باہر آئی جیسے کسی میز میں نصب دراز ہو۔ اس سنگی سل پر شیشے کے ڈبے میں چمڑے کا ایک بڑا سا مستطیل ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ خسرو کی آنکھیں یہ دیکھ کر چمک اٹھیں کہ چمڑے کے اس ٹکڑے پر چند سنہری لکیریں اور حرف نمایاں ہو رہے ہیں۔

''مجھے افسوس ہے امیر ارغل! جو کچھ دیکھنے کی بے تابی میں آپ ہر روز یہاں کا چکر لگاتے تھے، آپ کی آنکھیں اسے دیکھنے سے محروم رہیں گی۔'' اس نے شیشے کے ڈبے کا ڈھکن کھول کر اس میں سے چمڑے کا وہ بڑا سا ٹکڑا نکالا اور اسے لپیٹ کر احتیاط سے اپنے لباس کی جیب میں رکھ لیا۔ ذرا دیر میں وہ تلوار اور چند دوسری اشیا کے ساتھ وہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ باہر نکل کر اس نے پہلے تہ خانے کا راستہ بند کیا پھر دائیں طرف سرنگ میں قدم رکھ دیا۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدموں کے اعتماد سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی منزل سے واقف ہے۔ پہلے والی سرنگ کی طرح اسے اس سرنگ میں بھی سر جھکا کر چلنا پڑ رہا تھا لیکن اس سرنگ کی طوالت پہلی سرنگ کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ کافی دیر چلنے کے بعد وہ ایک جگہ رکا اور شمع روشن کر کے دیوار کو غور سے دیکھنے لگا۔ آخر اسے اپنا گوہر مقصود مل گیا۔ یہ سرنگ کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھروں میں سے ہی ایک پتھر تھا جس کے معمولی سے ابھار کو محسوس کرنے کے لیے اسے اپنے ہاتھ سے ہی دیوار کو ٹٹولنا پڑا تھا۔ ابھار کو محسوس کرتے ہی اس نے پتھر کو اپنے انگوٹھے کی مدد سے دبایا۔ چھوٹی جسامت کا وہ پتھر اندر دھنستا چلا گیا۔ پتھر کے اندر دھنستے ہی سرنگ میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی اور پتھروں کی بنی اس دیوار کا ایک حصہ کھسکتا چلا گیا۔ دیوار کھسکنے سے بننے والا وہ مستطیل طرز کا دروازہ زیادہ بلند نہیں تھا۔ خسرو سر جھکا کر اس دروازے سے باہر نکلا تو تازہ ہوا کے ایک جھونکے نے اس کا استقبال کیا۔ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ہی مسکراہٹ بکھر گئی۔ تہ خانے میں اپنے طویل قیام کے عرصے میں وہ کبھی بھی تن بہ تقدیر ہو کر فارغ نہیں بیٹھا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ اس خفیہ تہ خانے سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی دوسرا راستہ بھی ہوگا۔ ہر روز کئی گھنٹوں کی محنت و کوشش کے بعد آخر کار اس نے وہ راستہ ڈھونڈ نکالا تھا لیکن فوری فرار کی کوشش کرنے کے بجائے مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا تھا۔ آج اگر اختر اس کے سامنے فرار کا منصوبہ نہ رکھتا تو بھی اسے اس جگہ کو چھوڑ جانا تھا لیکن اختر کی وجہ سے اسے یہ سہولت حاصل ہوئی تھی کہ وہ اپنے قاتل نفرت حلیے کے بجائے انسانوں والی جون میں وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب ایک ٹیلے کے قریب کھڑا اپنے سفر کی راہ متعین کر رہا تھا۔

☆☆☆

ان کے قافلے نے عام راہ گزر سے ہٹ کر پڑاؤ ڈالا ہوا تھا اور طویل مسافت سے تھکے ہارے مسافر ٹولیوں میں بکھرے آرام کرنے یا کھانے پینے میں مصروف تھے۔ کسی بھی خطرے کے پیش نظر انہوں نے یہاں اپنے خیمے نصب نہیں کیے تھے اور کھلے آسمان تلے ہی اپنے ان ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے جو زادِ راہ کا انتظام کرنے قریبی بستی تک گئے ہوئے تھے۔ قافلے میں شامل ان کی راہنمائی کا فریضہ انجام دینے والے بوڑھے نے بتایا تھا کہ یہ ان کے راستے

میں پڑنے والی آخری انسانی آبادی ہے۔ اس کے بعد انہیں ویرانوں میں طویل اور دشوار سفر درپیش تھا جس کے لیے مناسب انتظام ہونا ضروری تھا۔ اس مناسب انتظام کے لیے ہی قافلے میں سے کچھ لوگ بستی تک گئے ہوئے تھے جبکہ داؤد بن معیز ایک اونچے ٹیلے پر لیٹا اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

ثریا کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی سارہ نے جب دیکھا کہ تھکن سے نڈھال ثریا کو باتیں کرتے کرتے اچانک اونگھ آ گئی ہے تو وہ اس کے پاس سے اٹھی اور چپکے سے اس ٹیلے کی جانب چل پڑی جس پر داؤد موجود تھا۔ ٹیلا چڑھ کر ابھی وہ داؤد کے عقب میں پہنچی ہی تھی کہ وہ اس کی آہٹ پا کر تیزی سے پلٹا اور پھر اسے دیکھ کر قدرے سخت لہجے میں بولا۔

''یہاں اس جگہ یوں کھڑی نہیں ہو۔ بلندی کی وجہ سے کوئی بھی تمہیں دیکھ سکتا ہے۔''

''میں اپنی غلطی پر معذرت چاہتی ہوں۔'' وہ فوراً ہی اس سے کچھ فاصلے پر ٹیلے کے ساتھ چمٹ کر لیٹ گئی اور ایسے لہجے میں معذرت کی کہ داؤد کی پیشانی سے ناگواری کے بل ایک پل میں غائب ہو گئے۔

''کیا آپ کو خطرہ ہے کہ کوئی ہمارے اس پڑاؤ پر حملہ کر سکتا ہے جو آپ یوں نگرانی کر رہے ہیں؟''

''اس خطرے نے تو خوارزم سے شروع ہونے والے سفر کی ابتدا ہی سے ہمارا دامن تھام رکھا ہے۔ ہم ہر گام پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اچانک ہی کہیں سے تاتاری کتے ہماری بو سونگھتے ہوئے آئیں گے اور ان لٹے پٹے لوگوں کی مزید بربادی کا سامان کر ڈالیں گے۔'' اس کے لہجے میں ایک محسوس کی جانے والی اداسی تھی تاہم آنکھیں نہایت چابکدستی سے اطراف کی نگرانی کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔

''میں تاتاریوں کے بارے میں نہ جاننے کے برابر ہی جانتی ہوں لیکن اس بات پر حیران ہوں کہ وہ لوگ اس شدت سے آپ لوگوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں کہ آپ کسی بھی جگہ خود کو ان سے محفوظ محسوس نہیں کرتے؟''

''ہم اس قوم کے افراد ہیں جس کے شیر دل شہنشاہ نے برسوں تاتاریوں کے سیل رواں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی اور تاتاریوں کو ایسی زک پہنچائی کہ جس کا انہیں اپنے کسی دوسرے مقابل سے تجربہ نہیں ہوا۔ ہم آخری حد تک تاتاریوں کے مقابل ڈٹے رہنے والے شیرِ خوارزم کے چاہنے والے ہیں اور تاتاری شیر خوارزم سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ انہیں ان کے کسی چاہنے والے کا وجود بھی اس روئے زمین پر برداشت نہیں۔'' اس کے لہجے کے درد نے سارہ کے محسوسات کو متاثر کیا لیکن اس نے زبان سے کسی حرفِ تسلی کی ادائیگی کے سلسلے میں خود کو معذور پایا۔ چند ثانیے کی خاموشی کے بعد داؤد خود ہی اسے بتانے لگا۔

''اپنے قافلے کو تاتاریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہم نے ایک طویل، دشوار اور غیر مستعمل راستہ اختیار کیا ہے۔ ہمارے محترم راہبر کے مطابق اب ہم سفر کے ایسے مرحلے میں داخل ہونے والے ہیں جو سب سے زیادہ دشوار لیکن محفوظ ثابت ہوگا۔ راستے کی دشواریوں کا سامنا کرنے کے لیے اس آخری بستی سے اسبابِ سفر کی خریداری ہماری اشد ضرورت ہے لیکن میں اس خطرے کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اس عام طور پر استعمال نہ ہونے والے راستے کی آخری بستی میں تاتاریوں کے چند جاسوس موجود ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ میں نے اپنے آدمیوں کو تین مختلف ٹولیوں میں خریداری کے لیے بستی میں بھیجا ہے پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنی اجنبی صورتوں اور خشک راشن کی بڑی مقدار میں خریداری کے سبب کسی کی نظر میں آ سکتے ہیں۔ میں اس جگہ لیٹ کر یہی جاننے کے لیے نگرانی کر رہا ہوں کہ کہیں میرے آدمی اپنے پیچھے کسی تاتاری جاسوس کو تو نہیں لگا کر لے آتے ہیں۔'' وہ خاصا متفکر نظر آتا تھا۔ سامنے سے دھول اڑتی نظر آئی تو وہ بے حد چوکنا نظر آنے لگا۔ سارہ نے بھی اپنی نگاہیں راستے پر جما دیں۔ آنے والا سوار برق رفتاری سے گھوڑا دوڑا رہا تھا لیکن اس نے ان کے پڑاؤ کی جانب رخ نہیں کیا اور سامنے سے سیدھا آگے نکلتا چلا گیا۔

''خدا کی قسم وہ عبدالمالک ہے اور جس انداز میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے یہاں سے گزرا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کے تعاقب میں کوئی ہے۔'' داؤد نے گھڑسوار کو شناخت کر لیا اور پریشانی کے عالم میں بولنے کے ساتھ ساتھ کمان میں تیر چڑھا لیا۔ اس کے تیر کو اپنا شکار ڈھونڈنے کے لیے ذرا بھی انتظار نہیں کرنا پڑا اور عبدالمالک کے پیچھے ہی گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک شخص ان کے سامنے سے گزرتا ہوا بری طرح اپنے گھوڑے پر اچھلا۔ داؤد کا چلایا ہوا تیر اس کی ران میں پیوست ہوا تھا اور اس غیر متوقع حملے نے اسے اس حد تک بدحواس کر دیا تھا کہ وہ اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر بیٹھا نہ رہ سکا تھا۔

''مجھے جا کر اسے دیکھنا ہوگا۔ اگر وہ کوئی تاتاری

جاسوس ہے تو اس سے ہمیں اہم معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔'' راہ گزر پر پڑے اس تڑپتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر داؤد مضطرب سے لہجے میں بولا تو سارہ نے خود کو اس کی مدد کے لیے مجبور پایا اور خلوص سے بولی۔

''آپ پیچھے جاکر اسے دیکھیں۔ میں یہاں سے نگرانی کا کام کرتی ہوں۔ بس آپ اپنی کمان اور چند تیر یہیں چھوڑ جائیے گا تاکہ پیچھے سے کوئی اور آئے تو میں اسے آپ کے لیے بے ضرر بنا سکوں۔''

''تمہیں یقین ہے کہ تم درست نشانہ لے سکو گی۔'' وہ تذبذب کا شکار تھا۔

''آپ کو میری صلاحیتوں پر شک نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے ثریا اور اس جیسی دیگر لڑکیوں کی طرح ہنگامی حالات میں تیغ زنی اور تیر بازی کے ہنر نہیں سیکھے۔ مجھے بچپن سے کسی کھیل کی طرح ان فنون کی تربیت دی گئی ہے اور میں کھلونوں ہی کی طرح ہتھیاروں سے کھیلنا جانتی ہوں۔'' اس نے داؤد کو یقین دہانی کروائی تو وہ تیر اور کمان اس کے قریب رکھ کر ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔ کچھ دیر تک وہ سارہ کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اس کی فکر میں مبتلا ہونے کے بجائے وہ پوری چابکدستی سے راہ گزر پر پڑے زخمی اور اطراف کا جائزہ لیتی رہی۔ زخمی کا گھوڑا جو اس کے گرنے کے بعد آگے چلا گیا تھا، پلٹ کر واپس آچکا تھا لیکن وہ شخص ران میں پیوست تیر اور چلتے گھوڑے سے گرنے پر لگنے والی چوٹ کے باعث اٹھ کر دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے سے عاجز نظر آتا تھا۔ داؤد ہاتھ میں ننگی تلوار لیے اس کے قریب پہنچا تو وہ حد سے زیادہ متوحش اور سراسیمہ نظر آنے لگا اور حالت خوف میں داؤد کی منتیں کرنے لگا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سارہ اس کے الفاظ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اس کے انداز سے یہی لگ رہا تھا کہ وہ داؤد سے اپنی جاں بخشی کی درخواست کر رہا ہے۔ داؤد نے اس شخص کی آہ وفریاد کو کتنی اہمیت دی اس بات کا تو سارہ کو پتا نہیں چلا لیکن اس نے دیکھا کہ داؤد بزورِ تلوار اس شخص کو اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہونے پر مجبور کر چکا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے خود بھی زخمی کو تھوڑا بہت سہارا دیا تھا لیکن اصل کمال بہرحال اس کی ننگی تلوار کی دہشت کا ہی تھا۔ جب وہ زخمی کے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد گھوڑے کی باگیں پکڑ کر کھینچ رہا تھا تو سارہ نے عقب سے ایک اور سوار کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ پہلے سوار کی طرح سرپٹ گھوڑا دوڑانے کے بجائے آہستہ خرامی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آرہا تھا اور ابھی اس کا چہرہ بھی واضح نہیں ہوا تھا لیکن سارہ اس کے گھوڑے کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ اہلِ قافلہ میں سے نہیں ہے۔ اہلِ قافلہ میں سے جو لوگ بستی کی طرف خریداری کی غرض سے گئے تھے، ان میں سے صرف عبدالمالک ہی گھوڑے پر سوار تھا۔ باقی دو افراد اونٹوں پر سوار ہوکر گئے تھے۔ گھڑسوار مزید آگے آیا تو گھوڑے کی سیاہ چیتوں والی سفید رنگت بھی واضح ہوگئی۔ رنگوں کا یہ امتزاج اہلِ قافلہ میں سے کسی کے گھوڑے کا نہیں تھا اس لیے اتنا تو طے ہوگیا کہ آنے والا کوئی اجنبی ہے۔ اس اجنبی کے بے ضرر یا ضرر رساں ہونے کا فیصلہ ابھی باقی تھا اس لیے سارہ نے چلے میں کھنچا تیر فی الفور چلانے سے اجتناب کیا۔

بلندی کی وجہ سے دور تک کا حال دیکھنے والی سارہ کے مقابلے میں داؤد کو کسی بات کی خبر نہیں تھی اور وہ گھوڑے کی لگام پکڑے زخمی سوار سمیت اس ٹیلے کی جانب بڑھا آرہا تھا جس کی بلندی پر سارہ سینے کے بل لیٹی ہوئی تھی اور جس کے عقب میں اہلِ قافلہ اپنی ممکن اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

چلے میں چڑھے تیر کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھی شیرنی کی طرح چوکنی سارہ نے دیکھا کہ گھڑسوار اندھا دھند آگے چلے آنے کے بجائے پیچھے ہی رک گیا ہے اور گردن گھما گھما کر ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہے۔ بالآخر کسی نتیجے پر پہنچ کر اس نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگائی، ایک بڑے سے پتھر کے ساتھ اس کی لگام باندھی اور ایک قریبی ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ سارہ فوراً ہی اس کا مقصد سمجھ گئی۔ وہ ٹیلے پر چڑھ کر اطراف کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا۔ اگر وہ ٹیلے کی بلندی تک پہنچ جاتا تو اس کی نظروں سے کچھ پوشیدہ نہیں رہتا۔ ویسے بھی وہ جس ٹیلے پر چڑھ رہا تھا، اس کی بلندی اس ٹیلے کی نسبت زیادہ تھی جس پر سارہ اس وقت موجود تھی۔ عالمِ اضطراب میں اس نے چلے میں چڑھے تیر کو فاصلے کی زیادتی کو خاطر میں لائے بغیر پوری قوت سے کھینچ کر چلا دیا۔ اگلا پل خود اسے ششدر کر دینے والا تھا۔ اس نے صاف دیکھا کہ ایک تیر ٹیلا چڑھتے شخص کی پشت میں پیوست ہوا۔ اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور پھر وہ تیزی سے پیچھے لڑھکنے لگا۔ لڑھکتے ہوئے اس کے حلق سے نکلنے والی چیخیں اتنی بلند تھیں کہ سارہ کے ساتھ ساتھ داؤد کے کانوں میں بھی جا پہنچیں۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور گردن گھما کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے داؤد۔ ایک اور تعاقب کار تھا جسے میں نے تیر کا نشانہ بنا کر ناکارہ کر دیا ہے۔'' سارہ ابھی

داؤد کو تسلی دے ہی رہی تھی کہ اس نے زمین پر گر کر تڑپتے شخص کے قریب عبدالمالک کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود کمان دیکھ کر اس پر انکشاف ہوا کہ زخمی ہو کر ٹیلے سے گرنے والا شخص اس کے نہیں بلکہ عبدالمالک کے تیر کا نشانہ بنا ہے۔ یقیناً وہ آگے کہیں سے چکر کاٹ کر واپس آیا تھا اور گھات لگا کر اس شخص کو نشانہ بنایا تھا۔ ٹیلے سے زخمی ہو کر گرنے والا شخص اب زمین پر تڑپ رہا تھا۔ عبدالمالک اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے نیچے اترا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ ابھی وہ معائنہ کر ہی رہا تھا کہ اس شخص کے جسم نے مزید دو تین جھٹکے لیے اور ساکت ہو گیا۔ عبدالمالک ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنے گھوڑے کے ساتھ ساتھ اس شخص کے گھوڑے کی بھی لگام تھام کر پڑاؤ کی طرف چل پڑا۔ آہستہ آہستہ داؤد کی طرح وہ بھی منظر سے غائب ہو کر سارہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سارہ اپنی جگہ موجود نگرانی کا فریضہ انجام دیتی رہی۔ جس وقت ایک خاکی اونٹ منظر میں داخل ہوا، عین اسی وقت اس نے اپنے قریب داؤد کی موجودگی محسوس کی۔

''عبدالمالک کے سپرد کر آیا ہوں بدمعاش کو۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ اس کی ساری حقیقت اگلوا لے گا۔'' سارہ کے پوچھے بغیر وہ اسے بتانے لگا۔ آنکھیں البتہ راستے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ اشیائے... خورونوش کی خریداری کے لیے بستی میں بھیجے گئے دونوں اونٹ اور ان کے سوار آگے پیچھے چلتے ہوئے پڑاؤ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ دونوں چابکدستی سے ان اونٹوں کے عقب اور اطراف میں کسی جاسوس کی موجودگی کو کھوجنے لگے۔ دور دور تک انہیں کسی ذی روح کا نشان نظر نہیں آیا یہاں تک کہ دونوں اونٹ پڑاؤ میں پہنچ گئے۔

''تم چاہو تو نیچے چلی جاؤ۔ میں فی الحال یہیں رہ کر نظر رکھوں گا۔ پڑاؤ کے کوچ کرنے تک ہمارا پوری طرح چوکنا رہنا بہت ضروری ہے۔'' چند لمحے مزید بیتے تو داؤد نے اس سے کہا۔ اصل میں وہ تنہا اس ٹیلے پر سارہ جیسی حسین لڑکی کی قربت میں خود کو ایک آزمائش میں مبتلا محسوس کر رہا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ وہ اب وہاں سے چلی جائے۔

''ہاں، میں جا کر دیکھتی ہوں۔ کہیں ثریا میرے غیاب پر پریشان نہ ہو رہی ہو۔ اس کی آنکھ لگ گئی تھی اس لیے میں اسے بتائے بغیر ہی آ گئی تھی۔'' اس نے داؤد کی کیفیت بھانپ لی اور فوراً ہی اس سے اتفاق کیا۔

''میں آ گیا ہوں اخی! اب میں نگرانی کروں گا۔ آپ نیچے جائیں۔ آپ کو عبدالمالک بھائی یاد کر رہے ہیں۔''

ابھی سارہ نے نیچے اترنے کے لیے جنبش کی ہی تھی کہ لطیف ٹیلے پر آ پہنچا اور داؤد کو پیغام دیا۔

''ٹھیک ہے۔ تم یہاں لیٹ کر دھیان سے نگرانی کرو۔ ذرا سی بھی بے پروائی مت دکھانا۔ مجھے شک ہے کہ کوئی اور بھی تاک میں ہو سکتا ہے۔'' اس نے لطیف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہدایت دی اور خود سارہ کے ہمراہ نیچے اترنے لگا۔ پڑاؤ میں عبدالمالک چہرے پر تشویشناک تاثرات لیے منتظر تھا۔

''کیا ہوا؟ کیا معلوم ہوا اس زخمی سے؟'' داؤد نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہمارا اندازہ ٹھیک ہے۔ وہ تاتاریوں کا ہی جاسوس ہے۔ مسلمانوں کے قافلوں کی راہ روکنے کے لیے تاتاریوں نے دور دور تک اپنے جاسوسوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ میرے پیچھے آنے والے دونوں افراد اپنے مزید دو ساتھیوں کے ساتھ اسی مقصد کے لیے بستی میں موجود تھے۔ ان دونوں کو مجھ پر کسی وجہ سے شک ہو گیا تھا اس لیے یہ اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر کے تصدیق کے لیے میرے پیچھے چلے آئے تھے۔ میں اپنے پیچھے ان کی موجودگی محسوس کر کے ہی سیدھا پڑاؤ میں آنے کے بجائے آگے نکل گیا تھا تاکہ مناسب موقع دیکھ کر ان سے جان چھڑا سکوں۔ آپ کی مداخلت نے میرے لیے آسانی پیدا کر دی۔'' عبدالمالک نے اس کے سوال کا مفصل جواب دیا۔

''یہ دونوں واپس نہیں جائیں گے تو یقیناً ان کے ساتھی ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔''

''جی بالکل، ایسا تو ہونا ہی ہے۔'' عبدالمالک نے داؤد کی تائید کی۔

''پہلا کام تو یہ کرو کہ دو افراد کو بھیج کر راہ میں مرنے والے کی لاش چھپانے کا انتظام کرو اور ان سے کہو کہ زمین پر گرے خون کے دھبے چھپانے کے لیے اس پر مٹی وغیرہ ڈال دیں۔''

''میں پہلے ہی اس سلسلے میں ہدایت دے چکا ہوں۔'' عبدالمالک نے مؤدبانہ اسے آگاہ کیا۔

''شاباش، اب ہمارا دوسرا کام یہ ہے کہ ہم فوری طور پر یہاں سے کوچ کی تیاری کریں۔ ان دو کی کھوج میں کسی کے یہاں تک پہنچنے سے قبل ہمارا یہاں سے روانہ ہو جانا بہتر ہو گا۔ پیچیدہ پہاڑی راستوں پر قدم رکھنے کے بعد اگر کسی نے ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش بھی کی تو اسے بہت

UUNOVELS.COM

دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"جو آپ کا حکم اخی! میں ابھی پڑاؤ میں منادی کروا دیتا ہوں۔" عبدالمالک فوراً حرکت میں آ گیا۔

"تم ابھی تک ثریا کے پاس نہیں پہنچیں؟" عبدالمالک کے روانہ ہوتے ہی وہ سارہ سے مخاطب ہوا۔

"جی بس جا ہی رہی ہوں۔" وہ فوراً ہی چل پڑی۔ چند قدم ہی آگے گئی تھی کہ اسے ثریا اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔

"میں تمہیں ہی دیکھنے آ رہی تھی۔ لگتا ہے تم آرام کرنے کے بجائے جب سے اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی ہو۔" ثریا اسے دیکھتے ہی بولنا شروع ہو گئی اور اس کے بارے میں اندازہ لگایا۔

"ایسی ہی کچھ بات ہے اور اس کا یہ فائدہ ہے کہ میرے پاس تازہ خبریں موجود ہیں۔"

"کیسی خبریں؟" ثریا متجسس ہوئی۔ جواب میں سارہ نے اسے سارے حالات سے آگاہ کر ڈالا۔

"میں نے ابھی آتے ہوئے تمہیں اخی کے ساتھ کھڑے بات کرتے تو دیکھا تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم دونوں کوئی معرکہ مار کر آ رہے ہو۔"

"معرکہ کیا؟ بس تمہارے اخی کی بیدار مغزی نے ہمیں فوری طور پر کسی حادثے سے بچا لیا۔ اب ان کے حکم کے مطابق ہمیں جلد از جلد یہاں سے کوچ کی تیاری کرنی ہے۔"

"چلو چل کر اپنا اسباب دیکھتے ہیں۔ ویسے تو مختصر قیام کے اعلان کی وجہ سے اخی کی ہدایت پر اسباب کھولا ہی نہیں گیا تھا پھر بھی ممکن ہے کہ کوئی ایک آدھ شے کسی نے ضرورت کے تحت نکال لی ہو۔" ثریا اس کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی۔ سارہ نے جاتے جاتے یونہی سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ داؤد پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" ثریا نے اس کا پیچھے مڑ کر دیکھنا محسوس کر لیا تھا۔

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔" اس نے ثریا کو ٹالا۔

"میں ابھی جب دور سے تمہیں اور اخی کو ساتھ کھڑے دیکھتی آ رہی تھی تو میرے دل میں ایک خیال آیا تھا۔"

"کیسا خیال؟" اس نے بے توجہی سے پوچھا۔

"تم دونوں ساتھ ساتھ کھڑے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ تم دونوں کا یہ ساتھ دائمی ہو جائے۔" ثریا نے اپنے دلی جذبات کے اظہار سے دریغ نہیں کیا لیکن سارہ ششدر رہ گئی۔

"تم اس طرح کیسے سوچ سکتی ہو ثریا؟" الفاظ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلے۔

"سوچنے پر کوئی کسی نے پابندی تو نہیں لگا رکھی ہے۔" ثریا ہنس دی۔

"کسی نے پابندی نہیں لگائی تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان خود کو کچھ بھی سوچنے کے بارے میں آزاد سمجھے اور ہر طرح کے زمینی حقائق کو نظر انداز کر دے۔ کیا تم میرے اور اپنے اخی کے درمیان موجود بنیادی فرق کو بھول گئیں جو اتنی بڑی بات سوچ ڈالی۔" اس کے لہجے میں تلخی سی در آئی تھی۔

"تمہیں بُرا لگا تو میں معذرت چاہتی ہوں لیکن یہ کہے بنا نہیں رہ سکتی کہ جس فرق کا تم ذکر کر رہی ہو اسے مٹنے میں دیر نہیں لگتی۔" ثریا نے اس کے تلخ لہجے کا بُرا مانے بغیر نرمی سے جواب دیا۔

"لیکن میں اس فرق کو قطعی نہیں مٹانا چاہتی۔" وہ مزید تیز لہجے میں بولی اور تیز تیز چلتی ہوئی ثریا سے چند قدم آگے نکل گئی۔

☆☆☆

ساشا سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو خوش تھا۔ امیر کے دربار میں مقام حاصل کرنے کی تمنا بڑے افسانوی طریقے سے پوری ہوئی تھی۔ اسے رہ رہ کر وہ مناظر یاد آتے جب وہ بپھرے ہوئے ہاتھی کی وحشت پر قابو پا کر لوگوں کو دہشت سے نجات دلانے میں کامیاب ہوا تھا اور اس کامیابی نے یکدم ہی اسے نمایاں کر کے سب کی آنکھوں کا تارا بنا دیا تھا۔ یہ دوسری بار تھا کہ اس نے امیر ارغل کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔ پہلے کارنامے کا تو امیر اپنی عزت کے خیال سے کھل کر اظہار نہیں کر سکا تھا لیکن دوسری بار میں اس نے تلافی کر دی تھی۔ ساشا امیر کے بخشے قیمتی ہار کو انگلیوں میں گھماتا مسکرائے جا رہا تھا اور اس کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز اپنے دشمنوں کو للکار رہی تھیں۔

"تمہاری آزادی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ تم نے جو کچھ میرے باپ اور میرے ساتھ کیا، اس کا حساب چکانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"تم نے سازش کے تحت ساشا کو اس کی سرداری سے محروم کرنے کی کوشش کی لیکن تم نہیں جانتے کہ حکمرانی ساشا کا نصیب ہے۔ میں چاہے جہاں بھی رہوں، راج ہی کروں گا۔" اس کی فراخ پیشانی پر عجیب سی چمک تھی۔

دل ہی دل میں اس طرح کی بے شمار باتیں سوچتا

UUNOVELS.COM

ہوا وہ جلد ہی اپنے آرام دہ بستر پر سو چکا تھا۔ کسی قصر کے وسیع و عریض اور پُرتعیش کمرے میں ریشم و حریر کے بستر پر سونے کا تجربہ اسے حال ہی میں ہوا تھا اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس طرح سونے والوں کی نیند میں غفلت کا عنصر نسبتاً زیادہ شامل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی غفلت بھری نیند سو رہا تھا۔ تسلسل سے دروازہ بجائے جانے پر اس کی آنکھ کھلی تو پہلے لمحے پر آنکھ کھلنے کا سبب سمجھ نہیں آیا۔ دروازہ دوبارہ بجا تو تیزی سے بستر چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ سامنے سلیمان کھڑا تھا۔

''تم بہت گہری نیند سو رہے تھے۔ نیند خراب ہونے پر میں تم سے معذرت چاہتا ہوں لیکن میں نے ضروری سمجھا کہ موجودہ صورتِ حال میں تمہیں حالات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔'' سلیمان کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی بہت بڑی خبر لے کر آیا ہے۔

''اتنی متکلف گفتگو نہ کرو۔ میں خود بھی سمجھ سکتا ہوں کہ اتنی رات گئے تم بلاوجہ میری نیند خراب کرنے نہیں آسکتے۔ اگر آ بھی جاؤ تو ایک دوست کی حیثیت سے میں ہمیشہ کھلے بازوؤں سے تمہارا استقبال کروں گا۔'' وہ سلیمان کا ہاتھ تھام کر اسے کمرے کے اندر لے آیا اور چند شمعیں روشن کیں۔

''اب اطمینان سے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے جو تم اتنے بے چین اور بے قرار ہو؟''

''دو بری خبریں ہیں۔ سمجھ نہیں آتا کہ پہلے کون سی سناؤں۔'' سلیمان نے اپنی پیشانی رگڑی۔

''جو چاہے سنا دو۔ میرے نزدیک میری اور میرے کسی بہت پیارے کی موت کی خبر کے علاوہ کوئی خبر اتنی بُری نہیں کہ جسے سننا مشکل ہو۔ موت ایک ایسی شے ہے جس کا انسان کے پاس کوئی حل نہیں اس کے علاوہ تو ہر بری خبر کے بعد انسان کے پاس یہ گنجائش ہوتی ہے کہ وہ دعا، کوشش اور جدوجہد سے حالات کو پلٹ کر اپنے لیے بہتری کی صورت پیدا کر سکے۔''

''واللہ، بہت شاندار بات کہی ہے تم نے۔ واقعی بُرے حالات سے مقابلہ کرنے کی تو واقعی ہر وقت انسان کے پاس گنجائش ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا یہ طرزِ فکر امیر کو بہت سہارا دے گا۔'' اس کی بات سن کر سلیمان نے بے اختیار داد دی تو وہ مسکرا دیا۔

''اس کا مطلب ہے بُری خبر کا تعلق امیر سے ہے۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' سلیمان نے اس کے اندازے کی تصدیق کی پھر خود ہی بتانے لگا۔

''کچھ گھنٹے قبل ہی اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ پچھلے عرصے میں ابوبکیٰ نے امیر کی اجازت سے جس قدر بھی اسلحہ و بارود وغیرہ خریدا تھا، وہ اسلحہ خانے میں موجود نہیں ہے۔ ابوبکیٰ کے ماتحت کام کرنے والے طاہر سے پوچھ گچھ پر انکشاف ہوا ہے کہ ابوبکیٰ خریدا ہوا اسلحہ، اسلحہ خانے میں جمع کروانے کے بجائے کسی دوسرے مقام پر ذخیرہ کرتا رہا تھا۔ طاہر کو اس مقام کے بارے میں معلوم تھا لیکن جب اس کی راہنمائی میں سپاہی وہاں پہنچے تو کچھ بھی نہیں مل سکا۔ یقینی طور پر ابوبکیٰ نے موقع کا فائدہ اٹھا کر سارا اسلحہ دوسری جگہ منتقل کروا لیا ہے۔''

''میرے خیال میں مجھے صحرا سے گرفتار کر کے ابوبکیٰ تک پہنچانے والا شخص طاہر ہی تھا۔'' طاہر، نام سن کر اسے چھریرے بدن اور خوب صورت آنکھوں والا خوش رو نوجوان یاد آ گیا۔

''میں اس بات سے واقف نہیں، البتہ طاہر کو ایک شریف اور محنتی نوجوان کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ وہ بغیر حیل و حجت کے فرمانبرداری سے احکامات کی پابندی کرنے اور اَن تھک محنت کرنے والا انسان ہے۔'' سلیمان نے جواب دیا۔

''کیا طاہر کو بھی ابوبکیٰ کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ہی گرفتار کیا گیا تھا؟''

''نہیں، طاہر اس واقعے کے وقت رخصت پر تھا۔ اس کے گھر سے اس کی والدہ کی بیماری کا خط آیا تھا اور بقول اس کے ابوبکیٰ نے ازراہِ ہمدردی از خود اسے چھٹی عنایت کر دی تھی۔ وہ چھٹی گزار کر اپنی ملازمت پر واپس آیا تو اسے گرفتار کر لیا گیا اور تفتیش کی گئی کہ آیا وہ ابوبکیٰ کی کسی سازش سے واقف ہے یا نہیں تو اس نے اسلحے کے بارے میں انکشاف کیا لیکن اس کے بیان کے مطابق ابوبکیٰ نے اسے بتایا تھا کہ اسلحہ امیر کے حکم پر ہی دوسرے مقام پر ذخیرہ کیا جا رہا ہے۔''

''لگتا ہے ابوبکیٰ اوپر سے نیچے تک سب کو دھوکا ہی دیتا رہا ہے۔'' ساشا نے سن کر تبصرہ کیا۔

''وہ ہے ہی بہت مکار شخص۔ اپنے پیچھے بہت سے لوگوں کو پھنسا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو واقعی اس کے ساتھ شامل تھے لیکن بیشتر وہ ہیں جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے مارے گئے اور جنہوں نے ابوبکیٰ کے ہر حکم کی تعمیل

صرف یہ سوچ کر کی کہ وہ امیر کا خاص ترین آدمی ہے۔ جس کا حکم ماننے سے انکار کرنا براہِ راست امیر کی نافرمانی تصور کی جائے گی۔"

سلیمان نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔ گرفتار شدگان کے ساتھ امیر کے حکم پر جو بلاتفریق ظلم و ستم ڈھائے گئے تھے، ان کی وجہ سے اس کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ یہ تو ہو گئی پہلی بُری خبر جس پر میرا تبصرہ یہ ہے کہ اسلحہ غائب ہو جانا اتنی بڑی بات نہیں۔ انسان کے اندر حوصلہ اور عزم ہو تو وہ قلیل تعداد اور اسلحے کی کمی کے باوجود بھی حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہم ابوبکیٰ سے وہ غائب کیا ہوا اسلحہ دوبارہ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر امیر محترم اجازت دیں تو میں اس سلسلے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کو تیار ہوں۔" ساشا نے اطمینان سے کہا تو سلیمان نے اسے رشک سے دیکھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا شخص زبانی کلامی بڑ کیں نہیں مار رہا بلکہ جو کہہ رہا ہے یقیناً اس پر عمل کرنے کی پوری پوری صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ایسے ساشا کا دل دہلا دینے والی چیخ کے ساتھ بپھرے ہوئے ہاتھی پر حملہ کرنے کا منظر اچھی طرح یاد تھا۔

"میں تمہاری یہ پیشکش امیر محترم تک پہنچا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں تمہاری صلاحیتوں کے اظہار کا پورا پورا موقع دیں گے۔"

"میں ان کے لیے یہ خدمت انجام دینے میں خوشی محسوس کروں گا۔ اب تم مجھے دوسرا مسئلہ یا بقول تمہارے بُری خبر بھی سنا ڈالو۔" ساشا نے بے نیازی سے کہا تو سلیمان نے گلا کھنکھارتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"دوسرا مسئلہ امیر کے لیے پہلے مسئلے سے کہیں زیادہ نازک اور تکلیف دہ ہے۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگاؤ کہ اس بری خبر کے علم میں آتے ہی ان کی حالت اس بری طرح بگڑ گئی تھی کہ استاد محترم اب بھی مستقل ان کے ساتھ ہیں اور علاج معالجے کے علاوہ حوصلہ افزا کلمات کے ذریعے بھی انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" سلیمان کی بات سن کر اسے بے اختیار وہ دو آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں یاد آئیں جن سے لوئیس کا دردناک انجام نہیں دیکھا گیا تھا اور صدمے کی شدت سے وہ جھیل سی آنکھیں یوں بند ہو گئی تھیں کہ وہ دلربا اپنے ہوش و حواس کھو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ بے ہوشی کا اندازہ بھی اس نے دور سے دیکھ کر ہی لگایا تھا۔ کیا خبر کہ ان لمحات میں اس کا دل ہی بند ہو گیا ہو اور اولاد کا غم تو بڑوں بڑوں کو ہلا دیتا ہے۔

"ایسا کون سا صدمہ پہنچا ہے امیر کو کہ ان کی طبیعت اس حد تک بگڑ گئی ہے؟" اس کے لیے اپنے لہجے کی بے نیازی کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ بھلے سے سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان، بڑے سخت ماحول میں اس کی تربیت کی گئی تھی لیکن تھا تو وہ بہرحال انسان ہی جسے ایک کمزور سی لڑکی کے نرم و نازک احساسات کچل دیے جانے کا خیال کچوکے لگاتا تھا۔ کہیں نہ کہیں وہ خود بھی اس لڑکی کا مجرم تھا۔

"وہ نایاب نقشہ جس کی امیر محترم کے آباء نسل در نسل حفاظت کرتے چلے آ رہے تھے، ان کی تحویل سے نکل گیا ہے اور یہ اتنا بڑا نقصان ہے کہ امیر محترم کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے۔" سلیمان کی دی اطلاع حیران کن تھی۔

"مگر ایسا ہوا کیسے؟ میری معلومات کے مطابق تو اس نقشے کو بے حد حفاظت سے کسی انتہائی خفیہ مقام پر رکھا گیا تھا اور ابوبکیٰ امیر کے اتنے قریب ہونے کے باوجود اس مقام کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ خود لوئیس نے بھی اس بارے میں کسی کو معلومات فراہم نہیں کی تھیں۔" سلیمان کا کیا یہ انکشاف واقعی متاثر کن تھا چنانچہ ساشا کی حیرت بھی حقیقی تھی۔

"نقشے کو باہر سے کسی نے نہیں چرایا بلکہ وہ شخص ہی چرا کر لے گیا ہے جسے اس کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا؟"

"کون تھا وہ شخص؟"

"ایک مخنث..... جو برسوں سے نقشے کی حفاظت کرتا چلا آ رہا تھا۔ امیر سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ہر نسل میں نقشے کی حفاظت کے لیے مخنث ہی مقرر کیے جاتے رہے تھے اور ان میں سے کبھی کسی نے انہیں دھوکا نہیں دیا تھا۔ وہ صبر شکر کے ساتھ ایک مقدس فریضے کی طرح یہ خدمت انجام دیتے تھے اور موت آنے پر ہی انہیں سبکدوش کیا جاتا تھا۔ موجودہ شخص امیر کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ بھروسا تھا اور انہیں اس کے کسی طرزِ عمل سے گمان نہ گزرا تھا کہ وہ کبھی انہیں دھوکا دے سکتا ہے۔ یہاں تک کہ نقشہ چوری کرنے کے ارادے سے خفیہ تہ خانے تک پہنچنے والے لوئیس کو بھی اس کے ہاتھوں سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ تمہاری فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں امیر محترم نے اسے پہلے ہی سے لوئیس کی آمد کے بارے میں باخبر کر دیا تھا اور اس نے لوئیس کے ساتھ وہ سلوک کیا تھا جس سے امیر محترم کا دل خوش ہو گیا تھا۔" سلیمان نے اسے ان تفصیلات سے آگاہ کیا جو خود اس کے علم میں بھی ابھی آئی تھیں۔

"قصر میں سارا وقت اتنا سخت پہرا ہوتا ہے، اس شخص کو نقشہ چرا کر فرار ہونے کا موقع کیسے ملا؟" اس نے

منطقی انداز میں سوچنا شروع کیا تو اسے لگا کہ قصر میں یقیناً کچھ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے چور کو یہاں سے نکلنے میں مدد فراہم کی ہوگی۔ ان لوگوں تک رسائی حاصل کر کے چور تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔

''اس سلسلے میں تحقیقات کی جارہی ہیں لیکن امیر محترم کا ذاتی خیال ہے کہ اس نے کسی طرح قصر سے نکلنے کا وہ خفیہ راستہ دریافت کرلیا تھا جو امیر محترم کے علاوہ کسی کے بھی علم میں نہیں تھا۔''

''امیر محترم کو چوری اور فرار کا علم کب اور کیسے ہوا؟'' اس نے سلیمان کی بات غور سے سنی اور اگلا سوال کیا۔

''جیسا کہ تم خود بھی جانتے ہو کہ موجودہ وقت ایک خاص وقت ہے جس میں امیر محترم کے آباء کی وصیت کے مطابق نقشے کا راز سامنے آنے والا تھا۔ وقت قریب محسوس کر کے امیر محترم ان دنوں بذاتِ خود نقشہ دیکھنے کے لیے روزانہ خفیہ تہ خانے تک جاتے تھے۔ آج وہ وہاں گئے تو محافظ نقشے سمیت غائب تھا اور امیر کا ایک وفادار ملازم اختر تہ خانے میں مردہ پڑا ہوا تھا۔''

''ملازم..... مطلب امیر کے علاوہ بھی کسی اور شخص کو خفیہ تہ خانے کے بارے میں علم تھا؟''

''لازمی سی بات ہے۔ نقشے کی حفاظت پر مامور شخص کو ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے کسی فرد کی ضرورت تو تھی لیکن اختر نہیں جانتا تھا کہ وہ جس شخص کے لیے یہ سب کر رہا ہے، اس کی اصل اہمیت کیا ہے اور اسے کس مقصد کے تحت وہاں رکھا گیا ہے۔''

''مقصد تو میں بھی نہیں سمجھ سکا۔ جب ایک ایسا خفیہ تہ خانہ موجود تھا جس کا امیر ارغل کے سوا کسی کو علم نہیں تھا تو امیر وہاں نقشہ رکھ کر مطمئن ہو سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ وقتاً فوقتاً اس جگہ جا کر نقشے کے محفوظ ہونے کی یقین دہانی کرتے رہتے۔'' اس نے معترض انداز میں اظہارِ خیال کیا۔

''تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن یہاں کچھ معاملات اتنے گنجلک ہیں کہ سوچ سوچ کر میرا اپنا دماغ تھک جاتا ہے۔ اب تم امیر کے خاندانی پس منظر ہی کو لے لو۔ ماضی میں امیر کے اجداد آتش پرست تھے۔ خاندان کے جن بزرگ سے یہ نادر نقشہ اگلی نسلوں کو منتقل ہوا، انہیں بڑے آتش کدے کے کاہن ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ انہوں نے نقشہ اپنے وارث کو منتقل کرتے ہوئے وصیت کی تھی کہ جس جگہ یہ نقشہ محفوظ کیا جائے، وہاں آگ ہر صورت جلتی رہنا چاہیے۔ آگ کے علاوہ زندگی کے باقی تینوں

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ اپریل 2020ء
کی جھلکیاں

جہاں گرد
اس مشہور سیاح کا زندگی نامہ
جس نے آدھی دنیا کا سفر کیا

وہ سنسنی خیزی پیدا کرنے
میں مہارت رکھتا تھا

معلومات حاصل کرنے والوں
کے لیے ایک دلچسپ تحریر

ایک ایسی سچ بیانی جو مدتوں یاد رہے گی

دلچسپ سفر کہانی سفر پہلا پہلا
طویل سرگزشت روسیاہ
اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے معلوماتی تحریریں

بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں،
آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے

بنیادی عناصر مٹی، ہوا اور پانی کی موجودگی کی بھی شرط تھی اور اس مقام کو صاف ستھرا اور مزین بھی ہونا چاہیے تھا۔ جب تک یہ لوگ آتش پرست رہے اس سارے اہتمام میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی۔ نقشے کا راز بھی ہر نسل کے وارث تک محدود رہا اس لیے چوری چکاری کا خدشہ پیدا نہ ہوسکا۔ مشکل تب پیش آئی جب اس خاندان نے اسلام قبول کیا۔ قبول اسلام کے بعد رہائش گاہ کے کسی حصے میں بلا جواز ہر وقت آگ روشن رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور وہ لوگ اس نادر نقشے سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے جو ایک نہ ایک دن انہیں کسی بے تحاشا اور انوکھی دولت تک پہنچانے والا تھا۔ چنانچہ خفیہ تہ خانے میں خفیہ کمرا بنانے اور اس کمرے کو ہمیشہ خفیہ رکھنے کے لیے ایسے شخص کی ضرورت پیش آئی جو مرتے دم تک وہاں رہ کر یہ خدمت انجام دیتا رہے اور انہیں اس سے کوئی خطرہ بھی نہ ہو۔ ایک مظلوم مخنث کو اس کی ابتدائی عمر سے مرتے دم تک اس خدمت کے لیے مخصوص کر دینا یقینی طور پر ایک بہترین اور بے خطر انتخاب تھا۔'' تفصیل بتاتے بتاتے سلیمان کے اپنے لہجے میں طنز در آیا۔

''نقشے کے بارے میں صرف وارث کو آگاہ کیا جاتا تھا تو پھر اتنے بہت سے لوگوں کو اس کے بارے میں کیسے علم ہوا؟''

''امیر ارغل کے والدِ محترم کی بے راہ روی کا نتیجہ..... انہوں نے ایک رات اپنی دل پسند کنیز کے سامنے شراب اور شباب کے نشے میں سب اگل دیا تھا۔'' سلیمان نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

''اور ان کی غلطی کا نتیجہ یہ ہے کہ باہر والے جو نظریں گاڑے بیٹھے ہیں، سو بیٹھے ہیں..... خود ان کے اپنے دونوں بیٹے اس نقشے کی خاطر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔'' ساشا نے مزہ لینے والے انداز میں نتیجہ اخذ کیا۔

''بڑے بیٹے کی حیثیت سے امیر ارغل اپنے والد کے وارث ہیں اور نقشے پر ان کا حق ہے۔'' سلیمان نے جھٹ اپنے امیر کی طرف داری کی۔

''میں تمہاری بات تسلیم کر لیتا ہوں لیکن فی الحال تو نقشہ امیر کے قبضے سے ہی نکل چکا ہے۔ حق کسی کا بھی ہو، اختیار اسی کا چلے گا جو نقشے پر قابض ہے۔'' اس کی دلیل ایسی تھی کہ سلیمان کے لیے انکار ممکن ہی نہیں تھا چنانچہ تائیدی انداز میں بولا۔

''یہ بات تو سب ہی سمجھتے ہیں اس لیے امیر محترم کی خواہش ہے کہ جلد از جلد نقشے کی واپسی ممکن بنائی جائے۔''

''وہ مخنث..... کیا نام ہے اس کا؟''

''خسرو۔''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ امیر محترم کو کچھ اندازہ ہے کہ فرار کے بعد خسرو کہاں کا رخ کر سکتا ہے؟''

''دو ہی امکانات ہیں۔ ابوبکیٰ یا پھر امیر سالک۔ امیر کے خیال میں اس کے امیر سالک کے پاس جانے کا زیادہ امکان ہے لیکن جس طرح اختر کی لاش خسرو کے کمرے میں پائی گئی ہے، اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ ابوبکیٰ نے اختر کے ذریعے خسرو کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ دوسری صورت میں اختر کے خسرو کے کمرے تک جانے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ وہ امیر کے اس حکم کا پابند تھا کہ سرنگ کے ابتدائی حصے میں ہی خسرو کو اس کی ضرورت کی اشیا پہنچا کر واپس پلٹ جائے۔'' سلیمان جزئیات کے ساتھ تمام تفصیلات حاصل کرنے کے بعد اس سے ملنے آیا تھا اس لیے اس کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دے رہا تھا۔

''شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے جاسوسوں کی مدد لی جاسکتی ہے۔ یقینی طور پر امیر محترم نے اپنے بھائی کے ارادوں سے باخبر رہنے کے لیے کچھ جاسوس تو مقرر کیے ہوں گے۔''

''امیر سالک کی جاسوسی کے لیے کچھ لوگ ہیں لیکن اگر خسرو فرار ہو کر ابوبکیٰ تک پہنچا ہے تو اطلاع ملنا مشکل ہو گی۔ ابوبکیٰ اس وقت امیر سفیان کی پناہ میں ہے اور امیر سفیان سے گہری دوستی کی وجہ سے کبھی اس قسم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔'' سلیمان نے جواب دیا۔

''اس مقصد کے لیے طاہر کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک مفرور کی حیثیت سے ابوبکیٰ کے پاس جا کر اس کی ہمدردیاں حاصل کر سکتا ہے۔''

''نہیں، ابوبکیٰ جیسا کائیاں شخص کبھی یقین نہیں کرے گا۔ وہ قصر کے انتظامات سے واقف ہے اور اسے معلوم ہے کہ یہاں سے کسی قیدی کا بھاگ نکلنا کتنا مشکل ہے۔'' سلیمان نے اس کی تجویز رد کر دی۔

''تو پھر طاہر کو ایلچی کی حیثیت سے وہاں بھجوانا مناسب ہوگا۔ اس کے ذریعے امیر سفیان کو یہ پیغام بھجوایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ ابوبکیٰ کو ہمارے حوالے کر دے تو دوستی کا رشتہ ایک بار پھر استوار ہو سکتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دوست خود کو حاصل ہونے والی آسودگی کے ثمرات سے دوسرے دوست کو محروم رکھے۔''

''اگر امیر سفیان نے یہ پیشکش قبول نہ کی تو؟''

UUNOVELS.COM

سلیمان نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"بے شک نہ کرے۔ طاہر کو وہاں بھجوانے کا اصل مقصد تو خسرو کا کھوج لگانا ہے۔"

"طاہر ہی کیوں؟ اس مقصد کے لیے کسی اور کو بھی بھیجا جاسکتا ہے۔"

"طاہر، ابوبکیٰ سے قریب رہا ہے۔ اسے تھوڑا سا سمجھا بجھا کر بھیجا جائے گا تو وہ ابوبکیٰ کو شیشے میں اتار کر اس سے سچائی اگلوانے میں کامیاب ہوجائے گا۔" اس نے دلیل دی۔

"ٹھیک ہے۔ میں اس سلسلے میں امیر محترم کی اجازت سے اقدامات کرتا ہوں۔ تم بھی اگلے قدم کے لیے تیار رہو۔" سلیمان اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

"کیسا قدم.....؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"راست قدم۔ نقشہ امیر سالک یا امیر سفیان جس کی بھی تحویل میں ہے، اس سے واپس حاصل کرنے کے لیے لشکر کشی کی جاسکتی ہے۔" سلیمان کی دی ہوئی اطلاع نے اس کے جسم میں سنسنی دوڑا دی اور وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

"امیر محترم اپنے دشمنوں کے خلاف مجھے پہلی صف میں پائیں گے۔"

"امیر محترم کو تمہاری بہادری اور وفاداری سے یہی امید ہے اسی لیے میں نے تمہیں نیند سے جگا کر تم تک یہ اطلاعات پہنچانا ضروری سمجھا تھا۔" سلیمان نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا اور باہر نکل گیا۔ ساشا اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ قدم رکھنے کی جگہ تو وہ پہلے ہی حاصل کرچکا تھا، اب تقدیر اسے آگے بڑھانے کے انتظامات کررہی تھی۔

☆☆☆

وسیع دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے لیکن دسترخوان پر صرف ایک فرد واحد کھانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جواں سال تھا اور شکل وصورت کے اعتبار سے بھی مناسب دکھائی دیتا تھا۔ اس کے جسم پر موجود قیمتی پوشاک اس کے خوش حال ہونے پر دلالت کررہی تھی لیکن وہ اپنے سامنے موجود کھانے پر ایسے ٹوٹا ہوا تھا، گویا صدیوں کا بھوکا ہے۔ کبھی وہ ایک ہاتھ سے مرغی کی ٹانگ بھنبھوڑتا تو کبھی دوسرے ہاتھ سے بھیڑ کے گوشت سے تیار کردہ کباب سالم منہ میں رکھ لیتا۔ منہ میں موجود نوالہ ختم ہونے سے قبل دوسرا نوالہ اندر ڈالنے کی کوشش میں کھانا مسلسل اس کے منہ سے گر کر اس کی قیمتی پوشاک کو گندا کررہا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کھانے کے علاوہ اس وقت دنیا میں کسی بھی چیز کی پروا نہیں ہے۔ اس کی خدمت پر مامور غلام اور خدمت گار زبان سے تو کچھ کہنے کی جسارت نہیں کرسکتے تھے لیکن ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ یہ کون وحشی ہے جو معزز مہمان کی صورت اس وسیع دسترخوان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

"اسے دیکھو..... وہ بھنے ہوئے گوشت کے ساتھ فیرنی کھانے کی کوشش کررہا ہے۔ جنگلی....." ایک غلام نے اپنے قریب کھڑے ساتھی کے کان میں سرگوشی کی، دوسرا جواب میں کچھ کہتا اس سے قبل دونوں ہی اپنے پیچھے آہٹ سن کر چوکنے ہوگئے۔ آنے والے کو دیکھ کر ان کا انداز مؤدبانہ ہوگیا اور سر تعظیم میں جھک گئے۔

"مہمان نے کھانے سے فراغت حاصل کرلی ہے یا نہیں؟" آنے والے نے بارعب لہجے میں دریافت کیا۔

"جی نہیں امیر محترم! ابھی وہ تناول فرما رہے ہیں۔" ایک غلام نے جواب دیا جسے سن کر آنے والا آگے بڑھ گیا اور حریری پردے کو ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے لیکن اس نے تیزی سے ان تاثرات پر قابو پالیا اور آگے بڑھ کر کھانے سے کچھ فاصلے پر براجمان ہوگیا۔ اس نے گوشت کا ایک بڑا سا پارچہ اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے اپنے قریب آبیٹھنے والے کو دیکھنے کی فرصت نکالی اور دیکھ کر شرمندہ ہوگیا۔

"معاف کیجیے گا بھائی جان! میں کئی وقت کا بھوکا ہوں اور اتنا عمدہ کھانا تو برسوں بعد نصیب ہوا ہے اس لیے اس طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا ہوں۔" اسے گویا خود بھی معلوم تھا کہ وہ نہایت غیر مہذبانہ طریقے سے کھانا کھا رہا ہے چنانچہ منہ میں موجود نوالہ جلدی جلدی چبا کر اسے پانی کی مدد سے حلق سے نیچے اتارا اور قدرے شرمندہ لہجے میں بولا۔

"مجھے تمہاری حالت کا بخوبی اندازہ ہے خسرو! میں یہاں تم پر تنقید کرنے نہیں بلکہ یہ دیکھنے آیا ہوں کہ تمہیں مزید کسی شے کی تو ضرورت نہیں ہے۔" خسرو کو نرم لہجے میں جواب دینے والا یہ شخص امیر سالک تھا۔

"مزید ضرورت....." خسرو طنزیہ لہجے میں ہنسا اور ہاتھ لہرا کر دسترخوان پر موجود اشیائے خورونوش کی طرف اشارہ کرکے بولا۔

"یہ سب اتنا زیادہ ہے کہ دیکھ کر میرے حواس جواب دے گئے ہیں اور برسوں سے ان سارے ذائقوں کو ترستی زبان ایسی ندیدی ہورہی ہے کہ میرا بس نہیں چلتا کہ

سب کچھ ایک ساتھ ہڑپ کرلوں۔''

''مجھے معلوم ہے میرے بھائی! تم برسوں ظلم و جبر کی چکی میں پستے رہے ہو۔ اگر مجھے تمہارے متعلق ذرا بھی بھنک مل جاتی تو میں سارے ادب ولحاظ بھول کر اس ظلم کے خلاف بھائی جان کے سامنے ڈٹ جاتا اور انہیں ہرگز بھی وہ نہ کرنے دیتا جو انہوں نے تمہارے ساتھ کیا۔'' امیر سالک کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

''کیا میرے کھو جانے کے بعد آپ نے کبھی مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟'' خسرو نے تڑپ کر پوچھا۔

''بہت کوشش کی تھی لیکن تمہارا کوئی سراغ ہی نہیں ملا۔ سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ تمہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ بھائی جان کے سامنے کئی بار میں تمہارے لیے رویا بھی لیکن انہوں نے سچ نہ بتایا اور مجھے یہ جھوٹی تسلیاں دیتے رہے کہ تمہیں ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ تمہارے بارے میں ان ہی کی ایک رائے یہ تھی کہ لوگوں کی طنزیہ باتوں اور نظروں سے گھبرا کر تم خود ہی ہم سب کو چھوڑ کر کہیں دور چلے گئے ہو اور اب کبھی لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ ماضی میں ان کے تمہارے ساتھ مشفقانہ سلوک کو دیکھتے ہوئے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے غیاب میں ان کا ہاتھ ہوگا۔'' امیر سالک نے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں بھی تو ان کی اسی جھوٹی محبت سے دھوکا کھا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس روز کوئی انوکھی جگہ دکھانے کا لالچ دے کر وہ مجھے ہمیشہ کے لیے قید میں ڈالنے لے جارہے ہیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ شروع کا عرصہ میں نے کس قدر سختی میں گزارا۔ مجھے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر رکھا گیا تھا اور کھانے کے لیے کھجور، خشک گوشت اور پنیر جیسی اشیا کے سوا کچھ مہیا نہ کیا جاتا تھا۔ میری زبان تازہ کھانے کا ذائقہ بھول چکی تھی اور تنہائی بھوت بن کر ڈراتی تھی.....'' بولتے بولتے اسے پھندا سا لگ گیا۔ خدمت گار امیر کا اشارہ پاکر پہلے ہی وہاں سے جاچکے تھے۔ امیر سالک نے اپنے ہاتھ سے پانی کا گلاس بھر کر اس کے منہ سے لگایا۔ اس نے دو گھونٹ پانی پی کر گلاس ہٹا دیا۔ اب اس کی توجہ کھانے پینے کی طرف سے یکسر ہٹ چکی تھی اور وہ بڑی رنجیدگی سے اپنے بیتے ہوئے ماہ وسال کی داستان سنا رہا تھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ آپ دونوں بھائیوں کی طرح میں بھی ناز ونعم میں پلا بڑھا تھا لیکن اس قید خانے میں بڑے بھائی جان کے حکم پر مجھے صفائی ستھرائی کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ آتش دان کو ہمہ وقت روشن رکھنے اور مچھلیوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری بھی ادا کرنی پڑتی تھی۔ ذرا سی بھی کوتاہی کی صورت میں وہ مجھے بے دردی سے کوڑے رسید کرتے تھے۔ ان کے ظلم وستم کے باعث آہستہ آہستہ میری مزاحمت کی طاقت جواب دے گئی اور میں بے چون وچرا کیے ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ میرے ہتھیار ڈالنے پر انہوں نے مجھ پر اتنی مہربانی کی کہ اپنے ایک معتبر ملازم اختر کو مجھے تازہ کھانا پہنچانے کی ذمے داری سونپ دی لیکن وہ، وہ کھانا نہیں ہوتا تھا جو قصر کے دیگر لوگ کھاتے تھے۔ وہ ملازمین کے لیے پکنے والا کھانا ہوتا تھا اور مجھے سال بھر میں دو چار بار ہی کوئی اچھی شے کھانے کے لیے دی جاتی تھی۔'' اس نے برسوں اس بات کا انتظار کیا تھا کہ کسی کو اپنے ساتھ بیتی سنا سکے چنانچہ آج ایک سامع میسر آیا تھا تو بولتا ہی چلا جارہا تھا۔

''میں تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ کر دوں گا میرے بھائی! میں شرمندہ ہوں کہ مجھے تمہارے خلاف ہونے والی سازش کی معمولی سن گن بھی نہ مل سکی، ورنہ تم دیکھتے کہ میں تمہارے لیے کیا کرتا۔''

''شاید میرے نصیب میں ہی یہ سب لکھا ہوا تھا۔''

خسرو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ اب تم یہاں میرے ساتھ رہو اور عیش سے زندگی گزارو۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد اپنی زندگی کا وہ بدترین حصہ ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دو گے۔ اتنے برسوں کی قید وبند اور ظلم وستم کے باوجود جس طرح تم اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب رہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آنے والے وقت میں تم کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے سکتے ہو۔'' محبت آمیز لہجے میں یہ سب بولتے ہوئے امیر سالک کی ٹٹولتی نظریں اندر تک خسرو کو کھنگالنے کی سعی کررہی تھیں۔

خسرو نے اس کی نگاہوں پر توجہ نہیں دی اور خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''شکریہ بھائی جان! آپ کی وجہ سے مجھے بہت حوصلہ ملا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد اس لائق ہوجاؤں گا کہ بڑے بھائی جان جیسے لوگ مجھ سے فقط ایک ملاقات کو بھی اپنے لیے باعثِ شرف سمجھیں گے۔''

خسرو کے الفاظ نے امیر سالک کا دل دھڑکا دیا۔ وہ دانستہ جس موضوع کو چھیڑنے سے گریز کر کے خسرو کو اپنے خلوص کا یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا، گفتگو کا رخ خود بخود ہی اس کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب بھی اس نے براہِ راست کوئی سوال نہیں کیا اور مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

''خاندانی نادر نقشے کی ملکیت حاصل کرنے کے بعد تم

یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہو میرے بھائی لیکن خیال رکھنا کہ وہ نقشہ حفاظت سے رہے۔ تم نہیں جانتے کہ بھائی جان کس قدر چالاک اور عیار انسان ہیں۔ تمہارے فرار کی خبر ہوتے ہی انہوں نے ہر طرف اپنے جاسوسوں کا جال بچھا دیا ہوگا اور انہیں کسی نہ کسی طرح اس بات کی خبر مل ہی جائے گی کہ تم میری پناہ میں ہو۔ وہ تم سے نقشہ حاصل کرنے کی خاطر زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ اگر تم چاہو تو تمہاری اور نقشے کی حفاظت کے لیے میں اپنے چند خاص آدمی مہیا کر دیتا ہوں۔"

"ارے نہیں بھائی جان، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بڑے بھائی جان کی فطرت سے خوب واقف ہوں اسی لیے یہاں آنے سے قبل ہی نقشے کو ایک جگہ محفوظ کر آیا ہوں۔" خسرو کے اطمینان نے امیر سالک کو مزید مضطرب کر دیا اور بے اختیار تیز لہجے میں بولا۔

"کہاں چھوڑ آئے ہو نقشہ؟ تمہارے پاس ایسی محفوظ جگہ کہاں سے آ گئی جہاں تم اتنی قیمتی شے کو چھپا کر رکھ سکو؟"

"آپ پریشان نہ ہوں بھائی جان اور مجھ پر بھروسا رکھیں۔ نقشہ بالکل محفوظ ہے۔ چند دنوں کے آرام اور تیاری کے بعد میں اس لائق ہو جاؤں گا کہ نقشے کی نشانیوں کے مطابق اس خزانے کی کھوج میں نکل سکوں جس کا ہم نسلوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کو مجھ پر بس اتنی مہربانی کرنی ہوگی کہ اس مہم پر جانے کے لیے مجھے وسائل مہیا کر دیں۔ آپ جانتے ہیں کہ فی الحال میں بالکل خالی ہاتھ ہوں لیکن مہم کی کامیابی کے بعد آپ کو اتنا معقول حصہ دینے کے لائق ہو جاؤں گا کہ آپ اپنے لیے ہمارے خاندانی قصر سے بھی بڑا اور عمدہ قصر بنوا سکیں گے۔" روانی سے بولتے ہوئے خسرو کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے الفاظ سے امیر سالک پر کیا گزر رہی ہے۔ امیر نے بھی کمال مہارت سے اپنے دلی جذبات چھپا لیے اور منافقانہ لہجے میں بولا۔

"تمہیں کسی بات کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہ صرف تمہیں اس مہم کے لیے اسباب فراہم کروں گا بلکہ خود بھی تمہاری حوصلہ افزائی کے لیے تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گا۔"

"بہت شکریہ بھائی جان لیکن میں آپ کو اس قدر زحمت دینا پسند نہیں کروں گا۔ بس چند مخلص اور محنتی ساتھیوں اور زادِ راہ کی فراہمی کا احسان بھی میرے لیے بہت ہوگا۔" خسرو کا لہجہ مؤدبانہ تھا لیکن اس میں موجود گریز کو سالک نے بخوبی محسوس کیا اور پہلو بدل کر بولا۔

"اس میں احسان کی کیا بات ہے بے وقوف! میں تمہارا بھائی ہوں اور ضرورت کے وقت ایک بھائی کا دوسرے بھائی کے کام آنا عین فرض ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ خزانے تک رسائی کی مہم کتنی مشکل اور خطرناک ثابت ہو۔ میں تمہیں تنہا کسی خطرے کے منہ میں نہیں بھیج سکتا۔ پہلے ہی تم اتنے برسوں کی جدائی کے بعد مجھے ملے ہو۔"

"میں تنہا کب جاؤں گا؟ آپ کے وفادار ہوں گے نا میرے ساتھ؟"

"اس موضوع پر ہم بعد میں تفصیل سے بات کریں گے، ابھی بہتر ہے کہ تم اچھی طرح آرام کر کے اپنی تھکن اتارو اور خوب جان بنا کر خود کو درپیش مہم کے لیے تیار کرو۔" امیر سالک نے اس کی بات کو خاطر میں لائے بغیر اسے جواب دیا اور زور سے تالی بجائی۔ فوراً ہی ایک خادم طعام گاہ میں داخل ہوا۔

"امیر خسرو کو ان کے لیے تیار کی گئی خواب گاہ میں پہنچا دو اور ان کا ہر ممکن خیال رکھو۔ اس سلسلے میں کوئی شکایت یا کوتاہی ناقابلِ معافی ہوگی۔" پُرجلال لہجے میں خدمت گار کو دیے گئے اس حکم کے بعد خسرو کے پاس بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بے بسی سے ہونٹ چباتا ہوا خدمت گار کی راہنمائی میں چل پڑا۔ اس کے جانے کے بعد امیر سالک بھی سوچوں میں گھرا اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ وہاں اس کی چہیتی بیوی صفیہ اس کی منتظر تھی۔ صفیہ بے تحاشا گوری رنگت اور بڑی بڑی آنکھوں والی عورت تھی جو اپنی دراز قامت کے باعث فربہ جسم کے باوجود بری نہیں لگتی تھی بلکہ اس کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جن پر ہر لباس اور ہر رنگ جچتا ہے۔ گوری رنگت کے علاوہ اس کے سنہرے بال بھی اس کی شخصیت کا ایک اہم جزو تھے۔ حقیقتاً اس خطے میں صفیہ جیسا رنگ و روپ رکھنے والی عورتیں نہیں پائی جاتی تھیں۔ امیر سالک اسے باہر سے بیاہ کر لایا تھا اور اردگرد کی عورتوں سے مختلف دکھائی دینے والی صفیہ شادی کے برسوں بعد بھی اس کے دل پر راج کرتی تھی۔

"کیا ہوا امیر! کوئی کامیابی حاصل ہوئی؟" امیر سالک کو خواب گاہ میں آتا دیکھ کر وہ تیزی سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور بے قراری سے پوچھا۔

"فی الحال تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ زنخا خسرو بہت چالاک ہے۔ نقشہ میرے حوالے کرنا تو دور کی بات، وہ تو مجھے اس کی ہوا بھی لگانے کو تیار نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس وسائل ہوتے تو بھول کر بھی یہاں کا رخ نہ کرتا۔" امیر سالک نے تھکے تھکے لہجے میں صفیہ کو حالات سے آگاہ کیا۔

''تو آپ کو بھی کیا ضرورت ہے اس کے اتنے لاڈ نخرے اٹھانے کی۔ ستون سے باندھ کر جسم پر اتنے کوڑے لگوائیں کہ خود ہی سارا سچ اگل دے۔'' صفیہ نے بے رحمی سے مشورہ دیا۔

''نہیں۔'' امیر سالک نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس طریقے سے ہم کچھ بھی معلوم نہیں کر سکیں گے۔ میں اس کا بھائی ہوں اور اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اگر میں نے اس کے ساتھ زبردستی کی تو وہ بری طرح اڑ جائے گا۔ وہ بچپن ہی سے بے حد ہٹ دھرم ہے۔''

''پھر آپ کیا کریں گے؟ نقشہ تو بہر حال ہمیں اس سے حاصل کرنا ہی ہے۔'' صفیہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔ وہ فضول خرچ عورت تھی اور اس کے ذاتی اخراجات ہی اتنے زیادہ تھے کہ وہ امیر سالک کے وسائل کو اپنے لیے ناکافی سمجھتی تھی۔

''فی الحال تو میں اسے پیار محبت سے شیشے میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم بھی اس کا خیال رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ وہ برسوں سے محرومی کا شکار ہے، ہو سکتا ہے ہماری محبت اور توجہ اسے ہم سے اتنا قریب کر دے کہ وہ ہم پر بھروسا کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔'' اس نے بیوی کو سمجھایا۔

''لیکن آپ کا تو کہنا ہے کہ وہ بہت ذہین اور چالاک ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری محبت کے پیچھے چھپی غرض کو سمجھ جائے۔'' صفیہ نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے۔ میں بچپن میں بھی اس کی ذہانت کو محسوس کرتا تھا اور اب بھائی جان کی قید سے نقشے سمیت بھاگ نکل کر اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ خطرناک حد تک ذہین ہے۔ تم اس کی اعصابی مضبوطی کا اندازہ اس بات سے کرو کہ اتنے برس قید میں رہنے کے باوجود اس نے اپنا ذہنی توازن قائم رکھا۔ معمولی غذا کے باوجود جسمانی صحت برقرار رکھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دل میں بھائی جان کے خلاف کدورت رکھنے کے باوجود اپنے رویے سے انہیں اس حد تک قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ انہوں نے نہ صرف اسے بیڑیوں سے آزاد کر دیا بلکہ کبھی کبھی ہونے والی ملاقاتوں میں حالاتِ حاضرہ سے بھی آگاہ کرتے رہے۔ خسرو جانتا تھا کہ بھائی جان کو میری نیت پر شک تھا اس لیے انہوں نے مجھے قصر سے نکال دیا ہے اور اب میں باغوں والی زمین پر مقیم ہوں۔ تم اندازہ کرو کہ وہ برسوں پہلے جبکہ اس کی عمر آٹھ دس سال سے زیادہ نہیں تھی، اس جگہ آیا تھا لیکن قصر سے فرار ہو کر یہاں پہنچنے میں اسے بہت زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور وہ بغیر سواری اور راہنمائی کے تنہا یہاں پہنچ گیا۔''

''واقعی اس بات نے تو مجھے بھی حیران کر دیا تھا کہ وہ کیسے سیدھا یہاں چلا آیا ورنہ اتنا زیادہ فاصلہ پیدل طے کرنا مذاق نہیں ہے۔ اوپر سے راستے بھی اتنے گنجلک ہیں کہ عام شخص کو دو چار بار میں یاد ہی نہیں ہو پاتے۔'' اس کی بات سن کر صفیہ نے تبصرہ کیا۔

''کہتے ہیں کہ اللہ جب کسی شخص میں ایک کمی رکھتا ہے تو بدلے میں کوئی دوسری صلاحیت بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ لگتا ہے خسرو جیسے ادھورے انسان کو ذہانت سے نواز کر اللہ نے حساب برابر کیا ہے۔''

''کیا فائدہ ایسی ذہانت کا جو کسی زنخے کی کھوپڑی میں ہو۔ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اگر وہ خزانے تک پہنچ کر اسے حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو اس سے کیا فیض پائے گا۔ مال و دولت تو آدمی اپنی آل اولاد کے لیے اکٹھی کرتا ہے اور خسرو کی آل اولاد تو ہونے سے رہی۔ بے چارہ زنخا.....'' اپنی بات کے اختتام پر زوردار قہقہہ لگا کر ہنستی صفیہ کے حسن کے ساتھ ساتھ بے رحمی میں بھی کوئی کلام نہیں تھا۔

☆☆☆

''اہلِ قافلہ بہت تھک گئے ہیں اخی! کیا رک کر تھوڑی دیر انہیں آرام کا موقع دے سکتے ہیں؟'' داؤد بوڑھے راہنما کے ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ پیچھے سے عبدالمالک گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے قریب آیا اور کچھ جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''ابھی رکنے میں خطرہ ہے عبدالمالک۔ ابھی ہم اتنے آگے نہیں آئے ہیں کہ اگر کوئی ہماری بو سونگھتا ہوا اس طرف آ نکلے تو اسے ہم تک پہنچنا دشوار ہو۔''

''وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اخی لیکن اکثر عورتوں، بچوں اور بوڑھے حضرات کے لیے یہ سفر بہت کٹھن ثابت ہو رہا ہے۔ انہیں آرام کے لیے مناسب وقت نہ دیا گیا تو ان کے لیے آگے بڑھنا بہت دشوار ہو جائے گا۔'' اس کا جواب سن کر بھی عبدالمالک اہلِ قافلہ کے لیے مزید سفارش کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''مجھے ان کی تکلیف کا احساس ہے لیکن اس وقت میرے لیے ان کی تکلیف سے زیادہ ان کا تحفظ اہم ہے۔ میری چھٹی حس مجھے احساس دلا رہی ہے کہ ابھی ہم خطرے کی حد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ خطرے سے نکل جانے کا اطمینان ہوئے بغیر میں پڑاؤ کا فیصلہ کر کے سنگین غلطی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔'' اس کا جواب اب بھی انکار میں ہی تھا۔

JUNOVELS.COM

''لیکن اخی.....''

''کوئی لیکن ویکن نہیں عبدالمالک۔ جاؤ اور لوگوں کو سمجھاؤ کہ رکنا موت کو دعوت دینا ہے اور میں اپنے لوگوں کو موت کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' اس بار اس کا لہجہ سخت اور دوٹوک تھا۔ عبدالمالک کی ہمت نہیں ہو سکی کہ مزید اصرار کر سکے۔ اس نے گھوڑے کی رفتار ہلکی کی اور داؤد سے پیچھے رہ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پیچھے سے آنے والے دو گھڑسوار اس سے آملے۔ یہ ثریا اور سارہ تھیں۔

''کیوں کیا کہا اخی نے؟'' ثریا نے عبدالمالک سے دریافت کیا۔

''وہ رکنے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محفوظ فاصلہ طے کیے بغیر پڑاؤ ڈالنا اہلِ قافلہ کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف ہوگا۔'' اس نے مختصراً اپنے اور داؤد کے درمیان ہونے والی گفتگو سے انہیں آگاہ کیا۔

''اور مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم یونہی چلتے رہے تو قافلے کے کمزور افراد اپنی سواریوں سے گر گر کر ہلاک ہونے لگیں گے۔'' سارہ نے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا۔

''میں اخی کی چھٹی حس پر بہت یقین رکھتا ہوں۔ اگر وہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے تو مجھے یقین ہے کہ واقعی خطرہ ہمارے تعاقب میں ہوگا۔'' عبدالمالک نے داؤد کی طرف داری میں آواز اٹھائی۔

''ایک شخص کی رائے پر اتنے بہت سارے لوگوں کا مطالبہ رد کر دینا بھی مناسب نہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ کمزور ہونے کے باوجود اب تک بہت ہمت سے کام لیتے آئے ہیں اور اس وقت اگر ان کی طرف سے پڑاؤ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ اب ان کی ہمت جواب دے چکی ہے۔'' سارہ کی ساری ہمدردیاں مسافروں کے ساتھ تھیں۔ اس ہمدردی میں وہ اتنی آگے بڑھی کہ داؤد کا خود کو قافلے میں شامل کرنے کا احسان بھول کر اعلان کرنے والے لہجے میں بولی۔

''میں خود جا کر داؤد سے بات کرتی ہوں۔ انہیں اکثریت کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا۔''

''لیکن سارہ!'' ثریا نے اسے روکنے کے لیے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ سنے بغیر ہی ہوا ہو چکی تھی۔ جلد ہی اس نے داؤد کو جا لیا۔

''میرے خیال میں آپ کو اپنے توہمات کو برطرف رکھ کر اہلِ قافلہ کی پڑاؤ کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔'' اس نے بغیر کسی تمہید کے براہِ راست گفتگو کا آغاز کر دیا تھا۔

چار دن سے

بیوی شوہر سے۔ ''آپ جب پودوں کو پانی دے لو گے تو میں نے آپ سے ایک چیز کے بارے میں بات کرنی ہے جو کہ میں نے آپ کے موبائل میں دیکھی ہے۔''

اب چار دن سے بھی زیادہ کا وقت ہو گیا ہے۔ شوہر اب بھی پودوں کو پانی دے رہا ہے۔

وقت

وقت نہیں رکتا لیکن کہیں نہ کہیں ہم رک جاتے ہیں۔ سرخ اینٹوں سے بنے کسی آنگن میں کہیں باورچی خانے میں چولہے کے پاس کب لمحے ہمیں قید کر لیتے ہیں۔ کوئی چائے کی پیالی ایسی ہوتی ہے جس کا ذائقہ زبان کبھی بھول نہیں پاتی۔ کوئی سرگوشی، کوئی مسکراہٹ، کوئی مہک، کوئی قہقہہ، کوئی آنسو، کوئی سناٹا تمام عمر کے لیے زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پرانی یادوں پر نئی یادیں سجانا درحقیقت مشکل امر ہے۔ جبھی تو ہم تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور زندگی مسکراتی ہوئی پاس سے گزر جاتی ہے۔

بجلی کا بل

یہ اس دن کا واقعہ ہے جب ابا جان نے مجھے بہت مارا۔ ہوا کچھ یوں کہ ابا جان نے مجھے بجلی کا بل جمع کروانے بھیجا اور میں نے ان پیسوں سے لاٹری کا ٹکٹ خرید لیا۔ گاڑی انعام میں رکھی گئی تھی۔ جب گھر پہنچ کر ابا جان کو صورتِ حال بتائی تو بہت مار پڑی لیکن اگلے دن جب صبح صبح سب سو کر اٹھے تو دروازے پر کھڑی گاڑی دیکھ کر سب کی چیخیں نکل گئیں۔ سب سے زیادہ میری چیخیں بلند تھیں کیونکہ گاڑی واپڈا والوں کی تھی جو میٹر کاٹنے آئے تھے۔ ابا جان نے دوبارہ مجھے بہت مارا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

UUNOVELS.COM

''تم میرے ایک مناسب فیصلے کو توہمات سے جوڑ کر اس کی مخالفت کا حق نہیں رکھتی ہو لڑکی! میں اس قافلے کا امیر ہوں اور بہتر فیصلہ کر سکتا ہوں کہ ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔'' اس کے انداز کو محسوس کرتے ہوئے داؤد نے اسے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''کثرت رائے کے خلاف کیا جانے والا فیصلہ محض انا پرستی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' سارہ ترنت بولی۔

''تم جسے انا پرستی کہہ رہی ہو، وہ انا پرستی نہیں تجربے کی بنیاد پر کیا جانے والا فیصلہ ہے۔ اس قافلے میں شامل لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ تاتاریوں کا تجربہ ہے۔ میں اپنے خاندان کا وہ آخری مرد ہوں جس نے خوارزم شاہ کی کمان میں تاتاریوں کا مقابلہ کیا ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کس قدر خونخوار اور مکار قوم ہے۔ میں اپنے تعاقب میں ان کے قدموں کی آہٹیں سن سکتا ہوں۔'' وہ اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ پر تاتاریوں کا خوف ایک بھوت بن کر سوار ہو اور آپ اپنے اس خوف کے پیچھے سب کو بے وجہ خوار کر رہے ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ جو دو افراد عبدالمالک کا پیچھا کر کے ہمارے قافلے تک پہنچنے کے نتیجے میں اپنے انجام تک پہنچے ہیں، ان کے سوا بھی کوئی تاتاری جاسوس بستی میں موجود ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو ان میں سے کسی کو اپنے ساتھیوں کی خبر لینے کے لیے ہماری روانگی سے قبل ہی ہم تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''تمہاری دلیل بے وزن نہیں۔ میں خود بھی حیران ہوں کہ کوئی ہم تک کیوں نہیں پہنچا لیکن اس ایک بات سے میں یہ نہیں سوچ سکتا کہ ہمیں تاتاریوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ جلد یا بدیر اپنے ساتھیوں کے انجام سے باخبر ہو کر ہمارے تعاقب میں ضرور نکلیں گے۔ میں بہت اچھی طرح ان کی فطرت جانتا ہوں۔ وہ آخری دم تک اپنے شکار کا پیچھا کرنے والی قوم ہے۔''

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، مفروضات کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں جبکہ میرے مطالبے کی بنیاد حقائق پر ہے۔ قافلے میں کئی لوگوں کی حالت اتنی خراب ہے کہ مجھے ڈر ہے وہ مزید چلتے رہنے کے بجائے بے دم ہو کر گر جائیں گے۔'' وہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر داؤد سے اتنی بحث کر رہی تھی۔ داؤد نے پہلے اسے گھورا پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔

''دیکھیے خاتون! میں آپ کے جذبات کو سمجھ رہا ہوں لیکن یقین کیجیے میں بھی اپنی قوم کا دشمن نہیں ہوں۔ میں انہیں مصیبت سے بچانے کے لیے اس تکلیف سے گزار رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ گزر سکتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر توانائی کا ایک پوشیدہ خزینہ بھی ہوتا ہے جس سے وہ عام حالات میں واقف بھی نہیں ہوتا لیکن غیر معمولی حالات میں قدرت خود اسے اس پوشیدہ خزینے کو استعمال کرنے پر اکساتی ہے تم آج ان لوگوں کو توانائی کا وہ پوشیدہ خزینہ استعمال کرنے دو۔'' اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ سارہ کو لگا اب وہ اس سے مزید بحث نہیں کر سکے گی۔ مزید کسی دلیل کے لیے وہ اپنے ذہن کو کھنگال ہی رہی تھی کہ پیچھے سے کچھ شور و غل سنائی دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ لوگ مڑ مڑ کر ایک دوسرے سے وجہ جاننے کی کوشش کرنے لگے۔ سارہ اور داؤد نے بھی اپنے گھوڑے روک لیے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پیچھے آنے والے افراد جن میں بیشتر تعداد خواتین کی تھی، کسی وجہ سے آگے بڑھنا چھوڑ کر رک چکے ہیں۔ داؤد نے بے چینی کی کیفیت میں گھوڑے کا رخ موڑ کر اسے پیچھے کی جانب دوڑانا شروع کر دیا۔ اس نے قافلے کے پچھلے حصے میں بھی چند نوجوانوں کو رکھا تھا جن کے ذمے پشت پر سے قافلے کی حفاظت کے علاوہ عقب میں تاتاریوں کی آہٹ سن کر خطرے سے آگاہ کرنے کا کام بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے ان کے پاس ایسے باجے موجود تھے جنہیں منہ سے لگا کر زور سے بجایا جاتا تو آواز دور دور تک پھیل جاتی۔ اسے کسی کے باجا بجانے کی آواز تو سنائی نہیں دی تھی اس لیے حملے کا اندیشہ نہیں تھا لیکن امیر قافلہ کی حیثیت سے معمولی سے معمولی گڑبڑ کے بارے میں جاننا بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا اس لیے پیچھے مڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اپنے گھوڑے پر سوار سارہ بھی اس کی پیروی کر رہی تھی۔

کچھ دور تک چلنے کے بعد انہیں ایک جگہ ہجوم دیکھ کر رکنا پڑا۔ اس ہجوم میں زیادہ تر مرد اور بچے شامل تھے جبکہ خواتین پیچھے مزید فاصلے پر ایک دائرے کی صورت اکٹھی تھیں اور لگتا تھا اس دائرے میں انہوں نے کسی کو گھیر رکھا ہے۔ ان سب کے بیک وقت بولنے سے اچھا خاصا شور بپا ہو گیا تھا پھر بھی ایک عورت کی درد میں ڈوبی چیخیں الگ ہی محسوس ہو رہی تھیں۔ داؤد کے دیکھتے ہی دیکھتے عورتوں نے چادریں اور اوڑھنیاں نکال کر پھیلانا شروع کر دیں۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے مضطرب سے لہجے میں ایک ادھیڑ عمر کے مرد سے پوچھا۔ سارہ البتہ رک کر گفتگو میں شریک ہونے کے بجائے خود حالات جاننے کے لیے آگے بڑھ گئی تھی۔ عورتوں کے دائرے کے قریب پہنچ کر

اس کی نظر ثریا پر پڑی تو وہ سیدھی اس کے پاس جا پہنچی۔
''کیا بات ہے؟ تم لوگ یہاں کیوں رکے ہوئے ہو؟''
وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اتری اور ثریا سے پوچھا۔
''طیبہ نامی ایک عورت کی طبیعت بہت بگڑ گئی ہے۔''
ثریا نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے اطلاع دی۔
''میں یہی بات تمہارے اخی کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے اسی بات کا ڈر تھا کہ اگر ہم نے یونہی سفر جاری رکھا تو کمزور لوگ چکرا چکرا کر گرنے لگیں گے۔''
''طیبہ کا مسئلہ کمزوری نہیں ہے۔'' ثریا نے اس کی تنقید سن کر تحمل سے اسے ٹوکا۔
''پھر..... پھر کیا مسئلہ ہے' میرا خیال ہے میں خود ہی جا کر دیکھتی ہوں۔'' اس نے عورتوں کے دائرے کو توڑ کر اس طرف جانے کی کوشش کی جہاں چادروں کو خیمے کے سے انداز میں تان دیا گیا تھا۔
''رک جاؤ سارہ! میرے خیال میں تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ طیبہ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے وہاں دائی زبیدہ کے علاوہ دیگر تجربہ کار خواتین موجود ہیں۔'' ثریا نے اسے کہنی سے پکڑ کر روکا اور آہستہ سے آگاہ کیا۔ سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ پھر آہستہ سے بولی۔
''مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسی عورت بھی سفر کر رہی ہے۔ ایسی حالت میں اتنا دشوار سفر کرنے کے بجائے اسے اگلے کسی قافلے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔''
''فیصلے پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ وہ ایک یتیم لڑکی ہے جس کے شوہر کے محاذ پر جانے کے بعد سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں مل سکی ہے۔ سسرالی عزیزوں میں بھی صرف ایک بوڑھی ساس اور جیٹھ کا خاندان باقی بچے ہیں۔ جیٹھ مزید رک کر اپنے بیوی بچوں کی زندگی خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھے اور بوڑھی ساس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ جوان بہو کے ساتھ کسی مصیبت کا تنہا سامنا کر سکے اس لیے مجبوراً طیبہ کو اس قافلے میں شامل ہونا پڑا۔'' ثریا نے اس کے اعتراض کا جواب دیا۔
''قافلے میں موجود دائی کو تو دھیان رکھنا چاہیے تھا کہ بچے کی پیدائش کا وقت قریب ہے اور دو انسانی زندگیوں کو بچانے کے لیے قافلے کو روک کر پڑاؤ ڈالنا ضروری ہے۔''
چادروں کے پیچھے سے سنائی دیتی عورت کی درد میں ڈوبی چیخیں اسے اس قدر مضطرب کر رہی تھیں کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہر ایک سے خفا ہو جائے۔
''روانگی سے قبل طیبہ کی ساس نے دائی سے اس کا معائنہ کروایا تھا اور دائی کا اندازہ تھا کہ ابھی کم سے کم پندرہ بیس دن باقی ہیں لیکن قدرت پر تو کسی کا زور نہیں چلتا۔ خالقِ کائنات نے طے کر لیا ہے کہ اس کی ایک مخلوق ان دشوار راستوں پر ہی جنم لے گی تو پھر کون ہے جو اس کی مرضی میں دخل اندازی کر سکے۔'' ثریا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
اس نے سنا اور سن کر یکدم ہی کھل کر مسکرانے لگی۔
''میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنا دیا ہے۔'' ثریا کو اس دھوپ چھاؤں کی سمجھ نہیں آئی۔ کہاں تو ابھی وہ اتنی سنجیدہ اور خفا سی تھی اور کہاں اب ایسے خوش ہو کر مسکرا رہی تھی۔
''میں تو بس خوش ہو رہی ہوں۔ تمہارے اخی کسی دلیل کو خاطر میں لا کر رکنے کے لیے تیار نہیں تھے تو خالقِ کائنات نے خود اپنی مخلوق پر رحم کھا کر قافلے والوں کے لیے پڑاؤ کا انتظام کر دیا۔''
''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میرے اخی بہت ظالم انسان ہوں۔'' ثریا وجہ جان کر خفگی سے بولی۔ سارہ جواب میں کچھ کہتی اس سے قبل بچے کے رونے کی آواز نے ان کی توجہ کھینچ لی۔
''میں جا کر دیکھتی ہوں۔'' سارہ اشتیاق سے بولتی بے قراری سے حرکت میں آئی۔
''ذرا صبر کرو۔ بچے کو صاف ستھرا کر کے دیکھنے کے لائق بنانے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔'' ثریا نے اس کا بازو تھام کر ایک بار پھر اسے روک لیا۔
''تمہیں ان معاملات کی بڑی خبر ہے۔''
''بڑے کنبوں میں رہنے والیوں کو جانے انجانے میں بہت کچھ معلوم ہو ہی جاتا ہے۔'' ثریا کے لہجے میں جانے کیوں اداسی گھل گئی۔
''بڑا کنبہ..... تم نے تو مجھے نہیں بتایا کہ اس قافلے میں تمہارے اخی کے علاوہ بھی تمہارے کنبے کے مزید افراد شامل ہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔ گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں اردگرد کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ عورتوں کی مصروفیت ابھی تک جاری تھی۔ کوئی لکڑیوں کو آگ لگا رہی تھی تو کوئی ڈول میں پانی گرم کرنے رکھ رہی تھی۔ کسی کو قہوہ تیار کرنے کی فکر تھی تو کوئی تیز تیز بولتی مشوروں پر مشورے اگل رہی تھی۔ عورتوں کی اس مصروفیت سے پرے مردوں نے پڑاؤ کے لیے خیمے لگانے شروع کر دیے تھے۔ اونٹوں پر لدا سامان اتارا جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے راہ میں پڑے بڑے پتھروں سے ہی پشت ٹکا کر سستانا شروع کر دیا تھا اور کچھ چلبلے بچے کسی بھی شے کو خاطر میں لائے بغیر کھیلنے کودنے میں

مصروف ہو چکے تھے۔ ان سب کے درمیان داؤد اِدھر اُدھر چکراتا ہدایات جاری کر رہا تھا۔ یقینی طور پر صورتِ حال کا علم ہو جانے کے بعد اس کو پڑاؤ ڈالنے کی اجازت دینی پڑی تھی لیکن دور سے ہی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اب بھی تشویش میں مبتلا ہے اور بے حد مجبوری کے عالم میں رکنے کا فیصلہ کر سکا ہے۔

''اخی کے سوا کنبے کا کوئی فرد موجود ہوتا تو تمہیں بتاتی نا۔ اب تو بس میں اور اخی ہی ایک دوسرے کا کل کنبہ ہیں۔'' ثریا پھیکا سا مسکرائی۔

''مطلب؟'' اسے ثریا کے لہجے کی اداسی بے چین کرنے لگی۔

''پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گی۔ خوشی کے موقع پر غموں کے قصے چھیڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔'' ثریا نے اسے ٹال دیا اور کھلکھلاتی ہوئی اس عورت کی طرف متوجہ ہوئی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ عورت کے ہاتھ میں ایک رکابی تھی جس میں کچھ گڑ اور مرمرے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے رکابی ثریا کے آگے کی اور بولی۔

''منہ میٹھا کرو ثریا!''

''پہلے خوش خبری تو سنایئے جناب۔''

''بیٹی تولد ہوئی ہے۔ اپنی ماں ہی کی طرح بہت خوب صورت اور دلکش ہے۔''

''اللہ نصیب اچھے کرے۔'' ثریا نے سن کر دعا کی اور گڑ کی چھوٹی سے ڈلی اٹھا کر منہ میں رکھی۔

''آپ بھی لیجیے نا۔'' عورت نے سارہ سے اصرار کیا تو اس نے بھی رکابی میں سے تھوڑے سے مرمرے اور چٹکی بھر گڑ کے ٹوٹے ہوئے ذرات سمیٹ لیے۔

''ہم بچی کو کب دیکھ سکیں گے؟'' ثریا نے عورت سے پوچھا۔

''بس ابھی تھوڑی دیر میں انابی اسے تیار کر دیتی ہیں تو اس کے کان میں اذان دلوانے کے بعد تم لوگوں کو اسے دیکھنے کی اجازت ہو گی۔'' عورت نے اطلاع دی اور آگے بڑھ گئی۔ وہ دونوں بھی باتیں چھوڑ کر قیام کے انتظامات کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں دن کا باقی حصہ تیزی سے ڈھل گیا۔ اندھیرا چھاتے ہی سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ شدید تھکن میں مبتلا جسموں پر نیند نے بڑی تیزی سے یلغار کی تھی۔ سارہ بھی ثریا کے ساتھ ایک خیمے میں موجود گہری نیند سو رہی تھی۔ یکایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے ایسا لگا کہ اس نے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی ہو۔ وہ اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھی۔ رات کے اس پہر گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دینا نظر انداز کیے جانے والی بات نہیں تھی۔ وہ آواز پر کان لگائے ہاتھ میں تلوار لیے تیزی سے باہر نکلی۔ چاند کی روشنی میں اس نے ایک سوار کو پڑاؤ سے دور جاتے ہوئے دیکھا۔

''وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور تیزی سے اس جانب بڑھی جہاں اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ اگلے ہی پل وہ گھوڑے پر سوار اس شخص کے تعاقب میں جا رہی تھی۔ اس کے لیے یہ امر باعثِ حیرت تھا کہ سوار کا رخ آگے کے بجائے واپسی کے راستے کی طرف تھا۔

''کہیں وہ کوئی جاسوس تو نہیں جو تاتاریوں کو پڑاؤ کی خبر دینے جا رہا ہے؟'' اس کے ذہن میں خیال آیا تو سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی اور اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اہلِ قافلہ خطرے میں ہیں۔

''مجھے داؤد کو آگاہ کرنا چاہیے تھا۔'' اسے اپنی عجلت پر افسوس ہوا لیکن اب واپس پلٹنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ واپس جا کر اطلاع دینے کے چکر میں وہ شخص بہت دور نکلنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اپنے محسنوں پر کوئی مصیبت ٹوٹنے کے خیال سے اس نے گھوڑے کی رفتار مزید بڑھا دی۔ اسے معلوم تھا کہ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں یہ عمل خطرناک ہے، وہ کسی حادثے کا شکار ہو سکتی ہے یا آگے جاتے سوار کو تعاقب کا علم ہو سکتا ہے۔

''جو ہونا ہے ہو جائے۔ میری زندگی کی قیمت اتنے بہت سے لوگوں کی زندگی سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔'' اس نے ہر واہمے کو ذہن سے نکال کر گھوڑے کی رفتار کچھ اور بڑھائی لیکن وہ حیران تھی کہ وہ سوار دوبارہ اس کی نگاہ میں نہیں آ سکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے حد برق رفتاری سے سفر کر رہا ہو۔ پہاڑی راستے پر اپنے گھوڑے کی ٹاپوں کی گونج میں اسے اگلے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

'کہیں مجھ سے سمت کے تعین میں غلطی نہ ہو جائے۔' اس نے سوچا اور کوئی سن گن لینے کی خواہش میں اپنا گھوڑا روک دیا۔ ابھی وہ اپنی سماعتوں پر زور دے ہی رہی تھی کہ قریب سے آہٹ سی سنائی دی۔ اس نے بھڑک کر آواز کی سمت دیکھنا چاہا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی اور ایک تلوار کی نوک عین اس کی ٹھوڑی کے نیچے آ ٹکی تھی۔

پُر خطر جزیروں اور بغاوتوں کے جنگل
میں بھٹکتے مسافر کی داستان کے
مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

وہ پرانے بوڑھے خوش قسمت ہیں اگر انہیں ہفتے میں ایک مرتبہ کوئی ملنے آجائے۔ چاہے وہ کوئی اجنبی ہی کیوں نہ ہو، جو محض تھوڑی دیر کے لیے رک کر یہی پوچھ لے کہ موٹے تکیے کی ضرورت تو نہیں یا ٹشو پیپر کو قریب رکھ دے۔ ان میں زیادہ تر وہ بوڑھے ہیں جنہیں بھلا دیا گیا ہے، اس کی وجہ بے رحمی نہیں بلکہ زندگی کی مصروفیات ہیں۔ ان کے دوست یا

تنہائی کا عذاب

شاہ زین رضوان

ہجوم سے دھکیل کر تنہائی میں رہنے پر مجبور کردینے والے لوگ بعض اوقات کس قدر سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ جو محفلوں کی جان ہوا کرتی تھی جب تنہائی کا عذاب سہنے کی باری آئی تو تمام حوصلے ہار بیٹھی اور پھر وہ سب کچھ ہوتا چلا گیا جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔

فلاحی اداروں میں تنہائی کو آباد کرنے والے ٹوٹے ہوئے لوگوں کی کہانی

UUNOVELS.COM

جیون ساتھی دنیا سے رخصت یا انہی کی طرح معذور ہو چکے ہیں۔ ان کے بچے بھی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہیں یا ان کی اپنی مصروفیات ہیں۔

یہ بوڑھے زیادہ تر اپنے بستروں میں رہتے ہیں اور انہیں پیشاب کی بدبو یا کافوری گولی کی ناگوار بو برداشت کرنا پڑتی ہے اور وہ کراہتے ہوئے گلہ کرتے ہیں کہ اگر ہم میں سکت ہوتی تو خود ہی کوئی بندوبست کر لیتے۔ اگر ہمارے پاس کوئی جادو کی مرہم ہوتا جس سے شکستہ جسم اور ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جا سکتے یا کسی فارمیسی سے صبر کی بوتل مل سکتی جس سے ہماری کبھی نہ ختم ہونے والی ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

یہ نسبتاً کم عمر لوگ تھے جن کی وجہ سے زیادہ تر مشکلات پیش آتی تھیں اور یہی لوگ دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بھی بوڑھے ہی تھے ورنہ یہاں نہ ہوتے۔ انہیں بھی باہر کی دنیا نے بھلا دیا تھا لیکن ایک دوسرے نے نہیں اور اسی چیز نے مجھے حیران کر دیا جب میں اپنے پہلے نرسنگ ہوم میں آئی۔ یہاں رہنے والے بھی انسان تھے۔ جھریوں والے لوگ جو بہت آہستگی سے حرکت کرتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتے۔ مثلاً اگر ان کا واکر نہ ملے، چائے ٹھنڈی ہو یا ان کا مددگار (نرس یا اردلی) انہیں صبح بخیر کہنا بھول جائے۔

بوڑھے مرد اب بھی کھیلوں، سیاست اور شاہی خاندان کے رومانوی قصوں میں دلچسپی لیتے تھے اور یہاں کی بوڑھی عورتیں ان لڑکیوں کی طرح تھیں جن کے ساتھ ہم کبھی اسکول جایا کرتے تھے۔ یہ بہت چھوٹے ذہن کی عورتیں تھیں جو کھانے کی میز پر اپنی جگہ کی حفاظت، طنز آمیز تبصروں اور شکر جیسی مسکراہٹ کے ساتھ کرتی تھیں۔ ان میں ایسی تنہا عورتیں بھی تھیں جو بے مقصد پرانے گیزر کے گرد چکر لگاتیں۔ اس کے علاوہ موٹی اور بھدی لڑکیاں بھی تھیں جو تباہ شدہ جسموں اور خراب بینائی کے باوجود بھرپور میک اپ کرتیں اور اپنے کان کھلے رکھتیں۔

بوڑھی عورتیں زیادہ تر اپنے کمروں میں ہی کھانا کھاتیں لیکن کم عمر عورتوں کی وجہ سے ہر بار کھانے کے وقت لفٹ آدھے گھنٹے کے لیے جام ہو جاتی حالانکہ میزوں پر بیٹھنے والے کبھی کبھار ہی تبدیل ہوتے۔ اسی طرح مینیو بھی کبھی نہیں بدلتا تھا۔ دن ہو یا رات کھانے میں ہمیشہ ایک ابلا ہوا ہاٹ ڈاگ، ایک بن، چکن لزانیہ اور پیزا ساس یا ٹونا مچھلی کے سینڈوچ جو حیرت انگیز طور پر مزیدار ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ بہت سی پیاز اور تھوڑی سلاد اور چٹنی بھی ہوتی تھی۔ ڈنر میں سب عورتیں جمع ہو کر خوب زور زور سے باتیں کرتیں۔ اس گروپ کی نمایاں شخصیت ماریانا پارکر تھی جو پچھلے چھ سال سے ہولی لیک ہوم میں انیس نمبر میز پر بیٹھ کر صدارت کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

مسز پارکر میرے ہولی لیک آنے کے ایک ہفتے بعد مر گئی لیکن اس نے اس مختصر وقت میں مجھ پر گہرا تاثر چھوڑا۔ وہ لمبے قد کی تھی اور اسّی سال کی عمر میں چھڑی کے سہارے چلتی تھی۔ اس کے سر پر گھنے چاندی رنگ کے بال تھے اور اس کے ناخنوں پر سرخ رنگ کی نیل پالش ہوتی تھی جبکہ لپ اسٹک میں اسے پکا گلابی رنگ پسند تھا۔ ماریانا پارکر ایک پرکشش عورت تھی اور مجھے پکا یقین تھا کہ اس نے جوانی میں بہت سے لوگوں کو گھائل کیا ہوگا۔

میں اپنی شفٹ ڈیوٹی پر چند منٹ تاخیر سے پہنچی۔ ڈیوٹی ختم کر کے جانے والے کچھ لوگ وہاں اس طرح ٹہل رہے تھے جیسے انہیں پہلی بس پکڑنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔ تانیکا تھامسن نے سویٹر اپنے سینے پر پھیلایا ہوا تھا اور وہ اس طرح سگریٹ کا دھواں کھینچ رہی تھی جیسے اس طرح اسے آکسیجن مل رہی ہو۔ مجھے دیکھ کر مائیک آرتھر اور دو دوسرے لوگوں نے سر ہلایا لیکن میں ان کے پاس سے تیزی سے گزر گئی کیونکہ میں سات منٹ کی رعایت ختم ہونے سے پہلے اپنا کارڈ پنچ کرنا چاہ رہی تھی۔ جان کوپر ٹائم کلاک کے پاس کھڑا ہوا میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں جان کو پسند کرتی ہوں حالانکہ وہاں پر کچھ رہنے والے اقرار کرتے تھے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ تھوڑا سا اکھڑ مزاج اور خاموش طبع تھا لیکن وہ اپنے وارڈ پر پوری توجہ دیتا تھا اور اسی نرمی کے ساتھ جس کی اس جیسے بھاری تن و توش کے آدمی سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اس کے گٹھے ہوئے ہاتھ کی ایک بالشت مجھے دکھی تھی حالانکہ میں بھی کوئی چھوٹی عورت نہیں ہوں۔ جان اس نرسنگ ہوم میں کافی عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صرف کیفے ٹیریا کے دو ورکرز کی مدتِ ملازمت اس سے قریب ترین تھی۔

جان نے مجھ سے نظریں ملائیں۔ ''پریشانی.....'' اس نے مختصراً کہا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر سیڑھیوں کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے وہاں دیکھا جب شفٹ ختم ہونے کی گھنٹی بج رہی تھی۔''

''کیا..... کسے دیکھا؟ جان! تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے سیڑھیوں کا دروازہ کھولا۔ وہاں ایک سنگل انرجی بلب کی مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ وہ منہ کے بل پگلی سیڑھی پر گری تھی۔ دونوں بازو لینڈنگ پر تھے

جیسے اس نے گرنے سے بچنے کی کوشش کی ہو۔ ٹانگیں ابھی تک سیڑھیوں پر تھیں۔ ان میں سے ایک عجیب زاویے پر مڑی ہوئی تھی۔

''میرے خدا!'' میں جھکی اور اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن جان نے میرا کندھا پکڑ لیا۔ ''وہ مر چکی ہے آڈرے۔ اسے مرے ہوئے کم از کم دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔''

میں نے جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ڈائریکٹر اور پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔''

جان نے کندھے اچکائے۔ ''لگتا ہے کہ یہ سیڑھیوں سے پھسل کر گری ہے، اس کی چھڑی ابھی تک ادھر ہی ہے۔''

دوسرے دن ڈائریکٹر کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے میں حیران ہو رہی تھی کہ جان نے اس حادثے کی اطلاع دینے کے لیے میرا انتظار کیوں کیا؟ میں اس سے برتر نہیں تھی بلکہ درحقیقت وہ مجھ سے ایک درجہ اوپر تھا۔ اس کا یہ بہانہ کہ وہ نائٹ شفٹ نہیں کرنا چاہتا، بودا ثابت ہوا بلکہ تھوڑا سا مشتبہ بھی جب ڈائریکٹر نے ناشتے کے بعد ایک اسٹاف میٹنگ میں یہ بتایا کہ پولیس میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ آنے تک مسز پارکر کی موت کو حادثہ قرار نہیں دے گی۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے چھڑی گری اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی لیکن وہاں کے رہائشی کبھی سیڑھیاں استعمال نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ جب کبھی آگ سے بچاؤ کی مشق ہوتی ہو۔ کوئی بھی حقیقی مشق ان کے لیے بہت خطرناک ہو سکتی ہے پھر کیا وجہ تھی کہ مسز پارکر سیڑھیوں کی طرف گئی؟''

ڈائریکٹر نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک ہوشیار لڑکی ہو آڈرے۔ تمہارے خیال میں کیا ہوا تھا؟''

میں نے کندھے اچکائے اور معصوم صورت بناتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتی جناب! میرا خیال ہے کہ وہ کچھ پریشان تھی اور بے دھیانی میں سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔''

وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا جس کے سر پر گنتی کے چند بال تھے اور وہ انہیں بڑے سلیقے سے اپنی کھوپڑی پر جمائے رکھتا تھا۔ ''مسز پارکر اپنی زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی پریشان نہیں ہوئی البتہ وہ ضعیف ہو گئی تھی۔''

میں نے ہولی لیک میں ایک ہفتہ قیام کے دوران نوٹ کیا کہ زیادہ تر میرے ساتھی ورکر ڈائریکٹر کی بے عزتی کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ وہ اسے احمق اور نااہل سمجھتے تھے لیکن اس نے ابھی تک میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا جس سے میں گھبرا جاتی بلکہ اس نے ہی مجھے یہاں ملازمت دی تھی۔ اس لیے میں اس کی عزت کرتی تھی۔

''کیا تمہارے کسی بھی ساتھی نے مالی مشکلات کی شکایت کی؟ کیا کسی کو گزر اوقات میں مشکل پیش آ رہی ہے؟''

''ہم سب کو ہی مالی پریشانی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ اردلی اور مددگاروں کو اچھی تنخواہ نہیں ملتی۔ اسی لیے زیادہ تر لوگ کالج میں داخلہ لے لیتے ہیں تاکہ وہ پیشہ ور معالجوں اور نرسوں کی طرح زیادہ کما سکیں۔''

''میں نے خاص طور پر کسی کو شکایت کرتے ہوئے نہیں سنا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں یہاں نئی ہوں۔ کوئی بھی مجھ پر بھروسا نہیں کرتا۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً تمہیں مسز پارکر کی فیاضانہ وصیت کے بارے میں علم ہوگا۔''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ادارے کو بہت اچھا ورثہ ملے گا جس سے فرنٹ لاؤنج کی تزئین و آرائش اور لائبریری میں روشنی کا انتظام آسانی سے ہو سکے گا جو اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ باقی پیسوں سے رہائشیوں کو تفریحی دورے پر لے جایا جائے گا۔''

میں اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ ریڈنگ روم لائبریری نہیں ہوتا لیکن اس کے بجائے میں نے کہا۔ ''بہت عمدہ۔'' البتہ مجھے تھوڑی سی الجھن ہو رہی تھی۔ یقیناً اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ کسی نے نئی لاشوں یا میوزیم کی سیر کے لیے مسز پارکر کو قتل کیا ہوگا۔

''اور ہر ملازم کے لیے ایک بونس اس کی مدتِ ملازمت کے مطابق ملے گا۔''

میں نے حیرت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔ ''بونس؟''

وہ مسکرایا۔ ''تمہارے لیے کچھ نہیں۔ جن لوگوں کی ملازمت کو ایک سال ہو گیا ہے، انہیں..... ہر ایک کو سو ڈالر ملیں گے۔''

میں نے سر ہلایا گو کہ کم آمدنی والے ملازمین کے لیے یہ ایک معقول رقم تھی لیکن اس کے لیے کسی کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس بونس کا سائز اسی حساب سے بڑھتا چلا جائے گا۔ پانچ سال کی ملازمت پوری کرنے والوں کو ایک ہزار ڈالرز اور دس سال والوں کو دس ہزار ڈالرز ملیں گے۔''

''دس ہزار ڈالرز؟'' میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

UUNOVELS.COM

"ہمارے پاس پندرہ سال والا کوئی ملازم نہیں ہے۔" اس نے افسردگی سے کہا۔ "سوائے میرے۔"

میں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا لیکن اس سے نظریں ملانے سے ڈر رہی تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیتا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو آڈرے۔" اس نے کہا تو میں چونک پڑی۔ "میں بے وقوف نہیں ہوں اور نہ ہی پولیس۔ ایک لاکھ ڈالر کسی کو قتل کرنے کے لیے بہت ہیں اگر تم ایسا چاہو۔ اسی طرح دس ہزار ڈالرز بلکہ سو ڈالرز بھی کافی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ پولیس ہم میں سے چند لوگوں پر خاص نظر رکھے گی۔ اس لیے میں تم سے مدد چاہتا ہوں۔ تم لوگوں سے مل کر معلوم کرو، شاید یہ پتا چل جائے کہ کسی کے پاس قتل کا کوئی محرک تھا؟ بظاہر یہی لگتا ہے کہ مسز پارکر سیڑھیوں سے نیچے گری ہے لیکن اس کے باوجود میں جاننا چاہوں گا کہ کیوں اور کیسے؟"

اس نے واضح طور پر میری ہچکچاہٹ محسوس کی اور بولا۔ "مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑا کیونکہ تم مجھے ہوشیار لگتی ہو اور اس معاملے میں بہت زیادہ ملازمین شامل نہیں ہیں۔ اگر تم کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو تمہیں بھی بونس مل سکتا ہے۔"

میں چند ڈالر کمانے کے موقع سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے رضامندی ظاہر کر دی اور کہا۔ "ٹھیک ہے، میں اپنے کان کھلے رکھوں گی۔ زیادہ سے زیادہ میں یہی کر سکتی ہوں۔"

اس نے سر ہلایا اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "شکریہ آڈرے۔" پھر وہ تھوڑا سا ہچکچایا۔ "میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی پیسوں کے لیے پُرجوش ہوں البتہ مسز پارکر کی موت نے مجھے افسردہ کر دیا ہے۔"

میں نے کوشش کی کہ اس پر شک نہ کروں۔

"میں نہیں چاہتا کہ مجھ سمیت ہولی لیک کے کسی بھی فرد پر شک کیا جائے۔ اگر پولیس کچھ معلوم کر لیتی ہے تو وہ اور بات ہے گو کہ مجھے اس میں شبہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے مجھے معلوم ہو جائے۔ تم یہ بات سمجھ سکتی ہو۔"

میں اس کی بات بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ "اس وصیت کے بارے میں کون جانتا تھا؟" میں نے پوچھا۔ میرا اشارہ کسی ایک جانب نہیں تھا۔ درحقیقت یہ بات سب کو ہی معلوم تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ بوڑھوں کے نرسنگ ہوم میں کوئی بات راز میں رہ سکے۔ یہاں کے رہنے والوں کے پاس گپ شپ کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے ان لوگوں پر نظر دوڑائی جنہیں یہاں کام کرتے ہوئے طویل عرصہ ہو گیا تھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

پولیس والے میرے یا ڈائریکٹر کی طرح تجسس نہیں تھے۔ پہلے روز دو باوردی آفیسرز وہاں گھومتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے نوٹس لیے اور چند جوان مددگاروں سے بات چیت کی لیکن لگتا تھا کہ وہ بھی میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں لگانا چاہتے۔ ان کے خیال میں یہ ایک سیدھا سادہ کیس تھا۔ مسز پارکر کی موت کے دو دن بعد سب کچھ معمول پر آ گیا۔ میں نے بھی کوئی غیر معمولی بات دیکھی نہ سنی۔

اپنا کام شروع کرنے کے لیے سب سے پہلے میری نظر جان پر گئی۔ اسے مسز پارکر کے ترکے میں سے دس ہزار ڈالرز ملنے تھے جو اس کی سالانہ آمدنی کے نصف کے برابر تھے لیکن میں اسے برا آدمی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ بڑی مستعدی اور فرض شناسی سے اپنا کام کرتا تھا۔ میں نے اسے ایک بوڑھے آدمی کو اس کی میز تک لے جاتے اور کرسی پر بٹھاتے دیکھا اور جب وہ شخص کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا تو تین منٹ بعد اس نے اسے دوبارہ پکڑ لیا۔ یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا گیا لیکن ہر بار جان کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی اور وہ سنجیدگی سے اپنا کام کرتا رہا۔

تانیکا کی کہانی اس سے مختلف تھی۔ وہ بھاری جسامت کی گول مٹول اور مجھ سے عمر میں دو برس بڑی تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراتی رہتی تھی لیکن چمک دار دانتوں کی نمائش اور تیز آواز کی وجہ سے مجھے اس کا انداز دوستانہ کے بجائے جارحانہ لگتا تھا۔ کام کے دوران وہ جان کے ساتھ نظر آتی تھی۔ میں نے ان دونوں کو دو مرتبہ اسٹور روم میں اکٹھے یا باہر بنچوں پر ایک ساتھ سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ تانیکا سو ڈالر حاصل کرنے والوں کی صف میں شامل تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ دس ہزار ڈالرز خرچ کرنے میں جان کی مدد کر کے خوش ہوتی۔ اس روز جب میں ڈیوٹی پر پہنچی تو وہ کام ختم کر کے واپس جا رہی تھی۔ روسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مائیک آرتھر، مینڈی، ماریا اور دو دوسرے مددگار جن کا نام میں نہیں جانتی، وہ بھی ڈیوٹی ختم کر کے جا رہے تھے۔ بے شک نرسنگ ہوم پرائیویٹ مددگاروں سے بھرا ہوا تھا جن کی خدمات لوگوں نے اپنے بڑوں کے لیے حاصل کی تھیں۔

یہ پرائیویٹ مددگار نرسنگ ہوم کے ملازم نہیں تھے اور انہیں مسز پارکر کی وصیت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ کیا ان لوگوں کو مشتبہ افراد کی فہرست سے نکالنا درست ہوتا؟ اور

اگر مسز پارکر کو قتل کیا گیا تو کیا اس کا محرک صرف مالی فائدہ تھا؟ ممکن ہے کہ اس نے کسی کو ناراض کیا ہو۔ نرسنگ ہوم میں رہنے والوں میں کوئی تیز مزاج بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے مسز پارکر کی میز پر بیٹھ کر لنچ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ دیکھ سکوں کہ وہ مجھے کیا بتاتے ہیں۔ جب میں نے ڈائننگ روم کی سپروائزر کو بتایا کہ میں یہاں کے رہائشیوں کے ساتھ لنچ کرنا چاہتی ہوں تو اس کی بھویں تن گئیں۔ اس کا ردِعمل حوصلہ افزا نہیں تھا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور ایک ٹرے لے کر انتظار کرنے لگی کہ کون مجھے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دیتا ہے۔

وہ مختلف قسم کے لوگ تھے لیکن ان کی جسمانی حالت خراب نہیں تھی۔ میں بوب سے پہلے بھی مل چکی تھی۔ پہلی نظر میں وہ حیرت انگیز طور پر جوان نظر آتا تھا لیکن جب اس نے حرکت کی تو اس کا مسئلہ ظاہر ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پوری طرح نہیں کھلتے تھے۔ گو کہ وہ خود کھا سکتا تھا لیکن یہ کوئی اچھا نظارہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی ڈیوٹی کے پہلے روز اس کی ٹھوڑی اور سینے پر آلوؤں کا چورا دیکھا تو اس کی مدد کرنا چاہی۔ اس کا انکار خوشگوار مگر واضح تھا اور مجھے اس کی یہ جرأت اچھی لگی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" میں نے ایک عام سوال کیا تھا لیکن میری نظریں بوب پر تھیں جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک چھوٹے قد کی عورت نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سفید چہرے پر بھوری آنکھیں نمایاں تھیں۔ "یہ ماریانا کی جگہ ہے۔" اس نے ناراضی سے کہا۔

ایک سانولے رنگ کی افریقن امریکن عورت میری حمایت میں بولی۔ "کوئی بات نہیں میلانی۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "کیا تمہیں وہ بری خبر یاد نہیں؟ ماریانا آج ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو گی۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے سر ہلا دیا۔

"پلیز۔" وہ عورت بولی۔ "ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ میں کینیا تا البانی ہوں۔ پروفیسر البانی لیکن تم مجھے کینیا کہہ سکتی ہو۔" اس کی آواز نرم اور ہموار تھی۔

"میرا نام آڈرے ہے۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں نئی آئی ہوں۔ سوچا کہ تم لوگوں سے تعزیت کر لوں۔"

کینیا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "مسز پارکر بہت ہی پیاری عورت تھی۔"

"واقعی وہ پیاری تھی۔" بوب نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میں اس کی کمی محسوس کر رہا ہوں۔"

ایک دبلی پتلی زرد رو عورت کینیا کے بائیں جانب بیٹھ گئی۔ "میں کیرولین ہوں۔" اس نے سختی سے کہا۔ "ہمیں باتیں کم اور زیادہ کھانا چاہیے۔ کالی مرچ دینا کینیا۔"

کینیا کا قہقہہ اس کی آواز کی طرح بھرپور تھا۔

"کیری! اب اچھی بن جاؤ۔"

اس نے کیرولین کو کالی مرچ اور مجھے بریڈ کی ٹوکری دیتے ہوئے کہا۔ "کیری اور میں یہاں نئی ہیں۔ ہم دونوں چیس ہاؤس سے آئے ہیں جو تین ماہ پہلے بند ہو گیا تھا۔ بوب پہلے سے یہاں ہے۔ اسے سات سال ہو گئے۔"

بوب نے تائید میں سر ہلایا اور اپنی توجہ ایک رول پر مرکوز کر دی۔

"میلانی بھی یہاں کافی عرصے سے ہے۔ اس کا شوہر دو سال پہلے مر گیا تھا۔"

کیرولین نے کینیا کا کندھا تھپتھپایا اور بولی۔ "جلدی سے کھانا ختم کرو تاکہ ہم ڈراما کلب پہنچ سکیں۔"

اس نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "میں آج بہت اچھی تحریر... پڑھ رہی ہوں۔"

میں نے کچھ سوچے بغیر شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا مکالمہ بول دیا اور کئی آنکھیں میری جانب اٹھ گئیں۔ صرف میلانی اپنی پلیٹ پر جھکی رہی۔

"مائی گاڈ۔" کینیا نے ستائشی انداز میں کہا۔ "تم شیکسپیئر سے خوب واقف ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ایک مددگار ہوتے ہوئے۔" میں نے اپنے دفاع میں کہا۔

"ہر کوئی اوتھیلو کو جانتا ہے۔ کم از کم وہ جس نے ہائی اسکول انگلش پڑھی ہو۔"

بوب کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری جیسے وہ کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو لیکن کیرولین جانے کے لیے تیار تھی۔

"کینیا! جلدی سے کافی ختم کرو۔" اس نے اصرار کیا۔

"مجھے مسز پارکر کے بارے میں تجسس ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم مجھے اس کے بارے میں بتا سکتی ہو؟"

کینیا کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آئی۔

"وہ بہت پیاری عورت تھی۔" اس نے دوبارہ کہا۔ "مہذب اور تعلیم یافتہ۔"

"کیا کوئی ایسا اسٹاف ممبر تھا جس سے اس کی نہ بنتی ہو؟"

"کیوں؟" بوب حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

UUNOVELS.COM

''مجھے تھوڑا سا تجسس ہے۔''

''مسز پارکر کو بلی بھی پسند کرتے تھے۔'' اس نے مضبوطی سے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی تانیکا کے ساتھ نہیں گھلتا ملتا۔ وہ بہت جلدی غصے میں آجاتی ہے۔ ویسے بھی مددگار تو جلدی جلدی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کی کون پروا کرتا ہے۔''

''ماریانا نے اپنی وصیت میں ہمارے لیے ایک نیا لاؤنج بنانے کے لیے کہا ہے۔'' کینیا اچانک بول پڑی۔ ''وہ اسی طرح کی عورت تھی، بے حد فیاض۔ اسٹاف کو بھی بونس ملے گا۔ لہٰذا وہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی انعام ملنے کی امید ہو۔ تم کیا کہتی ہو؟''

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ''میں حیران ہوں کہ مسز پارکر سیڑھیوں پر کیا کر رہی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا یہاں کے رہائشی سیڑھیاں بھی استعمال کرتے ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' بوب نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں سے زیادہ تر بہت ضعیف ہیں۔''

کینیا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کسی کو کوئی روکتا نہیں ہے۔'' اس نے اپنی کرسی پیچھے کی۔ اسی وقت دو مددگار وہاں آگئے۔

''تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو لڑکی؟'' ماریا نے مجھ سے کہا۔ ''تم ان لوگوں سے کم از کم بیس برس چھوٹی ہو۔''

میں اس کی بات کو مذاق سمجھ لیتی اگر اس کا اشارہ سب کی طرف ہوتا لیکن اس نے رہائشیوں کو نظر انداز کر دیا اور جارحانہ انداز میں صرف مجھ سے ہی مخاطب ہوئی۔

''ہم سب ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

میلانی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''تم نے اسے لڑکی کہا۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی اور مینڈی کی مدد سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میز خالی ہونے لگی۔ میلانی نے اپنے واکر کا سہارا لیا۔ کینیا اور کیرولین بازو میں بازو ڈالے وہاں سے جانے لگیں اور بوب اپنی کرسی کی پشت کو پکڑ کر خواتین کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

کمرے کے عقب سے ایک زور دار قہقہہ گونجا۔ ''عظیم خاتون کے نام!'' ایک مردانہ آواز آئی اور اس کی تائید میں بہت سی تالیاں بجنے لگیں۔ شاید وہ آئس ٹی کو جام صحت کے طور پر پی رہے تھے۔ آج اسٹاف بہت اچھے موڈ میں تھا اور وہ ورثے میں ملنے والے اپنے حصے کا جشن منا رہے تھے۔

لیکن اس جشن میں سب لوگ شامل نہیں تھے۔ میں ڈائننگ روم سے باہر آئی تو دیکھا کہ ایک لڑکی گھاس پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی کلائیاں ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں اور اس کے کندھے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ ایک اور مددگار نے اس کی کمر پر تھپکی دی۔ ''وہ بہت اچھی عورت تھی۔'' اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب اسے بہت مس کر رہے ہیں وینڈی۔''

وینڈی نے سر اٹھایا اور بولی۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے کہ یہ لوگ اس کی موت پر خوشی منا رہے ہیں۔''

دوسری مددگار نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''واقعی انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

میں مسکرا دی۔ وہ دونوں جذباتی عورتیں یہ نہیں جانتی تھیں کہ کسی کو مسز پارکر کی ذات سے دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ اس کی چھوڑی ہوئی دولت میں سے سب اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے بے تاب تھے۔

میں انہی خیالوں میں گم تھی کہ ڈائریکٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہال سے نکل کر میری طرف ہی آرہا تھا۔ ''ایک اچھی خبر.....'' اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ''میڈیکل ایگزامنر کا کہنا ہے کہ مسز پارکر کی موت حادثاتی تھی۔''

''کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ وہ سیڑھیوں پر کیوں گئی تھی؟'' میں نے کہا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شاید یہ ہم کبھی نہ جان سکیں گے۔ بہرحال، اب پولیس کوئی مزید تحقیقات نہیں کرے گی۔''

اگلے روز میں سہ پہر کے وقت باغبانی کی کلاس میں خواتین کی مدد کر رہی تھی۔ ان کے پاس مٹی، کھرپی اور باغبانی کی خواہش تھی لیکن وہ صفائی کے ساتھ گملوں میں بیج نہیں ڈال پا رہی تھیں۔

''یہ دیکھو مسز ولز۔'' میں نے اس کے بیجوں کے گرد مٹی ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں ستمبر میں تمہاری طرف سے بھنی ہوئی پھلیوں کی دعوت کی توقع کر رہی ہوں۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''اگر میرا کوئی کچن ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتی۔''

ایک چھوٹے قد کی مددگار میز پر سے مٹی صاف کر رہی تھی جو گملوں میں ڈالتے وقت وہاں بکھر گئی تھی۔ ''تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو میری۔''

اس کی ساتھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ ''تمہیں ایک

ہزار ڈالرز کا بونس ملنے والا ہے جبکہ مجھے صرف سو ڈالرز ملیں گے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ میرے مقابلے میں تمہارے کام کی زیادہ قدر و قیمت ہے۔''

پہلی مددگار نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں میری لیکن مجھے ہولی لیک میں کام کرتے ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں جبکہ تمہیں اتنا عرصہ نہیں ہوا۔''

''چار سال اور گیارہ مہینے۔'' میری نے افسردگی سے کہا۔ ''صرف ایک مہینا پیچھے ہوں۔''

''پھر بھی تمہیں سو ڈالر تو مل رہے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہیں؟''

میری نے سرد آہ بھری اور میز کو کپڑے سے صاف کرنے لگی۔ ''اب رونا بند کرو میری۔'' مسز ولز نے مداخلت کی۔ ''میں تمہارے لیے کچھ چھوڑ کر جاؤں گی۔''

میری نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''اچھا! وہ کیا؟''

بوڑھی عورت نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میرا سابق شوہر اور کچھ شراب کی بوتلیں۔'' وہ اور اس کی ساتھی زور زور سے قہقہے لگانے لگیں۔ میری نے منہ بنایا اور وہاں سے چلی گئی۔ کچھ لوگوں سے مذاق برداشت نہیں ہوتا۔

میں نے مشتبہ افراد کی فہرست سے دو نام اور نکال دیے۔ جس کسی کے بھی ایک، پانچ یا دس سال پورے ہو گئے ہوں وہ فائدہ پہنچانے والی عورت کو کیوں قتل کرے گا؟ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قتل کے تین محرک ہوتے ہیں۔ دولت، محبت اور غرور۔ میری نظر میں ظاہری محرک پیسا تھا۔ اگر واقعی مسز پارکر کو کسی نے دھکا دیا تھا تو اس کا محرک یہی ہو سکتا ہے۔ میں غرور کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ وہ دیکھنے میں بے ضرر عورت معلوم ہوتی تھی جس کی لوگ تعریف اور اس سے محبت کرتے تھے لیکن محبت؟ یہ بالکل مضحکہ خیز بات لگتی تھی۔ اس بوڑھے لوگوں کے نرسنگ ہوم میں کل سے محبت کرتی۔ بوب سے جس کا پورا جسم ہلتا تھا اور جو سہارے کے بغیر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا یا پھر کوئی مددگار؟ یہ سچ ہے کہ وہ ایک خوش شکل عورت تھی لیکن یہ بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ اس نرسنگ ہوم میں گنتی کے مرد مددگار تھے اور ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اپنی عمر کے پارٹنر کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کے قابل ہو۔

اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں بار بار محبت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر انیس نمبر میز پر لنچ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ مجھے اس میز پر بیٹھنے والوں کے ساتھ بات کرنے کا موقع مل سکے اور میں اسٹاف پر بھی نظر رکھ سکوں۔

جب میں وہاں پہنچی تو کیرولین دونوں ہاتھ میز پر رکھے مس کریمر سے شکایت کر رہی تھی۔ ''اب میں یہاں بیٹھ رہی ہوں۔ یہ میری سیٹ ہے اور میں کسی دوسری جگہ نہیں بیٹھوں گی۔''

مس کریمر نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیرولین! تمہارے ساتھی جاننا چاہتے ہیں کہ تم.....''

میں نے مسز کریمر اور کینیا کی طرف دیکھا۔ کینیا نے غیر محسوس انداز میں کندھے اچکا دیے۔ ''کیا میرے لیے کوئی جگہ ہے؟'' میں نے خوش مزاجی سے پوچھا اور امید بھری نظروں سے بوب کی طرف دیکھنے لگی جو پیروں پر جمے رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور مسز کریمر کے منڈلانے کی وجہ سے اس کے لیے اپنی کرسی پر بیٹھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

دوسری میز پر ایک بوڑھا شخص آئس کریم کے لیے شور مچا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنی پلیٹ اوپر اٹھا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے ڈائننگ روم سپروائزر کو بلا رہا تھا۔ مسز کریمر، کیرولین کو چھوڑ کر اس کی طرف چلی گئی۔

میلانی نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم ہمارے ساتھ شامل ہو سکتی ہو لیکن مسز پارکر کی سیٹ پر مت بیٹھنا۔''

میں ہچکچائی۔ بوب اور کینیا دونوں ہی مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہے تھے۔

''میلانی!'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مسز پارکر.....''

کیرولین جلدی سے بولی۔ ''مر گئی۔''

میلانی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کیا؟''

''ماریانا پارکر کو مرنے کے بعد بھی تم سے زیادہ توجہ مل رہی ہے۔'' کیرولین بڑبڑائی۔ ''میرا مطلب ہے کہ اس کی موت پر افسوس ہوا لیکن زندگی زندہ رہنے کے لیے ہوتی ہے۔''

کینیا میری الجھن بھانپ گئی۔ اس نے کہا۔ ''انتظامیہ کوشش کر رہی ہے کہ کیرولین اپنی بارہ نمبر میز پر بیٹھے لیکن وہ یہاں بیٹھنے کو ترجیح دیتی ہے، وہ اسے بتا چکے ہیں کہ اس میز پر جگہ نہیں ہے لیکن.....''

''یہ بالکل غلط ہے۔'' کیرولین پھٹ پڑی۔ ''ماریانا کے مرنے سے پہلے بھی یہاں ایک خالی سیٹ ہوتی تھی جس پر بل بیٹھا کرتا تھا۔''

''بل اسمتھ۔'' کینیا نے کہا۔ ''وہ کئی مہینوں سے ڈائننگ روم میں نہیں آیا۔ آ ڈرے! تم اس کی جگہ پر بیٹھ سکتی ہو اور کیری ڈیئر۔'' وہ اپنی دوست کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ''مسز کریمر نے واضح کیا ہے کہ ہمیں مختلف میزوں پر

UUNOVELS.COM

بیٹھنا چاہیے تاکہ ہم میں سے ہر کوئی نئے لوگوں سے مل سکے۔تم یہ بات جانتی ہو۔"

"میں نئے لوگوں سے نہیں ملنا چاہتی۔" کیرولین نے تلخی سے کہا۔"اور مجھے شبہ ہے کہ وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔"کینیا تا اور میں، چیس ہاؤس میں ایک دوسرے سے قریب تھے۔ ہم تین ہفتے قبل یہاں آئے تھے اور ہمارا پروگرام ایک ہی کمرے میں رہنے کا تھا لیکن ہمارے لیے ڈبل روم نہیں تھا۔پھر ایک جوڑا آیا اور انہیں ڈبل روم مل گیا۔"

"ہیری اور سوی شادی شدہ ہیں۔" بوب نے کہا۔ "جوڑوں کے لیے کچھ ڈبل روم خالی رکھنے پڑتے ہیں۔" لیکن میں کینیا کو دیکھ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کیری کے بولنے پر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد جب سب لوگ واپس جانے لگے تو میں نے کینیا کا بازو چھوا۔"کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے بات کر سکتے ہیں؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کیرولین بھی شاید ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہ رہی تھی لیکن کینیا نے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کامن روم میں میرے لیے ایک کرسی روک لینا کیری۔"

کیرولین نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن بالآخر وہ اور بوب باہر چلے گئے۔ میلانی بھی ان کے پیچھے تھی۔ کینیا کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔

"تم نہیں چاہتیں کہ کیرولین انیس نمبر میز پر بیٹھے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔"اور نہ ہی تم اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنا چاہتی ہو۔"

بوڑھی عورت سر ہلاتے ہوئے بولی۔"وہ ایک اچھی دوست ہے، میں اسے بہت پسند کرتی ہوں لیکن....."

"لیکن وہ تمہیں جلا رہی ہے۔"

کینیا گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔"بعض اوقات ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔"

وہ اپنی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے بولی۔"چیس ہاؤس میں سب کچھ ٹھیک تھا۔ کیرولین اور میں ایک بڑے گروپ کا حصہ تھے اور اکٹھے ہر کام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر سہ پہر میں لڑکھڑاتے ہوئے اسٹاربک چلے جاتے۔" اس نے دوبارہ ٹھنڈی سانس بھری۔"لیکن چیس کے بند ہونے کے بعد پرانے گروپ میں سے صرف میں اور کیرولین ہی یہاں آئے۔"

"اور اس نے تم سے چپکنا شروع کر دیا۔"

کینیا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔"میں نے ڈائریکٹر سے کہہ دیا تھا کہ ہمیں ڈبل روم نہ دیا جائے اور مسز کریمر نے بھی کوشش کی کہ وہ دوسری ٹیبل پر بیٹھے لیکن اس نے کبھی نئے دوستوں سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔"اس کے برعکس تم کسی نئی دوست سے بہت قریب ہو گئیں۔"

کینیا نے اپنے ہونٹ بند کر لیے۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ بالآخر اس نے خاموشی کا قفل توڑا۔ "ماریانا بہت پُرجوش، زندہ دل اور ذہین عورت تھی۔ ہم بہت جلد گھل مل گئے۔ ہمارا مزاج ایک جیسا تھا اور ہم کتابوں، فلموں، کھانوں اور یہاں تک کہ مردوں کے بارے میں گفتگو کر سکتے تھے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"میں اسے بہت یاد کرتی ہوں۔ اس کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہے لیکن بڑھاپے میں چیزیں بہت تیزی سے آگے بڑھتی ہیں۔ دوست بچھڑ جاتے یا مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا لیکن ماریانا کے ساتھ رہ کر میں اپنے آپ کو دوبارہ جوان محسوس کرنے لگی تھی۔"

اس کے آنسو اب تیزی سے بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے ایک صاف نیپکن دیا تاکہ وہ اپنا چہرہ پونچھ سکے۔

"کیا تم جانتی تھیں یا تمہیں صرف شک تھا؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور نیپکن سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔

"ایک رات پہلے۔" اس نے کہا۔"اس واقعے سے ایک رات پہلے میں نے کیرولین کو بتا دیا تھا کہ میں ناشتا اپنے کمرے میں کروں گی اس لیے وہ مجھے نہ بلائے۔ ماریانا اور میں اپنی بالکونی میں ناشتا کرنے والے تھے پھر ہم نے گیارہ بجے وین بلائی۔ ہم لنچ کے لیے ایک ریستوران اور شاپنگ کرنے ڈیپارٹمنٹل اسٹور جا رہے تھے۔ مجھے کیری کو بتانا تھا۔ وہ پریشانی سے پاگل ہو جاتی اگر میں ناشتے یا لنچ پر اسے نظر نہ آتی۔"

"کیری یہ سن کر پریشان ہو گئی اور کچھ کہے بغیر کمرے سے چلی گئی لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ماریانا خطرے میں ہے۔" وہ لڑکھڑانے لگی۔

مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی لیکن اتنی نہیں کہ میں اسے روک سکتی۔"تم نے کیا دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

UUNOVELS.COM

''یہ اگلی صبح کی بات ہے۔'' کینیا نے آہستہ سے کہا۔ ''ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ میں نے سوچا کہ ماریانا کے کمرے میں جاؤں۔ وہ اوپر کی منزل میں رہتی تھی اور اس کے لیے ایک چھوٹا سا گلدستہ چھوڑ دوں۔ میں نے باغ سے ایک تازہ گلاب توڑا اور میرا خیال ہے.....'' وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ ''میں نے دیکھا کہ کیری سیڑھیوں کی طرف سے آرہی تھی۔ انتہائی خاموشی اور خفیہ طریقے سے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ اس طرح بھی چل سکتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہم میں زیادہ تر لوگ کمزور ہیں۔'' کینیا نے اپنے سر کو اس طرح جھٹکا جیسے وہ اس تکلیف دہ یاد سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی ہو۔ ''کیری نے ہال کی ایک جانب دیکھا پھر دوسری طرف۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں لیکن کوئی کچھ نہ بولا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آگئی اور دروازہ بند کرلیا اور پھر بعد میں سنا کہ.....''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ وہاں کیا کر رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پھر ماریانا پروگرام کے مطابق چائے پینے نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی لیکن میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ میں کیرولین کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اکیلے چائے پی لی اور پھر.....''

میں نے سر ہلا دیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ میں جانتی تھی۔ ''مسز پارکر کے جسم پر ایسے کوئی نشانات نہیں تھے جو گرنے کی وجہ سے آئے ہوں۔''

کینیا نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر کیری نے صرف اس کی چھڑی پکڑ کر دور کر دی ہو تو اس کے بغیر وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی ہوگی۔ وہ اسی پر انحصار کرتی تھی۔''

''تم نے کیرولین کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم اس سے دوستی ختم کرنا چاہتی ہو؟''

کینیا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کوشش کی لیکن کیرولین کو میری ضرورت تھی۔ زندگی نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں صبر سے کام لوں تو شاید وہ کچھ نئے دوستوں سے ملنے لگے۔''

''اسی لیے کہتے ہیں کہ صبر کرنا بزدلوں کا کام ہے۔'' میں نے اسے ایک ڈرامے کا ڈائیلاگ سنایا۔

اس نے جواب میں جولیس سیزر کا مکالمہ دہرایا۔ ''بزدل اپنی موت سے پہلے کئی مرتبہ مرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پہلے میں کیرولین سے مخلص ہونے میں خوفزدہ تھی پھر اس نے جو کچھ کیا تو اس کا سامنا کرنے سے خوفزدہ ہو گئی۔ میں وہاں جانے اور دیکھنے سے بھی خوفزدہ تھی۔ اگر میں اسے دیکھنے چلی جاتی تو شاید ماریانا.....''

''پولیس کا کہنا ہے کہ وہ اسی وقت مر گئی تھی۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے اسے جا کر دیکھا یا نہیں۔''

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے تمہارا شکریہ۔ تم نے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا۔''

''لیکن ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیرولین کس طرح مسز پارکر کو جھانسا دے کر سیڑھیوں تک لے گئی؟''

کینیا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اس نے مسز پارکر سے یہی کہا ہوگا کہ لفٹ خراب ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے اور ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنے کمروں میں ہی رہتے ہیں اور ہمارا کھانا وہیں پہنچا دیا جاتا ہے۔''

اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔ ''کیرولین نے شاید اس کے دروازے پر دستک دے کر کہا ہوگا کہ لفٹ خراب ہے اور اسے میرے کمرے تک آنے کے لیے مدد کی پیشکش کی ہوگی۔'' اس نے خالی ڈائننگ روم پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔ ''کیرولین انتظار کر رہی ہوگی۔ اب مجھے جانا چاہیے۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں یہ کرنا ہے کہ ڈائریکٹر کو پوری بات بتا دو اور اس کے بعد پولیس کو بھی۔ وہ مسز پارکر کی چھڑی پر انگلیوں کے نشانات چیک کرنا چاہیں گے۔''

''وہ بری عورت نہیں ہے۔'' کینیا نے کہا۔ ''وہ صرف تنہا ہے۔ میں اس کی واحد دوست ہوں۔ تم نے اس کی فطرت کا ایک رخ دیکھا ہے۔ وہ بہت مہربان بھی ہو سکتی ہے۔ جب چیس ہاؤس بند ہو رہا تھا تو ہم ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے۔''

''ایسی دوستی ڈھونگ ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور زیادہ تر محبت کرنے والے احمق ہوتے ہیں۔'' اس نے ایز یو لائیک اٹ کا مکالمہ سنایا۔

''لیکن میں ایسی حماقت پسند نہیں کرتی۔'' میں نے بیزاری سے کہا اور اٹھ کر کامن روم کی طرف جانے لگی۔ اب مجھے کیرولین سے اعترافِ جرم کروانا تھا۔

⌘⌘⌘

اللہ کے ایک نیک فطرت اور برگزیدہ بندے کا مقام

جب کسی دل میں عبادتِ الٰہی کا شوق اور رمزِ کائنات کو سمجھنے کا ذوق ہو تو اس دل کی تڑپ اسے جگہ جگہ لیے پھرتی ہے اور جب تک یہ پیاس بجھ نہ جائے اسے بیٹھنے نہیں دیتی... حسین بن منصور حلاج کا شوق اور ذوق بھی انہیں مسلسل سفر میں رکھے ہوئے تھا... جہاں بھی موقع ملا تصوف کے اسرار و رموز سیکھتے رہے مگر ان کی وحشت انہیں کہیں بھی سکون سے رہنے نہ دیتی۔ ہمیشہ ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول رہتے۔

حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ

رضوانہ ساجد

تیسرا اور آخری حصہ

ان قیدیوں کو اب یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی لیکن قید خانے سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ باہر محافظوں کا سخت پہرا تھا۔

''آپ نے ہماری بیڑیاں تو کاٹ دیں لیکن اب باہر کیسے نکلیں گے؟ باہر تو محافظ موجود ہیں۔''

''میں تمہارے لیے ایک دروازہ بنائے دیتا ہوں۔ وہاں سے نکل جانا۔''

آپ نے پھر اشارہ کیا اور قید خانے کی دیوار ایک جانب سے شق ہو گئی اور آپ نے قیدیوں کو نکل جانے کا حکم دیا۔

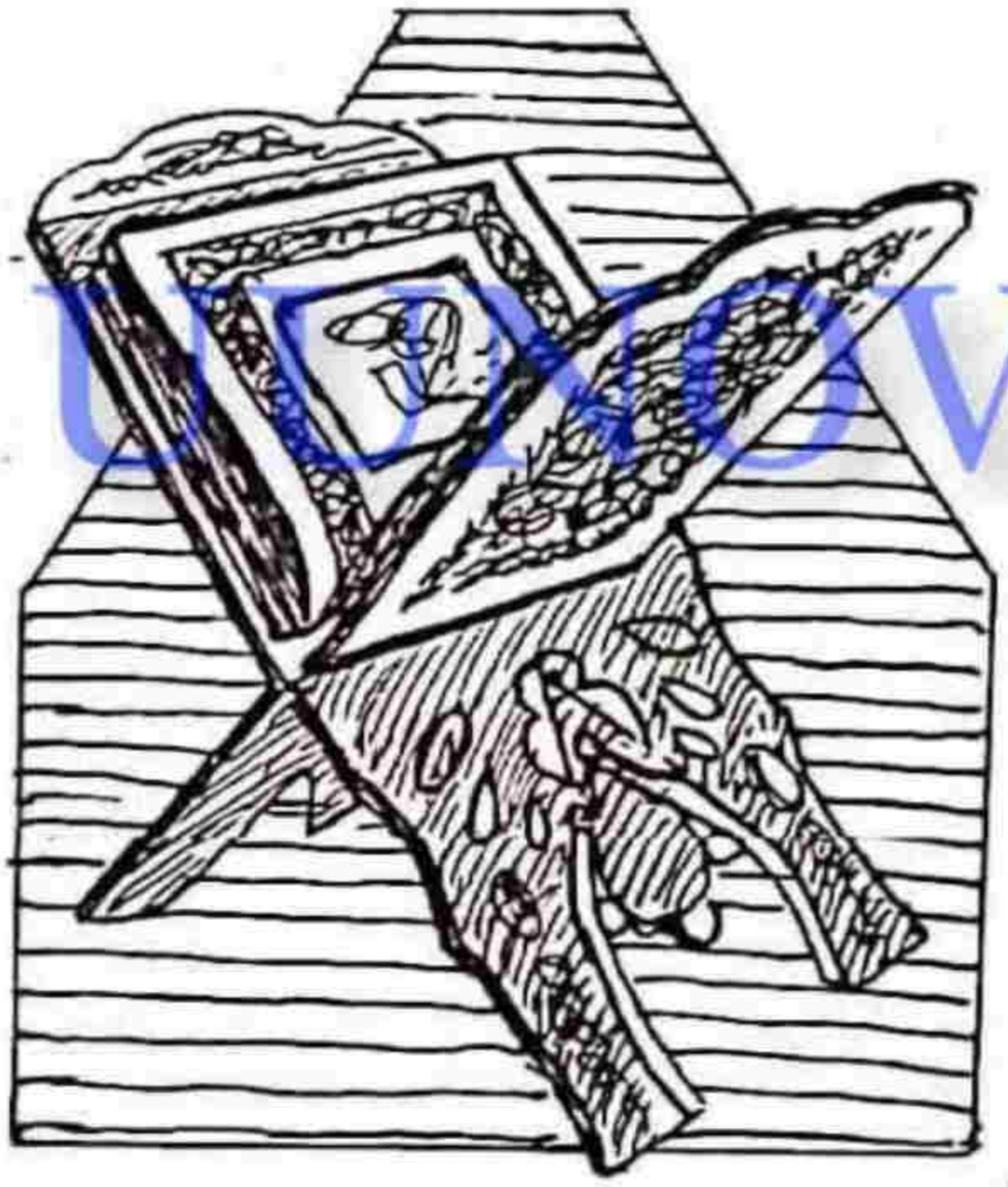

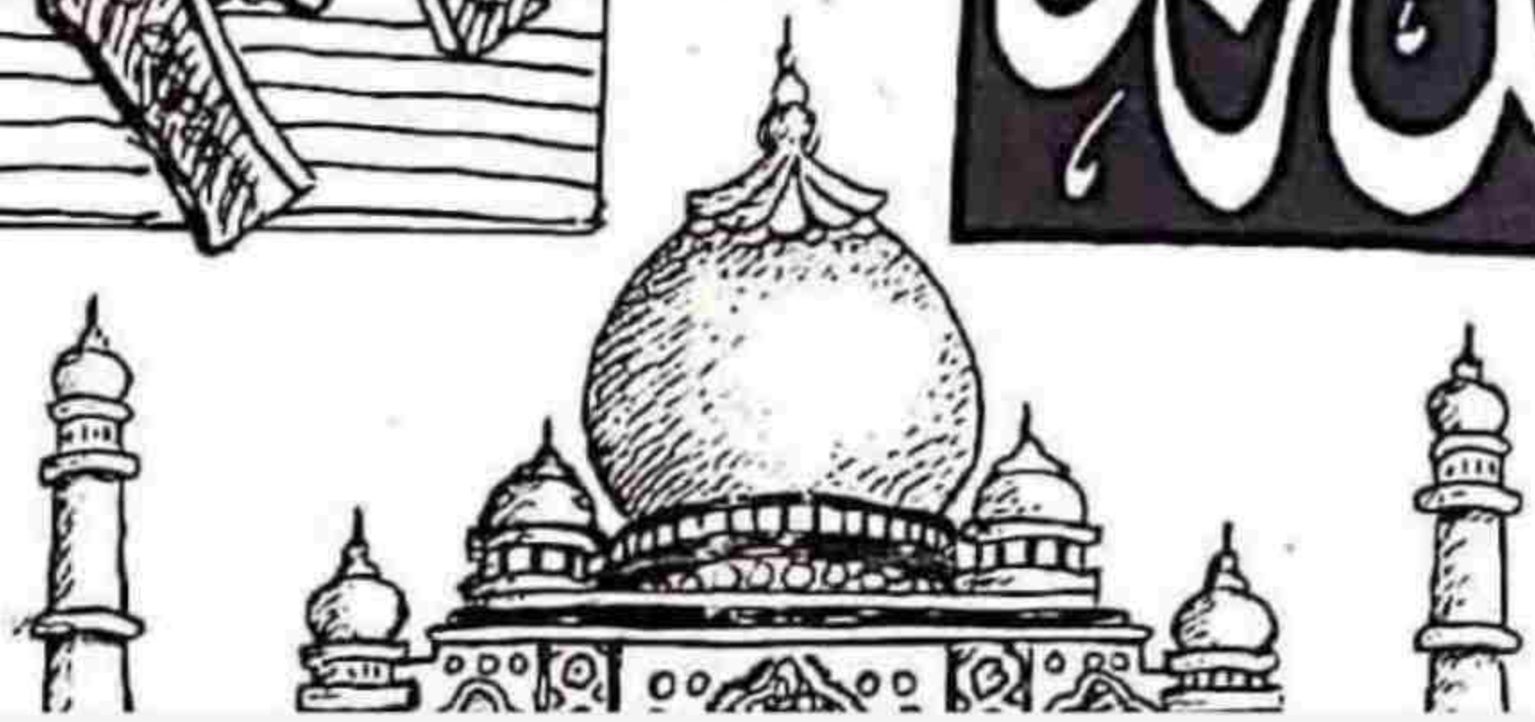

UUNOVELS.COM

قیدیوں کو پھر احساس ہوا کہ ان کا محسن بھی ان کے ساتھ آزاد ہو جائے۔

''آپ نے ہمارے لیے اتنا کیا ہے، آپ خود کیوں نہیں نکل جاتے؟''

''میں نے تم سے کہا نا کہ یہ ایک راز ہے جسے تم نہیں سمجھ سکتے۔ جلدی کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ ہم تو سولی پر چڑھیں گے، اسی وقت یہ راز ظاہر ہوگا۔''

تمام قیدی ایک ایک کر کے باہر نکل گئے اور آپ اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔

صبح ہوئی تو محافظوں نے دیکھا تمام قیدی فرار ہو چکے ہیں۔ منصور حلاج اسی طرح کمرے میں بند ہیں اور ان کے دروازے پر تالا جھول رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہ باہر نہیں نکلے۔ داروغۂ زنداں کو بلایا گیا۔ وہ بھی بدحواس تھا۔ اپنے ماتحتوں پر برسنے لگا پھر حضرت منصور کے پاس پہنچا۔

''تو نے کوئی شور سنا تھا؟''

''کیسا شور؟''

''رات کو تمام قیدی فرار ہو گئے۔ شور تو ہوا ہوگا اور تو کہتا ہے کوئی شور ہی نہیں سنا۔''

''ان قیدیوں کو ہم نے آزاد کر دیا۔''

''تم خود کیوں نہ بھاگ گئے؟''

''وہ قیدی ہماری طرح اللہ تعالیٰ کے قیدی نہیں تھے۔ ہمیں تو ہمارے محبوب نے یہاں رہنے کا حکم دیا ہے۔ ہم اس کا حکم کیسے ٹال سکتے تھے۔''

محافظ یہ جواب سن کر خوفزدہ ہو گیا اور بھاگا ہوا وزیر حامد بن عباس کے پاس گیا اور سارا ماجرا اس کو سنایا۔ وہ بدبخت آپ کی اس کرامت کا بھی قائل نہیں ہوا اور اسے بھی جادوگری سے تعبیر کیا۔

اس واقعے نے وزیر حامد بن عباس کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی دن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ منصور حلاج خود بھی فرار ہو جائیں اور اس کی ساری محنت اکارت چلی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قیدی باہر جا کر اس کی اس کرامت کا چرچا کریں اور اہلِ بغداد میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں کہ میں نے اسے قید میں ڈالا ہے۔

شرعی عدالت کی طرف سے حضرت منصور حلاج کے خلاف فتویٰ جاری ہو چکا تھا لیکن ابھی اس فتوے پر خلیفہ کے دستخط نہیں ہوئے تھے کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ حامد بن عباس کے لیے اب یہی مناسب تھا کہ جلد از جلد خلیفہ سے منظوری لے کر حضرت منصور کی سزا پر عملدرآمد کرا دے۔

اس نے خلیفہ کے نام دو خط تحریر کیے لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اب اس نے ضروری سمجھا کہ خود ملاقات کرے۔ وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ ایک اور واقعے نے اس کے قدم روک لیے یا یوں کہیے کہ اسے رکنا پڑا۔

خلیفہ مقتدر باللہ کا بیٹا ابوالعباس... جس کی عمر بہ مشکل چار سال تھی، اس نے ایک طوطا پالا ہوا تھا جو اچانک مر گیا۔ یہ طوطا ابوالعباس کو بہت پسند تھا۔ دن رات اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اسے مُردہ دیکھ کر وہ بری طرح رونے لگا۔ خادموں نے ہر طرح چاہا کہ وہ مُردہ طوطے کو ہاتھ سے رکھ دے اور رونا بند کر دے لیکن وہ کسی طرح بہلنے کو تیار نہیں تھا۔ خادموں نے اس حادثے کی اطلاع مقتدر باللہ کو دی۔ اس نے بھی شہزادے کو بہلانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی طرح کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کوئی بہتر سے بہتر طوطا لینے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اس کی تو بس ایک ہی ضد تھی کہ اسی طوطے کو زندہ کیا جائے۔ خلیفہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! جو مر جاتا ہے اسے پھر اللہ تعالیٰ ہی زندہ کر سکتا ہے۔''

اب شہزادے نے یہ ضد پکڑ لی کہ اللہ تعالیٰ سے کہو وہ میرا طوطا زندہ کر دے۔ وہ روتا جاتا تھا اور یہی کہتا جاتا تھا۔ خلیفہ نے بہت کوشش کی کہ وہ شہزادے کی توجہ طوطے کی طرف سے ہٹا سکے لیکن شہزادہ کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اچانک اس کا ذہن حضرت منصور کی طرف چلا گیا کیونکہ ان کی کرامات کے بارے میں سن رکھا تھا۔

خلیفہ نے اپنے ایک خادم کو قید خانے میں بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ منصور نامی قیدی کے سامنے تمام ماجرا بیان کرے اور ان سے درخواست کرے کہ وہ شہزادے کے طوطے کو اپنی روحانی قوت کے ذریعے دوبارہ زندہ کر دیں۔

حضرت منصور نے تمام باتیں غور سے سنیں اور خادم سے فرمایا۔ ''اپنے مالک سے کہنا کہ منصور گناہ گار میں اتنی طاقت کہاں کہ مُردہ کو زندہ کر دے، البتہ یہ ضرور کہنا کہ میرا ایک ایسا بھی ہے جس سے میں دعا کروں تو وہ پرندے کو دوبارہ زندہ کر دے۔ وہ میری دعا کبھی رد نہیں کرتا۔''

خادم واپس گیا اور جو کچھ حضرت منصور نے فرمایا تھا' خلیفہ کے گوش گزار کر دیا۔ خلیفہ نے مُردہ طوطا اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''ان سے کہنا میرا مقصد تو مردہ طوطے کو زندہ کرنا ہے ..... وہ کچھ بھی کریں، میرا مطلب پورا ہونا چاہیے۔''

خادم نے یہ پیغام بھی حضرت منصور تک پہنچا دیا۔

حضرت منصور نے خادم کے ہاتھ سے طوطا لے لیا۔ آپ نے ایک نگاہ مردہ طوطے پر ڈالی اور پھر اسے اپنی آستین میں چھپا کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پھر جب طوطے کو آستین سے نکالا تو طوطا زندہ ہو چکا تھا۔ خادم نے زندہ طوطا دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ اسی طوطے کو لے کر خوشی خوشی مقتدر باللہ کے پاس آیا۔ طوطے کو زندہ دیکھ کر خلیفہ کی حالت بھی وہی ہوئی جو کچھ دیر پہلے خادم کی ہوئی تھی۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کرامت کی گونج پورے قصرِ خلافت میں سنائی دینے لگی۔ ہر ایک آپ کی اس کرامت کا قائل ہو رہا تھا۔

وزیر حامد بن عباس نے یہ واقعہ سنا تو اس کی عقل گم ہونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کرامت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر دشمنی کی پٹی ایسی بندھی ہوئی تھی کہ حضرت منصور کے قتل کے سوا اسے کچھ اور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی بدحواسی تو اس لیے تھی کہ ایک ایک کر کے سب حضرت منصور کے قائل ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے ابونصر اور اس کی بیگمات اس کی عقیدت مند ہوئیں اور اب مقتدر باللہ بھی یقیناً اس کرامت کے بعد اپنے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ رکھنے لگے ہوں گے۔

اس سے پہلے کہ وہ خلیفہ سے ملاقات کرتا، خلیفہ نے اسے خود طلب کر لیا اور منصور حلاج کا ذکر چھیڑا۔

''جس شخص کو تم نے زنداں میں ڈال رکھا ہے، وہ نہایت باکرامت شخص ہے۔ اس نے آج ایک مردہ طوطے کو دوبارہ زندہ کر دیا۔''

حامد بن عباس نے جیسے ہی یہ بات سنی، اسے اپنا منصوبہ ناکام ہوتا دکھائی دیا۔ اسے حضرت منصور کے قتل نامے پر دستخط کرانے تھے اور وہ دیکھ رہا تھا کہ خلیفہ بھی ان کا عقیدت مند ہو گیا ہے۔

وہ نہایت چالاک شخص تھا۔ اس نے خلیفہ کی اس رگ پر ہاتھ رکھ دیا جس کے دبتے ہی اہلِ اقتدار کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔

''کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ایسے شخص کا راستے سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ مملکت کے مفاد میں یہی ہے کہ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے جبکہ شرعی عدالت اس کے خلاف فیصلہ سنا چکی ہے۔''

''اس کا وجود مملکت کے مفاد کے خلاف کیسے ہے؟''

''اس شخص نے شعبدے دکھا دکھا کر عوام الناس کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کسی روز یہی لوگ آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو افراتفری پھیل جائے گی۔ ہزاروں لوگوں کی جان لینے سے بہتر ہے کہ ایک شخص کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔''

غرض اس نے ایسی پُراثر تقریر کی کہ کسی ممکنہ بغاوت سے خلیفہ خود ڈر گیا اور فوراً یہ حکم نامہ جاری کر دیا۔

''جب قاضی القضاۃ اور علمائے بغداد نے منصور حلاج کے قتل کا فتویٰ دے دیا ہے تو پھر منصور حلاج کو عبدالصمد کوتوال کے حوالے کر دیا جائے اور کوتوال کی زیرِ نگرانی کوڑے لگائے جائیں۔ اگر اس سزا سے وہ مر جائے تو بہتر ورنہ اس کا سر قلم کر دیا جائے۔''

حامد بن عباس اس حکم کے انتظار میں تھا۔ اس نے دوسرے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی کوتوال عبدالصمد کو زنداں کی طرف بھیجا۔

کوتوال نے حضرت منصور کے کمرے کے سامنے پہنچ کر محافظ کو حکم دیا کہ تالا کھول دو۔ محافظ کچھ حیران ہوا کہ یہ وقت تالا کھولنے کا نہیں تھا لیکن حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے تالا کھولا اور حضرت منصور کو باہر آنے کے لیے کہا۔ اس ناوقت تالا کھلنے پر

حضرت منصور کو شک ہوا لہٰذا آپ نے پوچھا۔ ''باہر کون ہے؟ اس وقت مجھے کیوں بلایا جا رہا ہے؟''

''کوتوال عبدالصمد اور اس کے سپاہی باہر کھڑے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے اب ہم ہلاک ہوئے۔'' حضرت منصور نے فرمایا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ آپ کے پیروں میں اس وقت بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن آپ سبک رفتاری سے چل رہے تھے جیسے ان بیڑیوں کا کوئی وزن ہی نہ ہو۔ آپ نے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آپ کے ہونٹوں پر اس وقت نہایت دلفریب تبسم تھا۔ اپنی موت کا علم ہو چکا تھا لیکن چہرے پر کسی خوف کا عکس تک نہیں تھا۔

یہ منگل کا دن تھا اور ذی قعدہ کے مہینے کی 24 تاریخ تھی۔

یہ خبر کسی نہ کسی طرح اہل بغداد تک پہنچ چکی تھی کہ آج حضرت منصور حلاج کو پھانسی دی جائے گی لہٰذا لوگوں کی بڑی تعداد اس میدان میں جمع ہو گئی تھی جہاں آپ کو لے جایا جا رہا تھا۔ کوتوال کے سپاہی مجمعے کو قابو کرنے کے لیے کوڑے مار رہے تھے تاکہ کوئی شورش برپا نہ ہو۔

حضرت منصور خچر پر سوار تھے اور بے تابانہ یہ اشعار پڑھتے جا رہے تھے۔

''میرا ندیم ذرا بھی ظالم نہیں۔ اس نے مجھے ویسی ہی شراب محبت پلائی جیسی ایک میزبان، مہمان کو دیا کرتا ہے۔ پھر جب شراب کا دور چلنے لگا اور نشہ پورا ہو گیا تو میں بے ادب ہو گیا۔ اس نے ترک ادب پر مجھے سزا دی، تلوار منگوائی اور مجھے چمڑے کے بستر پر بٹھا کر قتل کیا۔

''اس شخص کی یہی حالت ہوتی ہے جو گرمی کے موسم میں اژدہے کے ساتھ بیٹھ کر پرانی شراب پیتا ہے۔''

جب کھلا میدان بالکل قریب آ گیا تو آپ کی زبان پر قرآن حکیم کی یہ آیت آ گئی۔ ''جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ قیامت کو جلدی لانا چاہتے ہیں اور جو اس پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقیناً آنے والی ہے۔''

ہجوم کی نظر جیسے ہی حضرت منصور پر پڑی، آہ وزاری کے ساتھ لوگوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اتنے بڑے مجمعے پر قابو پانا آسان نہیں تھا لیکن کوتوال نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ تمہیں جتنی طاقت استعمال کرنا پڑے استعمال کرنا۔ سپاہیوں نے بے تحاشا کوڑے برسانا شروع کر دیے اور مجمعے کو ایک جگہ رکنے پر مجبور کر دیا۔

اسی وقت ایک بوڑھی عورت ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے آئی۔ وہ چونکہ حضرت شبلیؒ کا ایک سوال لے کر آئی تھی اس لیے سپاہیوں نے اسے حضرت منصور کے پاس جانے دیا۔ بوڑھی عورت نے آپ سے کہا۔ ''شبلی نے یہ پوچھا ہے کہ تصوف کیا ہے؟''

''میں اس وقت جس حالت میں ہوں اسی کا نام تصوف ہے۔ ایک صوفی نعمت اور بلا میں کسی بھی وقت فرق محسوس نہیں کرتا۔''

یہ جواب دینے کے بعد حضرت منصور سیڑھیاں چڑھنے لگے تاکہ اس چبوترے تک پہنچ سکیں جہاں آپ کے لیے پھانسی کا پھندا تیار تھا۔

اگلی صفوں میں حکومت وقت کے حاشیہ بردار اور موقع پرستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ انہوں نے پتھر مارنا شروع کر دیے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے۔

''اس کا قتل کرنا مسلمانوں کے نفع میں ہے۔ اس کا خون ہماری گردنوں پر۔ اسے قتل کر دو۔''

مجمعے میں شورش پیدا ہو رہی تھی لیکن انتظامات اتنے سخت تھے کہ کسی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی لیکن آپ کا ایک خادم جان پر کھیل کر آپ کے پاس پہنچ گیا۔

''شیخ! مجھے آخری نصیحت فرمایئے۔''

شدید سنگ باری سے آپ سر سے پاؤں تک خون میں نہا گئے تھے لیکن آپ نے نہایت پامردی سے خادم کو جواب دیا۔

''اپنے نفس کو دنیا کی تمام خواہشوں سے خالی کر لے ورنہ یہ نفس تجھے ایسی چیزوں میں پھانس دے گا جو تیری برداشت سے باہر ہوں گی۔''

سپاہیوں نے آپ کے خادم کو دھکے دے کر سیڑھیوں سے اتار دیا۔

کوتوال عبدالصمد نے جلاد کو حکم دیا کہ کوڑے لگائے جائیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مجمع ایک مرتبہ پھر بے قابو ہو گیا۔

اس دھکم پیل کے دوران ایک بوڑھا شخص حضرت منصور تک پہنچ گیا۔

''حضرت! عشق کیا ہے؟''

''آج دیکھ لو گے۔ پھر کل دیکھو گے اور پھر پرسوں دیکھو گے۔''

ان الفاظ کا مطلب کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اس کی تعبیر بعد میں ظاہر ہونے والی تھی۔

کوتوال نے جلاد کو ایک مرتبہ پھر اشارہ کیا کہ کوڑے مارنے کی سزا شروع کی جائے۔

ایک ہزار کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ تعداد اتنی تھی کہ کسی بھی انسان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی اور پھر حضرت منصور کو تو سخت عبادت و ریاضت نے جسمانی طور پر بہت کمزور کر دیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ حضرت منصور کا کمزور جسم ایک کوڑا بھی برداشت نہیں کر سکے گا لیکن دنیا دیکھ رہی تھی کہ آپ کے جسم پر تازیانوں کی بارش ہو رہی تھی اور آپ کی زبان پر اُف تک نہیں تھی۔ بس ہر کوڑے پر احد، احد کی صدا بلند کر رہے تھے بلکہ جلاد نے تو بعد میں یہ بھی بتایا کہ وہ غیب سے آنے والی ایک آواز بھی سن رہا تھا جس میں کہا جا رہا تھا۔ ''لاتخف ہذا معراج الصادقین'' (یعنی اے ابنِ منصور! ڈرو نہیں، یہ مقام صادقین کی معراج کا ہے)۔

جب کوڑوں کی تعداد چھ سو تک پہنچ گئی تو کوڑے مارنے والا خود تھک گیا۔ اس نے سانسوں کو درست کرنے کے لیے ہاتھ روک لیا۔

کوتوال نے جلاد کو ڈانٹا۔ ''کیا تیرے ہاتھوں کی طاقت ختم ہو گئی ہے؟ پوری طاقت استعمال کر۔''

جلاد نے تازیانہ بلند کیا اور احد احد کی آواز میں ایک اور کوڑے کا اضافہ ہو گیا۔

اتنی بڑی تعداد میں کوڑے کھانے کے بعد طاقت ور سے طاقت ور انسان بھی اگر ہلاک نہیں تو بے ہوش ضرور ہو جاتا لیکن آپ پوری طرح ہوش میں تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت ہے جو ان کوڑوں کو آپ کی پیٹھ تک پہنچنے ہی نہیں دے رہی ہے۔

کوڑوں کی سزا پوری ہوتے ہی کوتوال نے نیا حکم جاری کر دیا۔

''حلاج کا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے۔''

مقتدر باللہ کے حکم نامے میں صاف لکھا تھا۔ ''حلاج اگر کوڑوں کی سزا کے دوران مر جائیں تو اچھا ورنہ ان کا سر قلم کر دیا جائے۔'' یہ کہیں نہیں لکھا گیا تھا کہ انہیں اذیت دینے کے لیے ان کا کوئی عضو کاٹا جائے اور اب ان کا ایک ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

ایک معمولی کوتوال کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ حکم نامے کے برخلاف کوئی حکم جاری کرے۔ یقیناً اس کے پیچھے وزیر حامد بن عباس تھا جو آپ کی دشمنی میں اتنا آگے نکل گیا تھا کہ آپ کو اذیت دے کر اس کے قلب کو تسکین ہوتی تھی۔

جلاد حکم کی تعمیل میں آگے بڑھا اور انتہائی بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت منصورؒ کا ایک ہاتھ کاٹ دیا۔ آپ کی زبان پر اس وقت بھی چیخ پکار کے بجائے اشعار کا ہجوم تھا۔

''میں اسی محبت کی قسم کھاتا ہوں جسے انقلابِ زمانہ کبھی نہ بگاڑ سکے۔ ہجومِ بلا کے وقت نہ مجھے ضرر پہنچا نہ کوئی تکلیف ہوئی۔''

یادِ خداوندی ایسی غالب تھی کہ کسی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا۔

پھر دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا۔

آپ نے خون آلود ہاتھوں کو اپنے چہرے پر ملا اور فرمایا۔ ''میرے چہرے کی زردی اس خون سے سرخی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو ہو کر جانا چاہتا ہوں۔''

آپ کے جسم پر مسلسل قیامت ٹوٹ رہی تھی لیکن آپ کی زبان پر مسلسل اللہ تعالیٰ کی کبریائی تھی۔

اس کے بعد آپ کے دونوں پاؤں کاٹ دیے گئے۔ اتنا خون بہہ جانے کے بعد بھی آپ ہوش میں تھے۔ اسے بھی

آپ کی کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔
پاؤں کٹنے کے بعد آپ نے اراکینِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میرے ظاہری پاؤں قطع کر دیے لیکن ابھی میرے باطنی پاؤں باقی ہیں جنہوں نے ہمت کا تاج عرش کے سر پر اتارا ہے۔''
دونوں پاؤں بھی کاٹ دیے گئے تو آپ کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ ابھی وہ زندہ تھے۔ خلیفہ مقتدر باللہ کی طرف سے سر کاٹنے کا حکم ابھی نہیں آیا تھا اس لیے یہ کام دوسرے دن تک ملتوی کر دیا گیا۔
سفاکی کی حد تھی کہ ایک آدمی جس کے دونوں ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے ہوں، اسے زندہ سولی پر لٹکا دیا گیا۔
حضرت منصور حلاج شدید تکلیف میں رات بھر سولی پر لٹکے رہے۔
مقتل کی ہولناک رات میں بس ایک ہی جملہ آپ کی زبان پر تھا۔
''پانے والے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی یار و مددگار نہیں۔''
جس شخص کو اس جرم میں سزا دی جارہی تھی کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے، وہ رات بھر توحید کا شور بلند کرتا رہا۔
دوسرے دن خلیفہ کا حکم آچکا تھا۔ جلاد کا ہاتھ بلند ہوا۔ حضرت منصور کی زبان سے پھر وہی کلمہ بلند ہوا۔ ''پانے والے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ تنہا اللہ اس کا ہے اور کوئی مددگار نہیں۔'' جلاد کا ہاتھ کچھ دیر کے لیے فضا ہی میں معلق ہو گیا تھا۔ یہ جملہ سن کر اس پر تھرتھری طاری ہو گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے حضرت حسین بن منصور حلاج کا سر قلم ہو گیا۔
حضرت منصور کا رشتۂ حیات جیسے ہی منقطع ہوا، پورا مقتل ''انا الحق'' کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ لوگ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں۔ عقدہ یہ کھلا کہ یہ آواز حضرت منصور کے لہولہان جسم سے ابھر رہی ہے۔
حامد بن عباس حواس باختہ ہو گیا۔ دوڑتا ہوا کوتوال کے پاس پہنچا۔ ''اس آواز کو کیسے بند کیا جائے۔ مرنے کے بعد تو یہ شخص ہمارے لیے اور بھی خطرناک ہو گیا۔''
جتنے اراکین سلطنت اس وقت موجود تھے، سب سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سپاہیوں نے مجمعے کو منتشر کر دیا تھا۔ اب تاریکی تھی، تنہائی تھی اور چند نفوس کے مشورے۔
جلاد کو حکم دیا گیا کہ حضرت منصور کے جسم کو ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا جائے، کسی طرح یہ آواز تو بند ہو۔ جلاد نے حکم کی تعمیل کی۔ آپ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ اب بھی انا الحق کی آوازوں سے میدان گونج رہا تھا۔
''اگر یہ شور بند نہ ہوا تو اہلِ بغداد ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔''
سب کے سب اتنے خوف زدہ ہوئے کہ آپ کے جسم کے ٹکڑوں کو اسی طرح مقتل میں چھوڑ کر چلے گئے۔
ان کے خیال میں وقت کے ساتھ ساتھ یہ آوازیں بند ہو جائیں گی لیکن ہوا اس کے برعکس۔ دوسرے دن حامد بن عباس اپنے ساتھیوں کو لے کر مقتل میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خون کے ایک ایک قطرے سے انا الحق کی آواز بلند ہو رہی ہے۔
وزیر حامد بن عباس کی طرف سے ایک اور حکم جاری ہوا۔
''حلاج کے بریدہ جسم کو آگ لگا دی جائے۔''

☆.....☆

شیخ فریدالدین عطار تذکرۃ اولیاء میں رقم طراز ہیں۔ ''روایت ہے کہ جب آپ کو دار کے نزدیک لے گئے تو آپ نے اول دار کو بوسہ دیا پھر سیڑھی پر قدم رکھ کر فرمایا کہ دار مردوں کی معراج ہے۔ پھر قبلے کی جانب منہ کر کے کچھ کہا۔ اس کے بعد مریدوں نے پوچھا کہ ہمارے متعلق آپ کا کیا حکم ہے اور منکروں کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ فرمایا کہ منکروں کو دوثواب ہوں گے اور تم کو ایک کیونکہ تم لوگ میرے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہو مگر منکر توحید اور شریعت کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہیں اور شرع میں توحید اصل اور حسنِ ظن فرع ہے..... جب آپ کے ہاتھ دار کی سیڑھی سے جدا کر دیے گئے یعنی کاٹ دیے گئے تو آپ ہنسے۔ پوچھا کہ یہ ہنسی کا کون سا موقع ہے؟ فرمایا کہ نسبت آدم سے ہاتھوں کو جدا کرنا آسان ہے۔ ایسے لوگ چاہیں تو ہمارے دست صفات کو قطع کریں۔ اس کے بعد آپ کے پاؤں کاٹے گئے تو پھر تبسم کیا اور فرمایا کہ ان پاؤں کے علاوہ میرے اور پاؤں بھی ہیں۔ ان کو کاٹو تو جانوں۔ اس کے بعد دونوں خون آلود کٹے ہوئے ہاتھ منہ پر مل لیے اور فرمایا کہ کثرت سے خون نکل جانے

توکل

حضرت ابوعمر تحیل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ 40 سال تک خدا کی رضا کے علاوہ اس سے کچھ طلب نہیں کروں گا۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحب زادی شدید علیل ہو گئیں مسلسل علاج کے باوجود مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا چنانچہ ایک رات ان کے شوہر عبدالرحمن سلمٰی نے ان سے کہا کہ تمہارا علاج تمہارے والد کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ تمہارے والد نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ چالیس سال تک خدا کی رضا کے سوا کچھ طلب نہ کروں گا اور اس عہد کو چالیس سال گزر چکے ہیں لہٰذا وہ نقض عہد کر کے تمہارے لیے دعا کر دیں تو یقیناً صحت یاب ہو جاؤ گی گو نقض عہد گناہ ہے لیکن اس سے تمہیں صحت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر وہ آدھی رات کو ہی اپنے والد کے گھر پہنچ گئیں اور جب آپ نے پوچھا کہ "عقد کے بعد سے تم یہاں بیس سال تک کبھی نہیں آئیں پھر آج آنے کی کیا وجہ ہے۔"

صاحب زادی نے عرض کیا کہ "اس کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے مجھے آپ جیسا عظیم المرتبت باپ اور عبدالرحمن سلمٰی جیسا شوہر عطا کیا ہے اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں زندگی سے زیادہ کوئی عزیز شے نہیں ہوتی اور مجھے بھی بہ تقاضائے بشریت اپنی زندگی عزیز ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی ہی کی بدولت مجھے آپ کا اور شوہر کا دیدار ہوتا رہتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے خدا سے یہ عہد کیا ہے کہ چالیس سال تک تیری رضا کے علاوہ اور کچھ طلب نہیں کروں گا۔ لہٰذا میں آپ کو آپ ہی کے عہد کا واسطہ دے کر عرض کرتی ہوں کہ آپ نقض عہد کر کے میرے حق میں دعائے صحت فرما دیں۔" لیکن فرمایا آپ نے کہ "نقض عہد کسی طرح جائز نہیں خواہ وہ بندے ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو پھر خدا سے نقض عہد کرنا بہت ہی باعث ملامت ہے اور اگر میں نقض عہد کر کے تمہارے لیے دعا کر دوں اور تم صحت یاب ہو جاؤ پھر بھی اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی اور جب موت کی آمد میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں تو پھر اب یا کچھ عرصے بعد موت آنے میں کیا فرق پڑتا ہے۔ لہٰذا میں اس گناہ کا مرتکب ہونا مناسب نہیں سمجھتا۔" اس جواب سے آپ کی صاحب زادی کو یقین ہو گیا کہ اب میرا وقت آ چکا ہے اور صحت یابی ممکن نہیں لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور آپ کی وفات کے بعد بھی چالیس سال زندہ رہیں۔

(حکایت اولیا سے اقتباس)

کی وجہ سے ممکن ہے، میرا چہرہ زرد ہو گیا ہو۔ اس لیے میں نے خون مل لیا ہے کہ سرخرو ہو جاؤں اور لوگ یہ گمان نہ کریں کہ موت سے ڈر کر میرا رنگ زرد ہو گیا ہے۔"

جب آپ کی آنکھیں نکال لی گئیں تو ایک کہرام مچ گیا۔ اس کے بعد آپ کی زبان کو کاٹنا چاہا مگر آپ نے فرمایا۔ "ذرا صبر کرو۔" پھر کہا۔ "الٰہی محض تیرے لیے یہ لوگ مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ تو ان کو اپنے فضل و کرم سے محروم نہ رکھ کیونکہ ان لوگوں نے تیری شریعت کی خاطر یہ تکلیف دی ہے۔"

☆.....☆

حکم دیا جا چکا تھا کہ حلاج کے بریدہ جسم کو آگ لگا دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ آپ کے جسم کے ٹکڑے آگ پر پیچ و تاب کھا رہے تھے اور ان سے اناالحق کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسی کا منہ بند کیا جا سکتا ہے، ان آوازوں کو کیسے روکا جائے۔ حکومتی کارندے حیران پریشان اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔

جب جسم کے ٹکڑے جل کر راکھ بن گئے تو راکھ سے اناالحق کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

قتلِ منصور اہلِ اقتدار کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ یہ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا کہ یہ آوازیں سن کر اہلِ بغداد مشتعل نہ ہو جائیں۔ جلد سے جلد یہ آواز بند ہونی چاہیے۔ یہ طے کیا گیا کہ کل اس راکھ کو دریائے دجلہ میں بہا دیا جائے۔ دریا کا پانی اس راکھ کو کہیں سے کہیں لے جائے گا اور آوازیں بند ہو جائیں گی۔

یہ تیسرا دن تھا جب حضرت منصورؒ کی باقیات کو ایک اونچے مینار سے دریائے دجلہ میں ڈالا گیا مگر جونہی یہ راکھ دریا میں ڈالی گئی دریا کا سکون تلاطم میں بدل گیا۔ طغیانی کے آثار پیدا ہو گئے اور پانی کناروں سے لبالب بھر گیا۔ یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کچھ ہی دیر میں شہر بغداد غرق ہو جائے گا۔ کسی طوفانی بارش کے بغیر سیلاب کا آ جانا باعثِ حیرت تھا۔

UUNOVELS.COM

حامد بن عباس حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ شاید اس مصیبت سے چھٹکارا دینے کے لیے کوئی آ جائے۔ اس وقت حامد بن عباس سے زیادہ بے بس شاید ہی کوئی ہو۔ اسی وقت ایک بوڑھا مجمعے سے باہر آیا۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ سانس پھول رہا تھا۔ بغل میں کوئی کپڑا دبا ہوا تھا۔ وہ سیدھا حامد بن عباس کے پاس پہنچا۔

''شہر میں افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ پانی اسی طرح بڑھتا رہا تو بغداد غرق ہو جائے گا۔''

''اے بوڑھے! یہ سب تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ اگر تیرے پاس کوئی تدبیر ہے تو وہ بتا۔''

''میں یہی بتانے آیا تھا۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''میرے آقا نے تختۂ دار پر آنے سے پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ جب میری خاکستر دریائے دجلہ میں پھینکی جائے گی تو دریائے دجلہ میں ایک طوفانی سیلاب آئے گا اور اس کی موجیں بغداد شہر کی دیواروں سے ٹکرانا شروع کر دیں گی۔ اس وقت میرا خرقہ دریا کے سامنے لے جا کر کہنا 'اے دریائے دجلہ! تجھے حسین بن منصور حلاج کے اس خرقے کے پیشِ نظر شہر سے ہٹ جانا چاہیے۔''

''وہ خرقہ (کرتہ) ہے تیرے پاس؟'' حامد بن عباس نے کہا۔

''یہ رہا وہ کرتہ۔'' بوڑھے نے اپنی بغل سے نکال کر دکھایا۔

''مجھے کیا دکھا رہا ہے، جلدی کر اور وہ کر جو تیرے آقا نے تجھ سے کہا تھا۔''

کیسا عجیب وقت آیا تھا۔ وہی حامد بن عباس جو حضرت منصور کو جادوگر اور شعبدہ باز کہتا رہا تھا، اب انہی کا خرقہ مدد کے لیے طلب کر رہا تھا۔

اب خادم کا داؤ چل گیا تھا۔ حامد بن عباس کے نرم پڑتے ہی بوڑھے نے کھری کھری سنا دیں۔

''تو نے میرے مخدوم کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کے بعد ہرگز تو کسی رعایت کا مستحق نہیں۔ اگر میرے مخدوم کی وصیت کا مجھے پاس نہ ہوتا تو ہرگز یہ راز فاش نہ کرتا۔ تجھے اور تیرے بغداد کو ڈوبنے دیتا۔''

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ جلدی کر، دریا کنارے کے اوپر آ گیا ہے۔''

اس بوڑھے نے حضرت منصور کا کُرتہ دریا کو دکھا کر وہ الفاظ دہرائے جو حضرت منصورؒ نے فرمائے تھے۔

حضرت فریدالدین عطارؒ نے تذکرۃ الاولیاء میں اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''آپ (حضرت منصورؒ) نے پہلے ہی خادم کو وصیت کر دی تھی کہ یہ لوگ میری خاک کو دریا میں ڈالیں گے اور دریا جوش مار کر بغداد کی طرف بڑھے گا۔ پس جب تم ایسی حالت دیکھو تو فوراً میرا پیراہن دجلہ کی طرف کر دینا چنانچہ جب خادم نے یہ کیفیت مشاہدہ کی اور اہل شہر میں ابتری پیدا ہو گئی تو خادم نے دجلہ کی طرف خرقہ کر دیا جس کو دیکھتے ہی دریا کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور پانی اصلی حالت پر آ گیا۔''

حضرت فریدالدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ دریائے دجلہ پُرسکون ہوتے ہی حضرت منصورؒ کے جسم کی تمام راکھ جمع ہو کر ساحل پر آ گئی جسے آپ کے عقیدت مندوں نے اکٹھا کر کے دفن کر دیا۔

ایک روایت یہ ملتی ہے کہ خلیفہ مقتدر باللہ کی والدہ ''شغب'' نے حضرت منصور حلاج کے ''سر'' کو ایک سال تک شاہی خزانے میں حفاظت سے رکھا اور پھر اپنے بھائی کے مقبرے کے نزدیک دفن کرا دیا۔

ایک سال تک شاہی خزانے میں رکھنے اور پھر ایک سال بعد دفن کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حامد بن عباس دنیا سے گزر گیا ہو گا تب تدفین عمل میں آئی ہو گی۔

اس سے حامد بن عباس کے اثر رسوخ اور طاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کی والدہ تک اس سے خائف تھی۔

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بغداد کے علماء و مشائخ کتنے خائف ہوں گے کہ اس کے ڈر سے حضرت منصور کے قتل نامے پر دستخط کر دیے اور بعد میں بھی کوئی شورش پیدا نہیں ہوئی۔ شہریوں نے تھوڑا بہت احتجاج کیا جس پر قابو پا لیا گیا۔ ورنہ علماء اور صوفیہ کی رائے حضرت منصور کے حق میں وہ نہیں تھی جو حامد بن عباس اور اس کی جماعت کی تھی۔ وہ انہیں کافر و زندیق کہتا تھا تاکہ ان کے قتل کا جواز پیدا ہو سکے۔ اس کے برخلاف اس دور کے صوفیائے کرام کی رائے آپ کے بارے میں کچھ اور تھی۔

حضرت شیخ ابن عطاؒ حضرت منصور کے ہم عصر اور امام شریعت و طریقت تھے۔ وہ حضرت منصور کا مقام و مرتبہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے۔ ''ہم تو منصور کے ادنیٰ غلاموں میں سے ہیں۔''

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ

حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف بہت بڑے صوفی بزرگ تھے۔ اس کے باوجود خود کو حضرت منصور کا نیاز مند کہا کرتے تھے۔ خود بھی صاحب کرامت تھے اور حضرت منصور کی کرامات فخریہ بیان کرتے تھے۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ شعبدہ ہے، کرامت نہیں۔

آپ کا مشہور قول ہے کہ حضرت حسین بن منصور عالم ربانی تھے۔

حضرت شیخ ابوالقاسم نصر آبادیؒ صوفیہ میں نہایت ممتاز تھے۔ علمائے ظاہر میں بھی آپ نرالی شان کے حامل تھے۔ حدیث میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ انبیائے کرام اور صدیقین کے بعد اگر کوئی موحد ہے تو وہ حلاج ہی ہیں۔

حضرت شبلیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''میں اور ابن منصور دونوں ایک ہی ہیں۔ میرا بھی وہی حال ہے جو ان کا ہے مگر فرق یہ ہے کہ انہوں نے اپنا حال ظاہر کر دیا اور میں نے چھپائے رکھا۔''

امام ابوالقاسم عبدالکریم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت منصور حلاج کا عقیدہ اہل سنت کے عقیدے کے مطابق تھا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت منصور کو سالک طریقت مانتے تھے۔ اپنی ایک تصنیف میں فرماتے ہیں۔ ''حسین بن منصور کو طریقت میں ایک دشواری پیش آ گئی تھی۔ ان کے زمانے میں کوئی ایسا نہیں تھا کہ ان کا ہاتھ پکڑ لیتا اور سلامتی کے ساتھ اس دشواری سے نکال دیتا۔''

یہی حال شیخ عبدالوہاب شعرانی کا ہے۔ انہوں نے حضرت منصور حلاج کو اولیاء میں شمار کیا اور ان کے عارفانہ اقوال سے اپنی کتاب ''طبقات کبریٰ'' کو زینت دی۔

حضرت سید علی ہجویر کے نزدیک حضرت حسین بڑے قوی حال اور عالی ہمت بزرگ تھے۔

شیخ فریدالدین عطارؒ تذکرۃ اولیاء میں لکھتے ہیں۔ ''آپ قتیل فی سبیل اللہ ہیں۔ آپ کی حالت نہایت عجیب و غریب گزری ہے۔ اپنے طریقے میں خود ہی مخصوص ولا ثانی تھے۔ ہر وقت غایت سوز و فراق میں مست و بے قرار رہا کرتے تھے۔ پاکباز، عاشق الٰہی مشہور زمانہ تھے۔ حقائق و معارف اور اسرار معانی میں نہایت کامل اور فصاحت و بلاغت میں ماہر و بے بدل تھے۔ شروع سے آخر تک آپ کی حالت کی تمام بنیاد ''بلا'' (تکلیف) پر ہے۔ مشقت اور مجاہدے میں بڑے درجے پر فائز تھے۔ باریک بیں تھے اور فراست و دانائی میں بے نظیر تھے۔''

حضرت شبلیؒ سے منقول ہے کہ جس شب آپ (حضرت منصورؒ) کی راکھ کو دفن کیا گیا، اسی شب میں آپ کی قبر مبارک پر پہنچ کر ساری رات عبادت کرتا رہا۔ صبح کے وقت اپنی مناجات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یہ ایک مومن بندہ تھا تو پھر تو نے ایک ایسے عارف و محب کو جو وحدت پرست تھا، ایسے عذاب میں کیوں مبتلا کیا۔ حضرت شبلی فرماتے ہیں کہ ابھی میری یہ دعا پوری نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اونگھ آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہم نے منصور کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے کیا کہ وہ ہمارے راز غیروں پر ظاہر کر دیتا تھا۔''

حضرت شبلیؒ ہی سے یہ روایت بھی ملتی ہے کہ قتل کے بعد میں نے حضرت منصور حلاجؒ کو خواب میں دیکھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ حضرت نے فرمایا، اللہ نے اپنی نوازش سے مجھے قصر صدق میں اتارا۔

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں، میں نے پھر پوچھا۔ ''ان دونوں گروہوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جو آپ کو اچھا اور برا کہتے تھے؟''

''اللہ نے ان دونوں پر اپنی رحمت نازل فرمائی۔ ایک گروہ پر اس لیے رحمت نازل کی گئی کہ اس نے میرے حال سے واقف ہو کر مجھ پر مہربانیاں کیں اور دوسرے پر اس لیے کہ وہ مجھ سے واقف ہی نہیں تھا اور مجھ سے دشمنی رکھتا تھا۔''

حضرت شبلیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ جس وقت حضرت حسین بن منصور حلاجؒ تختۂ دار پر کھڑے تھے تو شیطان آیا اور کہنے لگا۔ آپ تو انا الحق کہتے ہیں، میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ میں غیر اللہ کو سجدہ نہیں کرتا مگر لوگ آج تک مجھے لعنت کر رہے ہیں جبکہ آپ کے اوپر رحمت نازل ہوئی۔ حضرت منصور نے فرمایا۔ تمہاری انا اپنی ذات کے لیے تھی اور میرا انا الحق کہنا اللہ تعالیٰ کی ذات کا اظہار ہے۔

حضرت منصورؒ نے تختۂ دار پر جانے سے قبل ہی واضح الفاظ میں اپنی بے گناہی ثابت کر دی تھی اور فرما دیا تھا کہ میں صحیح العقیدہ مسلمان ہوں۔ ایک خدا کو مانتا ہوں۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتا ہوں۔ عشرہ مبشرہ کی فضیلت کا قائل ہوں۔ میں ان کا ذمے دار نہیں جو مجھے خدا کہتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ جھوٹے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد حامد بن عباس کی تشفی ہو جانی چاہیے تھی۔ اس وضاحت کے بعد بھی اس نے سزا برقرار رکھی اور سفاکی کا بدترین مظاہرہ کیا تو اسے اس کی ذاتی دشمنی ہی کہا جا سکتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ابن نصر قشوری حضرت منصور سے عقیدت رکھتا ہے۔ خلیفہ مقتدر باللہ بھی ان کے زیر عقیدت تھا۔ حامد بن عباس کو اندیشہ تھا کہ اگر یہی صورت حال رہی اور خلیفہ مقتدر باللہ بھی آپ کا عقیدت مند ہو گیا تو ابن نصر دربارِ خلافت کا طاقت ور ترین مہرہ بن جائے گا اور خود اس کا اثر و اقتدار ختم ہو جائے گا، یا ممکن ہے بساط ہی الٹ جائے۔ اس نے حضرت منصور کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ قاضی القضاۃ کو خریدا، ڈرایا دھمکایا اور قتل نامے پر دستخط کروا لیے۔ اس نے حضرت منصور کو مذہبی فتنہ قرار دیا لیکن دراصل حضرت منصور کی آڑ میں سیاسی مقصد پورا کیا۔

اگر حضرت منصور بدعقیدہ ہوتے تو صوفیہ اور مشائخ ان کی شان میں رقم طراز نہ ہوتے۔

حضرت منصورؒ کا خونِ ناحق رنگ لایا۔

وزیر حامد بن عباس نے اپنے اقتدار کی مضبوطی کے جو خواب دیکھے تھے، وہ جلد ہی چکنا چُور ہو گئے۔

خطیب بغدادی کی رُوایت ہے کہ حضرت منصور کے قتل کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حامد بن عباس کو بھی قتل کر دیا گیا۔ پہلے اس کے دونوں ہاتھ کاٹے گئے پھر دونوں پاؤں (واضح ہو کہ اسی طرح حضرت منصور کو بھی قتل کیا گیا تھا) وہ تکلیف کی شدت سے چیخ رہا تھا۔ بہت دیر تک زمین پر پڑا تڑپتا رہا۔ لوگ عبرت کی آنکھ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ قتلِ منصورؒ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، لوگوں کو وہ واقعہ یاد تھا۔

وہ نہ جانے کب تک تڑپتا رہتا کہ ایک شخص کو اس پر رحم آ گیا۔ وہ شمشیر بدست آگے بڑھا اور اس کا سر قلم کر دیا۔

مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں۔ اس نے بھی حضرت منصورؒ کو اسی طرح قتل کرایا تھا۔ پہلے ہاتھ پاؤں کاٹے تھے پھر سر قلم کر دیا تھا۔

قتلِ منصورؒ کا دوسرا کردار خود خلیفہ مقتدر باللہ تھا۔ قتل کا حکم نامہ اسی نے جاری کیا تھا۔ جس اقتدار کو بچانے کے لالچ میں اس نے یہ قدم اٹھایا تھا، اسی اقتدار نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

320ھ میں مونس نے موصل پر قبضہ کر لیا اور پھر بغداد پر حملہ آور ہوا۔ مقتدر اپنا لشکر لے کر آگے بڑھا۔ سخت مقابلے کے بعد مقتدر باللہ کو شکست ہوئی۔ وہ شکست کھا کر بغداد کی طرف پلٹا۔ راستے میں بربریوں کی فوج نے اسے گھیر لیا۔ ایک بربری نے آگے بڑھ کر مقتدر باللہ کا سر قلم کر دیا۔ اس کے سر کو نیزے پر بلند کر کے مونس کے سامنے لے جایا گیا۔

اس کا کٹا ہوا سر گلی کوچوں سے گزارا گیا۔

حضرت منصورؒ کا کٹا ہوا سر بھی اسی طرح بازاروں میں گھمایا گیا تھا اور پھر دجلہ کے پل پر آویزاں کر دیا گیا تھا۔

سر تو حضرت منصور کا بھی قلم ہوا تھا لیکن مقتدر باللہ اور حضرت منصور میں فرق ہے۔ مقتدر باللہ کا کٹا ہوا سر رسوائی کی داستان بن گیا۔ جب وہ نہیں رہا تو گھر گھر اس کی عیاشیوں کے چرچے سنے گئے۔ یہ بھی سنا گیا کہ وہ اپنی ماں کی بددعاؤں کے زیر اثر تھا۔ اس کی ماں منت سماجت کرتی رہی کہ وہ منصور حلاج کو آزار پہنچانے سے باز رہے لیکن اس نے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

اس کے برخلاف حضرت منصور کا کٹا ہوا سر ان کے لیے باعثِ نجات بن گیا چنانچہ مشہور ہے کہ ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر نظروں کے سامنے ہے اور حضرت حسین بن منصورؒ ایک ہاتھ میں جام لیے کھڑے ہیں اور سر جسم سے غائب ہے۔ بزرگ نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ سر قلم شدہ بندوں ہی کو جام عنایت فرماتا ہے۔''

ماخذات

تذکرۃ الاولیاء، شیخ فریدالدین عطار رحمۃ۔ حسین بن منصور، لویس ماسینیون۔ تاریخ بغداد خطیب بغدادی۔ سفینۃ الاولیاء داراشکوہ۔ سیرت منصور حلاج ظفر احمد عثمانی۔ اللہ کے ولی خان آصف۔ ولی اللہ، محمد الیاس عادل

"ہائے، میں کتنی خوش قسمت تھی کہ میری شادی 14 فروری کو ہوئی اور ویلنٹائن ڈے پر ہم نے ایک دوسرے کو پالیا۔" ہانیہ نے عامر کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور آج ہماری شادی کی دوسری سالگرہ ہے۔" عامر نے بھی بڑے پیار سے ہانیہ کی طرف دیکھا۔

"آج ویلنٹائن ڈے ہے۔۔۔ کسی لوا سپاٹ پر گھومنے نہ چلیں؟" ہانیہ نے عامر سے بڑے پیار سے پوچھا۔

"مجھے دفتر سے دیر ہورہی ہے اور تم کو ویلنٹائن ڈے کی پڑی ہے، شادی سے پہلے یہ چونچلے اچھے لگتے ہیں شادی کے بعد نہیں۔" عامر نے آئینے کے سامنے ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

"شادی کے بعد کیا بندہ رومانٹک نہیں رہتا؟" ہانیہ نے سوال کیا۔

"شادی سارے رومانس کو نگل لیتی ہے اور بندہ خالی رہ جاتا ہے۔" عامر نے ہانیہ کی بات مذاق میں اڑادی۔

"بندہ خالی رہ جاتا ہوگا، عورت نہیں ہوتی۔ عورت تو

شریک سفر کو دھوکا دے کر ٹھوکر کھانے والے شوہر کا انجام

پُراسرار

راناز زاہد حسین

لالچ کی کشتی نے کبھی کسی کو کنارے پر نہیں اتارا تو پروین کیسے منزل پالیتے جو دوسروں کے کاندھوں پر سوار ہوکر زندگی کو تمام کردینے کے خواہش مند تھے۔ لہٰذا وہ بھی ایک ایسی ہی پُراسرار رات تھی جس کا اصرار تھا کہ اسے ایسے ہی گزارا جائے جیسے اسے گزارنا چاہیے۔

UUNOVELS.COM

مرتے دم تک اپنے شوہر کی وفادار رہتی ہے۔"

"تو کیا میں تم سے وفادار نہیں ہوں؟" عامر نے ہانیہ کی طرف گھور کر دیکھا۔

"یہ میں نے کب کہا..... ویسے آپ کی یہ بات سن کر وہ محاورہ یاد آ گیا۔"

"کون سا محاورہ؟" عامر نے موزے پہن کر اپنے جوتے کے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

"چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔" ہانیہ ہنسنے لگی۔

"میں نے کون سی چوری کی ہے؟" عامر گھبرا کر بولا۔

"مذاق کر رہی تھی میں۔ آج شام جلدی آ جایئے گا۔ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے اور ویلنٹائن ڈے سیلیبریٹ کریں گے۔"

"اچھا کوشش کروں گا، اب مجھے ایک کپ چائے تو پلا دو۔"

"کوشش نہیں، شام کو مغرب کی نماز سے پہلے پہلے آپ نے میرے پاس ہونا ہے۔" ہانیہ نے بڑی ادا سے کہا۔

"یہ حکم ہے سرکار کا؟"

"جی بالکل سرکاری آرڈر۔"

"میری بیگم آج کچھ زیادہ ہی رومانٹک نہیں ہو رہی؟"

"آج دن ہی ایسا ہے۔" ہانیہ نے ایک دفعہ پھر عامر کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آج تو دفتر میں کام بہت ہے۔ شام سے پہلے پہلے میرا آنا مشکل ہوگا۔"

"مجھے تو شک ہونے لگا ہے آپ پر۔" ہانیہ کا رومانٹک لہجہ یکدم تلخ ہو گیا۔

"کیسا شک؟" عامر تھوڑا سا گھبراتے ہوئے بولا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"آپ ویلنٹائن ڈے کسی اور کے ساتھ سیلیبریٹ کرنا چاہتے ہیں۔"

"بیوی شک نہ کرے، یہ ہو سکتا ہے بھلا۔ بیوی کو تو نکاح پڑھنے کے ساتھ ہی نکاح نامے کے ساتھ شک کی ڈگری بھی مل جاتی ہے۔"

"آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں پھر..... جو مجھے شک میں مبتلا کر رہی ہیں۔"

"اچھا بابا! میں شام کو مغرب سے پہلے پہلے گھر آ جاؤں گا۔"

"یہ ہوئی نا اچھے شوہروں والی بات۔" ہانیہ جو تھوڑی ٹینس ہو رہی تھی، عامر کی یہ بات سن کر ہلکی پھلکی ہو گئی اور خوشی خوشی چائے بنانے لگی۔

"اس چائے میں میری چاہت بھی شامل ہے۔" ہانیہ نے چائے کا کپ عامر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" عامر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے اجازت ہے؟" عامر چائے پی چکا تو اس نے ہانیہ سے بڑے پیار سے اجازت طلب کی۔

"چلیے میں آپ کو دروازے تک چھوڑ کر آتی ہوں۔" ہانیہ عامر کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

عامر اپنے ڈرائنگ روم سے نکل کر لان میں آ گیا پورچ میں اس کی بلیک کلر کی گاڑی کھڑی تھی جس کو اس کا ملازم اکرم پانی کا پائپ لیے دھو رہا تھا۔ اکرم نے گاڑی چمکا دی تھی۔

"اکرم! کتنی دیر لگے گی ابھی؟" عامر نے اکرم کو گاڑی دھوتے ہوئے دیکھا تو بولا۔

"صاحب جی! میرا کام تو ختم ہو گیا ہے، آپ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالیں۔" اکرم نے ونڈ اسکرین کو اخبار کے کاغذ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

اکرم گاڑی میں بیٹھا تو اسے یاد آیا اس کا موبائل تو ڈرائنگ روم میں ہی رہ گیا ہے۔

"اکرم! بھاگ کر جانا میرا موبائل تو لے آؤ۔" عامر چابی اگنیشن میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"اکرم تم گاڑی کا پچھلا شیشہ بھی صاف کر دو، موبائل میں لے آتی ہوں۔" ہانیہ نے ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھہرو، اکرم لے آئے گا..... تم دو پل میرے پاس بیٹھو۔" عامر نے ہانیہ کے لیے دروازہ کھول دیا تو ہانیہ عامر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ہانیہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ عامر کے رویے کے پھیکے لہجے میں اچانک ہی رومانس کی مٹھاس پیدا ہو گئی تھی۔

"آج کے دن کی مناسبت سے میں تمہارے لیے کون سا گفٹ لاؤں؟" عامر نے بڑے رومانٹک انداز میں ہانیہ کی طرف دیکھا تو ہانیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھنے لگی جس کا شوہر شادی کے دو سال بعد بھی اس سے ایسے ہی پیار کر رہا تھا جیسے اس کی شادی کو دو سال نہیں دو ہفتے ہوئے ہوں۔

"میرا گفٹ آپ ہیں بس شام سے پہلے پہلے آ جایئے گا۔" ہانیہ نے اور کوئی فرمائش کرنی مناسب نہ سمجھی۔

"جی بہتر بیگم صاحبہ! جو حکم آپ کا۔" عامر کا جواب سن کر ہانیہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

ہانیہ دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلی تو اکرم عامر کا

UUNOVELS.COM

موبائل لے کر آ گیا تھا۔ موبائل پر کسی کی کال آ رہی تھی۔

''اکرم! دکھانا ذرا کس کی کال ہے۔'' ہانیہ نے اکرم سے موبائل لینا چاہا۔

''یار! جلدی موبائل دو مجھے، دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔'' عامر نے اکرم کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اکرم، عامر کا اتنا تلخ انداز دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے فوراً جا کر موبائل گاڑی میں بیٹھے عامر کو دے دیا۔ عامر نے موبائل کی اسکرین دیکھی تو کال کاٹ کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔

''اچھا ہانیہ شام کو چلیں گے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں۔'' عامر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

ہانیہ نے ہاتھ ہلا کر عامر کو الوداع کیا۔

اکرم نے کوٹھی کا دروازہ کھول دیا تو عامر گاڑی لے کر باہر نکل گیا۔

''یہ شام مستانی..... مدہوش کیے جائے۔'' ہانیہ یہ گیت بے ساختہ گاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''اکرم کس کی کال تھی تمہیں اندازہ ہوا کچھ؟'' ہانیہ کو عامر کا اکرم کو اس طرح ڈانٹنا کچھ عجیب سا لگا تھا اور اس کے دل میں شک نے پھر انگڑائی لی۔

''مجھے کیا پتا بیگم صاحبہ کس کی کال تھی۔''

''جب کال آ رہی تھی تو کسی کا نام لکھا نظر نہیں آ رہا تھا موبائل کی اسکرین پر۔'' ہانیہ نے اکرم کو کریدا۔

''صاحب نے مجھے اتنی زور سے ڈانٹا کہ موبائل کی اسکرین دیکھنے کی مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی۔''

''صاحب نے تم کو اتنی زور سے ڈانٹا کیوں، تمہیں کچھ کوئی اندازہ ہوا؟'' ہانیہ نے اکرام سے پوچھا تاکہ اسے پتا چلے جو وہ سوچ رہی ہے وہ اکرم بھی سوچ رہا ہے کہ نہیں۔ اگر اکرم نے بھی وہی بات سوچی جو ہانیہ کے دل میں تھی تو ہانیہ نے ایک بار پھر شک کے کنوئیں میں چھلانگ لگا دینی تھی۔ عامر نے جاتے جاتے اپنے رومانٹک موڈ سے ہانیہ کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہانیہ اس فون کال کے بعد پھر شش و پنج میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اسے عامر پر پھر شک ہونے لگا تھا کہ جیسے اس کا کسی لڑکی کے ساتھ چکر ہے۔

☆☆☆

عامر جب اپنے آفس پہنچا تو اس نے اپنے سیکریٹری حاشر کو دفتر میں طلب کیا۔

''مجھ سے ملنے تو کوئی نہیں آیا تھا؟'' عامر نے حاشر کے دفتر میں قدم رکھتے ہی اس سے سوال کیا۔

''جی وہی صاحبہ آئی تھیں جو روز آتی ہیں۔'' حاشر نے بتایا۔

''اچھا اب زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم کو اس کے آنے سے کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' عامر نے حاشر کو ڈانٹا۔ عامر نے حاشر سے آنے والی کا نام بھی پوچھنا گوارا نہیں کیا کیونکہ اسے آنے والی کا اندازہ ہو گیا تھا۔

''سوری سر۔'' حاشر نے عامر کا موڈ دیکھا تو فوراً سوری کہہ دیا۔

''اچھا اب تم جاؤ۔'' حاشر نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ کچھ یاد آ گیا اور پلٹ گیا۔

''سر! آپ نے کہا تھا آفس کی کھڑکیوں کے شیشے چینج کرنے ہیں۔''

''ہاں تو بلایا ہے کسی کو؟'' عامر نے پوچھا۔

''کل آئے گا کاریگر۔''

''اس کو بتا دیا تھا کہ اس طرح کے شیشے لگانے ہیں کہ اندر بیٹھا شخص باہر دیکھ سکے مگر باہر سے بیٹھا شخص اندر نہ دیکھ سکے۔''

''جی سر سب کچھ اس کو سمجھا دیا ہے۔''

''گڈ..... اب تم جا سکتے ہو کل یہ کام لازمی ہو جانا چاہیے۔'' عامر نے حاشر سے کہا۔

''او کے کل ہو جائے گا سر۔'' اتنا کہہ کر حاشر آفس سے باہر نکلا تو نبیلہ اندر آ گئی۔

''میں آدھا گھنٹا تمہارے دفتر میں بیٹھ کر گئی ہوں۔ میں نے تمہیں کال بھی کی تھی۔ تم نے میری کال ہی کاٹ دی۔'' نبیلہ نے آتے ہی عامر پر چڑھائی کر دی۔

''نبیلہ ڈیئر..... تم کو پتا ہے میں شادی شدہ بندہ ہوں۔ جب گھر سے نکلتا ہوں تو بیوی کے چونچلے بھی برداشت کرنے ہوتے ہیں۔'' عامر نے نبیلہ کو بڑے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بیوی کے چونچلے برداشت کر سکتے ہو، ہونے والی بیوی کے چونچلے برداشت کرتے ہوئے کیا تکلیف ہوتی ہے تم کو؟''

''آہستہ بولو..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' عامر نے سرگوشی کی۔

''کئی دفعہ تم سے کہا ہے آفس کے شیشے ہی چینج کروا لو، لیکن تم بہت لیزی ہو۔ اس طرح پرائیویسی نہیں رہتی بندے کی۔'' نبیلہ نے دفتر کے باہر دیکھا جہاں عامر کا سارا اسٹاف بیٹھا کام کر رہا تھا لیکن زیادہ تر کی نظریں عامر کے آفس کے اندر ہی مرکوز تھیں۔

''کہا ہے ایک بندے کو..... کل چینج کر دے گا۔''

UUNOVELS.COM

عامر نے نبیلہ کو بتایا۔

''آج شام کا کیا پروگرام ہے؟'' نبیلہ نے عامر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''شام کا پروگرام بڑا الف ہے۔'' عامر کو ہانیہ سے کیا وعدہ یاد آ گیا۔

''کیا مطلب الف ہے؟'' نبیلہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''شام کو میری بیوی ویلنٹائن ڈے میرے ساتھ سیلیبریٹ کرنا چاہتی ہے۔''

''ویلنٹائن گرل فرینڈ کے ساتھ سیلیبریٹ کیا جاتا ہے، بیوی کے ساتھ نہیں۔''

''تم بھی تو میری بیوی بننے والی ہو۔''

''بننے والی ہوں بنی تو نہیں۔ ابھی تو گرل فرینڈ ہوں۔'' نبیلہ ایسی ہی بے باک تھی۔

''مگر میں نے تو ہانیہ سے وعدہ کیا ہے کہ شام کو مغرب سے پہلے گھر آ جاؤں گا۔'' عامر نے اپنے پروگرام سے نبیلہ کو آگاہ کیا۔

''نہیں..... آج کی شام میرے نام۔'' نبیلہ بضد تھی۔

''نبیلہ! میری جگہ اپنے آپ کو رکھ کر سوچو۔''

''بس، میں نے کہہ دیا آج کی شام میرے نام۔''

''شام کو میں گھر نہ پہنچا تو ہانیہ نے تو آسمان سر پر اٹھا لینا ہے۔''

''کوئی بہانہ بنا دینا۔''

''کیا بہانہ بناؤں؟'' عامر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''اچھا جب شام ہو جائے گی بہانہ بھی سوچ لیں گے۔'' نبیلہ بے پروائی سے بولی۔

''میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم اس بات کو ایزی لے رہی ہو۔'' عامر پریشان تھا۔

''تم اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہو، پھر مجھ سے شادی کیسے کرو گے؟''

''آج شام کی بات کرو، جب شادی کا وقت آئے گا پھر اس بارے میں سوچیں گے۔''

''شادی کا وقت کب آئے گا، کہیں تم مجھ سے فلرٹ تو نہیں کر رہے؟'' نبیلہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''بڑی مشکل سے بیوی کا شک دور کر کے آیا ہوں، اب تم شک میں مبتلا ہو جاؤ۔'' عامر نے سر پکڑ لیا۔

''دو کشتیوں میں قدم رکھنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' نبیلہ ہنسنے لگی۔

''میں پریشان ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے؟''

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، عامر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دور افق پر سورج غروب ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شام ہوتے ہی نبیلہ عامر کو ایک عالی شان ریسٹورنٹ میں لے آئی تھی۔ ریسٹورنٹ کا ماحول کافی رومانٹک تھا۔ ریسٹورنٹ کی کھڑکیوں پر بڑے خوبصورت پردے لٹک رہے تھے۔ پردوں پر سرخ گلاب کے پھول بنے اصل لگ رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کی ہر ٹیبل پر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب جوڑے ویلنٹائن ڈے منانے آئے تھے۔ ہر ٹیبل پر پانچ پانچ موم بتیاں ایک اسٹینڈ پر روشن تھیں۔ موم بتیوں کی روشنی نے ماحول کو کافی رومانٹک بنا دیا تھا۔

ایک ٹیبل پر عامر اور نبیلہ بھی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ماحول کافی رومانوی تھا، اچانک عامر کا فون بجنے لگا۔ اپنے موبائل پر ہانیہ کی کال دیکھ کر عامر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ رنگین ماحول اچانک ہی سنگین ہو گیا تھا۔ عامر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کال کاٹ دے یا ریسیو کر لے۔ نبیلہ نے عامر کا چہرہ دیکھا تو بولی۔

''کیا بات ہے، بہت پریشان لگ رہے ہو؟'' نبیلہ نے پوچھا۔

''وہی ہوا نا جس بات کا ڈر تھا۔'' عامر اپنے موبائل کی روشن اسکرین کو دیکھے جا رہا تھا۔

''ہوا کیا ہے؟ موت کے فرشتے کا فون آ گیا ہے کیا؟'' نبیلہ ہنسی۔

''تمہیں بتایا تھا کہ شام کو میں نے ہر صورت گھر پہنچنا تھا۔ شام ہو گئی ہے اب میری بیوی کا فون آ رہا ہے۔ کیا کہوں اسے؟'' عامر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''کوئی بہانہ بنا دو۔'' نبیلہ فوراً بولی۔

عامر نے کال اٹینڈ نہ کی تو فون کی گھنٹی بجتے بجتے چند لمحوں بعد خود ہی خاموش ہو گئی۔ عامر پریشانی میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ساتھ والی ٹیبل سے ایک نوجوان اٹھ کر عامر کے پاس آیا۔

''ایکسکیوزمی سر! میرے موبائل میں بیلنس نہیں ہے ایک کال کر سکتا ہوں؟'' نوجوان عامر کے پاس آ کر بڑی خندہ پیشانی سے بولا۔ عامر نے اس نوجوان کے سامنے موبائل ان لاک کیا اور اس نوجوان کو تھما دیا۔ نوجوان نے نمبر ڈائل کیا، بات کی اور پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے موبائل عامر کو واپس کر دیا۔ عامر نے موبائل واپس لیا ہی تھا کہ اس

UUNOVELS.COM

کے موبائل کی اسکرین پھر روشن ہوگئی۔ پھر ہانیہ کی کال آرہی تھی۔ ہانیہ کی کال دیکھ کر عامر کے اوسان ایک دفعہ پھر خطا ہوگئے۔

''ہانیہ کا فون ہے اب بولو اس سے کیا کہوں؟'' عامر نے نبیلہ سے مشورہ مانگا۔

''اسے کہہ دو تم اغوا ہوگئے ہو۔ اس وقت تم کڈنیپرز کی تحویل میں ہو اس لیے رات گھر واپس نہیں آسکتے۔'' نبیلہ نے بغیر سوچے سمجھے مشورہ دے دیا۔

''بے وقوف ہو تم، اس طرح وہ پریشان ہوجائے گی۔ وہ پولیس کو بھی فون کرسکتی ہے اور بات بہت بڑھ جائے گی۔'' عامر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تم کہہ دینا کڈنیپر سے میرے معاملات طے پاگئے ہیں۔ انہوں نے پانچ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے صبح ہوتے ہی میں گھر آکر پانچ لاکھ روپے تاوان ادا کرکے ان سے جان چھڑالوں گا۔ تم پولیس کو اطلاع نہ کرنا اور چپ چاپ گھر میں بیٹھی رہنا۔ اگر پولیس کو اطلاع کرنے کی کوشش کی تو میری جان بھی جاسکتی ہے۔'' نبیلہ نے عامر کو سارا پلان سمجھا دیا۔

''ہاں، یہ بہانہ مجھے کچھ معقول لگتا ہے۔'' عامر نبیلہ کی اس بات سے مطمئن ہوگیا۔ اب عامر ہانیہ کی کال پک کرنے ہی لگا تھا کہ کال خود بخود کٹ گئی۔

''اب کیا کروں؟'' عامر نے نبیلہ کی طرف دیکھا۔

''تھوڑا انتظار کرلو کال پھر آئے گی۔'' نبیلہ بولی۔

کافی دیر تک کال نہ آئی..... تو عامر نے خود کال کی۔ اس بار ہانیہ نے کال اٹینڈ نہیں کی۔

''کال اٹینڈ نہیں کررہی اب کیا کروں؟'' عامر نے نبیلہ سے پھر مشورہ مانگا۔

''دوبارہ کرلو، اس نے بھی تمہیں دوبارہ کال کی تھی، تم نے اٹینڈ نہیں کی، وہ غصے میں ہوگی۔'' نبیلہ نے عامر کو سمجھایا۔ چند لمحے ٹھہر کر عامر نے پھر کال کی۔ اس بار بھی ہانیہ نے کال اٹینڈ نہ کی تو عامر نے تیسری بار کال کردی۔ اس بار ہانیہ نے کال اٹینڈ کرلی۔

''جایئے، میں آپ سے نہیں بولتی۔ آپ نے میری اتنی حسین شام برباد کردی۔'' ہانیہ نے کال اٹینڈ کرتے ہی شکایات کا دفتر کھول لیا۔

''تمہیں اپنی شام کی پڑی ہے یہاں میری جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔'' عامر نے ماہر ایکٹر کی طرح ایکٹنگ شروع کردی۔

''کیا ہوا آپ کو! خیریت تو ہے؟'' ہانیہ جو سخت ناراض تھی اس کا رویہ یکدم بدل گیا۔

''مجھے دو کڈنیپرز نے اغوا کرلیا ہے، میں اس وقت ان کی تحویل میں ہوں۔'' عامر بولا۔

''یااللہ خیر! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' ہانیہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''سچ کہہ رہا ہوں، لیکن تم پولیس وغیرہ کو فون نہ کرنا اور نہ ہی کسی سے ذکر کرنا ورنہ میری زندگی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' ہانیہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

''تم رات خاموشی سے گزار لو، میرے ان سے معاملات طے پاگئے ہیں۔ کڈنیپر نے مجھ سے پانچ لاکھ روپے بطور تاوان مانگا ہے۔ صبح ہوتے ہی گھر آکر میں ان کو ادا کردوں گا۔'' عامر بولا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ کہتے ہیں، میں ویسا ہی کروں گی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، رات آپ کے بغیر کیسے گزاروں گی میں۔''

''بس یہ کٹھن رات تو تم کو میرے بغیر گزارنی ہی پڑے گی۔ پھر ساری شامیں اور راتیں اپنی ہی ہوں گی۔'' عامر نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی دبائی اور پھر کال کاٹ دی۔

''ارے واہ عامر صاحب! آپ تو بڑے پکے اداکار ہیں۔'' نبیلہ نے عامر کو اس کی اداکاری کی داد دی۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' عامر نے نبیلہ سے پوچھا۔

''اب کسی اچھے سے سنیما میں رومانٹک سی مووی دیکھتے ہیں۔'' نبیلہ نے اگلا پروگرام بتایا۔

''میرا نہیں موڈ مووی دیکھنے کا۔'' عامر بے زاری سے بولا۔ ''اس رات کے لیے اتنا ڈراما کیا اور وہ بھی مووی دیکھ کر گزار دیں۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے جناب کا؟'' نبیلہ کو ذرا حیرانی ہوئی۔ ''میں آزاد خیال لڑکی ضرور ہوں لیکن بری لڑکی نہیں ہوں۔'' نبیلہ نے عامر پر واضح کیا۔

''تم کیا سمجھ رہی ہو مجھے، میں نے تم سے دوستی بُری لڑکی سمجھ کر نہیں کی۔ میں نے تو سوچا ہے کسی لوا سپاٹ پر چلتے ہیں، وہاں بیٹھ کر پیار محبت کی باتیں کریں گے۔'' عامر نے نبیلہ کے سامنے وضاحت پیش کی۔

''پیار محبت کی باتیں کرنے کے لیے سنیما سے اچھی

UUNOVELS.COM

اور محفوظ جگہ کوئی نہیں۔ مووی کا تو صرف بہانہ ہوگا۔"

"اچھا یہ بات ہے تو پھر چلتے ہیں کسی اچھے سے سنیما گھر۔" عامر خوش ہو کر بولا۔

☆☆☆

عامر گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ نبیلہ اور عامر بہت خوش تھے۔ نبیلہ کے لیے یہ رات بڑی حسین تھی، اس نے جس کو چاہا تھا، وہ اس کے ساتھ تھا۔ گاڑی کا رخ سنیما کی طرف تھا۔ اب عامر کی گاڑی قدرے ویران سی جگہ سے گزر رہی تھی۔ سنیما بس تھوڑا سا ہی آگے تھا۔ عامر بار بار سائڈ پر لگے شیشے میں دیکھ رہا تھا۔ جب سے وہ ریسٹورنٹ سے نکلے تھے، ایک موٹر سائیکل مسلسل ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ موٹر سائیکل پر دو نوجوان سوار تھے۔ عامر کی گاڑی جب سنسان سی جگہ پر پہنچی تو موٹر سائیکل سواروں نے موٹر سائیکل عامر کی گاڑی کے بالکل سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ موٹر سائیکل سلپ ہو کر ایک جانب گر گئی۔ عامر نے گاڑی روک لی، اپنی کار کا شیشہ نیچے کیا اور بڑے غصے سے موٹر سائیکل سواروں کو... دیکھا ایک نوجوان گاڑی کے دائیں جانب اور دوسرا نوجوان گاڑی کے بائیں جانب پستول لے کر کھڑے ہو گئے۔ عامر کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھ واردات ہو گئی ہے۔ ایک نوجوان نے عامر پر پستول تان لیا، یہ وہی نوجوان تھا جس نے عامر سے ریسٹورنٹ میں فون لے کر ایک کال کی تھی۔ اس نوجوان کو دیکھ کر نبیلہ کی چیخ نکلنے لگی تو دوسرے نوجوان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خبردار کوئی شور نہ مچانا، جو کچھ ہے ہمارے حوالے کر دو۔" نوجوان نے عامر پر پستول تانتے ہوئے کہا۔

"اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں۔" عامر نے جھوٹ بولا حالانکہ اس کی جیب میں اس وقت پچیس ہزار روپے تھے۔

"چھوٹے! اس کی تلاشی لو۔" نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا۔

چھوٹے نے جب عامر کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے پچیس ہزار کی رقم برآمد ہو گئی۔ نوجوان نے عامر کا موبائل بھی چھین لیا۔

"یار! موبائل تو مجھے واپس کر دو، رقم چاہے لے جاؤ۔" عامر نے نوجوان کی منت کی۔

"یہ موبائل بڑا قیمتی ہے۔" نوجوان نے موبائل کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے کسی کام کا نہیں، میں کسی بھی وقت اس موبائل کو بلاک کروا سکتا ہوں۔" عامر بولا۔

"آج رات تک تو بلاک نہیں ہوگا، صبح ہونے تک ہم اپنا کام کر چکے ہوں گے۔" نوجوان ہنستے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" عامر کو نوجوان کی بات سمجھ نہ آئی۔

"مطلب بھی صبح تک سمجھ آ جائے گا۔ چھوٹے! دونوں کو اتنا کلوروفارم سنگھا دو کہ صبح تک یہ ہوش میں نہ آئیں اور ساری رات ان کی رومانس کرتے ہی گزر جائے۔"

چھوٹے نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا۔ پہلے عامر کی ناک پر رکھا پھر چھوٹے نے دوسرا رومال نبیلہ کو سنگھایا۔ دونوں نوجوانوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور بھاگ گئے۔

☆☆☆

صبح ہوئی تو سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ عامر نے اپنے سر کو جھٹکا دیا تو وہ غنودگی کے اثر سے باہر آیا۔ نبیلہ اب بھی گاڑی میں بے ہوش پڑی تھی۔ گاڑی میں منرل واٹر کی بوتل پڑی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد عامر نے منرل واٹر کی بوتل کو منہ سے لگایا اور پانی کے دو گھونٹ بھرے۔ پھر عامر نے نبیلہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ چند لمحوں بعد نبیلہ بھی ہوش میں آ گئی۔ اس نے گاڑی کے باہر دیکھا باہر ہر طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔ نبیلہ آنکھیں مل مل کر گاڑی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔

"صبح ہو گئی کیا؟" نبیلہ نے عامر سے پوچھا۔

"ہاں صبح ہو گئی، وہ نوجوان ہمیں کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر کے بھاگ گئے تھے۔ مجھے تو اب تمہاری فکر ہے، ساری رات تم نے گھر سے باہر گزار لی۔ تمہارے گھر والے کیا سوچیں گے؟" عامر نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اللہ کا شکر ہے میرے امی ابو ایک شادی میں گئے ہوئے تھے ورنہ بہت گڑبڑ ہو جانی تھی۔" نبیلہ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

عامر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نبیلہ کو اس کے گھر اتارا پھر اپنے گھر واپس آ گیا۔ عامر جب گھر پہنچا تو ہانیہ لان میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ عامر نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ دروازہ کھول کر باہر آیا تو ہانیہ بھاگ کر اس کے گلے لگ گئی۔ ہانیہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عامر نے ہانیہ کو تسلی دی، اپنی شہادت کی انگلی سے اس کے آنسو صاف کیے۔ ساری رات جاگنے اور رونے کی وجہ سے ہانیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

UUNOVELS.COM

''ہانیہ! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ میں بھلا چنگا تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔'' عامر نے ہانیہ کی دلجوئی کی۔

''شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔ بھاڑ میں جائیں پانچ لاکھ روپے۔'' ہانیہ روتے ہوئے بولی۔

''کون سے پانچ لاکھ روپے؟'' عامر کا ماتھا ٹھنکا۔

''آپ نے ہی فون کر کے مجھے بتایا تھا۔ میں اغوا ہو چکا ہوں اور کڈنیپر مجھ سے پانچ لاکھ تاوان مانگ رہے ہیں۔''

''ہاں کہا تھا لیکن وہ تو میں نے.....'' عامر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا کیونکہ ہانیہ کو حقیقت بتانے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔

''بس آپ پانچ لاکھ کی فکر نہ کریں، مجھے آپ کی جان سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔'' ہانیہ بولی۔

''کون سے پانچ لاکھ..... یہ بار بار پانچ لاکھ کا ذکر کیوں کر رہی ہو؟'' عامر نے خود کلامی کی کیونکہ اس نے کسی کڈنیپر کو پانچ لاکھ نہیں دیے، البتہ ان دو نوجوانوں نے پستول دکھا کر اس سے پچیس ہزار روپے ضرور چھین لیے تھے اور پھر وہ اس کا موبائل لے کر بھاگ گئے تھے۔ اب عامر ہانیہ کو ساری بات بتا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس نے ہانیہ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔

''آپ نے خود ہی کہا تھا کڈنیپر ز نے مجھے اغوا کر لیا ہے اور وہ پانچ لاکھ تاوان مانگ رہے ہیں۔''

''ہاں کہا تھا لیکن ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ تاوان کی رقم صبح گھر آ کر میں خود ان کو ادا کر دوں گا۔''

''کڈنیپر ز نے آپ کو رات کے اندھیرے میں اغوا کیا اور تاوان وہ آپ سے دن کے اجالے میں وصول کرنے آپ کے ساتھ آپ کے گھر آتے؟ آپ نے کڈنیپر کو کیا اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔'' ہانیہ عامر کو سمجھانے لگی اور مزید بتایا۔

''جب آپ نے مجھے فون کال کر کے اپنے اغوا ہونے کی اطلاع دی تھی تو اس کے آدھے گھنٹے بعد ہی مجھے آپ کے نمبر سے ہی فون کال آئی تھی۔''

☆☆☆

ہانیہ اپنے بیڈ روم میں پریشان بیٹھی تھی۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی، اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ عامر کی کال تھی۔ ہانیہ نے فوراً کال ریسیو کی اور بڑی بے صبری سے بولی۔

''عامر! آپ ٹھیک تو ہیں؟ کڈنیپر ز نے آپ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟ آپ کے کہنے پر میں نے کسی کو بھی آپ کے اغوا کی خبر نہیں دی۔''

''آپ عامر کی بیوی بول رہی ہیں؟'' آگے سے ہانیہ کو کسی اجنبی کی آواز سنائی دی۔

''جی میں عامر کی بیوی بول رہی ہوں۔ آپ کون بول رہے ہیں؟'' ہانیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں کڈنیپر ہوں، آپ کا شوہر اس وقت میری تحویل میں ہے۔ اگر آپ کو اس کی زندگی پیاری ہے تو ابھی پانچ لاکھ روپے کا بندوبست کریں۔''

''ہاں مجھے بتایا تھا عامر نے پانچ لاکھ کا لیکن انہوں نے کہا تھا میں صبح خود گھر آ کر ان کو پانچ لاکھ ادا کروں گا۔''

''میں صبح ہونے کا رسک نہیں لے سکتا۔ تاوان کی رقم مجھے ابھی چاہیے۔ اگر اپنے شوہر کی جان پیاری ہے تو میرے بتائے ہوئے پتے پر ابھی رقم لے کر پہنچ جائیں۔''

''میں عورت ذات آدھی رات کو اتنی بڑی رقم لے کر کیسے گھر سے باہر نکل سکتی ہوں۔''

''کسی نوکر کو بھیج دیں، رقم دے کر۔''

''اس وقت اتفاق سے کوئی بھی گھر میں نہیں ہے۔ چوکیدار بھی چھٹی پر ہے۔''

''تو پھر میں خود آ جاؤں رقم لینے آپ کے گھر؟''

کڈنیپر کو جب تسلی ہو گئی کہ عامر کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے. تو اس نے خود اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''جی آ جائیں..... آپ میری عامر سے تو بات کروا دیں۔''

''آپ کو کوئی شک ہے کہ عامر میری تحویل میں ہے؟''

''نہیں، کوئی شک نہیں ہے۔ جب آپ اس کے نمبر سے مجھ سے بات کر رہے ہیں تو ظاہر ہے عامر آپ کی تحویل میں ہی ہوگا۔'' ہانیہ نے اپنا شک خود ہی دور کر لیا۔

''آپ رقم کا بندوبست کر کے رکھیں اور مجھے اپنا ایڈریس بتائیں۔''

ہانیہ نے ایڈریس بتایا تو کڈنیپر نے کال کاٹ دی۔

ہانیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ کڈنیپر ز اس کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ گیٹ پر آ کر انہوں نے پھر ہانیہ کو کال کی۔ ہانیہ رقم نکال چکی تھی، رقم لے کر گیٹ پر پہنچی تو دو کڈنیپر ز اس کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے نقاب کیے ہوئے تھے۔

''عامر کہاں ہیں؟'' ہانیہ نے کڈنیپر ز کو دیکھتے ہی پوچھا۔

''وہ صبح تک آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔'' کڈنیپر نے ہانیہ کو تسلی دی۔

''جب تک عامر نہیں آ جاتے، میں آپ کو رقم نہیں

UUNOVELS.COM

دوں گی۔" ہانیہ نے رقم دینے سے صاف انکار کر دیا۔

"اگر آپ کو اپنے شوہر کی زندگی عزیز ہے تو آپ کو میری بات کا یقین کرنا ہوگا۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ صبح آپ کا شوہر آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔" اس نے ہانیہ کو یقین دلایا۔

"یہ نہ ہو آپ ساری رقم بھی لے جائیں اور میرے شوہر کو بھی نہ چھوڑیں۔"

"اب آپ نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے، جلدی کر لیں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر کوئی نقصان ہو گیا تو پھر مجھے نہ کہیے گا۔" کڈنیپر کے اس جملے میں ہانیہ نے دھمکی کو واضح طور پر محسوس کیا۔

"ٹھیک ہے، یہ لیں رقم۔" ہانیہ نے کڈنیپر کو خاکی رنگ کا کاغذ کا لفافہ دیا جس میں مطلوبہ رقم موجود تھی۔ لفافہ لے کر یہ نوجوان فوراً بھاگ گئے۔

☆☆☆

"یہ تھی ساری کہانی پانچ لاکھ کی۔ اگر آپ نے اپنے اغوا ہونے کی خبر خود مجھے نہ دی ہوتی تو میں رات آنے والے کڈنیپرز پر کبھی بھی یقین نہ کرتی اور میں نے کڈنیپرز پر اس لیے بھی یقین کر لیا کہ ان کے پاس آپ کا فون بھی تھا۔ یہ لیجیے اپنا فون، جب وہ پانچ لاکھ روپے لے کر جانے لگے تو جاتے ہوئے آپ کا فون، مجھے واپس کر گئے تھے۔" ہانیہ نے عامر کو فون واپس کیا۔

"آج رات تک تو بلاک نہیں ہوگا، صبح ہونے تک ہم اپنا کام کر چکے ہوں گے۔" عامر کو اپنا فون دیکھ کر اس نوجوان کا فقرہ یاد آ گیا جس نے رات اس سے پچیس ہزار روپے وصول کیے تھے۔

"شکر ہے میں نے اسے فون پر پچاس لاکھ... تاوان کا نہیں کہہ دیا تھا ورنہ اس نے تو ان کو پچاس لاکھ بھی پکڑا دینے تھے۔" عامر نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

"یہ اپنے آپ سے کیا باتیں کر رہے ہیں آپ؟" ہانیہ نے عامر سے پوچھا جس کو عامر کی سرگوشی کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

"کچھ بھی نہیں، میں نے کیا کہنا ہے۔" عامر اب ہانیہ کو اصل حقیقت بتانے سے بھی ڈر رہا تھا۔ عامر اپنے جھوٹ کے فریب میں خود ہی پھنس گیا تھا۔ اسے ساری بات سمجھ آ گئی تھی۔ اب وہ اصل بات کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ کل جو رات اس نے نبیلہ کے ساتھ گزاری تھی، وہ اس کو پانچ لاکھ پچیس ہزار روپے میں پڑی تھی۔

"ویسے ایک بات ہے، کڈنیپرز اصول کے بڑے پکے تھے۔ رات وہ مجھ سے پانچ لاکھ لے کر گئے اور صبح ہوتے ہی انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔" ہانیہ خوش ہو کر بولی۔

"خبردار اگر جو اب تم نے میرے سامنے پانچ لاکھ کا ذکر کیا۔" عامر نے ہانیہ کو ڈانٹ دیا کیونکہ ان پانچ لاکھ کی تو وہ تھانے میں رپورٹ بھی درج نہیں کروا سکتا تھا۔

☆☆☆

"استاد! ویسے تمہارے دماغ میں کمپیوٹر فٹ ہے۔ تم نے تو چند لمحوں میں ہی ساری اسکیم تیار کر لی۔" چھوٹے نے نوٹ گنتے ہوئے اپنے استاد کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

"میں نے اسکیم کہاں تیار کی تھی، اسکیم تو مجھے بنی بنائی ملی تھی۔" استاد نے اسے خوش ہو کر بتایا۔

"وہ کیسے استاد؟" چھوٹا حیران ہوا۔

"جب ہم ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے تو ایک جوڑا ہمارے پاس ہی بیٹھا تھا۔ لڑکا اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ آیا تھا، اس نے گھر اپنی بیوی کو فون کیا کہ وہ اغوا ہو چکا ہے۔ کڈنیپر تاوان کے پانچ لاکھ روپے مانگ رہے ہیں۔ یہ سارا اس نے جھوٹ بولا کیونکہ اس دن ویلنٹائن ڈے تھا اور وہ لڑکا اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ یہاں انجوائے کرنے آیا تھا اور بیوی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ میرا دماغ اسی وقت گھوم گیا اور میں نے سوچا اگر یہ اغوا ہونا ہی چاہتا ہے تو پھر کیوں نہ اس کو اغوا کر ہی لیا جائے۔ لیکن پھر ہمیں اغوا کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ اس نے ہماری ساری راہ ہموار کر دی تھی اور تاوان کا تعین بھی خود ہی کر دیا تھا اور پھر ہمیں صرف ان دونوں کو کلوروفارم ہی سنگھانا پڑا۔" استاد زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے بولا۔

"استاد! ویسے ایک بات کا افسوس ہے مجھے۔" چھوٹے نے نوٹ اپنے استاد کو دیتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا افسوس ہے؟" استاد کو حیرت ہوئی۔

"استاد! اگر وہ لڑکا اپنی بیوی کو تاوان کا دس لاکھ بتا دیتا تو آج ہمارے پاس دس لاکھ ہوتے اور پانچ پانچ لاکھ ہم بانٹ لیتے۔"

پھر استاد شاگرد دونوں قہقہے لگانے لگے۔

"سچ ہی کہا ہے کسی نے..... خدا جب بھی دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔" استاد کے قہقہے اور بھی بلند ہو گئے۔

"سیانے کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن استاد..... تم نے تو عامر کے جھوٹ کو بھی پاؤں لگا دیے۔" چھوٹا اپنے استاد کے ذہن کی تعریف کرنے لگا۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

مظلوم

کبیر عباسی

زندگی کی آسائشوں پر کچھ لوگ صرف اپنا حق سمجھتے ہیں اور کچھ انہیں حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی ہی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسے ہی خواب کے پیچھے برباد ہوگئی تھی جو اس کے لیے اہم نہ ہونے کے باوجود انمول ہوگیا تھا۔

ہواؤں میں اڑنے والی ایک بے وزن حسینہ کا عبرت انگیز قصہ

"تانیہ بیٹا! کوئی آیا ہے، دروازہ کھولو۔" تانیہ کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی جب امی کی پکار اس کے کانوں میں پڑی۔

"امی! آپ کھول دیں نا، میں پڑھ رہی ہوں۔" اس نے بیزاری آمیز لہجے میں کہا۔

"بیٹا! سالن جل جائے گا۔ ورنہ میں کب تمہیں پڑھائی کے دوران ڈسٹرب کرتی ہوں۔" اسی لمحے دروازے پر پھر دستک سنائی دی۔ اس بار دستک پہلے سے بلند تھی۔ لگتا تھا آنے والے کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

تانیہ نے چادر جسم کے گرد لپیٹی اور چپل گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔

وہ بی اے کی طالبہ تھی اور چند دن میں اس کے پرچے شروع ہونے والے تھے۔ کالج سے انہیں فری کر دیا گیا تھا۔ اب وہ دن رات گھر میں ہی تیاری میں مشغول رہتی تھی۔ باقی مضامین کی تیاری تو ٹھیک تھی مگر انگریزی اس کا اچھی طرح امتحان لے رہی تھی۔ سرکاری اسکولز اور کالج میں پڑھنے کی وجہ سے اس کی انگریزی خاصی کمزور تھی۔ اوپر سے بی اے کی انگریزی تو اچھے اچھوں کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ اسے ٹیوشن کی ضرورت تھی مگر معاشی تنگدستی کے باعث وہ یہ اضافی خرچ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

UUNOVELS.COM

اس نے دروازے پر پہنچ کر بیزاری سے پوچھا۔
"کون ہے؟"
"اب کھول بھی دو دروازہ، کیا اندر کھڑے ہو کر ہی سارا انٹرویو کرنا ہے۔" جواب میں اس کی چچازاد بہن کی ناگوار آواز ابھری تو تانیہ کی بیزاری مزید بڑھ گئی۔
اف..... مہوش! مطلب کم از کم دو گھنٹے کا زیاں۔ اس نے بے بسی سے آنکھیں میچ لیں۔
"تم دروازہ کھول رہی ہو، یا میں جاؤں؟"
"جاؤ....." تانیہ نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ سامنے مہوش چہرے پر نخوت سجائے کھڑی تھی۔ وہ اوورکوٹ میں ملبوس تھی۔ سر پر اس نے سفید رنگ کی اونی ٹوپی پہن رکھی تھی جس کے سامنے گہرے سرخ رنگ کا بڑا سا پھول بنا ہوا تھا۔ اسی رنگ کی لپ اسٹک سے اس کے ہونٹ رنگے ہوئے تھے۔ اس حلیے میں وہ ہمیشہ کی طرح دلکش لگ رہی تھی۔ وہ ہر وقت ایسے ہی بنی سنوری رہتی تھی۔ تانیہ کی نظریں اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی اس کے ہاتھوں پر پڑیں۔ اس نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں ایک چمکتا دمکتا نیا اسمارٹ فون اٹھا رکھا تھا جس کی سرخ رنگ کی "کیسنگ" اس کی نیل پالش سے میچ کر رہی تھی۔
"اچھا تو اس لیے مہوش صاحبہ نے ہمارے گھر میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔" اسمارٹ فون دیکھتے ہوئے تانیہ نے سوچا۔
"کہاں تھیں تم؟ دروازہ بجا بجا کے میرے ہاتھ شل ہو گئے۔ اوپر سے تم لوگوں کو کال بیل لگوانے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔" اس نے نخوت سے کہا۔
"میں پڑھ رہی تھی۔" تانیہ نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔
"آنٹی کہاں ہیں؟"
"وہ کچن میں بزی ہیں۔ آجاؤ تم۔" چار و ناچار اسے کہنا پڑا۔
ریحانہ نے کچن کے دروازے پر مہوش کا استقبال کیا۔ تانیہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تو اس کی امی جلدی سے بولیں۔
"بیٹا! کھانا کھا کے اب پڑھائی شروع کرنا۔"
"نہیں آنٹی! اسے پڑھنے دیں۔" اس نے تانیہ کی طرف دیکھا۔ "کیا پتا کسی کتاب میں اسے مہمانوں سے برتاؤ کا طریقہ پڑھنے کو مل جائے اور اس کی سمجھ میں بھی آجائے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
تانیہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ اس نے جوابی وار کرنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اس کی امی تیزی سے بولیں۔ "تم لوگ بیٹھو، میں کھانا لگاتی ہوں۔"
"اسے بٹھائیں۔ میں کھانا لگانے میں آپ کی ہیلپ کرتی ہوں۔" اس نے طنزیہ انداز میں تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کچن میں داخل ہو گئی۔
"ارے نہیں بیٹا! تم مہمان ہو۔ بیٹھو تم۔"
"مہمان تو یہ لگ رہی ہے اور آپ اس کی....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اسی لمحے اس کا سیل فون بجنے لگا۔ وہ فون سنتے ہوئے کچن سے باہر نکل آئی اور لاؤنج میں رکھے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ کے سکون سے بات کرنے لگی۔
"ویڈیو کال..... نہیں بھئی، ابھی میں کزن کے گھر ہوں۔ شام کو ویڈیو کال پر بات کروں گی۔" وہ کن انکھیوں سے تانیہ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ تانیہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے کھانا لگانے لگی۔
مہوش نے کال کاٹی اور تانیہ سے بولی۔ "تمہارے گھر میں تو کوئی ڈھنگ کی جگہ بھی نہیں، جہاں کھڑے ہو کر بندہ ویڈیو پر کسی سے بات کر سکے۔ اب یہ اکھڑے پینٹ والی دیواریں دیکھ کر میری دوست کیا سوچتی۔"
"تو تمہیں کس نے دعوت دی تھی، ادھر آنے کی۔ سکون سے گھر بیٹھ کے باتیں کرتی رہتی نا ویڈیو پر۔" تانیہ نے سپاٹ انداز میں کہا مگر مہوش کے تو جیسے سر پر لگی اور تلووں میں بجھی۔
"تمہارے لیے نہیں آئی میں۔ آنٹی سے ملنے آئی ہوں۔" وہ خونخوار لہجے میں بولی۔
"تمہیں آنٹی سے ملنے کی تبھی کیوں یاد آتی ہے، جب تم کوئی نئی چیز لیتی ہو۔" تانیہ نے طنز کیا۔
مہوش نے مصنوعی انداز میں آنکھیں پھیلائیں اور پھر یکدم قہقہہ لگا کر بولی۔ "اوہ، اب سمجھ آئی۔ تو تم میرا نیا موبائل دیکھ کر جل گئی ہو۔ تبھی میں کہوں، یہ تانیہ بی بی اتنی بداخلاقی سے میرے ساتھ کیوں پیش آرہی ہیں۔"
"میں کیوں جلوں گی؟ تم چاہے دس دس موبائل لے کر گلے میں لٹکا لو۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے ناگواری سے کہا۔
"ہاں وہ تو نظر آرہا ہے۔" مہوش کا انداز جتانے والا تھا۔
تانیہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔
"آؤ نا بیٹا، کھانا کھاؤ۔" ریحانہ نے کھانا لگانے کے بعد مہوش سے کہا۔
"تھینکس آنٹی! میں تو ابھی ناشتا کر کے آرہی ہوں۔"

UUNOVELS.COM

''اتنی دیر سے ناشتا؟''

''بس آنٹی! میری تو روٹین ہی یہی ہے۔ بارہ بجے سے پہلے تو میری آنکھ ہی نہیں کھلتی۔'' اس کے انداز میں فخر تھا۔

وہ لوگ کھانا کھانے لگیں جبکہ مہوش موبائل سے ٹیڑھے میڑھے منہ بنا کے سیلفیز لینے لگی۔

''یہ دیکھیں آنٹی! کتنا زبردست رزلٹ ہے میرے موبائل کا۔'' اس نے اسکرین ریحانہ کی طرف موڑی۔

''ہاں واقعی، بہت پیاری تصاویر آئی ہیں۔'' ریحانہ نے رسمی انداز میں کہا۔

''تم بھی ایک نظر دیکھ لو۔ تمہارا بل نہیں آئے گا۔'' اس نے طنزیہ انداز میں تانیہ سے کہا۔

تانیہ نے کن انکھیوں سے تصویر دیکھی۔ مہوش بدستور اسے طنزیہ نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ ''تصویریں تو اچھی ہی ہوں گی، مگر یہ اکھڑے پینٹ کے بیک گراؤنڈ والی تصاویر تم کسی سے شیئر تو نہیں کر سکو گی۔'' تانیہ نے گویا بدلہ چکایا۔

''ہاہاہا.....'' مہوش نے قہقہہ لگایا۔ ''تم اس کی فکر مت کرو۔ بیک گراؤنڈ میں چینج کر لوں گی۔ اس میں ہر قسم کے فوٹو ایڈیٹنگ ٹولز ہیں۔ آخر کو جدید ترین اسمارٹ فون ہے۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ تانیہ کچھ نہ بولی۔ ریحانہ کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات ابھرے جنہیں اس نے مسکراہٹ کے پردے میں چھپا لیا۔ انہوں نے بات بدلنے کی غرض سے پوچھا۔

''تمہاری اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟''

''اسٹڈی.....؟ اچھی چل رہی ہے۔ بس مجھے تانیہ کی طرح ہر وقت کتابوں میں سر دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پاس ہو جاؤں گی میں۔'' اس نے تانیہ کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نقل کر کے..... ہونہہ۔'' تانیہ نے زیر لب کہا۔ مہوش نے اگر سنا بھی تو ان سنا کر دیا۔

وہ کھانا کھا کے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ مہوش نے جانے کی اجازت چاہی۔

''بیٹا! چائے تو پیتی جاؤ۔''

''نہیں آنٹی! میں ابھی ناشتا کر کے آئی ہوں اور ویسے بھی آپ جانتی ہیں، چائے تو میں پیتی نہیں۔ ہاں کافی ہوتی تو ضرور پی لیتی۔'' اس کا انداز جتانے والا تھا۔

اس کے جاتے ہی تانیہ غصے سے بولی۔ ''آپ نے اس کو اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے؟''

''تم ابھی ناسمجھ ہو۔ مجھے بہت دور تک سوچنا پڑتا ہے۔'' ریحانہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''کیا مطلب؟'' اس نے اچنبھے سے استفسار کیا۔

''بھابی آج کل حمزہ کے لیے لڑکی دیکھ رہی ہیں۔'' انہوں نے تانیہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''تو؟'' اس کے چہرے پر ناسمجھی کے رنگ پھیل گئے۔

''تو یہ کہ تم ان لوگوں سے بنا کے رکھو، وہ تمہارے بارے میں بھی سوچ سکتی ہیں۔''

''میں نے سب سے بنا کے ہی رکھی ہوئی ہے مگر یہ مہوش..... میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس نے انتہائی ناگواری سے کہا۔

''کرنا پڑتا ہے برداشت بیٹا۔'' انہوں نے اسے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک دفعہ تم اس گھر چلی گئیں تو بے شک نہ کرنا برداشت۔''

تانیہ کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات پھیل گئے۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن اس کی چیپ حرکتیں دیکھیں آپ نے..... آج کیسے نئے فون کی شو مار رہی تھی۔''

''تو کیا ہوا۔ تم بھی لے لینا فون۔''

''کیا؟'' وہ چیخی۔ ''میں اور اسمارٹ فون۔''

''کیوں، کیا تم اسمارٹ فون نہیں لے سکتیں؟'' انہوں نے ناگواری سے کہا۔ ''تمہاری پڑھائی میں حرج نہ ہو، یہی سوچ کر تمہیں فون نہیں لے کے دیا۔ تم بی اے کر لو تو لے دیں گے تمہیں فون۔''

''بابا مجھے فون لے دیں گے؟'' اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔

''کیوں نہیں۔ ہم نے کبھی تمہیں مہوش کے مقابلے میں پیچھے نہیں رہنے دیا۔ کم وسائل کے باوجود تم ویسا ہی پہنتی ہو، ویسا ہی کھاتی ہو۔ تم بابا سے بات کرنا، وہ کبھی تمہاری خواہش رد نہیں کر سکتے۔'' وہ کہتے ہوئے برتن سمیٹنے لگیں۔

تانیہ ان سے متفق نہیں تھی مگر اس نے بحث نہیں کی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تو چمکتا دمکتا اسمارٹ فون جھلملا رہا تھا۔

☆☆☆

تانیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے چار بھائی پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئے تھے۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اسے والدین کی پوری توجہ اور پیار ملا تھا۔ اس کے والد اظہار اور اسحاق دو ہی بھائی تھے۔ جب تک تانیہ کے دادا، دادی زندہ تھے، وہ اکٹھے رہتے تھے۔ مری شہر کے نواح میں ایک خوبصورت بستی میں ان کا گھر تھا۔

تانیہ کے والد ایف اے کرتے ہی فوج میں بھرتی ہو

UUNOVELS.COM

گئے تھے جبکہ اسحاق بی کام کرنے کے بعد ایک سرکاری محکمے میں بطور کلرک تعینات ہوا تھا۔ اس کی تنخواہ تو گزارے لائق تھی تاہم اوپر کی آمدن بے شمار تھی۔ جب تک ان کے والدین زندہ رہے تھے اس نے اپنی اوپر کی کمائی ظاہر نہیں کی تھی... دونوں بھائی جوائنٹ فیملی میں رہ رہے تھے اور برابر کا خرچ گھر میں دیتے تھے۔ تانیہ اور مہوش ہم عمر ہی تھیں اور ان کا بچپن اکٹھے ایک ہی گھر میں کھیلتے کودتے اور لڑتے جھگڑتے گزرا تھا۔ مہوش کے دو بڑے بھائی بھی تھے۔ تانیہ کے ساتھ ان کی بھی گاڑھی چھنتی تھی۔

تانیہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ وہ ہر کلاس میں اول آتی جبکہ مہوش بہ مشکل ہی پاس ہوتی۔ وہ دونوں ایک اسکول اور ایک ہی کلاس میں تھیں۔ تانیہ کو لائق ہونے کی وجہ سے اسکول میں خصوصی پروٹوکول ملتا جس کی وجہ سے غیر محسوس انداز میں مہوش ..... حسد کی آگ میں مبتلا ہو گئی۔ دونوں کی دوستی کو کب گھن لگا دونوں کو احساس ہی نہ ہوا۔

تانیہ بارہ سال کی تھی جب یکے بعد دیگرے اس کے دادا، دادی رخصت ہو گئے۔ اسی دوران اس کے والد بھی فوج سے ریٹائر ہو گئے۔ ان کے ریٹائر ہوتے ہی اسحاق نے گھر الگ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ مقامی رواج کے مطابق آبائی مکان چھوٹے بھائی کی تحویل میں ہی آتا تھا۔ ویسے بھی مکان میں اضافی کمرے اسی نے بنوائے تھے اور مکان کی تزئین و آرائش بھی اس کی کمائی سے ہوتی رہی تھی۔ اظہار تو فوج کی نوکری سے بہ مشکل گھر کے اخراجات پورے کرتا تھا، سو اظہار کوئی اعتراض نہ کر سکا۔

ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے اس نے پاس ہی اپنا مکان بنوا لیا۔ وہ اس رقم سے کوئی کاروبار کرنا چاہ رہا تھا مگر مکان بنوانا بھی ضروری تھا۔ اس کی ساری جمع پونجی مکان بنانے میں ہی خرچ ہو گئی۔ مکان بنتے ہی وہ منتقل ہو گئے۔ ریحانہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے کی عادی تھی۔ اس کی اپنی دیورانی صبیحہ سے بنتی بھی خوب تھی مگر اب خالی گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا۔ وہ اکثر کام کاج کرنے کے بعد صبیحہ کے گھر چلی جاتی یا صبیحہ اس کے ہاں آ جاتی۔

اسحاق نے کوشش کر کے اظہار کو ایک بینک میں سیکیورٹی گارڈ کی نوکری دلوا دی۔ پنشن اور تنخواہ سے ان کے گھر کا نظام بخوبی چلنے لگا۔ دوسری طرف اسحاق کے دن جیسے یکدم ہی پھر گئے۔ اس نے اپنے آبائی گھر کو وسعت دی۔ جدید طرز کا کچن اور واش رومز بنوائے۔ نئی اور جدید طرز کی مضبوط چھت ڈلوائی اور اسے اندر سے خوبصورت ڈیزائن سے آراستہ کیا۔ نیا فرنیچر ڈلوایا۔ اب اس کا مکان علاقے کے چند بہترین مکانوں میں سے ایک تھا۔ اس نے گاڑی بھی خرید لی۔ اس کے بیوی بچے برانڈڈ اشیا استعمال کرنے لگے۔

اظہار حیران تھا کہ جب وہ مشترکہ گھر میں رہتے تھے تو اسحاق اکثر اخراجات کا رونا روتا رہتا تھا مگر الگ ہوتے ہی جانے کہاں سے یکدم اس کے پاس دولت امڈ آئی تھی لیکن وہ کبھی اسحاق سے پوچھ نہیں سکا۔

اسحاق کے اخراجات بڑھنے سے اظہار کے خرچے بھی بڑھ گئے تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو ان سے کم نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جب صبیحہ شاپنگ پر جاتی تو ریحانہ کو ساتھ لے کر جاتی۔ اس کی دیکھا دیکھی وہ بھی ویسی ہی چیزیں اپنے اور تانیہ کے لیے خریدتی تھی جیسی صبیحہ اپنے اور بچوں کے لیے خریدتی۔ خاندان اور پاس پڑوس کی شادیوں میں اسحاق شاہانہ انداز میں خرچ کرتا تھا۔ اظہار کم آمدنی کے باوجود اسحاق سے پیچھے نہ رہتا۔ نتیجے میں پہلے جو تنخواہ اور پنشن اسے کافی لگا کرتی تھی، ساری خرچ ہونے لگی۔ اب وہ کوشش کے باوجود رقم پس انداز نہیں کر پا رہا تھا۔ موسم سرما کی بر فباری کے بعد مکان مرمت مانگتا مگر اس کے پاس اتنی رقم ہی نہ ہوتی کہ وہ مکان پر خرچ کر سکتا۔

میٹرک کے بعد مہوش نے اسلام آباد کے پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ تانیہ نے بھی اپنے والد سے اسی کالج میں داخلہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اظہار نے جب کالج کی فیس پتا کی تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''سوری بیٹا! میں اس کالج میں تمہیں داخلہ نہیں دلوا سکتا۔'' انہوں نے انتہائی دل گرفتگی سے تانیہ کو کہا تھا۔

اس کے بابا نے اس کی ہر خواہش پوری کی تھی۔ وہ ان کو دل گرفتہ دیکھ کر تڑپ گئی۔ ''کوئی بات نہیں بابا، میں سرکاری کالج میں داخلہ لے لوں گی۔ یہاں بھی پڑھائی اچھی ہے۔'' اس نے لہجے میں مصنوعی بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ اظہار اسے دکھی نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنے بھائی سے مقابلے کی دوڑ میں پیچھے رہا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب تانیہ کو مہوش سے کسی میدان میں شکست ہوئی تھی۔ تانیہ یہ شکست تسلیم کر لیتی مگر مہوش کی طنزیہ باتیں اسے سلگا جاتیں۔ پہلے پہل وہ جب مہوش کو کالج بس سے اسلام آباد آتے جاتے دیکھتی تو جل جاتی مگر آخر کار اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ پوری طرح سے پڑھائی میں جت گئی۔ اب وہ اسی طرح سے اس سے شکست کا بدلہ چکا سکتی تھی کہ اس سے زیادہ نمبر

لے لیتی۔ اس نے پری میڈیکل کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی پڑھائی ٹھیک چل رہی تھی مگر اچانک اس کی ایک ٹیچر کا ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ انہیں بائیولوجی اور کیمسٹری پڑھاتی تھی۔ کالج میں اور کوئی ان مضامین کی ٹیچر تھی ہی نہیں۔ ایک اور ٹیچر انہیں یہ مضامین پڑھاتے تو لگی مگر وہ انہیں محض رٹے لگوا رہی تھی۔ اب اسے ٹیوشن کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے بابا سے بات کی تو وہ پھر اسے بے بسی سے دیکھتے رہ گئے۔ ان نظروں میں ہی اس کے سوال کا جواب تھا۔ وہ یہ جواب جان گئی۔ ''چلیں کوئی بات نہیں بابا! میں مینیج کر لوں گی۔'' وہ بہ مشکل اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اپنے کمرے میں جا کے وہ جی بھر کے روئی۔

جب اس کا فرسٹ ائیر کا رزلٹ آیا تو باوجود جان توڑ محنت کے وہ بہ مشکل تین سو اکتالیس نمبر لے سکی تھی۔ اسے نمبر کم آنے کا تو دکھ تھا مگر اسے یقین تھا کہ اس کے نمبر کم از کم مہوش سے زیادہ ہی ہوں گے۔ اس لیے جب مہوش رزلٹ کے بعد ان کے گھر آئی تو وہ بڑے تپاک سے ملی تھی۔

''بڑی خوش لگ رہی ہو۔ لگتا ہے کوئی بڑا تیر مارا ہے۔'' مہوش نے عجیب سے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی ہوں۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔

مہوش طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ''دن رات کتابوں میں سر کھپانے کے بعد محض فرسٹ ڈویژن؟''

اس طنز پر تانیہ کی رنگت اڑی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''میں نے پری میڈیکل رکھا تھا۔ اس میں جان تو مارنا پڑتی ہے۔ تمہاری طرح آرٹس کے مضامین نہیں رکھے تھے۔''

''کیا فائدہ پری میڈیکل رکھنے کا۔ کونسا تمہیں میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا۔ آخر کو تمہیں بھی آرٹس کے مضامین ہی رکھنا پڑیں گے۔''

''وہ تو بعد کی بات ہے۔ تم سناؤ، تمہارا رزلٹ کیا رہا؟''

''بھئی، میں نے تمہیں زبانی بتایا تو تم یقین نہیں کرو گی۔ یہ خود ہی دیکھ لو۔'' اس نے مارکس شیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مہوش کے نمبر دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ ''چار سو بیس نمبر.....؟'' اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

''تمہیں تو کبھی میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔''

وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔ ''لاکھوں کی فیس دے کر بھی بندہ کتابوں میں سر دیے بیٹھا رہے تو فائدہ؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کو چھوڑو، تانیہ ڈیئر۔ لو منہ میٹھا کرو۔'' اس نے مٹھائی کا ڈبا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ تانیہ حسرت و یاس کی تصویر بنی اسے دیکھتی رہ گئی۔ دولت کے بل بوتے پر وہ اسے ایک بار پھر ہرانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

مہوش کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ تانیہ ایف ایس سی میں بہ مشکل فرسٹ ڈویژن ہی لے سکی تھی۔ اس نے آگے پڑھائی کرنے کا فیصلہ ہی کیا تھا کہ کالج میں سائنس کی ٹیچر رہی ہی نہیں۔ دوسری طرف مہوش نے ایف اے میں اے گریڈ لینے کے بعد اسی کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ تانیہ کو خبر ہو چکی تھی کہ مہوش کو امتحانات میں کھلی نقل کرائی گئی تھی، تبھی وہ اتنے اچھے نمبر لے سکی تھی مگر وہ بے بس تھی، کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

''آخر کب تک وہ نقل کے سہارے کامیاب ہوتی رہے گی۔ کبھی ایک پیپر میں بھی سختی ہو گئی تو اس کا فیل ہونا یقینی ہو گا۔'' وہ اسی امید کے ساتھ نئے سرے سے پڑھائی میں جت گئی۔

اس وقت بھی وہ کتابیں کھول کر بیٹھی تھی مگر اس کی نظروں کے سامنے بار بار مہوش کے ہاتھ میں موجود رہنے والا فون گھومنے لگتا تھا اس کی طنزیہ گفتگو یاد آنے لگتی تھی۔

'کچھ بھی ہو، میں نے اسمارٹ فون ضرور لینا ہے اور وہ بھی اس سے اچھا فون۔' اس نے ایک عزم سے سوچا۔

☆☆☆

رات کے کھانے سے۔۔ فارغ ہوئے ہی تھے کہ تانیہ اظہار سے اٹھلا کے بولی۔ ''بابا! میں بی اے میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی تو آپ مجھے کیا گفٹ کریں گے؟''

انہوں نے شفقت سے اسے مسکرا کر دیکھا۔ ''جو میری بیٹی کہے گی۔''

''آج مہوش کے پاس نیا اسمارٹ فون تھا۔ آپ مجھے ویسا ہی اسمارٹ فون لے دیں گے نا؟''

''اسمارٹ فون؟'' ان کی آواز لڑکھڑائی۔ ''اس کی تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی؟'' یہ سوال نہیں، ایک بے بس باپ کا جواب تھا مگر تانیہ آج کوئی جواب سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''مہوش کو کیا ضرورت ہے؟'' اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''بیٹا! ان کے پاس دولت ہے۔ وہ ایسے چونچلے افورڈ کر سکتے ہیں، ہم نہیں۔'' انہوں نے بے بسی سے کہا۔

UUNOVELS.COM

''کہاں ہے دولت، اس کے ابو محض ایک کلرک ہی تو ہیں۔ان کی تنخواہ آپ سے زیادہ تو نہیں ہوگی۔''

اسحاق تھا تو کلرک مگر اس کے پاس اوپر کی کمائی کے بہت سے مواقع تھے۔وہ یہ بات اس سے نہیں کہہ سکتے تھے سو اسے بے بسی سے دیکھتے رہ گئے۔

''بابا! یہ میری آخری فرمائش ہے آپ سے۔اس کے بعد میں کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔آپ اس بار بے شک مجھے عید پر شاپنگ بھی نہ کرانا۔''اس کی آواز بھرا گئی۔

اس کے آنسو دیکھ کر اظہار تڑپ کے رہ گئے۔''نہیں بیٹا، ایسے نہ کہو۔میرا تو جی چاہتا ہے تمہاری ہر فرمائش پوری کروں مگر... اسمارٹ فون؟''

ریحانہ چائے لیے کچن سے نکلیں۔تانیہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''امی، آپ تو کہتی تھیں بابا میری کوئی خواہش نہیں ٹالتے۔''

''اسمارٹ فون تو آجکل ہر بچے بچی کے ہاتھ میں ہے۔کیا ہے، اگر آپ اسے بھی لے دیں تو۔''

''بھئی تم ماں بیٹی نے اتحاد کرلیا ہے تو میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔''انہوں نے گویا ہار مان لی۔

''تو آپ مجھے فون لے دیں گے؟''اس کے چہرے پر بچوں کی سی خوشی مچلی۔

''اگر تم نے بی اے میں فرسٹ ڈویژن لے لی تو۔''انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہرے۔''اس نے نعرہ لگایا۔''بابا! آپ کتنے اچھے ہیں۔''اس نے لاڈ سے کہا۔اظہار اسے بچوں کی طرح خوش ہوتے دیکھ کر مسکرانے لگے مگر اس مسکراہٹ کے پیچھے جو درد چھپا تھا وہ تانیہ محسوس ہی نہ کرسکی۔اس کے لیے تو اس وقت بس اپنی خواہش مقدم تھی، اس خواہش کی تکمیل میں وہ باقی سب بھول چکی تھی۔

☆☆☆

بی اے کے امتحانات اور پھر رزلٹ آنے میں ابھی تین چار ماہ پڑے تھے۔یہی سوچ کے اظہار نے تانیہ سے وعدہ کر لیا تھا مگر وہ باوجود کوشش کے ان چار ماہ میں ایک روپیہ بھی پس انداز نہ کرسکے۔رمضان سے پہلے خاندان میں ہونے والی شادیوں نے ان کے کس بل نکالے تو رہی سہی کسر عید پر پوری ہوگئی۔مہنگائی تھی کہ بڑھتی جارہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کے اخراجات بھی۔انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیسے اپنی آمدنی بڑھائیں۔اس آمدنی میں تو ایک روپیہ جوڑنا بھی ان کے لیے کارِدشوار ہو چکا تھا۔

تانیہ نے جس اسمارٹ فون کی ان سے فرمائش کی تھی، وہ پچیس ہزار کا تھا۔وہ اتنی رقم ادھار لے سکتے تھے مگر اس کی واپسی ان کے لیے مشکل ہو جاتی۔اب تو وہ یہ ''دعا'' کرنے پر مجبور تھے کہ تانیہ فرسٹ ڈویژن ہی نہ لے سکے۔اسی صورت وہ تانیہ کی نظروں میں سرخرو رہ سکتے تھے۔

جوں جوں رزلٹ کے دن قریب آتے جارہے تھے، ان کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

وقت کو کب کسی کی پریشانی سے کوئی سروکار ہوتا ہے وہ تو بے حسی سے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔تانیہ کے رزلٹ کا دن بھی آن پہنچا۔وہ اس دن بینک میں ڈیوٹی پر تھے جب انہیں تانیہ کی کال موصول ہوئی۔

''بابا! میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگئی۔''اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔تھی تو ان کے لیے بھی یہ بہت بڑی خوشخبری مگر موجودہ حالات میں ان کا دل یہ خبر سن کے ڈوب سا گیا۔

''مبارک ہو بیٹا۔''وہ بہ مشکل کہہ سکے۔

''مہوش کی انگلش میں سپلی آئی ہے۔بڑا اتراتی پھرتی تھی وہ.....اس بار میں نے اسے ہرا دیا۔''اس کے لہجے میں خوشی کے ساتھ تنفر بھی تھا۔

وہ اسے کہنا چاہتے تھے کہ کسی کی ناکامی پر ایسے خوش نہیں ہوتے مگر نہ کہہ سکے۔

''بابا! آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟''آخر کار اس نے وہ جملہ بول ہی دیا جس سے وہ خائف تھے۔

''جی بیٹا۔''انہوں نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔تانیہ نے ان کے لہجے پر غور ہی نہیں کیا۔

''تو پھر آج آپ وہی فون لے کے آنا جس کا میں نے آپ سے کہا تھا۔''

''بیٹا! اتنے پیسے تو مشکل ہیں، اسمارٹ فون تو پندرہ ہزار کا بھی مل جائے گا۔''انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں۔''وہ چیخی۔''مجھے بس وہی فون چاہیے اور آج ہی چاہیے۔''اس کے لہجے میں ہٹ دھرمی تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔''ان کے گلے سے بہ مشکل پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

''میں آپ کا انتظار کررہی ہوں۔''اس نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

اظہار نے گہرا سانس لیا۔بینک میں چہل پہل جاری تھی۔لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں کی رقم ان سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی مگر یہ چند قدم کا فاصلہ ان کے

UUNOVELS.COM

لیے میلوں پر محیط تھا۔ لوگ لاکھوں کی رقوم جمع کرا رہے تھے، نکلوا رہے تھے مگر اس رقم پر ان کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ تو اس رقم کے محافظ تھے، وہ اپنے ہاتھ میں اٹھائی گن کو بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے۔

☆☆☆

اظہار مرے ہوئے قدموں سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی چال میں کسی ہارے ہوئے جواری کی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تانیہ کی منتظر نگاہیں گھوم رہی تھیں۔ وہ پُراشتیاق انداز میں دروازہ کھولتی مگر اسے خالی ہاتھ دیکھ کر اس کے چہرے پر جو مایوسی چھا جاتی، یہ سوچتے ہی اظہار کا دل جیسے کوئی مٹھی میں جکڑ لیتا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جیب میں رکھا پستول نکال کر کنپٹی پر رکھ کے گولی چلا دے مگر اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی۔ اسے اپنا دل بھی گھر کے راستے کی طرح ویران لگ رہا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں ایک گھٹی گھٹی سے آواز پڑی۔ وہ ٹھٹک کے رک گیا۔ کچھ لمحے اسی طرح بیت گئے۔ وہ قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ اسے کپڑا پھٹنے کی آواز سنائی دی۔ جنگل میں سناٹے کا راج تھا۔ اس لیے یہ آواز اسے بالکل واضح سنائی دی تھی۔ وہ الجھن زدہ انداز میں آواز کی سمت بڑھا۔ اس نے ایک دو جھاڑیاں ہٹائی ہی تھیں کہ اس کی نظر ایک لمبے تڑنگے نوجوان پر پڑی۔ وہ حلیے سے ہی کوئی بگڑا ہوا رئیس زادہ لگ رہا تھا۔ اظہار کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف نمودار ہوا جسے اس نے کمال خوبی سے چھپا لیا۔ وہ بیزاری سے بولا۔

"او بھائی! کدھر جا رہے ہو۔ ادھر میرا ساتھی رفع حاجت کے لیے گیا ہے۔"

اسی لمحے وہ گھٹی گھٹی سے آواز پھر سنائی دی۔ یہ آواز کسی لڑکی کی لگ رہی تھی۔ اظہار نے جیب سے پستول نکال لیا۔ پستول دیکھ کر نوجوان کے چہرے پر ہراس نمودار ہوا۔

وہ زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولا۔ "او بھائی! کیوں پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاتے ہو۔"

"کون ہو تم لوگ اور ادھر کیا ہو رہا ہے؟" اس نے سختی سے کہا۔

جھاڑیوں میں کشمکش کی آواز بڑھ گئی۔

"تم کہاں سے خدائی فوجدار بن کے آ گئے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔" بیزاری سے کہتے ہوئے نوجوان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اظہار نے پستول لہرایا۔

"اپنا ہاتھ باہر نکالو۔" نوجوان نے جلدی سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں پرس تھا۔ اس نے پرس نکال کے پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ اظہار کی طرف بڑھائے۔ پیسے دیکھ کر اظہار کو اپنی پریشانی یاد آ گئی۔ یہ رقم تو گویا اس کے لیے غیبی امداد تھی۔ اس نے اپنے بینک کے ساتھیوں سے ادھار مانگا تھا۔ اسے پندرہ ہزار ادھار مل گئے تھے۔ موبائل لینے کے لیے اسے دس ہزار ہی مزید درکار تھے۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات دیکھ کر لڑکا بولا۔

"یہ پکڑو اور جان چھوڑو۔"

اظہار نے کانپتے ہاتھوں سے رقم لی اور پیچھے مڑ گیا۔ جھاڑیوں میں کشاکش جاری تھی مگر اس نے اپنے کان بند کر لیے۔ وہ تیزی سے دور جانے لگا۔ اس کا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔ جھاڑیوں سے آنے والی آوازیں اب بہت دور رہ گئی تھیں مگر اب اس کے اندر سے آواز ابھر رہی تھی۔ اس کے ضمیر کی آواز..... جو بار بار اسے کچوکے لگا رہا تھا۔

"کسی معصوم لڑکی کی بے بسی کا سودا تم نے اپنی بیٹی کی خوشی سے کر دیا۔" اس نے تھپک تھپک کر اس آواز کو سلا دیا۔

وہ مارکیٹ پہنچا اور تانیہ کا من پسند فون خریدا۔ واپسی پر اس کی نظروں کے سامنے بار بار اپنی بیٹی کا خوشیوں بھرا چہرہ جھلملا رہا تھا۔ اس کی خوشی کا تصور کرتے ہی اس کے دل میں .. مسرت سی ہونے لگی۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا مگر وہ اس اندھیرے سے بے پروا خوش خوش تیز قدموں سے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ جنگل میں وہ اس مقام پر پہنچا تو اچانک جھاڑیوں سے اس کا ایک پڑوسی نکلا۔ اس کے چہرے پر ہراس چھایا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے بولا۔

"بھائی صاحب، ادھر ایک لاش....." وہ اتنا کہہ کر یکلخت رک گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

اظہار کا دل دھڑکا۔ "کہاں ہے لاش؟" وہ کہتے ہوئے جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔

"بھائی صاحب! آپ ادھر نہ جاؤ۔" وہ اسے روکتے ہوئے بولا۔

اظہار نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور آگے بڑھا۔ اس نے جھاڑی سرکائی ہی تھی کہ ملگجے سے اندھیرے میں اسے ایک برہنہ لاش دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھ سے موبائل کا ڈبا چھوٹ کے نیچے جا گرا۔ وہ تانیہ کی لاش تھی۔ اس کی آخری فرمائش ہی اس کی موت کا سبب بن گئی تھی۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

چاہ تمنا

ناہید سلطانہ اختر

کبھی کبھی عشق ایسا سحر پھونک دیتا ہے کہ کسی کی چاہ میں کوئی اپنی تمام زندگی ہی تج کر اپنے محبوب کی خواہشوں میں خود کو یوں گم کرلیتا ہے کہ اپنی ذات کے لیے کوئی روزن کوئی جھروکا نہیں چھوڑتا مگر... کبھی ایک ایسالمحہ بھی آتا ہے جب وہ سب کچھ بُھلا کر اپنی ادھوری ذات کی تکمیل کرنے گم شدہ جزیروں پر نکل جاتا ہے اور گزشتہ زندگی کے تمام رشتوں اور رابطوں سے کٹ کر اپنے ادھورے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے اتنی دور نکل جاتا ہے کہ واپسی کے لیے کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ وہ بھی تو اپنے سنہرے مستقبل کو تاریکی میں دھکیل کر دوسروں کی راہوں میں چراغ بن کر راہنمائی کرنے کی لگن میں خود کو کھو بیٹھی تھی مگر... اچانک ماضی کے دریچوں نے کچھ اس طرح صدا لگائی کہ وہ اپنی جنت چھوڑ کر اس آواز کے تعاقب میں اتنی دور نکل آئی کہ اپنے گھر کا راستہ ہی بھول گئی۔

محبت کی مسحور کن دھن پر لہرانے والی ایک ناگن حسینہ کی گہری چالوں کا فسانہ

UUNOVELS.COM

شدید سردی تھی۔

ٹھمتھ، انگلش کاؤنٹی ڈیون کا ساحلی قصبہ دھند اور برفانی ہواؤں کی زد میں تھا۔ ٹھمتھ! ایک خواب سرا جہاں ایک بار آنے والا بار بار اس کے ریتیلے ساحل پر اپنے نقوش یا ثبت دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔

برفانی ہواؤں کے تھپیڑوں میں جھومتا، ڈولتا اور اس دلکش ساحلی مقام کے مبہوت کر دینے والے نظر افروز منظر کو گھونٹ گھونٹ اپنے نفس میں اتارتے ہوئے وہ پیش نظر بیکراں سطحِ آب سے بلندی پر فصیل ساحل کے پہلو میں بچھی پختہ راہ گزر پر اپنی دھن میں مگن چلتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے دائیں جانب فصیل سے بہت نیچے ریتیلے ساحل کی آغوش میں لحہ بہ لحہ رنگ و ہیئت بدلتی آبی لہریں موجزن تھیں اور ان کی شوریدہ سری کو دور، بہت دور نیلگوں آسمان نہایت متانت مگر محبوبیت سے تک رہا تھا۔ بجرے سطحِ آب پر ہلکورے لے رہے تھے۔ فضا میں مرغابیوں کی صدائیں غوطہ زن تھیں۔ فصیل ساحل سے متصل پختہ راہ گزر پر فاصلے فاصلے سے سجے تختوں پر مرد و زن، بوڑھے اور جوان اپنی اپنی خواب سراؤں میں بیٹھے تھے..... کہیں پیار کے پچھی دنیا و مافیہا سے بیگانہ ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے، کہیں آخر عمر اپنے ماضی کی راکھ میں چنگاریاں کریدتے اور اپنے آس پاس زندگی سے بھرپور جوان جوڑوں کو بصد حسرت دیکھتے چٹے نسروں والے بوڑھے مرد اور عورتیں اور کہیں زندگی کو اپنی نوکِ پا پر باور کرنے کی غلط فہمی کے مرتکب ہوتے زندگی کے میٹھے برسوں کی چاشنی میں ڈوبے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں..... اس راہ گزر کے بائیں جانب پختہ اور صاف ستھرے راستے پر آتی جاتی خواتین کی پاپوشوں کی ایڑیوں کی کھٹ پٹ نے فضا میں مترنم سی راگنی بکھیر رکھی تھی۔ سڑک کے اس پار پہلو بہ پہلو استادہ بلند عمارتوں کے بام و در لحہ بہ لحہ رنگ بدلتی آبی لہروں کو نہایت مستقل مزاجی سے دیکھ رہے تھے۔ ان عمارتوں کے عقب میں سبز پوش پہاڑیاں نگہبان بنی کھڑی تھیں۔ فصیل ساحل سے متصل پختہ راہ گزر پر جہازی سائز سنگی کیاریوں میں سرخ و زرد ٹیولپس کے پرے کھلے کھڑے تھے اور انہی سنگی کیاریوں کی آغوش میں ایک مخروطی سائبان تلے اِک چاہِ تمنا راہ گزاروں کو دعوتِ تمنا کا نقیب بنا ہوا تھا۔

شدید سردی اور دھند کے باوجود ٹھمتھ کے ساحل پر زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہی تھی اور اس جگمگاہٹ میں گزرتے گزرتے محب نے اُسے اسی چاہِ تمنا کے نزدیک نہایت عقیدت سے دونوں ہاتھ باندھے، آنکھیں موندے منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتے ہوئے دیکھا۔ وہ یکلخت رک گیا اور اس کی نظروں کے سامنے موجود منظر جیسے ٹھہر سا گیا۔ کچھ دیر بعد جڑے ہاتھ کھول کر وہ جانے لگی تو محب نے اسے مخاطب کیا۔ ''سنو!''

وہ پلٹی اور اسے دیکھنے لگی۔

محب کو یوں لگا جیسے اس ساحلی تفریحی مقام کا حسن... دوآتشہ ہو گیا ہو۔ سیاہ لانبے کوٹ، لانگ بوٹس اور سر پر اونی کنٹوپ میں وہ نہایت دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

''تم نے مجھ سے کچھ کہا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی..... جی ہاں۔'' محب نے چاہِ تمنا کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں یہ کیا ہے۔''

''پڑھ لو..... اس پر لکھا ہے۔'' اس نے جانے کے لیے پر تولے۔

''اور اگر کوئی پڑھنا نہ جانتا ہو تو؟''

''تو آگے بڑھ جائے..... یہاں اور بہت سی چیزیں بھی ہیں دیکھنے کو۔''

''مثلاً؟''

اس نے شانے اچکائے اور اردگرد طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''مثلاً..... یہ سارا منظر جو تم اردگرد دیکھ رہے ہو..... وہ دیکھو.....'' اس نے ریتیلے ساحل کی جانب انگلی اٹھائی۔ ''پانی سے اٹکھیلیاں کرتے بچے کتنے اچھے لگ رہے ہیں..... اوکے.....'' اس نے اپنے ہاتھ کی انگلیاں نچائیں اور پھر جانے کو بڑھی۔

''سنو..... سنو..... یہ..... اس کے بارے میں تو بتاتی جاؤ۔'' محب نے دوبارہ چاہِ تمنا کی طرف انگلی اٹھائی۔

''دس شلنگ کا سکہ اس چاہ میں ڈالو، چرخی گھماؤ اور جو دعا مانگنا چاہتے ہو مانگ لو۔'' اس نے کہا۔

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''کس بات کا؟''

''کہ یہاں مانگی ہوئی دعا قبول ہوتی ہے۔''

''تجربہ نہیں۔''

''لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم اس کے نزدیک کھڑی دعا مانگ رہی تھیں۔''

''پہلا اتفاق ہے..... دیکھوں گی دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں۔''

''پوچھ سکتا ہوں کیا دعا مانگی ہے تم نے؟''

اس نے محب کو تنبیہی نظروں سے دیکھا اور بولی۔

UUNOVELS.COM

''بہت ذاتی سا سوال نہیں کر رہے ہو تم!''

''معذرت!'' محب خفیف سا ہو گیا پھر چاہِ تمنا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ویسے ہے خاصی دلچسپ بات کہ — ترقی یافتہ دنیا کے باسی خود کو یوں بھی بہلاتے ہیں۔''

وہ جاتے جاتے پھر پلٹی اور اسے معترض نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ترقی یافتہ ہونا اور عقیدہ دو مختلف باتیں ہیں جناب۔''

''تمہارا ووٹ کس کے حق میں ہے؟''

''عقیدے کی پختگی ناممکن کو ممکن کر سکتی ہے۔'' وہ پورے یقین سے بولی۔

''بُرا نہ ماننا — ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا — پہلا اتفاق ہے — کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آج سے پہلے تمہیں چاہِ تمنا کی چرخی گھما کر دعا مانگنے کی ضرورت درپیش نہ آئی تھی یا آج سے پہلے اس پر یقین نہیں تھا؟''

وہ مسکرا دی اور بولی۔ ''میں یہاں نووارد ہوں۔ اسکول کے زمانے کی ایک سہیلی کی دعوت پر چند دن کے لیے یہاں آئی ہوئی ہوں — میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ اس قدر خوبصورت اور پُرسکون مقام ہوگا۔''

''حسنِ اتفاق کہ میں بھی یہاں نووارد ہوں۔ اپنے دوستوں سے تعریف سن کر چند دن کے لیے یہاں آیا ہوا ہوں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''زیادہ دور سے نہیں، ایکسیٹر یونیورسٹی میں طالبِ علم ہوں۔''

''ہندوستانی ہو؟''

''نہیں..... پاکستانی۔''

''یونیورسٹی میں کیا پڑھ رہے ہو؟''

''طبیعیات کا طالب علم ہوں۔''

''عمر سے تو لگتا ہے تعلیم کے اعلیٰ مدارج میں ہوگے۔''

''تمہارا اندازہ درست ہے..... پوچھ سکتا ہوں تم کیا کرتی ہو؟''

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ''جو تم نہیں کر سکتے۔''

''یعنی؟'' محب نے اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔

''میں..... بیلے ڈانسر ہوں۔''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں بیلے ڈانس نہیں کر سکتا۔''

''آں ہاں!'' وہ نہایت جانفزا انداز میں مسکرائی۔ ''بیلے ڈانس میں ہوتا کیا ہے..... جسم کے اعضا کو کمان کی طرح اکڑا اکڑا کر رقص کرنا — میں کر کے دکھاؤں۔'' محب بولا۔

''اوہ نہیں — لوگ مفت کا تماشا دیکھنے کو رک جائیں گے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

محب کو مذاق سوجھا۔ ''نہیں نہیں — یہ دیکھو۔'' اس نے اپنا دایاں بازو اکڑا کر اوپر اٹھایا اور بائیں ٹانگ قوس کی صورت عمودی رخ پر موڑ لی۔

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور سنگی کیاریوں میں ٹیولپس کے پرے اس کی کھلکھلاہٹ پر سر دھننے لگے۔

''بس بس — اس سے زیادہ نہیں — مان گئی کہ تم بیلے کر سکتے ہو۔'' وہ کچھ بے تکلف دکھائی دینے لگی۔

''ویسے میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم وہ نہیں کر سکتیں جو میں کر رہا ہوں۔''

''سائنس میرا مزاج ہی نہیں — میں تو فنونِ لطیفہ کی بندی ہوں — ویسے تم یہاں انگلستان ہی کے باشندے ہو یا تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہو؟''

''تعلیم حاصل کرنے۔''

''پھر؟''

''پھر سے مطلب؟''

''یعنی یہیں رہو گے یا تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس چلے جاؤ گے؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا — والدین حیات نہیں — بہن کوئی اللہ نے دی نہیں — ایک بڑا بھائی ہے جو شادی شدہ ہے اور اپنی زندگی میں مگن — ہو سکتا ہے میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد واپس اپنے دیس چلا جاؤں — یہ بھی ممکن ہے کہ یہیں رک جاؤں، بہرحال یہ آئندہ حالات پر منحصر ہے۔''

''فی الحال تو آپ چاہ تمنا کے کان میں اپنی تمنا پھونکنے پر انحصار فرمائیں۔'' مسکراہٹ تو جیسے اس کے لبوں پر دھری تھی۔

''اب تو واقعی چاہ تمنا کی چرخی گھمانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' محب اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''لیکن پختہ عقیدے کے ساتھ گھمانا چرخی کو..... عقیدے کے بنا کچھ نہیں ہوتا۔''

''اطمینان رکھو..... پورے یقین کے ساتھ گھماؤں گا..... ویسے آپس کی بات ہے، چاہ تمنا کی چرخی گھما کر دعا مانگی جائے یا بت پرستوں کی طرح پتھر کے دیوی دیوتاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر یا ہم مسلمانوں کی طرح ان دیکھے رب پر

UUNOVELS.COM

کامل یقین کے ساتھ اپنی پیشانی زمین پر ٹیک کر..... مانگتا تو بندہ اسی رب سے ہے جو اوپر آسمانوں میں بیٹھا ہے۔"

"بہت یقین ہے تمہیں اپنے اَن دیکھے رب پر!" وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"ارے مت پوچھو اس یقین کی بلندی، گہرائی اور شدت کا۔"

"آں ہاں۔"

محب نے اپنی جیب سے دس شلنگ کا ایک سکہ نکالا اور اسے اپنے انگوٹھے کے ناخن پر رکھ کر پہلے اچھالتے پھر ہتھیلی پر لیتے ہوئے بولا۔ "لو..... میں مانگنے جا رہا ہوں اپنے رب سے۔" اس نے سکہ چاہ تمنا میں ڈالا اور نہایت خشوع وخضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگا۔

وہ اس دوران آگے بڑھ گئی۔

"سنو!" وہ دعا مانگ کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی زیادہ دور نہ گئی تھی۔

"کہو۔" وہ ٹھٹک گئی۔

"یہ نہیں پوچھو گی کہ میں نے کیا دعا مانگی ہے۔"

اس نے شانے اچکائے اور بے نیازی سے بولی۔

"تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔"

"تم نے تو نہیں بتایا کہ تم نے چاہِ تمنا سے کیا تمنا چاہی ہے مگر میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ میں نے اپنے رب سے کیا دعا مانگی ہے۔"

"مجھے دوسروں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی لینے کا کوئی شوق نہیں۔"

"کیا ہم اکٹھے چل سکتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر محب کو دیکھا۔

"میرا مطلب ہے..... میں بھی اکیلا ہوں تم بھی اکیلی..... ساتھ چلیں گے تو باتیں کرتے ہوئے راستہ کٹ جائے گا۔"

"معاف کرنا..... میں راستہ کاٹنے نہیں..... موسم کی دلفریبی اور اس جگہ کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے نکلی ہوں۔"

"اکیلی کیا خاک لطف اندوز ہو گی۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی اور اسے تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں..... میں ایشیائی مردوں کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ جھوم کر بولا۔

"کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں..... تم کالے مرد اکثر اس غلط فہمی میں رہتے ہو کہ گوری عورت اخلاقیات سے عاری ہوتی ہے۔ اشارہ کرو اور وہ تمہارے ساتھ چل پڑتی ہے۔ تمہارا طریقۂ واردات بھی عجیب ہے۔ پہلے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے ہو پھر اظہارِ عشق ہوتا ہے اور شادی کی فرمائش۔ عورت مان جائے تو تبدیلیِ مذہب کی شرط۔ بچے پیدا ہونے کے بعد تمہیں خیال آتا ہے کہ گوری سے شادی کر کے تم نے بہت بڑی غلطی کر دی۔"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں..... بے شمار ہیں مجھ جیسے کالے جو گوریوں سے شادی کر کے خوش ہیں۔"

"زبردستی۔"

"نہیں نہیں، حقیقتاً۔"

"اچھا خیر..... تم اپنا راستہ لو..... میں اپنے راستے جاتی ہوں۔"

"شام کو فارغ ہو؟"

"خیریت!" وہ چونکی۔

"شام کو سمندر بہت سحر انگیز ہو جاتا ہے۔"

"اچھا! مجھے معلوم نہیں تھا۔" وہ پھوکے منہ سے بولی۔ اس کی دبی دبی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اسے محب کی بتائی ہوئی بات اچھی طرح معلوم تھی۔

وہ اس کے تجاہل عارفانہ پر جھینپ گیا۔

"تم کب سے ہو یہاں؟"

"آج پانچواں دن ہے۔" وہ بولی۔

"پھر تو تم نے شام کے وقت سمندر کی سحر ناکی ضرور دیکھی ہو گی۔"

"جین اور میں شام کو روزانہ ساحل پر آتے ہیں..... آج نہیں ہے وہ..... شاید کل بھی نہ آ سکے..... کارڈف میں اس کی ایک خالہ رہتی تھی، اس کی تدفین میں گئی ہوئی ہے۔"

"پھر تو ہم آج شام مل سکتے ہیں..... وہ سامنے والی بنچ پر میں تمہارا انتظار کروں گا..... سڑک پار ہاتھ کے ہاتھ تیار گرما گرم ڈونٹس اور کریم کافی بہت مزہ دے گی۔"

"لگتا ہے پیتے رہے ہو کافی؟"

"جس دن سے آیا ہوں..... صبح وشام۔"

"کتنے دن ہو گئے؟"

"آج تیسرا دن ہے۔"

"کتنے دن رہو گے؟"

"شاید ایک ہفتہ..... اور تم؟"

"میں اتوار کو واپس چلی جاؤں گی۔"

"ویسے رہتی کہاں ہو؟"

"لندن۔"

UUNOVELS.COM

"دوبارہ کب آؤ گی؟"

"جب خدا لائے۔"

"خدا جلدی لائے۔"

"کیوں بھئی!" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"تم ہنستی ہو کی بہت اچھی لگتی ہو۔"

"بناؤ مت۔"

"میری کیا مجال..... بنانے والے نے تمہیں بنانے کے بعد سانچہ ہی توڑ دیا ہوگا۔"

"لگتا تو نہیں کہ تم طبیعیات کے طالب علم ہو۔"

"تو پھر کیا لگتا ہے۔"

"جانے دو۔"

"نہیں نہیں بتاؤ۔" محب نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "میں نے غلط تو نہیں کہا تھا۔"

"کیا؟"

"کہ میں تم ایشیائی مردوں کو اچھی طرح جانتی ہوں..... سخت دل پیچک ہوتے ہو۔"

"مگر تمہارے مردوں کی طرح ہرجائی نہیں..... تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی ہم تو ایک دفعہ جسے دل دے دیتے ہیں پھر اسی کے ہو کر رہتے ہیں۔"

"خیر، اب ایسی بھی بات نہیں۔ لندن میں میری ایک مسلمان دوست بتاتی ہے کہ اسلامی دنیا میں تو ایک مرد بیک وقت چار بیویاں بھی رکھ سکتا ہے۔"

"ہاں مگر ہمارے دین کا حکم یہ ہے کہ مرد چاروں کے ساتھ انصاف کرے..... یہ نہ ہو کہ ایک بیوی کا تو خیال کر رہا ہے، باقی تین کو نظر انداز۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"مشکل ہے کبھی تو چار کی اجازت کے ساتھ انصاف کی شرط بھی عائد کر دی ہے اللہ نے۔"

اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ "اوہو! باتیں کرتے کرتے ہم کتنی دور نکل آئے۔ مجھے اب واپس جانا چاہیے..... جین کی دادی کو چائے بھی بنا کر دینی ہے مجھے۔"

"جین کی دادی بھی ہے؟"

"ہاں..... کافی بوڑھی..... جین کی ماں کو مرے تو کئی سال ہو گئے۔ ماں کے انتقال کے بعد اس کی دادی ہی نے اس کی سرپرستی کی..... جین بڑی اچھی بہت سمجھدار اور ہمدرد طبع لڑکی ہے۔ اس نے دادی کو اولڈ ہوم میں داخل کرانے کے بجائے اپنے ہی ساتھ رکھا ہوا ہے۔ بہت خیال رکھتی ہے دادی کا۔"

"اور جین کی عدم موجودگی میں تم یہ فریضہ نبھا رہی ہو۔"

"جین کی دوست جو ہوں..... اور جین بھی تو میرا کتنا خیال رکھ رہی ہے۔ جب سے آئی ہوں اس نے میری مہمانداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی..... بے چاری کو خالہ کی تدفین میں جانا لازم تھا ورنہ مجھے چھوڑ کر وہ ہرگز نہ جاتی..... اچھا اب میں جاتی ہوں۔"

"شام کو ملو گی نا؟"

"شاید۔"

"نہیں نہیں، وعدہ کر کے جاؤ۔" وہ مچلا۔

"کوشش کروں گی۔"

"کوشش نہیں..... وعدہ۔"

"اوکے۔" وہ مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ نے محب کے چہار اور چہ افشاں سا کر دیا۔

"میرے خدا!" محب نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "کتنا احمق ہوں میں کہ....."

"اس میں کیا شک ہے۔" وہ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بولی۔

محب نے اسے پیار سے گھورا۔ "تمہارا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"میں نے کون سا پوچھ لیا تمہارا نام۔"

"میرا نام محب ہے..... محب علی خان۔"

"مجھے کیرول کہتے ہیں۔"

"کیرول!" محب نے دہرایا۔

"شام کو ملو گے کہاں؟"

"چاہِ تمنا کے نزدیک۔"

"ٹھیک ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں؟"

"کہاں؟" وہ چونکی۔

"جین کے گھر تک۔"

اس نے شانے اچکائے۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"شکریہ۔" وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

جین کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ قدیم طرزِ تعمیر کا پرانا سا گھر جس کے باہر گھنی باڑھ تھی اور دریچوں پر پڑے پردوں سے پراسراریت جھانک رہی تھی۔

گھر کے داخلی دروازے میں چابی گھماتے ہوئے کیرول نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ "شام کو ملتے ہیں۔" اس نے کہا اور دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گئی۔

UUNOVELS.COM

محب دروازہ بند ہونے کے بعد واپس مڑا۔

یونیورسٹی کے ساتھیوں سے اس نے نمتھ کی سحر ناکی کے جو قصے سنے تھے، نمتھ تو اسے ان قصوں سے بھی زیادہ سحر انگیز لگ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ قریب قریب ہر شام اس کے اور کیرول کے درمیان شام آشنائی بن گئی۔

بعض لوگوں پر ان کے نام کتنے سجتے ہیں، اس کا بھرپور اندازہ محب کو پہلی بار اسی شام ہوا۔ کیرول فقط نام کی کیرول نہ تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک مسحور کن ترنم اور بدرجہ اتم غنائیت تھی۔ لگتا تھا خدا نے اس کا خمیر سات سُروں سے گوندھا تھا۔ ہر سُر ایسی لَے میں تھا کہ وہ دلنشیں نغمہ بن گئی تھی۔ اس کے دم کی برکت نے دو دن قبل طوفانی بارش کے بعد برفانی ہواؤں کی زد میں آئے ہوئے نمتھ کو محب کے لیے فردوس بر روئے زمیں بنا دیا تھا۔

تازہ تازہ ڈونٹس اور گرما گرم کریم کافی کے ساتھ وہ دونوں ایک بنچ پر بیٹھے گاہے بگاہے سمندر اور اپنے اردگرد رقصاں رونقوں کو دیکھتے اور باتیں کرتے رہے۔

محب اسے اپنا تعارف دے چکا تھا، اب اس کی باری تھی۔

وہ لندن سے آئی تھی۔ جین اور وہ اسکول کے زمانے سے سہیلیاں تھیں۔ کیرول کے والدین حیات تھے مگر دونوں میں عرصہ دراز قبل علیحدگی ہو چکی تھی۔ کیرول نے اسکول کے بعد مزید تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ بیلے ڈانس سیکھ کر وہ ایک طائفہ میں شامل ہو گئی تھی جو قریہ قریہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا پھرتا تھا۔ اس کے دو بھائی بھی تھے مگر وہ ان سے اور والدین سے لاتعلق ہو کر قطعاً خود مختار زندگی گزار رہی تھی۔ جین کی دعوت اور پُرزور اصرار پر وہ چند دن اس کے ساتھ گزارنے کے لیے نمتھ آئی ہوئی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی جین کے بغیر آج کا دن بہت بور گزرے گا مگر تم مل گئے۔" کیرول نے ڈسپوزیبل مگ سے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیے تو جین ہے..... ذرا مجھ جیسے غریب الوطن کی تنہائی اور بوریت کا اندازہ تو کرو۔" محب اپنے لہجے میں دنیا جہان کی بے چارگی سموتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا؟" کیرول نے کہا۔

"کس سے!" وہ چونکا۔

"تنہائی سے۔"

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ "عادی ہو گیا ہوں۔" اس نے کہا۔

"مجھے تو بہت خوف آتا ہے تنہائی سے۔" کیرول نے جھرجھری لی۔

"تو پھر اب تک تنہا کیوں ہو؟" وہ دھیرے سے اس کے نزدیک سرکتے ہوئے بولا۔

"کوئی اب تک دل کو بھایا ہی نہیں۔" وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

"معیار اونچا ہو گا..... کوئی امیر کبیر آدمی۔"

"نہیں..... میں پیسے کو اہمیت نہیں دیتی۔"

"تو پھر کس چیز کو اہمیت دیتی ہو؟"

"ذہنی ہم آہنگی کو۔" اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا پھر بولی۔ "زندگی کے سفر پر ایک ساتھ نکلنے والے مرد اور عورت کو ایک لَے میں قدم اٹھانے چاہئیں ورنہ سُر الجھ جاتے ہیں اور زندگی ایک بے سُرا راگ بن جاتی ہے..... میں خوب دیکھ بھال کر اپنے شریکِ زندگی کا انتخاب کروں گی اور ہمیشہ اسی کی بن کر رہوں گی..... بار بار راستہ بدلنا میری خو نہیں۔"

"کیسے پرکھو گی اسے؟" محب نے پوچھا۔

وہ مسکرا دی۔ "ایک فیتہ ہے میرے پاس۔"

"مذاق میں مت ٹالو..... میں قطعاً سنجیدہ ہوں۔"

"کیا مطلب!" وہ چونکی اور محب کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا میں جان سکتی ہوں کہ میرے قطعاً نجی معاملے میں تمہیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"بتا دوں؟"

"ہاں ہاں..... بتاؤ۔"

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

وہ اچھل پڑی اور آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے خدا! آج صبح ہم پہلی بار ملے ہیں اور وہ بھی اتفاقاً اور آج شام ہی یہ ہماری دوسری ملاقات ہے اور تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کر رہے ہو۔"

"کیرول!" محب اسے نہایت چاہت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "محبت ماہ و سال کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک ہی جست میں ساری منزلیں تمام کر لیتی ہے۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں..... تم نہ ملیں تو میں پارہ پارہ ہو کر بکھر جاؤں گا۔"

"کافی اور ڈونٹس کا بہت شکریہ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"اور آج کی شام مجھے بوریت سے بچانے کا بھی شکریہ۔"

محب میں نہ جانے کہاں سے اک جرأت رندانہ عود کر

آئی۔ اس نے کیرول کا ہاتھ پکڑلیا اور بولا۔ ''میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔''

کیرول نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''تم ایسے نہیں جاسکتیں..... تمہیں میری بات سننی ہوگی۔''

وہ چند ثانیے اسے یوں دیکھتی رہی جیسے اس کی فاترالعقلی کا یقین کرلینا چاہتی ہو پھر اس نے کہا۔ ''سناؤ۔''

''ایسے نہیں..... بیٹھو اور میری بات سنو۔''

وہ بیٹھ گئی۔

''بولو۔'' وہ کچھ دیر منتظر رہنے کے بعد بولی۔

''مجھے موقع دے کر دیکھو۔''

''کس بات کا؟''

''میں..... میں..... تم سے..... شا.....شادی.....

کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

وہ بے ساختہ ہنسی..... یوں جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

''میں بہت سنجیدہ ہوں کیرول۔'' وہ بولا۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''یقین کرو کیرول..... میں ایک اچھا شریکِ زندگی ثابت ہوں گا..... تمہارے بتائے بغیر ہی جان لیا کروں گا کہ تمہارے دل میں کیا ہے..... کیا چاہتی ہو تم۔''

''فی الحال تو میں جانا چاہتی ہوں۔''

''ایسے نہیں جاسکتیں تم۔''

''تو پھر کیسے؟''

''میرے سوال کا جواب دے کر۔''

''کون سے سوال کا!'' اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

''تمہاری ہمسفری کا..... تم سے شادی کرنے کا۔''

''اچھے طالب علموں کی طرح اپنی تعلیم پر توجہ دو..... تعلیم مکمل کرو..... پھر بیٹھ کر سوچو کہ یہیں رہنا ہے یا اپنے ملک واپس جانا ہے۔''

''تم ہاں تو کرو..... ہمیشہ کے لیے یہیں پڑاؤ ڈال دوں گا۔''

''موحب..... یہی نام بتایا تھا نا تم نے اپنا۔''

''ہاں..... محب۔''

''کچھ معنی ہے تمہارے نام کا؟''

''ہاں ہاں..... محب کا مطلب ہے..... چاہنے والا..... دوست..... دلدار..... میں تمہیں ٹوٹ کر چاہوں گا کیرول۔''

وہ یکلخت نہایت سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔ ''موحب! ہم دو مختلف دنیاؤں کے باسی ہیں۔''

''مجھے یقین ہے ہم دونوں باہم مل کر ایک نئی اور زیادہ بہتر اور خوبصورت دنیا بسا سکیں گے۔''

''میں امکانات پر نہیں حقائق پر یقین رکھتی ہوں..... ہمارے مذاہب مختلف ہیں، معاشرت مختلف ہے..... میں نے بہت سی ایسی مثالیں دیکھی ہیں جہاں مرد اور عورت نے مذہب اور معاشرت کے اختلاف کے باوجود شادی کی اور آخرکار ناکام ہوئے۔ رشتہ بھی نہ چل سکا، اولاد بھی بیگانی ہوئی اور..... دردِ دل مفت میں۔''

''اولاد تو یہاں ویسے بھی بیگانی ہی ہوجاتی ہے..... مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے کیرول..... ہم مثال قائم کریں گے۔''

''موحب! تم جذباتی ہو رہے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے کیرول۔''

''ایسا ہی ہے..... ہمیں ملے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں..... زندگی کا اتنا اہم فیصلہ اتنی عجلت میں نہیں کیا جاتا۔''

''یہ میرے دل کی آواز ہے کیرول۔''

''سردی بڑھ رہی ہے..... اٹھو اور اپنی قیام گاہ پر جاکر کمبل میں دبک کر اپنی کسی ہم مذہب، ہم معاشرت لڑکی کا خواب دیکھو۔''

''اتنی کٹھور مت بنو کیرول ورنہ.....''

''ورنہ؟''

''تمہارے سامنے اس سمندر میں ڈوب کر جان دے دوں گا۔''

وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

''اور جاتے جاتے کسی کو بتا جاؤں گا کہ میں جس لڑکی کے لیے جان دے رہا ہوں، اس کا نام کیرول ہے جو جین کی سہیلی ہے۔''

''جین نام کی نہ جانے کتنی لڑکیاں رہتی ہوں گی ٹمتھ میں۔''

''مگر کیرول کی سہیلی تو ایک ہی جین ہوگی۔''

''یقین نہیں آتا کہ تم طبیعیات کے طالب علم ہو۔''

''گولی مارو طبیعیات کو..... فی الحال تو مجھے بس تمہاری طلب ہے..... تم نہ ملیں تو میں ادھورا رہ جاؤں گا۔''

''میرا خیال ہے میں تو اٹھوں۔'' کیرول نے اٹھنے کا قصد کیا۔

''ایسے نہیں۔'' محب نے مچل کر کہا اور اس کی کلائی پکڑلی۔

''موحب!''

''وعدہ کرو کہ میری درخواست پر غور کروگی اور کل پھر ملوگی۔''

UUNOVELS.COM

''وعدہ نہیں..... جین واپس آ گئی تو مجھے اس کے پروگرام کا پابند ہونا پڑے گا۔''

''خدا کرے نہ آئے۔''

''ارے واہ! کیوں نہ آئے..... وہ میری میزبان ہے۔''

''اگر وہ آ بھی جائے تو کل تم شرفِ میزبانی مجھے بخش دو۔''

''جین بھی ہوگی میرے ساتھ۔''

''منظور!'' وہ جھوم کر بولا۔

''کہاں ملو گے؟''

''جہاں تم کہو۔''

''وہ جو سامنے سفید عمارت نظر آ رہی ہے اس کے عقب میں ایک کیفے ہے..... وہاں۔'' کیرول نے اس کی توجہ برلبِ سڑک ایک عمارت کی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

''کس وقت؟''

''جب تم کہو۔''

''سہ پہر چار ساڑھے چار بجے۔''

''ٹھیک ہے۔''

☆☆☆

اگلے روز کیرول تنہا ہی اس سے ملنے آئی۔ جین واپس نہیں آ سکی تھی۔ کیفے کی مالکہ نے دونوں کو نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ کیرول نے آئس کریم لینا پسند کی، محب نے کافی۔

کیفے میں ان دونوں کے علاوہ ایک نوجوان تھا جو فش اینڈ چپس پر ٹوٹا ہوا تھا اور ایک معمر عورت جو غالباً چائے یا کافی پی رہی تھی۔

''محب!'' کیرول نے کیفے کے ایک الگ تھلگ گوشے میں پڑی میز پر اپنے سامنے دھرے آئس کریم اسکوپ سے چمچ میں آئس کریم لے کر اپنے منہ تک لے جاتے ہوئے محب سے کہا۔ ''گزشتہ شب میں سونے سے پہلے تا دیر تمہارے بارے میں سوچتی رہی اور یہ بات مجھے کچھ عجیب لگی کہ صرف دو ملاقاتوں کے بعد ہی تم نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا۔''

''تم یہ بات کل بھی کہہ چکی ہو..... ویسے تمہارے خیال میں کسی لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کرنے کے لیے لڑکا اور لڑکی میں کتنی ملاقاتیں ہونا ضروری ہیں؟'' محب نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''تم میری بات کو مذاق میں لے رہے ہو۔'' کیرول نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔'' محب کامل سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''شادی کھیل نہیں..... مرد اور عورت کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ ہوتا ہے۔ اچھا ساتھی مل جائے تو فبہا ورنہ زندگی عذاب بن جاتی ہے..... میرے خیال میں شادی کا فیصلہ کرنے سے قبل لڑکا اور لڑکی دونوں کو ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھ لینا ضروری ہے۔''

''کیرول.....'' محب نے کہا۔ ''شاید تم میرے ایک مختلف النسل آدمی ہونے کی وجہ سے اعتبار کرنے میں متذبذب ہو..... میری رنگت ضرور گہری ہے مگر دل کا بہت اجلا ہوں۔''

''رنگ، نسل میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے..... مجھے اگر ایک سیاہ فام حبشی بھی متاثر کر گیا تو میں اس کا ہاتھ تھام لوں گی۔''

''اچھا تو پھر مجھے موقع دو کہ میں تمہیں متاثر کر سکوں۔''

''تم یہاں کب تک ہو؟''

''جب تک تم چاہو۔''

''میرا مطلب ہے تم یہاں کتنے دن اور رہ سکتے ہو؟''

''تم چاہو تو تمام زندگی۔''

''اوہو! مجھے یہ بتاؤ تم اور میں یہاں کتنا وقت اکٹھے گزار سکتے ہیں؟''

''حکم کرو۔''

''یونیورسٹی کب سے جانا ہے؟''

''دو ہفتوں بعد۔''

''ٹھیک ہے..... ہم یہ دو ہفتے اکٹھے گزاریں گے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے..... مجھے اگر تم سے ذہنی ہم آہنگی محسوس ہوئی تو میں تمہارے بارے میں سوچوں گی۔''

''پھر بھی سوچو گی!''

''بھئی تمہیں اپنی تعلیم بھی تو مکمل کرنی ہے۔''

''تعلیم شادی سے تو نہیں روکتی..... شادی کے بعد بھی تعلیم مکمل کی جا سکتی ہے۔''

''اتنی بے تابی کی وجہ؟''

''تم سے محبت۔''

''اوہ!'' اس نے نہایت دلنشین انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے۔

UUNOVELS.COM

''تم بہت حسین ہو کیرول..... تمہاری شخصیت تمہارے نام کی طرح مترنم ہے۔ میں دل و جان سے تم پر مرمٹا ہوں۔''

''مجھے آج تک کسی اور شخص نے اس طرح نہیں سراہا۔'' وہ بولی۔

''اب اگر کسی نے کوشش کی تو میں اس کی جان لے لوں گا۔''

''ہاہ!'' وہ زور سے ہنسی۔

☆☆☆

اگلے دو ہفتوں کے دوران وہ دونوں بلاناغہ ملتے رہے۔ صبح سے شام بلکہ اکثر رات گئے تک ان کا وقت اکٹھے گزرتا۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے، بانہوں میں بانہیں ڈالے وہ دونوں ٹنمتھ کے ساحل اور گلی کوچوں میں گھومتے پھرے۔ ٹنمتھ کا ساحل ان کے نقوش پا کا امین بن گیا۔ کبھی فصیل سمندر کے پہلو بہ پہلو ہم قدم چلتے اور یخ بستہ سمندری ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے، کبھی چوبی تختوں پر بیٹھ کر ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتے ہوئے، کبھی ٹیولپس سے بھری سنگی کیاریوں کی منڈیروں پر ٹک کر مرغابیوں کی سبک پروازی کا نظارہ کرتے ہوئے، کبھی اپنے ساتھ انہیں بھی چپس ٹونگاتے ہوئے، کبھی چاکلیٹ ڈرنک یا کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے، کبھی بجرے میں سمندر کی سیر کا لطف اٹھاتے ہوئے، کبھی سنہری ریت پر ٹانگیں پسار کر اور کبھی سبز پوش ڈھلانوں پر پہلو بہ پہلو نیم دراز ہو کر ان دونوں نے دنیا جہان کے موضوعات کھنگالے۔ ایک دوسرے کو اپنے ماضی میں جھانکنے کا موقع فراہم کیا۔ حال کا احوال سنایا۔ مستقبل کے جھروکوں سے آنے والے دنوں کے خدوخال دیکھے اور محب نہایت عجز و محبت سے اپنا دامان سوال کیرول کے سامنے دراز کیے رہا۔

کیرول نے اسے جین سے ملوایا اور اس کی دادی سے ملوانے کے لیے اس کے گھر میں بھی لے گئی۔ اس نے دونوں کو بتا دیا کہ محب اس سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ جین کی دادی نے نہایت گرمجوشی سے کہا۔ ''کیرول، انکار مت کرنا..... ایشیائی مرد بہت باوفا اور خیال رکھنے والے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔''

''خصوصاً پاکستانی مرد!'' محب نے اپنی دانست میں ازراہِ تفنن گرہ لگائی۔

''تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔'' جین کی دادی نے اس کی بات کو نہایت سنجیدہ لیا اور کھڑکی پر پڑا پردہ سرکا کر ایک سبز پوش ڈھلان پر بنے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''وہاں..... اس گھر میں ایک اطالوی عورت اپنے پاکستانی خاوند اور تین بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ہماری پڑوسن مسز اینتھونی سے اس کی کافی دوستی ہے۔ مسز اینتھونی بتاتی ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی میں ایسا اچھا شوہر کسی کا نہیں دیکھا۔''

''سن لیا!'' محب نے کیرول کو جتایا۔

بالآخر کیرول نے ہاں کر دی مگر اس شرط کے ساتھ کہ محب کو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا ہوگی۔

''تعلیم تو شادی کے بعد بھی مکمل کی جا سکتی ہے کیرول۔'' محب نے بے تابی ظاہر کی۔

''جلدی کیا ہے محب..... پہلے تم اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کر لو۔''

''اور اگر اس دوران تم بدل گئیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے خدانخواستہ تمہارا ارادہ بدل گیا تو!''

کیرول نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔ ''تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟''

''نہیں نہیں..... میں خدشہ ظاہر کر رہا ہوں۔'' محب شرمندہ ہو گیا۔

''تمہیں کم از کم ایسے لوگوں پر تو بھروسا کرنا آنا چاہیے جو بغیر کسی جبر کے تمہیں کسی معاملے میں زبان دیں..... مجھے وعدہ نبھانا آتا ہے محب۔''

''سوری۔'' وہ مزید شرمندہ ہو کر بولا۔

تعطیلات کے اختتام پر وہ دونوں اس وعدے کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے کہ جب، جہاں اور جیسے ممکن ہوا، ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔

☆☆☆

زیادہ نہیں کوئی چھ ہفتوں بعد محب تین دن کی لگاتار چھٹیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کیرول سے ملنے لندن پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ گھٹنوں سے اونچے اسکرٹ کے بجائے پورے بازوؤں والی لانبی میکسی میں ملبوس تھی۔

''تم اس لباس میں بہت خوبصورت لگ رہی ہو کیرول!'' محب نے سراہا۔

''میں جانتی تھی تمہیں یہی اچھا لگے گا۔''

''اچھا! کیسے جانتی تھیں؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''تمہیں یاد ہوگا، میں نے ٹنمتھ میں تم سے کہا تھا..... وہ دو افراد جو زندگی کے راستے پر ایک دوسرے کے ہمسفر بننے

UUNOVELS.COM

جارہے ہوں، انہیں ایک دوسرے کی پسند، ناپسند کا اندازہ ہونا چاہیے..... انہیں زبان سے بتائے بغیر ہی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دوسرے کے دل میں کیا ہے..... میں نے بیلے طائفہ کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ایک سپر اسٹور میں نوکری کرلی ہے۔ یہاں لندن میں پاکستانیوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ میں کوشش کررہی ہوں کہ پاکستانی مرد کی نفسیات کو بہتر طور پر سمجھ پاؤں..... مجھے پتا چلا ہے کہ تم لوگ اپنی عورتوں سے ستر پوشی کے خواہش مند ہوتے ہو۔ اسے گھر کے کاموں میں ماہر دیکھنا چاہتے ہو۔ تمہیں بیوی کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند ہوتا ہے۔ تم اسے گھر کے اندر ہی دیکھنا چاہتے ہو۔ اس کا حجاب تمہیں خوش کرتا ہے۔ کسی غیر مرد سے اس کا اختلاط تمہیں وحشت پر لے جاتا ہے۔"

"زبردست کیرول! لگتا ہے تم تو ایک پاکستانی مرد کی بیوی بننے کے لیے انٹرن شپ کررہی ہو۔" محب بولا۔

"مجبوری ہے۔"

"آئی لو یو کیرول!"

"اور ہاں، میں نے سگریٹ نوشی بھی کم کردی ہے۔ رفتہ رفتہ ترک بھی کردوں گی۔" کیرول نے کہا۔

محب اس خیال سے جھوم اٹھا کہ کیرول سے شادی کی امیدواری اس کا ایک اچھا فیصلہ تھا۔

ان دونوں کی اگلی ملاقات ایکسیٹر میں ہوئی جہاں کیرول خود اس سے ملنے کے لیے آئی تھی۔

چوتھی یا پانچویں ملاقات میں کیرول نے اس سے کہا۔ "محب! تم کہو یا نہ کہو مگر میں جانتی ہوں کہ جلد یا بدیر تم مجھ سے ایک مطالبہ ضرور کرو گے۔"

"کیسا مطالبہ!" وہ چونکا۔

"میرے مسلمان ہونے کا۔"

محب دم بخود رہ گیا۔

"یہ تم نے کیسے جانا؟" اس نے کیرول سے پوچھا۔

"ایک غیر مذہب اور مختلف ثقافت کے فرد سے شادی کی تیاری کرتے ہوئے مجھے جاننا چاہیے کہ وہ کیا چاہتا ہے کیا نہیں..... تم سے وعدۂ شادی کے بعد میں ایشیائی بالخصوص ایک مسلمان مرد کی نفسیات سے آگاہی کی کوشش میں کئی ایسے جوڑوں سے ملی ہوں جن میں عورت میری طرح مقامی اور مرد پاکستانی مسلمان ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلمان مرد کی شعوری تمنا یہی ہوتی ہے کہ اس کی شریکِ زندگی اسی کی ہم مذہب ہو۔"

محب کو یوں لگا جیسے وہ پہلے ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ ہونے کو تھا۔ کیرول اپنا ہوم ورک کررہی تھی اور وہ منتظرِ فردا تھا۔ کیرول مسلمان پاکستانی مرد کی نفسیات سے آگاہی حاصل کررہی تھی مگر اس نے مغربی عورت کی نفسیات سے آگاہ ہونے کی ابجد بھی نہیں شروع کی تھی۔

"اگر میں تم سے یہ مطالبہ کروں تو کیا تم مان لوگی؟"

"میں تیاری کررہی ہوں۔"

"کس بات کی؟"

"میں نے قرآنی تعلیم شروع کررکھی ہے..... خدا کو منظور ہوا تو مسلمان ہوجاؤں گی۔"

"اوہ کیرول! میرا جی چاہتا ہے تمہارے قدموں میں بیٹھ جاؤں۔"

"تمہاری جگہ یہاں ہے۔" وہ اپنے سینے پر مقامِ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے ایک بات بتاؤ۔" محب اسے وارفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے کیا توقعات منسوب رکھتی ہو تم۔"

"فقط ایک توقع۔"

"وہ کیا؟"

"میرے کہے بنا تم یہ جان لو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

"تم مایوس نہیں ہوگی۔"

"محب! پہلے تم کہا کرتے تھے..... آج میں کہوں گی..... آئی لو یو۔"

"تھینک یو..... تھینک یو کیرول۔"

☆☆☆

شادی سے قبل کیرول نے لندن کے ایک اسلامی مرکز میں برضا و رغبت اسلام قبول کرلیا۔ اس کے اس اقدام پر اس کے اپنے گھر میں خاصی بدمزگی ہوئی۔ اس کی ماں نے جو عیسائیوں کے ایک کٹر فرقے سے تعلق رکھتی تھی، کافی لے دے کی۔ "ایک مسلمان کے لیے اپنا مذہب ترک کرکے تو گناہ گار ہوئی ہے۔ کیا ملا ہے تجھے دوسرا مذہب اختیار کرکے۔"

کیرول نے ماں کی یہ بات اسلامی مرکز کے ایک عہدیدار کے سامنے رکھی تو وہ متانت سے بولے۔ "اپنی والدہ سے کہنا مجھے ہدایت نصیب ہوئی ہے۔ قبولیتِ اسلام نے مجھے قلب و روح، ظاہر و باطن کی پاکیزگی کا تحفہ عطا کیا ہے۔ طہارت سکھائی ہے۔ حوائج ضروریہ سے فراغت کے بعد میں پانی کا استعمال ضروری سمجھنے لگی ہوں۔ نجاست سے دور ہوکر نفاست اختیار کرگئی ہوں۔"

محب کو بھی اپنے بھائی کی طرف سے چنداں مختلف

UUNOVELS.COM

صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس نے بھائی کو ایک نو مسلم دوشیزہ سے شادی کی خبر سنائی تو وہ بھبک اٹھا۔ ''اپنے وطن میں مسلمان لڑکیاں ناپید ہوگئی تھیں کیا جو تم نے ایک غیر مذہب لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا۔''

''بھائی جان! وہ مسلمان ہوگئی ہے۔''

''ہونہہ! مسلمان ہوگئی ہے..... وقتی رنگ ہے، چار دن میں اس کا بھی رنگ اتر جائے گا۔ تمہارا نشہ بھی ہرن ہوجائے گا۔''

''بھائی جان! اس نے قبولِ اسلام سے پہلے اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ جو سوچ سمجھ کر اسلام قبول کرے وہ پھر اسی کے ساتھ رہتا ہے۔''

''دیکھتا ہوں کتنی دیر رہتی ہے..... جس نے تم سے شادی کرنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑ دیا وہ کل کسی اور کے لیے تمہیں بھی چھوڑ سکتی ہے۔''

''نہیں بھائی جان! وہ ایسی نہیں ہے۔''

''ایسی ویسی کچھ نہیں..... مغرب کی عورتیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں..... میں کیا انجان ہوں..... دو سال رہا ہوں انگلینڈ میں..... ان پری ڈکٹیبل ہوتی ہیں سب کی سب..... آج تیرے ساتھ کل میرے ساتھ۔''

''مجھے آپ کی دعا چاہیے۔''

''خود بھگتو گے۔''

''میں اسے ساتھ لے کر آؤں گا آپ سے ملوانے کے لیے..... آپ خود دیکھیں گے وہ یہاں کی عام لڑکیوں سے کتنی مختلف ہے۔''

''آسمان سے اتری ہوگی۔'' بھائی نے طنز کیا پھر غصے سے کہا۔ ''کوئی ضرورت نہیں اسے یہاں لانے کی..... ابا کے مکان میں تمہارا حصہ تمہیں وہیں پہنچ جائے گا۔'' بھائی کے لہجے میں تلخی تھی۔

''مجھے کسی حصے کی ضرورت نہیں۔''

محب کو دیگر افرادِ خاندان کی جانب سے بھی کوئی مثبت ردِعمل نہ ملا۔ کزنز میں اس کی اپنے ایک ماموں زاد شکیل سے خوب بنتی تھی۔ اس نے بھی کوئی حوصلہ افزا بات نہ کی۔

رشتے داروں کے ردِعمل اور جلی کٹی سن کر محب جو شادی کے بعد کیرول کو جس کا قبولِ اسلام کے بعد اسلامی نام غنار رکھا گیا تھا، اپنے رشتے داروں سے ملوانے کے لیے پاکستان لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہوگیا۔ ویسے بھی مادی عوامل کی کارفرمائی نے اسے انگلستان ہی میں روزگار اختیار کرنے پر راغب کر رکھا تھا۔ پاکستان میں تو اچھے بھلے ڈگریاں ہاتھ میں لیے پھر رہے تھے یا پھر اپنی مرضی کے خلاف حالاتِ کار میں کام کرنے پر مجبور تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کیرول اس کے ساتھ آغازِ سفر میں ہی اس کے رشتے داروں کی منافرت دیکھ کر بددل ہوجائے۔

☆☆☆

محب اور کیرول کی شادی پر محب کے دوستوں کا ردِعمل بھی رشتے داروں سے مختلف نہ رہا۔ محب کے دوستوں کا خیال تھا کہ یہ رشتہ زیادہ عرصے نہیں چلے گا۔ اس کے ایک قریبی دوست نے اس کی شادی پر سینہ ٹھونک کر دعویٰ کیا کہ اس کا اور کیرول کا رشتہ چند ماہ بھی چل جائے تو وہ اپنا نام بدل لے گا۔

ایک اور دوست نے کیرول کی تبدیل شدہ ظاہری ہیئت پر استہزائیہ انداز میں تبصرہ یوں کیا۔ ''چار دن کا ڈراما ہے پھر نہ یہ حجاب رہے گا نہ معصومیت۔ مسز محب ننگی ٹانگوں، ننگی بانہوں، ننگی جنگھی کٹ کٹ کرتی پھر رہی ہوں گی اور مسٹر محب اس کے عبایا کو سینے سے لگائے گھر کے اندر بیٹھے ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہوں گے۔''

محب کے ایک شناسا نے اپنے ایک ہندوستانی مسلمان اور اس کی مذہب تبدیل شدہ انگریز بیوی کا نوحہ ان الفاظ میں سنایا۔ ''سالی برقع کے نیچے اسکرٹ پہنتی ہے۔ بچے نام کے مسلمان ہیں--- گنوں میں پورے گورے۔ شراب، خنزیر سب چلتا ہے ان کے گھر میں۔''

''لاحول ولاقوۃ!'' محب نے کہا۔

''یار! ان کی اپنی تو مرد اور عورت کی ایک چھ کی نسبت چل رہی ہے۔ سالی گوریوں کو گورے تو ملتے نہیں۔ ہم مسلمانوں کو قابو کر لیتی ہیں اور ہم بھی ایسے الو کے پٹھے کہ ان کی گوری چمڑی اور سنہری زلفوں پر رجھ جاتے ہیں۔''

''مجھے گالی دے رہے ہو۔'' محب نے دوست کو گھورا۔

''نہیں نہیں یار..... میں تمہیں گوریوں کی اصلیت بتا رہا ہوں۔''

''خیال رہے کہ میری بیوی بھی گوری ہے۔'' محب نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔

''اللہ تمہارا حافظ ہو۔'' دوست دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر بولا۔

شادی کے بعد کیرول نے جس کا اسلامی نام باوجود کوشش کے محب کی زبان پر نہ چڑھ پایا، سپر اسٹور میں اپنی ملازمت کو خیرباد کہا اور گرہستن بن کر گھر بیٹھ گئی۔ محب کو

UUNOVELS.COM

یونیورسٹی میں نوکری مل گئی تھی اور وہ اپنی نوکری سے خوش بھی تھا اور مطمئن بھی۔ کیرول دن بھر گھرداری میں لگی رہتی اور محب کی پسند ناپسند کا پورا خیال رکھتی۔ محب کی خاطر اس نے برصغیر کے روایتی کھانے پکانے کی مشق شروع کی۔ کبھی آس پاس کسی پاکستانی یا ہندوستانی پڑوسن سے پوچھ کر اور کبھی مطبوعہ تراکیب کے ذریعے۔ محب کو بریانی پسند تھی، اس نے کھانا پکانے کی ایک کتاب سے بریانی بنانا سیکھی۔ محب کو شامی کباب اچھے لگتے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ کی کوشش کے بعد بالآخر لذیذ شامی کباب بنانا سیکھ لیے۔ محب کو کڑھی سے رغبت تھی۔ اس نے ایک ہندوستانی ہمسائی کے گھر جا کر کڑھی بنانا سیکھی۔ کچوریاں بھی اس نے اسی خاتون سے بنانا سیکھیں۔ دیسی مسالوں کی خریداری کے لیے وہ دکان در دکان جھانکتی پھرتی۔ مٹھائیاں اس نے ایک بنگالی دوست سے بنانا سیکھیں۔

محب کی خوشنودی حاصل کرنے کو وہ ایسے ایسے جتن کرتی کہ محب اس کا اور گرویدہ ہو جاتا۔ ایک روز محب نے باتوں باتوں میں کہا۔ ''میری والدہ مرحومہ شکر پارے بہت عمدہ بناتی تھیں۔''

''وہ کیا ہوتا ہے محب؟'' کیرول نے پوچھا۔

''ہماری ایک دیسی مٹھائی۔''

کیرول نے ایک ہندوستانی بڑھیا ڈھونڈ نکالی جسے شکر پارے بنانا آتے تھے اور اس سے سیکھ کر اس نے محب کے لیے شکر پارے بھی بنانا شروع کر دیے۔ محب کی خوشی کی خاطر اس نے پاجامہ، ٹراؤزر اور فل آستینوں والے ٹاپس کے علاوہ شلوار، قمیص بھی اپنے پہناووں میں شامل کر لیے۔

محب نے ایک روز ساڑی کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا بشرطیکہ اس میں عریانیت نہ ہو۔ کیرول نے ساڑی خریدی۔ ایک بنگالی خاتون سے ساڑی باندھنا سیکھنے کی کوشش کی اور ریڈی ٹو ویئر ساڑی پہننے کی خاطر ایک درزی سے ساڑی میں چنٹیں ڈلوا کر اس کی فال تیار کروائی اور محب کو خوش کرنے کو اس ایک ساڑی کو اتنی بار پہنا کہ اسے ساڑی پہننے اور سنبھالنے کی اتنی مشق ہو گئی کہ اس کی الماری میں ایک نہیں، کئی ساڑیاں ہینگر پر لٹکی رہنے لگیں۔

محب کو تازہ پھول پسند تھے۔ کیرول نے اپنے گھر میں ان ڈور اور آؤٹ ڈور پھولوں کے گملے اتنی خوبصورتی سے آراستہ کیے کہ گھر آنے جانے والے احباب تعریف کیے بنا نہ رہتے۔

کیرول نماز پڑھتی۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرتی۔ قرآنی تعلیمات میں محب کو بھی شریک کرتی۔ لگتا تھا خود کو ایک وفا شعار اور شوہر کی خوشنودی کو مقدم جاننے والی عورت ثابت کر دینے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا چاہتی تھی۔

اپنے والدین اور دونوں بھائیوں سے کیرول کا تعلق نہایت واجبی سا رہ گیا تھا۔ محب سے ان کا میل جول بھی سرسری تھا۔ ہیلو، ہائے، بائے قسم کا۔ کوئی گرمجوشی تھی نہ رشتے کا احساس۔

''میری وجہ سے تم اپنے گھر والوں سے دور ہو گئی ہو۔'' ایک روز محب نے کہا۔

''نہیں محب! تمہاری وجہ سے نہیں۔۔۔ مسلمان ہو جانے کی وجہ سے۔''

''مسلمان بھی تو تم میری خاطر ہوئی ہو۔''

''نہیں نہیں۔۔۔ میں اللہ کے لیے مسلمان ہوئی ہوں۔''

''تم نے مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیا ہے کیرول۔''

''لو یو محب!''

''می ٹو کیرول!''

لو یو محب! کیرول کا گویا پسندیدہ فقرہ بن گیا تھا۔ صبح سے رات تک وہ اَن گنت مرتبہ محب سے اپنی محبت کا اس مختصر سے فقرے سے نہایت محبوبیت سے اظہار کرتی۔ محب اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا کہ اسے کیرول جیسی خوبصورت، وفا شعار اور اطاعت گزار شریک زندگی ملی تھی اور محب کے دوست احباب ششدر اور کیرول کے بارے میں اپنی قیاس آرائیوں پر خجل! ان کے یہ دعوے کہ کیرول سے محب کا رشتہ ناپائیدار ہوگا، منہ چڑاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کیرول تو مشرقی عورت سے لگا کھا رہی تھی۔

سارہ کی پیدائش ان دونوں کے رشتے کے مزید استحکام کا باعث بنی۔ دوسرا بچہ معزان کے لیے نئی خوشیوں کا پیامبر ثابت ہوا۔ نیب کی آمد نے محب کو مزید قوی ہونے کا احساس بخشا۔ تارا دنیا میں آئی تو محب اور کیرول کی چھوٹی سی دنیا اور جگمگا اٹھی۔ کون کہتا ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال بیوی کو مرد سے قدرے بیگانہ کر دیتی ہے۔ محب کو تو یوں لگتا جیسے ہر بچے کی آمد اسے کیرول سے اور قریب کرتی جا رہی تھی۔ ہر بچہ نئی خوشیوں کا پیامبر اور ان دونوں کے رشتے کو مزید مستحکم کرنے کا نقیب بن کر آیا۔ محب کو مغرب کی عورت کے بارے میں مشرق کا یہ خیال بھی خام محسوس ہوتا کہ مغرب کی عورت اولاد سے بے پروا اور اپنی ذات کے سحر میں گم رہتی ہے۔ کیرول تو بچوں کی پیدائش کے بعد ہمہ تن ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی۔ کیرول ہی کیا بچوں کی نگہداشت و

پرداخت کے سلسلے میں محب مغرب کی نوعمر اور نوجوان ماؤں کو بھی پورا انصاف کرتے دیکھتا تھا۔ کیا گھر کیا باہر، کیا شاپنگ مالز، کیا ٹیوب اسٹیشنز ..... محب چھوٹی چھوٹی ماؤں کو بھی اپنے بچوں کو گلے کا ہار بنائے دیکھتا۔ خود سختیاں جھیلتیں، مشقت اٹھاتیں، بوائے فرینڈز چھوڑ کر بھاگ جاتے مگر مائیں تنہا بچوں کو ہر سہولت اور آرام پہنچانے کی کوشش کرتیں۔

کیرول نے بچوں کی پیدائش کے بعد ان کی نگہداشت و پرداخت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ وہ بچوں کے لیے ماں بھی ویسی ہی مثالی ثابت ہوئی جیسی کہ محب کے لیے بے مثال شریکِ زندگی ثابت ہوئی تھی۔ چاروں بچے یکے بعد دیگرے ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو سال کے وقفے سے دنیا میں آئے تھے لیکن اس نے چاروں کو یکساں توجہ دی۔ مجال تھی کہ کبھی کوئی بچہ اس کی عدم توجہی کا مظہر دکھائی دیا ہو۔ کیرول صبح سے رات تک مصروف رہتی مگر کبھی تکان کا گلہ نہ کرتی البتہ کبھی کبھی ہنس کر یہ ضرور کہتی کہ اسے چار تھوڑی پانچ بچے سنبھالنے پڑتے تھے۔ اس کا اشارہ محب کی طرف ہوتا۔ محب تساہل پسند اور خاصا پھوہڑ تھا۔ اپنے استعمال کی چیزیں نہایت بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر ڈال دیتا۔ قمیص یہاں تو پتلون وہاں۔ ایک جوتا شوریک پر تو دوسرا بیڈ کے نیچے۔ ایک موزہ جوتے کے اندر دوسرا فرش پر۔ بیڈ سائڈ پر استعمال شدہ ٹشو پیپرز کا ڈھیر ہوتا۔ تکیے کا غلاف اترا ہوا اور تکیہ دہرا ہوا۔ خدا جانے کیوں وہ رات کو سونے سے پہلے تکیے کے غلاف اتار کر پھینک دیا کرتا تھا۔ واش روم میں جاتا تو ٹوتھ پیسٹ کھلا چھوڑ دیتا۔ واش بیسن میں ٹونٹی سے پانی ٹپکتا چھوڑ آتا۔ صابن، سوپ ڈش کے بجائے باتھ ٹب کے کنارے پر پڑا ہوتا یا روشن دان کے چوکھٹے پر۔ کیرول جو نہایت خوش سلیقہ تھی، اس کی بدنظمی پر جھلانے یا خفا ہونے کے بجائے نہایت تحمل کا مظاہرہ کرتی۔ اکثر ہنس کر کہتی۔

''مجھے اپنے گھر کے سب سے بڑے بچے کی طرف سے چیزیں اِدھر اُدھر بکھیرے رکھنے کا سامنا ہے۔''

بچے بڑے ہوئے تو کیرول نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور اور یکساں توجہ دی۔ چاروں بچوں میں سے کسی کو کبھی یہ گلہ نہ ہونے دیا کہ ان میں سے فلاں کو زیادہ محبت یا توجہ دی جارہی تھی یا فلاں کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ محب کو چھوٹی بیٹی تارا چاروں بچوں میں سب سے زیادہ پیاری تھی مگر بظاہر وہ چاروں پر یکساں شفقت رکھتا۔ والدین کی بھرپور توجہ کا نتیجہ چاروں بچوں کے غیر معمولی اعتماد اور تعلیمی میدان میں نمایاں رہنے کی صورت نکلا۔ احباب و اقارب میں کیرول اور محب کی مثالیں دی جاتیں۔ مرد اپنی بیویوں سے کہتے۔ ''محب بہت خوش قسمت ہے جو اسے کیرول جیسی بیوی ملی۔'' عورتیں اپنے شوہروں سے کہتیں۔ ''شوہر ہو تو محب جیسا محبت کرنے اور خیال رکھنے والا ..... کیرول کی جنبشِ ابرو پر ناچتا ہے۔'' شوہر کہتے۔ ''بیوی بھی تو کیرول جیسی خوبصورت، ہنس مکھ، خوش سلیقہ اور شوہر کے اشاروں پر چلنے والی ہو۔'' بیویاں کہتیں۔ ''بیوی کی ہر خواہش پوری کرتا ہے محب۔''

کیرول اور محب کے حلقۂ احباب میں شامل والدین اپنے بچوں کو کیرول اور محب کے بچوں کی مثالیں دیتے نہ تھکتے۔ ''بچے ہوں تو ان جیسے تمیز دار اور ذہین۔''

''سارہ اپنے کالج کی بہترین مقررہ ہے۔''

''معز نے ٹاپ پوزیشن لی ہے اپنے اسکول میں۔''

''منیب پڑھاکو ہونے کے ساتھ گٹارسٹ بھی خوب ہے۔''

''تارا کو دیکھو اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے کہانیوں کی ایک کتاب بھی لکھ ڈالی۔''

''کیرول بتا رہی تھی کہ تارا کی کتاب چھاپنے کے لیے ایک پبلشر نے رابطہ کیا ہے۔'' محب اور کیرول اپنے بچوں کی صلاحیتوں کو پھلتے پھولتے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ فخر محسوس کرتے۔

محب کی مثالی ازدواجی زندگی کے قصے پاکستان میں اس کے بھائی اور دیگر اعزہ و اقارب تک بھی پہنچ کر ایک سے دوسرے تک گردش کرنے لگے۔ محب جی ہی جی میں سوچتا کبھی اس کا بڑا بھائی انگلستان آکر اس کا پُرسکون گھر، باوفا اور گھردار بیوی اور خوبصورت و ذہین بچے دیکھے تو وہ بھائی سے پوچھے۔ ''کہیے اب کیا رائے ہے آپ کی مغرب کی عورت کے بارے میں؟''

بھائی کا تو انگلستان آنا نہ ہو سکا حالانکہ محب نے انہیں بارہا دعوت دی البتہ محب کا ایک عم زاد جس کی بیٹی کی لندن میں مقیم ایک پاکستانی گھرانے میں شادی ہوئی تھی، اپنی اہلیہ کے ہمراہ بیٹی اور اس کے سسرال والوں سے ملنے کے لیے انگلستان آیا تو محب نے بھی انہیں اپنے گھر مدعو کیا۔ کیرول اور بچوں سے مل کر وہ لوگ بہت خوش اور متاثر ہوئے۔ محب کے عم زاد نے جس کا نام محمود تھا، علیحدگی میں محب سے کہا۔ ''ہم تو سمجھتے تھے تمہاری مسز انگریزی لباس پہنتی ہوں گی۔ انگریزی طور طریقے ہوں گے مگر یہ تو ہماری توقعات سے بالکل مختلف نکلیں ..... ملاقات ہونے پر السلام علیکم کہہ کر تمہاری بیوی نے مجھے حیران کر دیا۔''

''کیرول نماز بھی پڑھتی ہے۔روزے بھی رکھتی ہے۔''

''اچھا!''

''ہاں ہاں۔''

''اور کھانا..... لاجواب تھا بھئی..... بریانی، کوفتے، کھیر..... کس کس چیز کی تعریف کروں..... کہاں سے سیکھا تمہاری بیگم نے یہ سب کچھ۔''

''کچھ کتابوں سے کچھ اپنی دوستوں سے۔'' محب نے بتایا۔

''اور گھر بھی کیا خوب سجا رکھا ہے۔''

''سب کیرول کا کمال ہے۔''

''کیرول کیوں کہتے ہو..... مسلمان ہوئی ہے تو اسلامی نام بھی تو رکھا گیا ہوگا۔''

''مجھے کیرول پکارنا ہی اچھا لگتا ہے..... نام میں کیا رکھا ہے، دل مسلمان ہونا چاہیے..... ویسے اسلامی نام غنا رکھا گیا تھا۔''

''غنا بولا کرو۔''

''کوشش کروں گا۔'' محب نے محمود کا دل رکھنے کو کہا۔

محمود کی بیوی، بیٹی، داماد اور ان کے ساتھ آنے والی بیٹی کی ساس بھی کیرول اور بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔

''آپ اگین بھی آنا۔'' مہمانوں کے واپس جاتے ہوئے کیرول نے انہیں انگریزی لب و لہجے سے مغلوب اردو میں دوبارہ آنے کی دعوت دی تو محمود کی بیوی نے کیرول کا ہاتھ گرمجوشی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''یو کم ٹو پاکستان۔''

''شیور..... می ضرور!'' کیرول نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرتے ہوئے دعوت قبول کی۔

''آپ بہت اچھی ہیں بھابی۔'' محمود کی بیوی نے فرطِ مسرت سے کیرول کو اپنے گلے لگا لیا۔

کیرول نے گھر آئے مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے انہیں علیحدہ علیحدہ تحائف بھی دیے۔ محمود کی بیوی کچھ شرمندہ ہو کر بولی۔ ''بھابی ہم تو آپ کے لیے کچھ لائے ہی نہیں۔''

کیرول نے نہایت خوش دلی سے ان کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔ محب کو ترجمان بننا پڑا۔

''اصل میں پہلی ملاقات تھی نا..... سائز اور پسند ناپسند کا اندازہ نہیں تھا۔'' محمود نے بات بنائی۔

''یار! تم لوگوں کا آجانا ہی ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ ہے۔'' محب نے کہا۔

''اب میں جا کر بتاؤں گا سارے خاندان والوں کو کہ محب یوں ہے محب ووں ہے..... جا کر دیکھو محب کو' اللہ نے اسے دنیا میں ہی جنت دے دی ہے..... ہاں یار! بہت خوش ہوا دل تمہارا پُرسکون گھر اور ویل کروم فیملی دیکھ کر۔'' محمود نے رشک سے کہا۔

''سب کیرول کا کمال ہے۔''

''بے شک اخاتونِ خانہ اچھی ہو تو گھر جنت بن جاتا ہے..... تم بہت خوش قسمت ہو۔''

''بڑے بھائی کو ضرور بتانا میری بیوی کے بارے میں۔''

''ہاں ہاں انہیں تو ضرور بتانا ہے کیونکہ فیملی گیدرنگز میں وہ تمہارے بہت قصیدے پڑھتے ہیں۔''

''کیا بھلا؟'' محب کو تجسس ہوا۔

''یہی کہ خاندان چھوڑ کر غیروں بلکہ غیر مذہب میں جا گھسا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں..... تم نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔''

''ہاں ہاں، اب تو میں ڈنکے کی چوٹ پر گواہی دے سکتا ہوں کہ محب غیر مذہب میں نہیں جا گھسا بلکہ اس نے تو وہ کیا ہے جو خاندان میں پہلے کسی نے نہیں کیا..... کس نے کیا ہے کسی غیر مسلم کو مسلمان..... یار! سچ بہت خوش ہوا ہوں میں تمہارے بیوی بچوں سے مل کر۔''

''شکریہ محمود۔'' محب نے کہا۔

☆☆☆

محمود اور اس کی بیوی کا محب کے گھر آنا انگلستان آنے والے محب کے رشتے داروں کے لیے اس کے گھر کا دروازہ کھول گیا۔ بہت نہیں، چار چھ افراد ہی آئے مگر آئے ضرور۔ جو آتا یہی کہتا۔ ''محمود نے تمہارے بال بچوں کی اتنی تعریف کی کہ ہم نے سوچا انگلینڈ آئے ہیں تو تمہارے بال بچوں سے ضرور مل کر جائیں۔'' کیرول ہر مہمان کو خاطر خواہ احترام دیتی اور آنے والوں کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔

شکیل جو محب کا پھوپی زاد بھائی تھا اور تقریباً اسی کا ہم عمر بھی، نہایت مین میکھ نکالنے کی فطرت رکھتا تھا اور اسی باعث اب تک کنوارا تھا۔ کہیں اسے لڑکی پسند نہ آتی، کہیں لڑکی کے گھر والے۔ کسی گھرانے کی معاشرتی حیثیت مطمئن نہ کرتی تو کسی لڑکی کے باپ بھائی معاشی اعتبار سے ڈھیلے لگتے۔ شکیل کی ماں بیسیوں اس کے لیے لڑکیاں دیکھ دیکھ کر اتنی بیزار ہو گئی تھیں کہ انہوں نے شکیل کی شادی کے معاملے سے گویا ہاتھ ہی اٹھا لیا تھا۔ شکیل کی شادی کا معاملہ کئی برس

UUNOVELS.COM

سے سرد خانے میں پڑا تھا اور وہ خاندان کا سینئر ترین کنوارا قرار پا چکا تھا۔

شکیل بھی انگلستان کی سیر و تفریح کو آنکلا۔ محب سے فون پر رابطہ کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ محب نے گھر آنے کی دعوت دی۔ شکیل آیا تو آٹھ دس دن محب کے ہاں مہمان رہا۔ ان آٹھ دس دنوں میں محب نے اسے شادی کر لینے کی بار ہا ترغیب دی۔ وہ سنتا کبھی مسکرانے پر اکتفا کرتا، کبھی کہتا۔ ''مطلب کا رشتہ تو ملے۔''

''بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے جتنا چھانو اتنا ہی کر کرا لگتا ہے۔''

ایک روز شکیل بولا۔ ''شادی کر کے ملتا کیا ہے۔''

''گھر، گھر کا سکون، خیال رکھنے کو بیوی اور دل بہلانے کو بچے۔'' محب نے ذاتی تجربے کے نتائج بیان کیے۔

شکیل نے سر اثبات میں ہلایا اور بولا۔ ''ٹھیک کہتے ہو۔''

شکیل واپس جانے لگا تو اس نے محبت سے بظاہر مذاقاً کہا۔ ''پچھلے آٹھ دس دنوں میں تم نے مجھے شادی کا اتنی مرتبہ مشورہ دیا ہے کہ میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں شادی کر ہی لوں۔''

''ارے واہ! دل خوش کر دیا..... نیک کام میں دیر مت کرنا۔'' محب پھڑک کر بولا۔

''اپنا کان ادھر لاؤ۔'' شکیل مسکراتے ہوئے بولا۔

محب نے اپنا کان اس کے منہ کے نزدیک کر دیا۔

''بھابی جیسا ایک پیس اور تلاش کر لو..... دیر نہیں کروں گا۔'' شکیل اپنی بات پر آپ منہ الال کر زور سے یوں ہنسا جیسے اس نے یہ بات مذاقاً کہی ہو لیکن اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ اس مذاق میں حقیقت بھی تھی۔

☆☆☆

برسوں بعد محب کو اپنے تمام رشتے داروں سے ملنے کے لیے وطن جانے کی لگی تو کیرول اور چاروں بچوں نے اس کی خواہش کو غیر معمولی پذیرائی دی۔ بچے اس سے نہایت اشتیاق سے اس ان دیکھی سرزمین کے بارے میں سوال پہ سوال کرنے لگے، جہاں وہ جانے والے تھے۔

''ڈیڈی! پاکستان کیسا ہے؟''

''بہت اچھا میرے بچے۔''

''وہاں سوئمنگ پولز ہوتے ہیں؟'' تیراکی کے شوقین منیب نے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔''

''ڈیڈی وہاں گھر کیسے ہوتے ہیں؟''

''جیسے یہاں ہوتے ہیں۔''

''اور وہاں لوگ کیسے ہوتے ہیں؟''

''سادہ، ملنسار، ہر حال میں اللہ کو یاد رکھنے اور اس کا شکر ادا کرنے والے۔''

''ڈیڈی سی سائڈز ہیں وہاں؟''

''بالکل ہیں۔''

اس سفر کی تیاریوں کے دوران اچانک ہی عمرہ کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب جانے کا پروگرام بھی بن گیا۔ محب بیوی بچوں کو خانہ خدا اور مسجد نبویؐ میں حاضری دلواتا ہوا انہیں پاکستان لے گیا۔ بھائی کے گھر قیام ہوا۔ اعزہ و اقارب نہایت اشتیاق سے محب کی بیوی اور بچوں کو دیکھنے کے لیے آئے۔ کیرول کو دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی جاتیں کہ اتنی ڈھکی چھپی تو اکثر عام پاکستانی عورتیں بھی نہیں رہتیں۔ بھائی نے محب سے کہا۔ ''میاں! کوئی نیکی پسند آ گئی تمہاری اللہ میاں کو ورنہ گوریاں کیا جانیں حجاب اور کیا جانیں شرم و حیا۔''

''ان پری ڈکٹیبل ہوتی ہیں بھائی..... اپنے عمل سے آپ کو کسی بھی وقت حیران کر سکتی ہیں۔ کیرول اتنی اچھی عورت ثابت ہو گی خود میرے اپنے گمان میں بھی نہ تھا۔''

محب نے بھائی سے اپنا برسوں پرانا حساب بے باق کیا۔

دو ہفتے پاکستان میں قیام کے دوران کیرول اور چاروں بچے وی آئی پی بنے رہے۔ محب انہیں بہت سے قابلِ دید مقامات کی سیر و تفریح کے لیے لے گیا۔ انگلستان واپسی کے بعد بھی دنوں گھر میں پاکستان کا مختلف حوالوں سے تذکرہ ہوتا رہا۔

یہ بھی انسانی فطرت کی بوالعجبی ہے کہ جو چیز دسترس میں ہو وہ غیر اہم اور جو دسترس سے دور ہو، وہ اہم لگتی ہے، سو محب کے بچے..... جو پاکستان میں لوگوں کی جانب سے غیر معمولی پذیرائی اور حسین قدرتی نظاروں سے مالا مال علاقوں کی سیر و تفریح کے بعد پاکستان سے خاصے سرشار واپس ہوئے تھے، محب سے کہتے۔ ''ڈیڈی! آپ کو پاکستان میں سیٹ ہونا چاہیے تھا۔''

''کیوں بھئی؟'' محب پوچھتا اور اس کے ایک سوال کے متعدد جوابات ملتے۔

''کیونکہ وہاں آپ کے اتنے سارے رشتے دار ہیں۔''

''کیونکہ آپ اتنے کوالیفائیڈ ہیں آپ کو وہاں کوئی بھی اعلیٰ پوزیشن مل جاتی۔''

''کیونکہ پاکستان میں لوگ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

UUNOVELS.COM

''کیونکہ پاکستان میں مہنگائی نہیں۔''

ان متعدد جوابات کے مقابل محب صرف ایک جواز پیش کرتا۔

''بھئی تمہاری ماں سے محبت ہوگئی تھی مجھے اور محبت کے لیے تو آدمی تخت وتاج بھی چھوڑ دیتا ہے۔''

''مم! کیا آپ کو بھی ڈیڈی سے پیار ہوگیا تھا؟'' بچے بے باکی سے کیرول کو چھیڑتے۔

''جبھی تو شادی کی میں نے تمہارے باپ سے۔'' کیرول مسکراتے ہوئے کہتی۔

''اب ہم آپ دونوں سے پیار کرتے ہیں۔'' بچے وفورِ محبت سے دونوں کے گلے میں بانہیں حمائل کردیتے، چمٹ جاتے، چومتے اور بانہوں میں لے کر نچادیتے۔

زندگی بہت خوبصورت تھی ان دنوں۔

☆☆☆

پھر زندگی کا حسن ماند پڑنا شروع ہوا۔

پہلے سارہ گھر سے گئی۔ حصولِ تعلیم اور ملازمت کے ساتھ اس نے خودمختار زندگی گزارنے کے لیے علیٰحدہ فلیٹ لے لیا۔

''اتنا بڑا گھر تو ہے پھر تمہیں علیٰحدہ رہنے کی کیا ضرورت؟'' کیرول نے اس کے جانے سے پہلے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''مم! میں خودمختار زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہاں بھی تم پر کوئی جبر تو نہیں سارہ۔''

''ہاں..... مگر میں اپنے دوستوں کی طرح انڈی پینڈنٹ رہنا چاہتی ہوں..... آپ بھی تو اپنی نوجوانی میں اپنے گھر والوں سے علیٰحدہ ہی رہا کرتی تھیں۔''

سارہ کے جانے کے بعد کیرول دنوں اداس رہی۔ اٹھتے بیٹھتے اسے یاد کرتی۔ اس کی یاد آنسو بن کر اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی رہتی۔ محب اسے دلاسا دیتا۔ ''وہ گھر ہی سے تو گئی ہے، اس شہر سے تو نہیں۔ پچھلے دو ویک اینڈز اس نے ہمارے ہی ساتھ گزارے، پھر آجائے گی۔''

''محب! رات کو اس کا بستر خالی دیکھ کر میرا دل بہت دکھتا ہے۔'' کیرول رونے لگتی۔ محب اسے گلے لگا کر تسلی دینے لگتا۔

ابھی سارہ کے جانے کا زخم ہرا ہی تھا کہ معز نے اپنی ایک دوست کے ساتھ رہنے کا طبل بجادیا۔

''لڑکے اور لڑکی کا شادی کیے بغیر ساتھ رہنا ناجائز اور حرام تعلق ہوتا ہے بیٹے۔'' محب نے اسے سمجھانا چاہا۔

''اوہ ڈیڈی آپ کس زمانے کی بات کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھے بغیر شادی کرلینا بے وقوفی ہوتی ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ساتھ رہنا ضروری ہوتا ہے۔'' معز بولا۔

''میں اور تمہاری ماں شادی سے پہلے ساتھ رہے تھے کیا؟''

''وہ اور زمانہ تھا۔''

''زمانہ اب بھی زمانہ ہی ہے..... تم لوگ بدل گئے ہو۔''

''بہرحال۔'' معز نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ''میں کرسٹینا کے ساتھ رہنے جارہا ہوں۔''

معز بھی گھر سے چلا گیا۔

منیب نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لندن میں پڑاؤ ڈال دیا۔

تارا کو اپنے ایک مصری ہم جماعت سے محبت ہوگئی اور اس نے دورانِ تعلیم ہی شادی کرلی۔

گھر میں محب اور کیرول رہ گئے۔

محب صبح یونیورسٹی چلا جاتا۔ درس وتدریس سے وابستگی نے اسے دماغی اور ذہنی طور پر نہایت فعال رکھا ہوا تھا۔ یونیورسٹی سے اس کی واپسی عموماً سہ پہر کو ہوتی۔ کبھی کبھی شام بھی ہوجاتی۔

کیرول دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی۔ کبھی سودا سلف خریدنے چلی جاتی، کبھی کسی دوست سے ملنے اس کے گھر۔ کبھی وقت گزاری کے لیے ونڈو شاپنگ کو نکل جاتی، کبھی گھر کی غیر ضروری چیزیں سمیٹ کر کسی رفاہی ادارے میں جمع کرانے جا پہنچتی۔ ہفتے کے ابتدائی چار دن بڑی مشکل سے کٹتے۔ گھر میں اکیلاپن اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ طاقوں میں سجی اپنے بچوں کی تصویروں کو وہ کئی کئی مرتبہ جھاڑتی، پونچھتی۔ پانچویں دن وہ ویک اینڈ پر بچوں کی متوقع آمد پر ان کی پسندیدہ اشیائے خورونوش کی تیاری کے ساتھ ان کے اٹھنے بیٹھنے میں ہر سہولت کا اہتمام کرنے لگتی۔ سارہ کو محب کی طرح چٹ پٹے کھانے پسند تھے۔ معز میٹھی چیزوں سے رغبت رکھتا۔ منیب کو بس فش اینڈ چپس ہی کافی ہوتے۔ تارا سی فوڈز کی شیدائی تھی۔ معز کی گرل فرینڈ چائنیز فوڈ شوق سے کھاتی۔ تارا کا شوہر خاصا تک چڑھا تھا، اچھی سے اچھی چیز میں بھی کوئی نہ کوئی خامی نکال دیتا۔ کیرول کو ہر ایک کی انفرادی پسند ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا۔ ویک اینڈ کی تیاری ایک روز پہلے ہی شروع

UUNOVELS.COM

ہوجاتی۔ کیرول کچھ چیزیں ''ہاف ڈن'' کرکے رکھ لیتی۔ کچھ وقت کے وقت تیار کرتی۔ بچوں کے انتظار کا موسم جمعے سے ہی شروع ہوجاتا۔ ہفتہ اور اتوار کو کیرول کے کان گھر کے دروازے پر لگی گھنٹی پر لگے رہتے۔ کبھی چاروں آجاتے کبھی سارہ کو اس کی کوئی مصروفیت آنے سے روک لیتی۔ کبھی معز کی گرل فرینڈ کا موڈ نہ بنتا، کبھی منیب کو ہفتہ بھر کام کے دنوں کی تکان زیادہ ہوتی، کبھی اسے کہیں اور جانا ہوتا۔ کبھی تارا کے ہاں مہمان آرہے ہوتے، کبھی تارا کا شوہر ویک اینڈ اپنے گھر ہی میں گزارنا چاہتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ چاروں میں سے کوئی نہ آپاتا۔ کیرول کی ساری تیاری دھری رہ جاتی۔ بچوں کی پسند کے ہاف ڈن کھانے اسے اور محب کو مل جل کر بھگتانے پڑتے۔ جو بچتے انہیں مضرِ صحت ہوجانے کے خدشے سے ڈسٹ بن میں پھینکنا پڑتا۔

زندگی بہت بدل گئی تھی۔ جو بچے گزری کل کیرول اور محب کی توجہ کے طلب گار رہا کرتے تھے، کیرول ان کی توجہ کی طلب گار بن گئی تھی۔ محب کو اس کے تدریسی اور تحقیقی کاموں ہی سے فرصت نہ تھی۔ ویک اینڈ پر بچے آجاتے تو وہ خوش ہوجاتا۔ نہ آتے تو کیرول کی طرح دلگیر نہ ہوتا۔

''کوئی مجبوری ہوگی کیرول۔'' وہ کیرول کا دل رکھنے کو کہتا۔

''پورا ہفتہ انتظار کرتی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''ایک ایک دن گن گن کر گزارتی ہوں۔''

''جانتا ہوں۔''

''کیلنڈر پر نظریں لگی رہتی ہیں میری..... آج بدھ ہے کل جمعرات پھر جمعہ۔'' وہ نہایت مغموم سی ہوجاتی۔

''میری جان! زندگی بھی ہفتے کے دنوں کی طرح بدلتی چلی جاتی ہے..... آغازِ ہفتہ پوری سرگرمی سے ابتدا پھر بتدریج ٹیمپوسٹ پڑنے لگتا ہے۔ ہفتے کے چوتھے دن ویک اینڈ کا انتظار شروع ہوجاتا ہے۔ پانچویں دن سارے کام لپیٹنے کی جلدی اور ویک اینڈ کی سرخوشی کا احساس دل میں پاؤں پسارنے لگتا ہے۔ پھر آرام اور سہولت کے دو دن جو کلیتاً آپ کے اپنے ہوتے ہیں، اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے۔''

''معز نہیں آیا اس بار۔''

''مصروف ہوگا۔''

''وہ چڑیل نہیں چاہتی کہ معز اپنے ماں باپ کے ساتھ وقت گزارے۔'' کیرول گلہ کرتی۔

''عورت ہونے کا ثبوت دے رہی ہو۔'' محب مسکراتا۔

''کیا مطلب؟''

''اتنی اچھی بیوی..... ایسی مثالی ماں..... لیکن بیٹے کی گرل فرینڈ کے لیے تم روایتی ساسوں والا لب و لہجہ اختیار کرلیتی ہو۔''

''بری لگتی ہے وہ مجھے۔''

''ہاں کیونکہ تمہارے بیٹے کی ذات میں تمہاری حصے دار جو بن گئی ہے وہ۔''

''وہ معز کے لائق تھی ہی نہیں..... پتا نہیں معز کو اس میں کیا نظر آیا۔''

''جو تم میں مجھے نظر آیا تھا۔''

''کیا مطلب!'' کیرول چونک کر اسے ابرو چڑھاتے ہوئے دیکھتی۔

''کویو ڈارلنگ۔'' محب کہتا۔

''کویو۔'' کیرول اپنا سر محب کے شانے پر رکھ دیتی۔ بچوں سے کیرول کے براہِ راست گلے شکوے بھی ہوتے۔

''سارہ! تو آئی کیوں نہیں۔''

''مم! میری دوست کی برتھ ڈے تھی۔''

''ماں باپ کا تجھے خیال نہیں۔''

''مم! ضروری تھا۔ وہ میرا برتھ ڈے کبھی مس نہیں کرتی۔''

''میں نے رات تک تیرا انتظار کیا۔''

''سوری مم! بہت دیر ہوگئی تھی۔''

''تو کیا ہوا، دیر ہی سے آجاتی..... یہیں سو جاتی۔''

''مجھے اپنے بیڈ پر ہی نیند آتی ہے۔''

''یہاں تو جیسے تو کبھی سوئی ہی نہیں۔''

''اگلے ویک اینڈ ضرور آؤں گی مم..... تم میرے لیے کوئی تیز مسالے دار چیز بنا کر رکھنا۔''

''مجھے کیا ہوا تھا منیب..... تو کیوں نہیں آیا؟''

''مم! کوئی ضروری کام تھا۔''

''ماں باپ سے ملنے سے بھی زیادہ ضروری!''

''تمہارے گھر تک لمبا سفر تھکا دیتا ہے مم۔''

''تیرا تو جیسے یہ گھر رہا ہی نہیں کبھی۔''

''تم پہلے تو ایسی نہیں تھیں مم۔''

''کیسی؟''

''چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلد خفا ہوجانے اور لفظوں پر اپنے بچوں کی پکڑ کرنے والی۔''

''پاگل ہوگئی ہوں میں۔'' کیرول بُرا مان جاتی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' منیب شرمندہ ہوکر کہتا۔

UUNOVELS.COM

''میں تیرا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

''اوہ مم! آپ اتنی زود رنج کیوں ہوگئی ہیں۔''

''میں نے تم بہن بھائیوں کو اپنی زندگی کے سنہری دن دیے۔'' کیرول جتاتی۔

''سب مائیں اسی طرح کرتی ہیں۔''

''اولاد کا بھی تو کچھ فرض ہوتا ہے۔''

''آپ کو پتا ہے، آپ کا مسئلہ کیا ہے۔''

''کیا؟''

''آپ نسلاً تو انگریز ہیں اور اس معاشرے میں بچوں کا اپنے ماں باپ سے علیحدہ ہوکر زندگی گزارنا کوئی عجوبہ امر نہیں لیکن چونکہ آپ نے ایک ایسے معاشرے کے آدمی سے شادی کی جہاں نسل در نسل ماں باپ اور اولاد کا اکٹھے رہنے کا چلن ہے تو ساری زندگی اس شخص کے ساتھ گزار کر آپ کی سوچ بھی بدل گئی ہے۔ آپ چاہتی ہیں آپ کی اولاد آپ کی ذات کے گرد ہی گھومتی رہے..... بس..... مم! آپ انگلستان میں رہ رہی ہو، یہ ڈیڈی کا پاکستان نہیں۔''

''تم مجھے ایک مختلف النسل آدمی سے شادی کا طعنہ دے رہے ہو؟''

''ایسی بات نہیں۔''

''یہی بات ہے۔'' کیرول اپنے خیال کی درستگی پر اٹک جاتی۔

''مجھے آپ دونوں سے پیار ہے مم..... آپ سے بھی ڈیڈی سے بھی۔''

''جیسے اس ہفتے نہیں آئے ہو اگلے ہفتے بھی مت آنا۔'' ایک ویک اینڈ منیب کے نہ آنے پر کیرول ناراض ہوکر بولی۔

''کیوں نہ آؤں..... فش اینڈ چپس تیار رکھنا میرے لیے۔''

''وہ تو میں نے اس دفعہ بھی تیار رکھے تھے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا..... اتوار کی شب گیارہ بجے تمہارے ڈیڈی نے فرمائش داغ دی کہ منیب تو آیا نہیں۔ اس کے فش اینڈ چپس مجھے تل دو۔''

''اور آپ کو تلنے پڑے؟''

''ظاہر ہے۔''

''ہاہ!'' منیب زور سے ہنسا پھر بولا۔ ''چچ چچ! میری شوہر پرست ماں!''

''ترس کھا رہے ہو ماں پر!''

''تو اور کیا کروں مم۔''

''ویک اینڈ پر راہ تکتی ہوں تمہاری..... تھوڑی دیر ہی کو آجایا کرو۔'' کیرول نرم پڑ گئی۔

''نہ تکا کریں راہ۔''

''کیوں؟''

''زندگی بدلتی ہے مم ..... وقت اور حالات کے ساتھ ہماری ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ آپ کے ہاتھ کے چپس اینڈ فش مجھے آج بھی اتنے ہی مرغوب ہیں، جتنے اسکول کے زمانے میں ہوا کرتے تھے مگر اب میری پیشہ ورانہ مصروفیات، میری ذاتی زندگی میری پہلی ترجیح بن گئی ہیں۔''

''مگر میری پہلی ترجیح تو آج بھی تمہارے ڈیڈی، تم اور تمہارے بہن بھائی ہی ہیں۔''

''مم پلیز! سمجھنے کی کوشش کریں۔'' منیب کے لہجے میں بیزاری تھی۔ ''آپ کے بچوں کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ وہ آپ کی خواہشوں کے پنجرے میں قید نہیں رہ سکتے۔''

کیرول کو صدمہ ہوا، محب سے شادی کے بعد سے اب تک اس نے شوہر، اولاد اور گھر کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ خود کو بدل ڈالا تھا۔ اولاد کی دن رات سیوا کی تھی۔ ان کا مستقبل بنانے کے لیے اپنی خواہشیں، آرام، راحت سب کچھ تج دیا تھا اور آج اسی اولاد میں سے ایک بیٹا کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی خواہشوں کے پنجرے میں قید نہیں رہ سکتا تھا۔ بجا کہ اس کی اولاد اور وہ خود بھی اس معاشرے کی پروردہ تھی جہاں ہر فرد اپنی مرضی کی زندگی جینا چاہتا ہے مگر اولاد کے معاملے میں وہ اتنی ہی جذباتی اور زود رنج تھی جتنی دنیا بھر کی مائیں!

☆☆☆

موسمِ سرما اپنے عروج پر تھا۔ آغازِ ہفتہ کیرول نے محب کو بتایا کہ اس کی ایک پرانی دوست کیٹ جو شادی کے بعد مسز لارنس کہلاتی تھی، شدید بیمار تھی اور وہ اس کی عیادت کے لیے فوکسٹن جانا چاہتی تھی۔ دونوں ماضی میں ایک ہی بیلے طائفہ کی رکن رہی تھیں۔ کیرول چاہتی تھی محب یونیورسٹی سے چھٹی لے کر اسے فوکسٹن لے جائے مگر محب نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں ایک سیمینار کے باعث نہ جاسکے گا۔

''کب ہے سیمینار؟'' کیرول نے پوچھا۔

''لگاتار تین دن۔''

''کیٹ کی بیٹی بتا رہی تھی، وہ لب مرگ ہے۔ معالجین کا کہنا ہے وہ کسی بھی وقت جاسکتی ہے۔ کیٹ ہمارے بیلے طائفہ کی ایک خوش خصلت اور پُرادا رکن ہوا

کرتی تھی۔ میں اس سے ضرور ملنا چاہتی ہوں — تم سیمینار میں اپنی شرکت ملتوی نہیں کر سکتے؟"

"نہیں — کیونکہ مجھے اپنی یونیورسٹی کی نمائندگی کرنی ہے — مجبوری نہ ہوتی تو میں ضرور چلتا تمہارے ساتھ — بچوں میں سے کسی کو کہو، وہ تمہیں لے جائے۔" محب بولا۔

"ان کی اپنی مصروفیات ہوں گی — کوئی بات نہیں — میں خود چلی جاؤں گی۔"

"کیسے؟"

"کیسے بھی — میں نہیں چاہتی کہ کیٹ چلی جائے اور مجھے اس کی بیماری کی خبر ملنے کے باوجود اس سے نہ مل سکنے کا قلق رہے۔"

"تین دن ٹھہر جاؤ پھر اکٹھے چلیں گے۔"

"میں ایک دن بھی انتظار نہیں کرنا چاہتی۔"

"میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ یہاں سے فوکسٹن تک خاصا سفر ہے اور تمہیں خود بھی دو دن پہلے غور رہا ہے۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ ابھی نہیں جاتی میں۔"

"لو یو کیرول۔"

"می ٹو محب۔"

کیرول اکیلی ہی اپنی دوست کی عیادت کو چلی گئی۔ ہمیشہ کی طرح گھر کے داخلی دروازے کی ایک چابی کیرول کے پاس تھی دوسری محب کے پاس۔ محب شام ڈھلے گھر واپس لوٹا تو کیرول اس وقت تک واپس نہ آئی تھی۔ موبائل فون کا استعمال ان دنوں ترقی یافتہ ممالک میں بھی ویسا عام نہ ہوا تھا جیسا آج ترقی پذیر اور غریب ممالک میں بھی عام ہے۔ ورنہ شاید محب صبح کیرول کے جانے کے بعد سے بشرطِ اپنی فراغت اس سے رابطے میں ضرور رہا ہوتا۔ اسے کیرول کی واپسی کا انتظار ہی کرنا تھا۔

کیرول رات کو واپس لوٹی۔ تکان اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ محب نے اسے بانہوں میں لیا تو زندگی میں پہلی بار اسے کیرول کے انداز میں حدت کے بجائے سرد مہری کا احساس ہوا۔ اس نے حدت کے اس فقدان کو لبِ مرگ دوست کو زندگی سے موت کی جانب بڑھتے دیکھنے کا اثر جانا۔

"کیسی ہے تمہاری دوست؟" محب نے پوچھا۔

کیرول نے مایوسی اور پژمردگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"میں تمہاری وجہ سے پریشان تھا۔"

"ضرورت تو نہیں تھی۔"

"تم میری زندگی ہو کیرول۔" محب نے اسے دوبارہ اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

"کچھ چاہیے تمہیں؟" کیرول نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"سستا لو پھر دیر۔"

"پھر کافی؟"

محب دھیرے سے مسکرایا۔ "جانِ من! ہم دونوں کی کامیاب خوشگوار ازدواجی زندگی کا بھید اسی ذہنی ہم آہنگی میں تو مضمر ہے کہ ہم بنا کہے بھی ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ لیتے ہیں۔"

"میں بے وقوف تھی۔" کیرول نے کہا۔

"کیا مطلب؟" محب چونکا۔

کیرول اس کی بانہوں کا حصار توڑ کر کچھ کہے بنا کمرے سے نکل گئی۔ محب اس کے جسے کی بازگشت میں الجھا چھوڑے حیران رہا۔ پھر کیرول کے اس جملے کے ذائقے کیرول کے تبدیل سرد رویے اور کیٹ کی علالت سے ملتا کیرول کے ہاتھ کی بنی کافی گرم کرنے کچن کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

کیرول جس خاموشی سے گئی تھی، اسی خاموشی سے کمرے میں واپس لوٹی اور کافی مگ محب کو تھمانے کے بعد آتش دان کے نزدیک پڑی راکنگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا کر اس نے گہری گہری ایک گہری سانس بھرتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور دھیرے دھیرے کرسی پر آگے پیچھے جھولنے لگی۔

"تھک گئی ہو؟" محب نے کیرول پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے آنکھیں کھولے بنا جواب دیا۔

"اسپتال میں تمہاری دوست کے پاس اس کا کوئی قریبی ہے؟"

"بیٹی —"

"کیٹ نے تم سے بات کی؟"

"ہاں۔"

"خوش تو ہوئی ہوگی تمہارے جانے سے۔"

"وہ صرف تکلیف کا اظہار کر سکتی ہے۔ خوشی اور غم اس کے لیے بے معنی ہو چکے ہیں۔"

"شدید بیماری میں یہی ہوتا ہے۔"

کیرول راکنگ چیئر پر زور زور سے جھولنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے محب کو اندازہ ہوا کہ وہ ہیجانی کیفیت سے دوچار تھی۔ محب نے اس کی کیفیت کو اس کی دوست کی علالت کے غم و فکر پر محمول کیا۔

UUNOVELS.COM

☆☆☆

دو دن ہی گزرے تھے کہ کیرول کو کیٹ کے انتقال کی خبر ملی۔ محب ان دو دنوں میں یونیورسٹی میں ہونے والے سیمینار میں مصروف رہا۔ کیٹ کے انتقال کی خبر سن کر اس نے کیرول سے کہا۔ ''اچھا ہوا جو تم اس سے مل آئی تھیں۔''

''پتا نہیں اچھا ہوا یا نہیں۔'' وہ جو کیٹ سے مل کر آنے کے بعد چپ چپ سی تھی، کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

''تدفین کب ہے؟''

''اتوار کو۔''

''جاؤ گی؟''

''تمہارے بچوں نے جو آنا ہے۔''

''صرف میرے تو نہیں..... تمہارے بھی تو ہیں۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔

جمعے کی شام کیرول حسب معمول ہفتہ وار سودا سلف خرید کر لائی اور اس نے بچوں کی پسند کی چیزیں تیار کر کے فریج میں رکھنا شروع کر دیں۔ ہفتے کو دن چڑھے سارہ کا فون آگیا، وہ بری طرح کھانس رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ فلو ہونے کے باعث وہ اس ویک اینڈ پر ان دونوں سے ملنے نہ آسکے گی۔ منیب کو کسی دوست کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ معز کی گرل فرینڈ کا کتا اسپتال میں داخل تھا۔ معز اور اس کی گرل فرینڈ اس کی وجہ سے پریشان تھے۔ تارا کا میاں اپنی ماں سے ملنے مصر جا رہا تھا۔ تارا کو اسے ائرپورٹ چھوڑنا تھا۔ منیب اور تارا دونوں نے اتوار کو آنے کی امید تو دلائی مگر دونوں میں سے کوئی اتوار کو بھی نہ آسکے۔

''اس سے تو بہتر تھا ہم کیٹ کی تدفین میں چلے جاتے۔'' شام کو محب نے کیرول سے کہا۔ وہ اس وقت گرم اونی شال اپنے کندھوں کے گرد لپیٹے کسی سوچ میں گم بیٹھی تھی۔

''یہ بھی کوئی زندگی ہے محب۔'' اس نے کہا۔

محب سمجھ گیا کہ وہ بچوں کے نہ آنے پر اداس ہو رہی تھی۔ اس کے عقب میں آکر اس کے شانوں کے گرد اپنی بانہوں کا حصار باندھتے ہوئے وہ جھک کر نہایت محبت سے بولا۔ ''کیوں؟ کیا ہوا زندگی کو؟''

''پانچ دن انتظار کرو اور چھٹے دن وہ فون کر کے کہہ دیں کہ ہم فلاں سبب سے نہیں آسکتے۔''

''جان! ہمیشہ ہی تو ایسا نہیں ہوتا..... محض اتفاق ہے کہ اس ہفتے چاروں میں سے کوئی بھی نہیں آسکا۔''

''کبھی کبھی بھی کیوں!'' اس نے تڑپ کر محب کی جانب دیکھا۔ ''پانچ دن میں ان کے انتظار میں گزارتی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں..... میں جانتا ہوں..... لیکن ان کی اپنی مصروفیات بھی تو ہیں۔'' محب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میری بھی تو ہو سکتی تھیں۔'' کیرول گھائل لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے محب کے چہرے پر سے اپنی نظریں ہٹالیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ان کی خاطر میں نے اپنی شناخت کھو دی..... خود کو مٹا ڈالا۔''

''وہم ہے تمہارا کہ تم نے اپنی شناخت کھو دی..... تم چار خوبصورت اور جوان بچوں کی ماں ہو کیرول..... دیکھو تو کتنے اچھے اور سعادت مند ہیں تمہارے بچے..... یہاں تو اولاد برسوں پلٹ کر ماں باپ کی خیر خبر نہیں لیتی..... ہمارے چاروں بچے اختتام ہفتہ پر اکثر ہمارے پاس ہوتے ہیں اور جب بھی ان میں سے کوئی کسی ذاتی سبب سے ہمارے پاس آنے سے قاصر ہو تو وہ ہمیں آگاہ کرتا ہے، معذرت چاہتا ہے۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کیرول کہ ہمارے بچے بہت اچھے، بہت سعادت مند ہیں۔ ہمارا خیال رکھتے ہیں اور یہ بلاشبہ تمہاری تربیت کا اثر ہے۔''

''میں اس زندگی سے اکتا چکی ہوں۔'' کیرول نے بیزاری سے کہا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ اپنی دوست کیٹ کی عیادت کر کے آنے کے بعد سے تم چپ چپ، مغموم اور الجھی الجھی ہو..... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زندگی سے بھرپور رشتے داروں اور دوستوں کو بستر مرگ پر پڑے دیکھ کر اچھا بھلا انسان یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے..... تمہارے ساتھ بھی شاید یہی ہوا ہے۔ اپنی دوست کو لب مرگ دیکھ کر تم بھی یاسیت میں مبتلا ہو گئی ہو۔ اس کیفیت سے خود کو نکالو۔''

کیرول اپنی جگہ سے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے روبرو جا کر اپنے بالوں کو الٹ پلٹ کر آئینے میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں یاد ہے محب میں کتنی خوبصورت ہوا کرتی تھی۔''

محب اس کے عقب میں آکھڑا ہوا اور آئینے میں اس کے عکس کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اب بھی حسین ہو کیرول!''

وہ یکبارگی تڑپ کر پلٹی اور محب کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جھوٹی تسلی مت دو مجھے۔'' محب اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

''میں وہ نہیں رہی جو تھی۔'' کیرول جارحانہ لہجے میں بولی پھر اس کے لہجے میں دل گرفتگی حلول کر گئی۔ ''اس روز

جب میں کیٹ کی عیادت کے لیے گئی تو اسپتال میں میری ملاقات مسٹر فریڈ سے ہوگئی۔ وہ بھی کیٹ کی عیادت کے لیے آئے ہوئے تھے۔"

"مسٹر فریڈ کون؟" محب چونکا۔

"مسٹر فریڈ ہمارے بیلے طائفہ کے منیجر ہوا کرتے تھے۔"

"آں ہاں۔"

"مسٹر فریڈ نے مجھے دیکھا تو شاکڈ رہ گئے۔"

"کیوں؟"

"میں اپنے طائفہ کی سب سے خوبصورت اور نازک اندام لڑکی ہوا کرتی تھی۔ کیٹ سے تو ان کا ملنا جلنا رہا تھا مگر میں برسوں بعد مسٹر فریڈ سے ملی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو کہا لڑکی تم نے اپنا کیا حشر کرلیا ہے۔"

"انہوں نے تمہیں لڑکی کہا!" محب دھیرے سے مسکرایا۔

"ہاں۔"

"بتاتیں انہیں کہ تم چار جوان بچوں کی ماں ہو۔"

"انہیں کیٹ کی زبانی معلوم تھا..... کیٹ سے تو میری کبھی کبھار فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔" کیرول نے توقف کیا پھر پلٹ کر محب کے روبرو ہوگئی اور دھیمے لہجے میں بولی۔ "ہمارے طائفہ میں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی..... گلوریا..... بہت عام سی لڑکی تھی..... میرا مطلب ہے کچھ خاص خوبصورت نہ تھی..... میں اپنے طائفہ کی مرکزی رقاصاؤں میں شامل تھی..... مجھ سے گلوریا کا کوئی مقابلہ نہ تھا مگر مسٹر فریڈ بتا رہے تھے..... گلوریا فرانس چلی گئی تھی۔ وہاں اس نے صفِ اول کے ایک بیلے رقاص کی سرپرستی حاصل کی اور بیلے رقاصہ کی حیثیت سے خاصا نام کمایا۔ دنیا بھر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرچکی ہے۔ مسٹر فریڈ بتا رہے تھے، بارہا اس نے لندن میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ چند ماہ پیشتر بھی اپنے طائفہ کے ساتھ لندن آئی تھی۔ مسٹر فریڈ کہہ رہے تھے انہیں جب بھی اس کی آمد کی خبر ملتی ہے، اس کا شو دیکھنے ضرور جاتے ہیں۔ بقول مسٹر فریڈ گلوریا جب رقصاں ہوتی ہے تو دیکھنے والے مبہوت ہوجاتے ہیں۔ دلوں کی دھڑکنیں تھم جاتی ہیں۔ پچاس سال کی عمر سے تجاوز کرجانے کے باوجود وہ ایک نازک اندام اور سبک خرام دوشیزہ نظر آتی ہے۔ رقص کرتے ہوئے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دیتی ہے جس کی نظریں یوں اوپر لگی ہوتی ہیں جیسے ستاروں کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہو..... مسٹر فریڈ نہایت فخر محسوس کرتے ہیں کہ گلوریا کبھی ان کے طائفہ کا حصہ ہوا کرتی تھی۔"

محب کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ "تم نے مسٹر فریڈ کو متنبہ کردینا تھا کہ گلوریا کے شوہر کو پتا چل گیا کہ وہ اس کی بیوی کے اتنے بڑے مداح ہیں تو وہ انہیں اپنا رقیب باور کرلے گا۔"

"گلوریا نے فشنس برقرار رکھنے کی خاطر شادی نہیں کی..... مسٹر فریڈ کہہ رہے تھے..... گلوریا خوش قسمت بھی ہے عقل مند بھی..... وہ عام عورتوں کی طرح خانہ داری اور بچوں میں گھر کر خود کو ضائع کردینے کی حماقت میں نہیں پڑی۔ اس نے خود کو اہمیت دی، اپنا خیال رکھا اور اپنی شناخت بنالی۔"

"پاگل ہے تمہارا مسٹر فریڈ۔" محب بولا۔ "عورت کی پہچان، اس کی شناخت اس کا گھر، شوہر اور بچے ہوتے ہیں..... تم نے اپنے بچوں کے بارے میں بتایا اسے؟"

"ہاں..... بتایا۔"

"پھر؟"

"وہ ہنس کر کہنے لگے..... تم خود تو گم ہوگئیں۔"

کیرول نے ایک پل کو توقف کیا پھر تاسف سے بولی۔ "ہاں محب..... انہوں نے ٹھیک ہی تو کہا..... میں خود تو گم ہوگئی۔"

"تم کہاں گم ہوسکتی ہو جانِ من۔" محب نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا پھر ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تم تو یہاں بستی ہو جانِ محب۔"

کیرول کسمسائی۔ "محب!" اس نے اپنا سر محب کے سینے سے لگاتے ہوئے دھیمی سی آواز میں کہا۔

"ہاں..... بولو۔"

"مسٹر فریڈ افسوس کر رہے تھے کہ میں نے اپنی شناخت بنانے کے لیے کوئی تگ و دو کیوں نہیں کی جبکہ میں شکل و صورت اور بیلے کارکردگی میں اپنی دوسری ساتھیوں سے بہت بہتر تھی۔ مسٹر فریڈ کا کہنا تھا، میں گلوریا سے کہیں آگے جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔"

"دفع کرو گلوریا کو اور دفع کرو مسٹر فریڈ کے کہنے سننے کو بھی۔" محب بولا۔

"محب! ایک بات کہوں؟" کیرول کی انگلیوں کا لمس محب اپنے گریبان پر محسوس کرسکتا تھا۔

"کہو۔"

"تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے۔"

محب اس کی بات کی گہرائی میں نہ جاسکا۔

"لو..... چھوڑ دیا۔" اس نے کیرول کے گرد اپنی بانہوں کا حصار کھول دیا۔

وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"
"کچھ نہیں۔" اس نے نظریں چرالیں۔
"کچھ تو؟" محب نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
"میں تھک گئی ہوں۔" وہ بوجھل آواز میں بولی۔
محب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے دیوان تک پہنچا اور اسے دیوان کے کنارے پر بٹھانے کے بعد خود بھی اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔
"پتا ہے کیا کیرول۔" محب کے لہجے میں دلسوزی تھی۔
"تم اور میں برسوں سے ایک ہی دائرے میں محصور زندگی گزارتے رہے ہیں---- میں یونیورسٹی، تدریس اور تحقیق کا---- تم گھر اور تمہاری خانہ دارانہ ذمے داریاں---- تم تھک گئی ہو اور زندگی کی یکسانیت سے اوب گئی ہو---- مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہمیں اپنے لیے بھی کچھ وقت نکالنا چاہیے---- اب کی بار تعطیلات میں ہم دونوں اکٹھے کہیں چلتے ہیں۔ گھومیں گے---- پھریں گے---- گزرے دنوں کو یاد کریں گے---- تم اب بھی اتنی حسین ہو کیرول!"
"کہاں جاؤ گے؟" کیرول نے اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھا۔
"جہاں میں نے تمہیں پایا تھا۔"
"جہاں میں گم ہوئی تھی۔" اس نے بلا توقف کہا۔
"کیا مطلب!" محب نے چونک کر اسے دیکھا۔
"ٹمتھ کا چاہِ تمنا یاد ہے تمہیں؟"
"بھول سکتا ہوں بھلا---- وہیں تو میں نے تمہیں پایا تھا۔"
"اور میں---- خود کو گم کر بیٹھی تھی۔" کیرول کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔ "میں شادی نہ کرتی تو آج گلوریا سے کہیں آگے ہوتی۔"
"گولی مارو گلوریا کو۔"
کیرول نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
"ہم ٹمتھ چلیں گے کیرول..... ساحل پر گھومیں پھریں گے---- بنچ پر بیٹھ کر آبی لہروں کا رقص دیکھیں گے---- مرغابیوں کو چپس کھلائیں گے..... سڑک پار کافی اور ڈونٹس کی وہ دکان خدا جانے اب ہوگی کہ نہیں..... اگر ہوئی تو تم بنچ پر بیٹھ کر میرا انتظار کرنا..... میں تمہارے لیے گرم گرم کافی اور تازہ بتازہ ڈونٹس لے کر آؤں گا..... ہم ٹیولپس سے بھری سنگی کیاریوں کے جلو میں اپنی تصویریں بنوائیں گے---- میں چاہِ تمنا میں سکہ ڈال کر پھر ایک دعا مانگوں گا۔"
"کیا دعا؟"
"کہ تم سدا میری زندگی کے آسمان پر یونہی تاباں و فروزاں رہو..... آئی لو یو کیرول۔"
وہ خاموش رہی۔

☆☆☆

آغازِ ہفتہ میں محب کی پیشہ ورانہ مصروفیات پھر شروع ہو گئیں۔ ہفتے کے پہلے دن یونیورسٹی سے گھر واپس لوٹتے ہوئے محب نے کیرول کے لیے چاکلیٹ اور تازہ پھولوں کا ایک خوشنما دستہ خریدا۔ دونوں چیزیں کیرول کی پسندیدہ تھیں۔ پھول دیکھ کر وہ کھل اٹھتی۔ بار بار سونگھتی، گہری گہری سانسیں لیتی جیسے تازہ پھولوں کی خوشبو اپنے نفس میں اتار رہی ہو اور چاکلیٹ تو اسے بچوں کی طرح خوش کرتی۔ محب کا خیال تھا پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے جب وہ گاڑی سے اترے گا تو کیرول اسے حسبِ معمول گھر کے داخلی دروازے پر کھڑی مسکراتی ہوئی ملے گی مگر خلافِ معمول وہ دروازے پر نہیں تھی البتہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کیرول اسے لیونگ روم میں ملی۔ سفید ٹراؤزر کے ساتھ اس نے آسمانی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ سالہا سال ڈھکا رہنے والا سر ننگا تھا۔ اس نے بالوں کو بلونڈ ڈائی کر رکھا تھا۔ چہرہ میک اپ زدہ تھا۔
"آج تو تم بہت بدلی ہوئی نظر آ رہی ہو۔" محب نے گلدستہ اور چاکلیٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
محب کی بات سن کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اس نے گلدستہ اور چاکلیٹ دونوں کو قدرے بے اعتنائی سے ایک طرف رکھ دیا۔ محب کو اس کی بے اعتنائی کھٹکی۔ اس نے روزانہ کی طرح نہ تو اس کے ہاتھ سے اس کا بریف کیس لیا نہ کوٹ اتارنے میں اس کی مدد کی۔
"کہیں جا رہی ہو کیا؟" محب نے سرتاپا اس کی تیاری پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"ابھی تو نہیں۔"
"یعنی کہیں جانے کی تیاری ہے؟"
"چائے پیو گے یا کافی؟"
"تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے میں مہمان آیا ہوں۔"
"کیا پتا کون مہمان ہے۔"
"کیا مطلب!" محب چونکا۔
"کچھ نہیں..... تم اپنے کمرے سے ہو آؤ تب تک میں تمہارے لیے چائے، کافی کچھ بناتی ہوں۔"
محب کو کیرول کے رویے میں غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ گرمجوشی، حلاوت اور چاہت جس کا اظہار وہ

ہر روز اس کی گھر واپسی پر کیا کرتی تھی، مفقود تھی۔ محب اپنے کمرے سے ہو کر تبدیل شدہ لباس میں لیونگ روم میں آیا تو فضا کافی کی مہک سے معمور تھی۔ محب کو کافی کا مگ تھما کر کیرول اس کے روبرو بیٹھ گئی۔

''یہاں میرے پاس بیٹھو نا۔''

کیرول اس کے پاس آ بیٹھی۔ کافی کا مگ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے محب نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ مرد تھا اور شوہر۔ بیوی کے حلیے اور رویے میں خلافِ معمول تبدیلی اسے کھٹک رہی تھی۔ مگر وہ سب پوچھنے سے گریز کر رہا تھا۔ جہاندیدہ شخص تھا۔ یونیورسٹی میں جوانوں کی آنکھوں سے ان کے دلوں میں جھانکتا رہا تھا۔ جانتا تھا جلد یا بدیر کیرول کے حلیے اور رویے میں تبدیلی کا سبب آشکار ہو جائے گا۔

کیرول عجلت میں تھی۔ اس نے بات کرنے میں دیر نہیں کی۔ رات کے کھانے پر جب وہ دونوں کھانے کی میز پر بیٹھے تو اس نے دیکھا کیرول خالی پلیٹ میں کانٹا گھما رہی تھی۔

''کیا بات ہے..... تم کھانا نہیں کھا رہیں۔''

''کھاتی ہوں۔'' اس نے نہایت بے دلی سے تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔

محب کے لیے اس کی خاموشی معنی خیز تھی۔

''محب!'' اس نے مچھلی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں لیتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔

محب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں۔''

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کرو۔''

''ویسے تو خیر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں.....'' اس نے توقف کیا پھر بولی۔ ''ہمارے درمیان یہی معاہدہ تھا نا کہ میرے کہے بغیر تم جان لو کہ میرے دل میں کیا ہے۔''

''ہاں مگر..... میں تمہارے اس معیار پر اکثر پورا نہیں بھی اترا ہوں..... بہتر ہوگا کہ اس وقت بھی تم مجھے خود بتا دو۔'' محب نے کہا۔

کیرول اپنی پلیٹ میں پڑے ادھ کھائے مچھلی کے ٹکڑے کو کچھ دیر تک ہیجانی سی کیفیت میں جا بجا کانٹے سے کچوکتی رہی پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مسٹر فریڈ سے ملاقات ہونے کے بعد سے میں مسلسل کرب میں رہی ہوں..... گلوریا کی میرے مقابل کیا حیثیت تھی..... دوسرے درجے کی رقاصہ ہوا کرتی تھی وہ..... میں نے حماقت کی جو اتنی جلدی شادی کر کے گھر اور بچوں میں الجھ گئی۔ میں تو بہت آگے جا سکتی تھی، بہت نام کما سکتی تھی۔ بیلے کی دنیا میں ایک شناخت ہوتی، پہچان ہوتی.....'' دفعتاً کیرول کے لہجے میں پچھتاوے اور کرب کی جگہ جارحانہ کیفیت حلول کر گئی۔ ''گلوریا اگر پچاس سال کی عمر میں بھی اپنے رقص سے لوگوں کو مبہوت کر سکتی ہے تو میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔''

''تمہارا اور گلوریا کا کیا مقابلہ میری جان..... تم نے تو پچھلے تیس سال سے مجھے مبہوت کر رکھا ہے..... آئی لو یو کیرول۔'' محب اپنا ایک بازو کیرول کے ایک شانے سے دوسرے تک دراز کرتے ہوئے بولا۔

''میں جانتی ہوں تم مجھ سے محبت کرتے ہو مگر مجھے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔''

''عقلمندی کی تم نے جو اپنا گھر بسا لیا..... آج تمہارے پاس گھر ہے، بچے ہیں، چاہنے والا شوہر ہے۔ خدانخواستہ گلوریا کی طرح خانہ بردوش اور تماش بینوں کی غلط نگاہوں کا مرکز نہیں ہو تم۔''

''تماش بینوں میں فن کے قدردان بھی ہوتے ہیں جو فنکار کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ مسٹر فریڈ بھی گلوریا کے فن کے قدردان ہیں کہ نہیں۔''

''چھوڑو..... ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔''

''محب!''

''ہاں۔''

''میں کئی دن سے ایک نفسیاتی جنگ میں تھی..... آج میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ!'' محب چونکا۔

''اپنی تلاش میں جانے کا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے تمہارے گھر سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تم ٹھیک تو ہو..... گھر صرف میرا نہیں، ہم دونوں کا ہے۔''

''مجھے گھر یا اس کی مالیت سے کوئی غرض نہیں..... تم نے مجھے اتنے سال اپنے سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا ہے..... مجھے محبت دی ہے، عزت دی ہے۔ تمہارے گھر میں میرا قیام عارضی تھا، گھر تمہارا ہی ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو کیرول! تم اس گھر کی ملکہ ہو۔''

''پلیز! مجھے کوئی لالچ مت دو..... میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے جانا ہے..... تمہیں بتائے بغیر خاموشی سے بھی جا سکتی تھی مگر جو عرصۂ حیات ہم نے اکٹھے گزارا، اس کا

تقاضا تھا کہ میں تمہیں بتا کر جاؤں۔ بچوں کو تم مت بتانا، میں یہاں سے جانے کے بعد خود فون کر کے بتادوں گی انہیں..... میرا خیال ہے وہ میری اس دلیل سے اتفاق کریں گے کہ ہر فرد کو اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ہے۔"

محب دم بخود تھا۔ کیرول کی آواز اسے کسی اور ہی سیارے سے آتی اور نامانوس لگ رہی تھی۔

"تم سے جدا ہوتے ہوئے میں تمہیں ایک بات کا یقین دلانا چاہتی ہوں..... تمہارا جی چاہے تو میری بات کا اعتبار کر لینا..... میری زندگی میں تمہارے علاوہ کسی دوسرے مرد کی نہ گنجائش ہے نہ کبھی ہوگی..... تم سے بہتر آدمی مجھے اس جنم میں تو ملے گا نہیں..... اسی لیے مجھے تم سے طلاق کا مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی..... ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں آزاد کر سکتی ہوں..... معاف کرنا، مجھے قانونی موشگافیوں کے باعث ایسا کہنا پڑ رہا ہے ورنہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اسلامی قانون طلاق کے سلسلے میں مرد کو عورت کا پابند نہیں کرتا۔"

"میرا خیال ہے تمہیں کسی نفسیاتی معالج کے پاس جانے کی ضرورت ہے۔" محب نے خاصی تشویش سے کہا۔

"تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ میرا ذہنی توازن درہم برہم ہے تو ایسا ہرگز نہیں..... میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔" کیرول نے توقف کیا پھر بولی۔ "ہوسکتا ہے ہم آخری مرتبہ ایک میز پر اکٹھے بیٹھے کھانا کھا رہے ہوں۔ تمہیں میری طرف سے دوسری شادی کی پوری اجازت ہوگی۔"

"کیرول!" محب کا پیمانہ صبر چھلک اٹھا۔ "میری قوتِ برداشت کو زیادہ مت آزماؤ..... تم اس گھر سے کہیں نہیں جاؤ گی۔"

"مجھے روک تو نہیں سکتے تم۔" اس نے للکارنے والے انداز میں کہا۔

"بالکل روک سکتا ہوں..... تم میری بیوی ہو..... میری اجازت کے بغیر تم کہیں نہیں جاسکتیں۔"

"یہ تمہارا دیس نہیں ہے محب..... انگلستان ہے..... جہاں مرد، عورت پر زور و جبر نہیں کر سکتا۔"

"میں زبردستی کروں گا۔" محب کا لہجہ جارحانہ تھا۔

"تم مجھے قتل کر کے خاموش کر دو تو اور بات..... بصورتِ دیگر میں اپنی مدد کے لیے پولیس بلالوں گی۔"

"بلالو۔" خبث چراغ پا ہو کر کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔

کیرول بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور محب کے غصے سے خائف ہونے کے بجائے اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔

"آئی لو یو محب!" اس نے محب کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

محب نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔

"ناراض مت ہو محب۔"

"ہنسوں، ناچوں، گاؤں، قہقہے برساؤں..... دنیا کو سناؤں کہ میری بیوی، چار جوان بچوں کی ماں اپنی شناخت کی تلاش میں گھر چھوڑ کر جا رہی ہے۔" محب بھبکا۔

"تدریس کا عمل اگر تمہیں سرشاری دیتا ہے تو بیلے کبھی میرا بھی جنون ہوا کرتا تھا محب..... کیا تم یقین کرو گے کہ ان دنوں میں سوتے میں بھی خود کو رقص کرتے دیکھا کرتی تھی..... تم سے شادی کے بعد میں نے اپنے اس جنون کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا مگر شوق کی دبی ہوئی چنگاری تو کسی بھی وقت بھڑک سکتی ہے۔"

"اس کمینے بڈھے فریڈ نے تمہیں ورغلایا ہے۔" محب نے دانت پیسے۔

"ورغلایا نہیں..... مجھے میری اہمیت کا احساس دلایا ہے۔"

محب نے مسٹر فریڈ کو اپنی عادت کے خلاف گالی دی۔

"اس بے چارے کو بُرا مت کہو۔"

"کیرول!" محب نے اپنی دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کھڑی کی اور کیرول کو تنبیہی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم اگر گھر سے گئیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"محب! ہوسکتا ہے میں واپس لوٹ آؤں مگر فی الحال مجھے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا..... تم بھی نہیں محب۔"

ملکہ کی راجدھانی میں عورت کی بالادستی کا احساس بے بسی بن کر محب کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ کیرول اجنبی بنی اسے دوسرے کنارے پر کھڑی محسوس ہوئی۔

"تم نے مجھے بہت خوش رکھا محب..... تمہاری تمام عنایتوں کا بے حد شکریہ..... میں تم سے محبت کرتی تھی، کرتی ہوں، کرتی رہوں گی۔"

محب نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا منظر سے نکل گیا۔

رات بہت کٹھن تھی۔ کیرول کے منع کرنے کے باوجود محب نے بچوں کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

"جانے دیں ڈیڈی..... گھر سے نکلیں گی تو انہیں گھر کی قدر آجائے گی۔" سارہ نے کہا۔

"اگر وہ فیصلہ کر ہی چکی ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

UUNOVELS.COM

معز بولا۔

''ہر فرد کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق.... ..... ہے ڈیڈی۔'' منیب نے کہا۔

''ڈیڈی! میرے اپنے مسائل بہت ہیں۔ آپ لوگ مجھے اپنے مسائل کی داستان نہ سنایا کریں۔'' تارا نے سرد مہری دکھائی۔

محب کو دکھ ہوا۔ کیرول نے چاروں بچوں کی تعلیم و تربیت پر جو توجہ دی تھی، وہ نہ جانے کیوں اکارت گئی تھی۔ جن دنوں چاروں زیرِ تعلیم تھے اور گھر میں ہوتے تھے، کیرول اور اس کے اپنے حلقہ احباب میں ان کے بچوں کی تمیز، تنظیم اور ذہانت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ گھر سے کیا گئے بے مہار ہی ہو گئے۔ باہر کی مادر پدر آزاد فضاؤں کا اثر تھا یا دو مختلف نسلوں کے ملاپ کا ردِ عمل۔

کیرول چلی گئی۔

محب کی سمجھ میں نہ آتا، تیس سال سے زائد کے سفر میں کس مقام پر کیا غلطی ہوئی تھی جس کا شاخسانہ یوں سامنے آیا تھا۔ اسے بار بار بڑے بھائی کے الفاظ یاد آتے۔ ''یار! پاکستان میں لڑکیاں ناپید ہو گئی تھیں کیا جو تم نے گوری سے شادی کر لی..... بھائی میرے اپنی عورتیں وفادار ہوتی ہیں۔ ہر حال میں نبھاتی ہیں۔ آخر تک ساتھ چلتی ہیں۔ آنکھیں نہیں دکھاتیں، مرد کے سامنے آنکھیں جھکائے رکھتی ہیں۔ اچھی، بری سب سہتی ہیں۔ مرد کی زیادتی پر بھی اف نہیں کرتیں۔ اندر ہی اندر رو کر چپ ہو جاتی ہیں اور پھر..... ویسی کی ویسی وفادار! تم ان کا اعتبار کر سکتے ہو۔ دھوکا نہیں دیتیں..... گوریوں کا کیا ہے یار..... قسمت سے کوئی دانہ اچھا نکل آیا تو خیر ورنہ ناقابلِ اعتبار..... ان پریکٹیکل! کچھ پتا نہیں ہوتا اگلے لمحے کیا کر بیٹھیں۔ کس کے ساتھ چل دیں۔''

''کیرول ایسی نہیں ہے بھائی۔'' اس نے کہا تھا۔

''دیکھتے ہیں۔'' بھائی نے گویا اس کی رائے کو چیلنج کیا تھا۔

تیس برس سے زائد عرصہ کیرول ایک مثالی گھر دار عورت بنی رہی تھی۔ اس نے اسے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اچانک بدل گئی تھی۔ مسٹر فریڈ کو اس کی اس کایا پلٹ کا کس حد تک ذمے دار ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ کیا کیرول کے پاس اپنی سمجھ بوجھ اپنی عقل نہیں تھی؟ اتنا بڑا فیصلہ۔ آزمائش تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی..... ساعت بہ ساعت! نسل بہ نسل! شیطان کے نرغے میں آ کر کفرانِ نعمت کرنے اور عہد توڑنے والوں کا انجام اچھا کب ہوتا ہے جو کیرول

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروا لیں۔

یا

ادارے کو 1200 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 600 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے لیے کسی اچھے انجام کی توقع کی جاسکتی۔

بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا..... مغرب کی عورت ان پری ڈکٹیبل ہوتی ہے..... کچھ پتا نہیں اگلے لمحے کیا کر بیٹھے۔

کیرول کے جانے کے بعد محب کو بار بار اپنی کزن عائشہ کا خیال بھی ستاتا۔ چھوٹے چچا کی بڑی بیٹی..... اس کی کچھ بولتی ہوئی آنکھیں۔ بے صدالیوں پر لکھی تحریر..... اس نے کبھی کچھ نہیں کہا تھا اس سے..... جھوٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں مگر اس کی بولتی آنکھیں اور بے صدالب اس کے دل میں محب کے لیے چھپی محبت کے نقیب تھے۔ جب وہ پڑھنے کے لیے انگلستان آرہا تھا تب بھی اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ بے صدالب صدا دے رہے تھے۔ ''پردیس جاکر بھول نہ جانا محب!''

محب بھول گیا تھا۔ عائشہ ہی کو نہیں، بہت سے رشتوں کو اور کیرول کے بعد تو جیسے اسے صرف کیرول ہی یاد رہ گئی تھی۔ کئی سال بعد جب وہ کیرول اور بچوں کو لے کر پاکستان گیا تو عائشہ اسے دو کمروں کے ایک چھوٹے سے گھر میں اپنے بیمار شوہر اور پانچ بچوں کے ساتھ بڑی جھینپی جھینپی اور شرمندہ سی ملی تھی۔ اس کے گھر میں محب، کیرول اور ان کے بچوں کو بٹھانے کے لیے پلاسٹک کی کرسیاں بھی پوری نہیں پڑ سکی تھیں۔ عائشہ کا شوہر کسی حکومتی ادارے میں کلرک تھا۔ عائشہ اپنے گھر آئے مہمانوں کو رنگ برنگے مگوں میں چائے اور پلیٹ میں پھیلا کر رکھے گئے بسکٹ پیش کرتے ہوئے بہت شرمندہ نظر آتی تھی۔

کیرول کے جانے کے بعد خود احتسابی کی منزل سے گزرتے ہوئے محب نے سوچا..... جیسی راحت اس نے کیرول سے شادی کے بعد اسے اپنے گھر میں فراہم کی تھی، اس کا عشر عشیر بھی اگر کیرول سے شادی کرنے کے بجائے عائشہ کو اپنے گھر میں بسا کر اسے فراہم کر دیتا تو عائشہ مجسم شکرگزار بنی اس کے پاؤں دھو دھو کر پی رہی ہوتی۔ بچے بھی اِدھر اُدھر نہ جاتے۔ گھر میں بچوں کے بچوں کی رونق بنی ہوتی۔

کیرول کے جانے کے بعد ویک اینڈ پر صرف سارہ آئی۔ اس نے محب کو بتایا کہ کیرول فرانس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔

محب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

کیرول کے جانے سے پہلے اس نے اپنی مردانگی اور انا کے سینے پر پاؤں رکھ کر اسے روکنے کی آخری کوشش کی تھی۔ ''تمہارے بغیر میں مرجاؤں گا کیرول!'' اس نے کہا تھا۔

''نہیں محب۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی تھی۔ ''کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا..... سارہ جب اس گھر سے گئی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ واپس نہ آئی تو میں مرجاؤں گی..... وہ واپس نہیں آئی اور میں زندہ رہی..... معز گھر سے گیا تو بھی میں نے یہ خیال کیا تھا کہ میں اس کے بنا مرجاؤں گی مگر تم دیکھ لو زندہ رہی کہ نہیں..... منیب اور تارا کے جانے کے بعد بھی میں اسی کرب سے گزری تھی محب..... دو چار دن دل دکھتا ہے پھر سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔''

کتنی کٹھور تھی کیرول!

ٹیکسی میں اپنا چرمی صندوق اور سفری تھیلا بھی اس نے محب سے رکھوایا تھا۔ اس کا اسباب اٹھاتے ہوئے محب کو یوں لگا تھا جیسے وہ کیرول کے ساتھ گزرے تیس برسوں کا تابوت اٹھا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو گالیاں دیتا رہا اور اس دیس میں عورت کی آزادی اور خودمختاری کو کوستا رہا۔ کیرول کے سر پھرے پن سے نمٹنے کے لیے وہ اگر تشدد کا راستہ اپناتا تو اس کا ٹھکانا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ عورت کی ہٹ دھرمی کا راستہ روکنے والا مرد بن کر وہ نشانِ عبرت بھی بنایا جاسکتا تھا۔

کیرول کے ساتھ اس کی طویل خوشگوار رفاقت کا یہ انجام خود محب ہی نہیں، انگلستان میں اس کے اور کیرول کے حلقۂ احباب اور پاکستان میں اعزہ واقارب کے لیے بھی چونکا دینے والی خبر تھی۔ ہر ایک نے حسبِ مقدور افسوس کا اظہار کیا۔

محب کا عم زاد محمود جو اپنی بیوی کے ہمراہ انگلستان میں مقیم بیٹی سے ملنے آیا تھا اور دونوں میاں بیوی کیرول سے مل کر انتہائی متاثر ہوئے تھے، کیرول کے جانے کی خبر سن کر اس نے محب کو فون کیا اور بولا۔ ''محب! میرے اور تمہاری بھابی کے لیے یہ خبر ایٹم بم کے دھماکے سے کم نہیں..... ہوا کیا؟''

''بس یار! میرا اور اس کا ساتھ اتنا ہی تھا۔'' محب یہی کہہ سکا۔

شکیل، محب کا پھوپی زاد بھائی جسے شادی کے لیے کوئی لڑکی ہی پسند نہ آئی تھی اور جس نے انگلستان آمد پر ہفتہ عشرہ محب کے گھر میں گزار کر جاتے ہوئے کہا تھا کیرول بھابی جیسا ایک پیس اور تلاش کرلو، شادی کرلوں گا۔ اس نے کہا۔ ''یار محب! یقین نہیں آتا کہ کیرول بھابی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ تمہاری خوشگوار ازدواجی زندگی سے متاثر ہوکر تو

UUNOVELS.COM

میں نے انگلینڈ سے واپس آتے ہی اپنا گھر بسالیا تھا۔"

یقین تو محب کو بھی نہ آتا تھا کہ کیرول اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ خود کو اس واہمے میں مبتلا پاتا کہ کیرول گھر کے کسی حصے سے ہنستی مسکراتی یا اپنے ہاتھوں کو تولیے سے خشک کرتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور پوچھے گی۔

"لیں مائی لو! انی اور کافی؟"

بڑے بھائی حیات ہوتے تو کہتے۔ "میاں! سمجھایا تھا نا تمہیں کہ مغرب کی عورت ان پری ڈکٹیبل ہوتی ہے..... کچھ پتا نہیں ہوتا اگلے لمحے کیا کر جائے۔"

کیرول کے جانے کے بعد بچے بھی دھیرے دھیرے گھر کا رستہ بھول گئے۔ بھولے بھٹکے بھی ان میں سے کسی کا فون آ جاتا یا فادرز ڈے اور کرسمس پر کارڈ۔ انہی سے کبھی کیرول کے بارے میں بھی خبر مل جاتی۔ وہ فرانس چلی گئی تھی۔ فرانس جانے کے بعد کچھ عرصہ بچوں سے رابطے میں رہی پھر رہا سہا رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔

حیات نے اپنا سفر جاری رکھا۔

سارہ نے ایک لاد ین کینیڈین آدمی سے شادی کی اور اس کے ساتھ کینیڈا چلی گئی۔ معز کئی سال اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا رہا پھر دو بچوں کی پیدائش کے بعد دونوں نے شادی کر لی۔ مغرب کا یہ قرینہ بھی عجیب تھا۔ پہلے ساتھ رہنا پھر بچے پیدا کرنا بعد ازاں شادی۔ محب نے اور اس کے آباء نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ ان کی ایک نسل پر ایسا وقت بھی آئے گا جب مرد و عورت بنا نکاح اگلی نسل کو جنم دیں گے۔ منیب نے مجرد رہنا پسند کیا۔ اس کا خیال تھا مرد اور عورت کے درمیان شادی کا بندھن ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ شاید یہ خیال اس نے ماں اور باپ کی ازدواجی زندگی کے انجام سے کشید کیا ہو۔ کون سمجھاتا اسے کہ نسلِ انسانی کا پہلا بندھن ہی مرد اور عورت کا رشتہ ہے۔ مودت اور رحمت کا رشتہ۔ مرد اور عورت بعد نکاح مودت یعنی چاہت کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ ان کی باہمی نفسانی اور معاشرتی ضروریات ایک کے لیے دوسرے کے دل میں محبت کو گھر دیتی ہیں اور عمر گزرنے کے ساتھ بڑھاپے میں دونوں ایک دوسرے کے لیے رحمت بن جاتے ہیں۔ ایک کے لیے دوسرے کے دل میں رحم کا جذبہ گھر کر لیتا ہے۔

تارا، محب کی سب سے چھوٹی اور عزیز ترین بہن جوانی میں روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گئی۔ جوان بہن کی مرگِ ناگہاں نے محب کے اعصاب کو بدترین شکست و ریخت سے دوچار کیا۔

بہت سال گزرے۔

کیرول ایک زخم، ایک خواب بن کر رہ گئی۔ زخم جو ٹیسیں دیتا تھا۔ خواب جو روح کو تڑپاتا تھا۔

تنہائی کی قید کاٹتے محب کو ایک روز کیرول چیرنگ کراس ریلوے اسٹیشن پر نظر آ گئی۔

"کیرول!" وہ اسے بے تابانہ پکارتا اس کے پیچھے لپکا۔

وہ ٹھٹک گئی۔

محب اس کے روبرو جا تھما۔

کیرول انگریزی لباس میں ملبوس تھی۔ گھٹنوں سے ذرا نیچے اسکرٹ۔ سرنگا اس کے بائیں بازو پر بیگ جھول رہا تھا۔

محب ایک مرتبہ پھر چاہِ تمنا پر کھڑا تھا۔ وہ بھول گیا کہ کیرول ایک طویل سفر کے بعد اس سے کس بے رخی سے نگاہیں موڑ کر گئی تھی۔ وہ بھول گیا کہ اس کے روبرو کھڑی عورت کبھی مسلمان عورت کے روپ میں بھی رہی تھی۔ اسے بس اتنا یاد رہا کہ اس کے روبرو کھڑی عورت اس کی محبت تھی۔ محبت کی خودغرضی یہی ہے کہ وہ محبت کرنے والے کو ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

"میں تمہارے بغیر جی نہیں سکا ہوں کیرول۔" وہ گڑگڑایا۔

"مگر میں تو جی رہی ہوں۔" کیرول نے کہا۔

"گھر چلو۔" محب نے اس کا بازو تھام لیا۔

"کون سے گھر؟" اس نے محب کو اچنبھے سے دیکھا۔

"اپنے گھر..... ہم دونوں کے گھر۔"

وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ "یہ ملاقات محض اتفاق ہے..... مجھے گمشدہ ہی سمجھو۔"

"پلیز!" محب نے اس کا بازو پکڑ کر منت کی۔

"نہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔"

محب کو دھچکا لگا، وہ اب بھی دوسرے کنارے پر ہی کھڑی تھی۔

"راستے جدا کر کے کیا ہاتھ آیا تمہارے..... کیا یہ ہے تمہاری شناخت!" محب نے اس کے سر سے پاؤں تک عمودا نظر ڈالی۔

وہ چند ثانیے خاموش کھڑی رہی پھر اس نے کہا۔ "میری کوئی شناخت نہیں..... میں گم ہو چکی ہوں۔" اس نے آہستگی سے اپنا بازو محب کی گرفت سے چھڑایا اور تیزی سے اس ٹرین کی طرف لپکی جو مسافروں کو اتارنے اور

UUNOVELS.COM

چڑھانے کے لیے اسٹیشن پر آرکی تھی۔ محب پلیٹ فارم پر یوں ساکت کھڑا رہ گیا جیسے اس کے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہوں۔

اعترافِ شکست کر کے جانے والی کیرول ہجومِ زندگی میں پھر گم ہو گئی۔

شکیل، محب کا کزن اپنی بیوی کے ہمراہ انگلستان کی سیر و سیاحت کو آیا تو محب کے گھر مہمان ہوا۔ بہت احتیاط اور رازداری سے اس نے ایک دن اس سے پوچھا۔ ''ایک بات بتا محب..... مگر سچ بتانا۔''

''پوچھو۔'' محب جانتا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کرے گا جس کا تعلق اس کی اور کیرول کی ازدواجی زندگی سے ہوگا۔

''فرض کر.....'' شکیل گویا ہوا۔ ''تجھے زندگی بالکل نئے سرے سے شروع کرنے کو ملے تو کس طور گزارنا پسند کرے گا تو اسے؟''

''زندگی کا وہ عرصہ جو میں نے کیرول کے ساتھ گزارا اسے تو میں بعینہٖ گزارنا پسند کروں گا باقی میں اگر تھوڑا بہت ردوبدل ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔'' محب نے بلاتردد جواب دیا۔

شکیل اس کا منہ دیکھنے لگا۔

''کیا تو اب بھی..... کیرول بھابی کو مس کرتا ہے؟'' شکیل نے قدرے اشتباہ سے محب کو دیکھا۔

محب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور شکیل کے شانے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ''برادر! کسی دانشور نے کہا ہے محبت قطبی ستارے کے مانند ہوتی ہے، جو کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔''

☆☆☆

محب ریٹائر ہوا تو اس نے بچوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ ابھی حیات تھا سب سے پہلے سارہ کو پھر دونوں بیٹوں کو باری باری فون کیا۔ سارہ نے جہازی سائز کا ایک کارڈ ارسال کیا۔ فیروزی اور سیاہ رنگ میں چھپے اس خوبصورت کارڈ پر ابھرے ہوئے نقرئی حروف میں لکھا تھا۔

''آپ کی ریٹائرمنٹ پر..... تہِ دل سے نیک تمناؤں کا پیغام.....

برسوں کی تھکن اتاریں..... آرام کریں..... زندگی کی رعنائیوں سے محظوظ ہوں۔''

محب کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ زندگی میں رعنائی کہاں رہی تھی۔ وہ تو کیرول اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اب تو بڑی بے مزہ سی زندگی گزار رہا تھا وہ۔ اکثر اسے اپنے کالج کے مجلہ میں شائع شدہ رباعی کے اشعار یاد آنے لگتے۔

کتنی تنہا گزر رہی ہے حیات
جیسے اک میں ہی ہوں زمانے میں
ایک آئینہ تک نہیں اے دوست
زندگی کے نگار خانے میں

معز نے مشورتاً اسے کچھ عرصے کے لیے پاکستان جا کر اپنوں میں وقت گزارنے کو کہا۔

منیب نے کچھ دنوں کو اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی..... زور تھا کچھ دنوں پر!

محب نے ٹمنتھ کا رخ کیا۔

ٹمنتھ! کیرول اور اس کے کنوارے نقوشِ پا کا امین!

ٹمنتھ برسہا برس بعد بھی ویسا ہی دلفریب اور پُرسحر تھا۔ شدید ٹھنڈ میں فصیلِ ساحل کے پہلو میں ٹھٹک کر طوفانی آبی لہروں کی شوریدہ سری کا نظارہ کرتے ہوئے اسے بے اختیار دھند اور ٹھنڈ میں ڈوبا وہ یادگار دن یاد آ گیا۔ جب اس نے ٹمنتھ میں کیرول کو پہلی بار دیکھا تھا۔

ذہن کے بام و در یادوں کے چراغوں سے روشن ہونے لگے۔

وہی ٹھاٹھیں مارتا بیکراں سمندر!

وہی آہنی اور سنگی فصیلوں کی حدود کا پابند ساحل!

مرغابیوں کی سبک پروازی!

سنگی کیاریاں اور ان میں لہلہاتے، سر دھنتے ٹیولپس کے پرے!

بنچوں پر اپنی اپنی خواب سراؤں میں دبکے مرد و زن!

ساحل پر چونچالیاں کرتے بچے!

فضا میں وہی دلربائی وہی غنائیت۔

''روٹری وشنگ ویل'' اور اس چاہِ تمنا کی منڈیر پر اپنا ہاتھ دھرے نہایت چاہ سے اس چاہِ تمنا پر جھکی کیرول!

محب کے دل میں ہوکیں اٹھنے لگیں۔

سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، سوائے اس کے کہ کیرول وہاں نہ تھی۔

ٹھاٹھیں مارتے بیکراں سمندر پر سبک پروازی کرتی مرغابیوں پر آخری نظر ڈال کر محب تنویمی سی کیفیت میں پختہ سیڑھیاں اترتا قدرے نشیب میں محبت کرنے والوں کا انتظار کرتے چاہِ تمنا کے نزدیک جا تھما اور جیب سے ایک سکہ نکال کر چاہِ تمنا کی نذر کر دیا۔

ٹمنتھ اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM